راہِ عمل

(جلد سوم)

[حصہ ششم]

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

نام کتاب: راہِ عمل (جلد سوم) [حصہ ششم]
تالیف: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات: ٦٦٦

فہرست

پیغمبر اسلام کی حیاتِ طیبہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے، ان کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، ۶/سال تک اپنی والدہ اور ان کی وفات کے بعد نویں سال تک دادا کی پرورش میں رہے، پھر آپ کے چچا نے نہایت محبت کے ساتھ آپ کی پرورش کی، اس یتیمی کی زندگی نے آپ کے اندر یتیموں اور کمزوروں کے بارے میں محبت اور رحم دلی کے بے پناہ جذبات پیدا کر دیئے، آپ کی سچائی اور امانت داری کا اتنا شہرہ تھا کہ لوگ آپ کو صادق (سچا) اور امین (امانت دار) کہہ کر پکارتے تھے، آپ کے اندر فطری طور پر بڑی حکمت و فراست بھی پائی جاتی تھی، نبی بنائے جانے سے پہلے کعبۃ اللہ کی ٹوٹی ہوئی عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنے کے مرحلہ میں مختلف قبیلوں کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہو گیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ایسی لڑائی چھڑ جائے گی کہ خون کی ندیاں بہنے لگیں گی؛ لیکن سب لوگوں نے آپ کو حَکَم مان لیا اور آپ نے ایسا خوب صورت فیصلہ کیا کہ سارے لوگوں نے ہنسی خوشی قبول کر لیا۔

ٹھیک ۴۰/سال کی عمر یعنی ۶۱۱ء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و دیانت اور اخلاقی خوبیوں کا پورے مکہ میں چرچا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچپن اور جوانی اسی مکہ میں گزارا، نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں نے ہر طرح کی ایذاء رسانی کا راستہ اختیار کیا؛ لیکن کوئی انگلی نہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر اٹھے اور کوئی زبان نہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت و پاکیزگی پر کھلے۔

جب آپ کی عمر ۴۰/سال کی ہوئی تو آپ پر اللہ کا کلام اُترنا شروع ہوا، اس اچانک پیش آنے والے واقعہ سے آپ گھبرا گئے، آپ فوراً اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور اپنی گھبراہٹ کا اظہار کیا، اس وقت آپ کی بیوی نے – اور ظاہر ہے کہ بیوی سب سے زیادہ شوہر کے حال سے باخبر ہوتی ہے – کہا: خدا کی قسم! اللہ ہرگز آپ کو رُسوا نہیں کرے گا؛ کیوں کہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے

ہیں، ناداروں کا خیال کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور کسی اچھے کام کی وجہ سے انسان مصیبت میں پڑ جائے تو اس کی مدد کرتے ہیں۔ (بخاری، حدیث نمبر:۳) پھر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان فرمائیں تو مکہ کے قدیم طریقے کے مطابق آپ نے صفا کی پہاڑی سے آواز لگائی، لوگ جمع ہوگئے، آپ نے اپنی بات پیش کرنے سے پہلے لوگوں کے سامنے اپنی ذات کو پیش کیا، آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان ۴۰؍سال گزارے ہیں، تم نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا؟ تمام لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا: سچا، پھر آپ نے دریافت کیا کہ تم نے مجھے امانت دار پایا یا خیانت کرنے والا؟ تمام لوگوں کی زبان پر تھا: امانت دار، آپ نے مزید پوچھا: اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک فوج کھڑی ہے، جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم اس کا یقین کروگے؟ لوگوں نے کہا: بظاہر ایسے حالات نہیں ہیں کہ کوئی گروہ ہم پر حملہ کرے؛ لیکن ہم نے کبھی آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے یا بددیانتی کرتے ہوئے نہیں دیکھا؛ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ آپ کہیں اور ہم اس کا یقین نہ کریں، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: ''تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں''- اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے کس اعلیٰ معیار پر تھے کہ جن لوگوں کے درمیان آپ نے بچپن سے لے کر جوانی تک کا پورا وقت گذارا، ان سے آپ کو اپنے بارے میں دریافت کرنے میں کوئی ڈر نہیں ہوا؛ اسی لیے جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا، وہ بھی اس بات کی ہمت نہیں کرسکے کہ آپ کے اخلاق و کردار پر انگلی اٹھائیں۔

۱۳؍سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعوتِ دین کی جد و جہد فرمائی، یہ ۱۳؍ سال ایسے گزرے کہ شب و روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے قرار رہتے کہ کسی طرح اللہ کے بندے اللہ کو پالیں اور صحیح راستہ کی طرف آجائیں، پورا دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر دعوت دینے میں گزارتے، ایک ایک دروازہ پر پہنچتے اور دروازۂ دل کو دستک دیتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور اس کی خوشامد فرماتے؛ لیکن بہت کم لوگ تھے،

جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا، اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ حق کی روشنی ان کے سامنے دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل کر آ گئی، مگر بت پرستی اور بے دینی کو چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں تھے؛ کیوں کہ یہی ان کے آباء واجداد کا مذہب تھا، اس درمیان کوئی تکلیف نہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی نہ گئی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے خاندان سمیت بائیکاٹ کیا گیا، مسلمان لقمہ لقمہ کو ترستے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خاندان کے ساتھ درخت کے پتے اور چھال تک کھانے پر مجبور تھے، جسم اقدس پر اونٹ کی اوجھ اور غلاظت ڈال دی گئی، گلے میں پھندہ ڈال کر جان لینے کی کوشش کی گئی، راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، جملے کسے گئے اور تالیاں پیٹی گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتر العقل اور جادوگر مشہور کیا گیا۔

نبوت کے سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا رخ کیا، شاید ان کو قبولِ اسلام کی توفیق ہو؛ لیکن طائف کی زمین مکہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی، انھوں نے نہ صرف انکار کیا؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اوباش لڑکوں کو بھی لگا دیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکتے، خاک اڑاتے، ہنستے اور تمسخر کرتے، جسم لہولہان ہو گیا، نعلین مبارکین میں خون جم گیا، گھٹنے زخمی ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جاتے، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کر دیتے، حضرت زید بن حارثہؓ ساتھ تھے، انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاندھوں پر اُٹھا لیا اور ایک باغ کی پناہ لی، ٹوٹے ہوئے دل اور اشک بار آنکھوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف متوجہ ہوئے، جب مطمئن ہو گئے تو بڑی پُر درد دُعا فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الٰہا! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں، آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بے کسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں، آخر آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ کیا اس حریف بے گانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے، یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملہ پر قابو رکھتا ہے؛ لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ

نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے، میں اس بات کے مقابلہ میں کہ آپ کا غضب مجھ پر پڑے یا آپ کا عذاب مجھ پر نازل ہو، آپ ہی کے نور جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں، مجھے تو آپ کی رضا مندی اور خوش نودی مطلوب ہے، آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی۔

خدا کی قدرت دیکھیے کہ ایمان اور اسلام کی جو تخم آپ نے مکہ اور طائف کی سرزمین میں بوئی تھی، اللہ اس سے اہل مدینہ کے دلوں کو بار آور فرما رہا تھا، بارش کہیں اور ہو رہی تھی اور ایمان کا آبِ حیات کہیں اور جمع ہو رہا تھا، حج کے موقع سے مدینہ کے لوگ مکہ آئے، ان کے کان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ مخلص اور حق کے متلاشی تھے، ضد اور اکڑ نہ تھی، اس لیے فوراً ہی کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ طے ہوا، ایمان لائے اور اہل ایمان کو پناہ دینے کا عہد بھی کیا، مکہ کی زمین بتدریج اہل ایمان پر تنگ سے تنگ تر ہوتی جاتی تھی، بعض مسلمانوں کو گلے میں پھندا ڈال کر گرم ریتوں پر گھسیٹا جاتا، بعضوں کو سلگتے ہوئے شعلوں پر لٹایا جاتا اور ان کے جسم سے رسنے والے لہو سے آگ بجھائی جاتی، کسی کو دھوئیں کی دھونی دی جاتی، بعضے تو بے رحمی سے شہید ہی کر دیئے گئے۔

لیکن مجال نہ تھی کہ دامنِ صبر مسلمانوں سے چھوٹ جائے اور حکم خداوندی کے بغیر وہ اپنے طور سے فیصلہ کریں، آخر خود خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آ جائیں، مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ آنے لگے اور صرف وہی مکہ میں رہ گئے، جو یہاں سے جا نہیں سکتے تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مکہ ہی میں مقیم تھے اور اپنے بارے میں حکم خداوندی کے منتظر، اسلام کے دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا، ہر قبیلہ سے ایک ایک نمائندہ لے کر درِ دولت کا محاصرہ کر لیا، ادھر خدا کی طرف سے صورتِ حال سے آپ کو آگاہ فرمایا گیا، آپ پورے اطمینان کے ساتھ کچھ آیتیں پڑھتے ہوئے اور ایک مشتِ غبار محاصرین پر پھینکتے ہوئے باہر نکل آئے اور چھپتے چھپاتے کچھ دنوں میں مدینہ تشریف لائے،

آپ کے سر دھڑ پر انعام مقرر ہوا، پیچھا کرنے والوں نے پیچھا کیا اور اپنے تئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق خاص حضرت ابو بکرؓ کی جان لینے کی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھی، مگر خدا کی تدبیر کے سامنے ساری تدبیریں اکارت گئیں اور نبوت کا جو آفتاب مکہ میں طلوع ہوا تھا، مدینہ میں مہر نیم روز بن کر روشن ہوا۔

آپ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو جشن کا منظر تھا، بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت، آقا اور غلام، بڑے اور چھوٹے، دل اور آنکھیں بچھائے پروانہ وار کھڑے تھے، زبان پر استقبالیہ نغمے، نگاہانِ شوق بے تاب، یا تو مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ تھی یا پھر مدینہ نے دل وجگر راہوں میں بچھا رکھے تھے، مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کو اہل مدینہ نے اپنے یہاں جگہ دی، گھر دیا، دَر دیا، کھیت اور باغات نثار کیے اور سب سے بڑھ کر اتھاہ محبت اور پیار کی سوغات دی، اہل مدینہ نے جو ایثار کیا، شاید ہی انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے، اہل مکہ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، وطن کی فضاؤں کو خیر باد کہا، اعزہ و اقرباء کی محبت قربان کی اور اپنی پوری دنیا سے منھ موڑ کر ایک ایسی منزل کو چل پڑے جہاں اجنبیت سے سابقہ تھا اور مستقبل موہوم تھا، اس لیے آپ نے مکہ سے ترکِ وطن کر کے آنے والوں کو ''مہاجرین'' اور مدینہ کے رہنے والوں کو ''انصار'' کا نام دیا، مہاجرین کے معنی ہیں ''دین کے لیے ترکِ وطن کرنے والا'' اور ''انصاری'' کے معنی ہیں ''اہل ایمان کی مدد ونصرت کرنے والا''، مسلمانوں میں ان دو طبقوں کے سوا کسی تیسرے طبقہ کا تصور نہیں، نہ ذات پات کا، نہ قبیلہ اور برادری کا، نہ ملک اور صوبہ کا، نہ زبان کا، کوئی اور تقسیم نہیں جو اللہ کو مسلمانوں کی گوارا ہو۔

ہجرت کا یہ واقعہ ایک طرف مسلمانوں کی قربانی اور دین کی حفاظت و اشاعت کے لیے پیغمبر اسلام اور ان کے رفقاء عالی مقام کے ایثار و فدا کاری کی یادگار ہے اور دوسری طرف آئندہ اسلام کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا مقدمہ، یہ محض مکہ سے مدینہ کی طرف سفر نہیں تھا؛ بلکہ مغلوبیت سے غلبہ وظہور کی طرف اور مقہوریت سے طاقت و شوکت کی

طرف سفر تھا، بظاہر مسلمانوں پر زمین تنگ ہو رہی تھی؛ لیکن خدا نے اسی تنگی میں آفاق کی وسعت کو سمو رکھا تھا، یہ واقعہ نااُمیدیوں میں اُمید کی کرن سے روشناس کرتا ہے اور حوصلہ شکن حالات میں اُمید و حوصلہ کا چراغ جلاتا ہے اور اس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کیسی کیسی قربانیوں اور جاںنثاریوں سے خدا کے اس دین کو سربلند کیا گیا ہے اور کس قدر خون ولہو کے ذریعہ حق و صداقت کے اس شجرۂ طوبیٰ کی آب یاری فرمائی گئی ہے؟!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے اہم پہلو رحم دلی اور امن وصلح اختیار کرنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔ (بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر: ۳۷) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا: رحم کرنے والوں ہی پر خدائے مہربان بھی رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۲۴) جو لوگ کمزور اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے خصوصی مدد کے مستحق ہوتے ہیں، ان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر اچھے سلوک کا حکم دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یتیم کی محبت کے ساتھ پرورش کرے، وہ جنت میں میرے بہت قریب رہے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جیسے یہ دو انگلیاں۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۵۱۵، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۸۲۰) آپ نے بوڑھوں کی توقیر اور بچوں کے ساتھ شفقت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جو ایسا نہ کرے، وہ ہمارا آدمی نہیں۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۱۹) عورتوں کے ساتھ خاص طور پر اچھے سلوک کی تلقین کی۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمزوروں اور پریشان حال لوگوں کی مدد کی اہمیت کو بتاتے ہوئے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے پوچھیں گے: میں بیمار تھا، تم نے عیادت نہیں کی؟ میں بھوکا تھا، تم نے کھانا نہیں کھلایا؟ میرے کپڑے نہیں تھے، تم نے مجھے لباس نہیں پہنایا؟ بندہ پوچھے گا: اے اللہ! کیا آپ بیمار پڑ سکتے ہیں اور میں آپ کی عیادت کر سکتا ہوں؟ کیا میں آپ کو کھانا کھلا سکتا ہوں؟ کیا میں آپ کو کپڑے پہنا سکتا ہوں؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تو فلاں بیمار کے پاس پہنچتا تو مجھے وہاں موجود پاتے، اگر تو فلاں

بھوکے کے پاس پہنچتا تو مجھے وہاں موجود پاتا، اگر تو فلاں ننگے کے پاس جاتا تو مجھے وہاں موجود پاتا۔(مسلم، عن ابی ھریرہؓ ،حدیث نمبر:۲۵۶۹) آپ کی رحم دلی کا حال یہ تھا کہ مکہ میں ۱۳؍سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ پر ایمان لانے والوں نے نہایت تکلیف میں گزارے، مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں، بعضوں کو ریت پر گھسیٹا گیا، بعضوں کو آگ کے انگارے پر لٹایا گیا،بعض مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا گیا،خود آپ کے گھر کی دہلیز پر کانٹے ڈالے جاتے، گھر کے اندر کچرا پھینک دیا جاتا، گلے میں اونٹ کی اوجھ کا پھندا ڈال کر مارنے کی کوشش کی گئی، قتل کا منصوبہ بنایا گیا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پورے عرصہ میں نہ کبھی ہاتھ اٹھایا نہ اپنے ساتھیوں کو اس کی اجازت دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ خالی ہاتھ مدینہ چلے گئے، مدینہ کے زیادہ تر لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی اور آپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، آپ چاہتے تھے کہ اب یکسوئی کے ساتھ لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے؛ لیکن اہل مکہ کو یہ بھی گوارہ نہیں ہوا، انہوں نے مسلمانوں کی اس چھوٹی سی بستی پر اگلے ہی سال حملہ کر دیا اور بدر کے میدان میں جو مدینہ سے ۸۰؍میل پر واقع ہے، جنگ کی نوبت آ گئی، اللہ کی ایسی مدد ہوئی کہ دشمنوں کے بڑے بڑے ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے، آپ نے قیدیوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا، یہاں تک کہ رہا کرتے ہوئے انہیں نئے جوڑے پہنا کر رخصت کیا، اگلے ہی سال دوبارہ مکہ والوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ لڑائی بالکل مدینہ کی سرحد پر لڑی گئی، بہت سے مسلمان شہید ہوئے؛ لیکن اس حال میں بھی آپ حملہ کرنے والوں کے لیے دعا ہی کرتے رہے، دو سال کے بعد پھر اہل مکہ نے مختلف قبیلوں کو اپنا اتحادی بنا کر مسلمانوں پر حملہ کیا، یہ اتنی بڑی اور جنگی وسائل سے مالا مال فوج تھی کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی جنگی حکمت عملی اختیار کی کہ بالآخر دشمنوں کو واپس ہو جانا پڑا۔ یہ واقعہ مدینہ آنے کے پانچویں سال کا تھا، اس تابڑ توڑ حملہ کے باوجود اگلے سال آپ مسلمانوں کے ساتھ احرام کا لباس پہن کر مکہ کے لیے نکلے، جو امن اور جذبہ عبادت کی علامت سمجھا جاتا تھا اور عربوں کی

روایت کے مطابق احرام باندھ کرآنے والے کسی شخص کو کعبہ کا طواف کرنے سے روکا نہیں جاتا تھا؛ لیکن پھر بھی اہل مکہ نے اجازت نہیں دی اور بالآخر آپ نے لڑائی سے بچتے ہوئے اہل مکہ کی شرطوں پر صلح کرلی اور واپس ہوگئے، اہل مکہ نے اس معاہدہ کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ کو- جو غیر مسلم ہی تھا - مکہ میں دوڑا دوڑا کر قتل کیا، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی سے بچنے کے لیے ان سے کہا کہ وہ ان کا خوں بہا ادا کردیں، مگر انہوں نے اسے بھی قبول نہیں کیا اور کہا کہ ہمیں جنگ کرنی ہے؛ چناں چہ جس قبیلہ پر ظلم کیا گیا تھا، اس کے اصرار پر مجبور ہوکر مکہ سے ہجرت کے آٹھویں سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار ساتھیوں کو لے کر پھر مکہ روانہ ہوئے اور ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے؛ چناں چہ اہل مکہ نے بغیر کسی لڑائی کے ہتھیار ڈال دیا، اس وقت وہ تمام دشمن آپ کے سامنے کھڑے تھے، جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکا تھا، آپ کی بیٹی کو طلاق دلوائی تھی، قتل کا منصوبہ بنایا تھا، مسلمانوں کو ناقابل برداشت ایذاء پہنچائی تھی، مکہ چھوڑ دینے کے باوجود مدینہ پر بار بار حملہ کیا تھا؛ لیکن آپ نے نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؛ بلکہ ان کو ان کے جرائم کی یاد دلا کر شرمندہ بھی نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: **انتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم۔** (النسائی فی سنن الکبریٰ، حدیث نمبر: ۱۸۲۷۶) آج تم سب آزاد ہو تم پر کوئی پکڑ نہیں۔ امن وآشتی کو قائم رکھنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اسی بات کی تعلیم دی کہ کوئی مسلمان دوسرے کے لیے تکلیف کا سبب نہ بنے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر مسلمان کون ہے؟ فرمایا: **من سلم الناس من لسانه ویده۔** (الاحسان فی تقریب صحیح بن حبان، حدیث نمبر: ۲۶۸۴) وہ شخص کہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ سب سے اچھا مسلمان وہ ہے کہ جس کے شر سے لوگ امن میں رہیں، زیادہ تر پڑوسیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی ہے؛ اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا: **من کان یؤمن باللّٰہ فلا یؤذی جاره۔** (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۱۸۵) جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو، وہ پڑوسی کو نہ

ستائے۔ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا: جس کا اللہ پر ایمان ہو، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۱۹) غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا خلاصہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنا، لوگوں کو امن وآشتی کی طرف بلانا، شرم وحیاء کی دعوت دینا اور اخلاق کی اصلاح کرنا تھا۔

اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ آخرت کا یقین ہے، یعنی اس بات کا یقین کہ ایک ایسا وقت آئے گا، جب خدا کے حکم سے یہ کائنات ختم کردی جائے گی، تمام انسان زندہ کیے جائیں گے، انہوں نے دنیا میں جو اچھے کام کیے تھے، ان کو اس کا بہترین انعام دیا جائے گا، وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے اور انسان نے جو گناہ کیے تھے، انہیں اس کی سخت سزا ملے گی اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا یقین عقل وفطرت کے عین مطابق ہے، دنیا میں انسان بہت سے اچھے کام کرتا ہے؛ لیکن اس کو اس کی جزا نہیں ملتی؛ بلکہ بعض دفعہ وہ دکھ بھری زندگی گزار کر دنیا سے چلا جاتا ہے، اس کے برخلاف کچھ لوگ ظلم وزیادتی کرتے ہیں؛ لیکن دنیا میں ان کو سزا نہیں مل پاتی ہے؛ اس لیے عقل اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیے، جہاں نیکی کرنے والوں کو انعام اور گناہ اور زیادتی کرنے والوں کو سزا ملے، اسی کا نام آخرت ہے، وہاں خاندان، رنگ ونسل اور علاقہ وزبان کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ انسان کے عمل اور کردار کی وجہ سے جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔ آخرت کا یقین ایک انقلابی عقیدہ ہے، اس کی وجہ سے انسان کی سوچ بدل جاتی ہے، انسان اس وقت بھی نیکی کے کام کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، جب کوئی تعریف کرنے والا اور انعام دینے والا نہ ہو اور اس وقت بھی برائی اور ظلم سے باز رہتا ہے، جب کوئی دیکھنے والی آنکھ اور ٹوکنے والی زبان نہ ہو، مثال کے طور پر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ شراب انسان کی صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور اخلاق کے لیے بھی؛ لیکن امریکہ جیسے ملک میں تمام ترغیبی اور قانونی وسائل کے استعمال کے باوجود یہ بات ممکن نہ ہوسکی کہ لوگوں کو شراب سے روک دیا جائے، خود کئی مسلم ریاستوں میں شراب بندی کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے سخت سے سخت قوانین بنائے گئے؛ لیکن پھر بھی

مکمل طور پر اسے روکنا ممکن نہ ہوسکا، عرب کے لوگ شراب کے رسیا تھے، ان کی کوئی محفل شراب سے خالی نہیں ہوتی تھی؛ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے لوگوں کے ذہن میں آخرت کا یقین پیدا کیا، پھر جب شراب کے حرام ہونے کا اعلان ہوا تو جن کے ہونٹوں تک شراب پہنچ چکی تھی، انہوں نے اس کو حلق تک نہیں پہنچایا، شراب کے مٹکے توڑ دیئے اور مدینے کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔ اسی طرح سودی کاروبار عربوں میں عام تھا، وہ اسے ایک تجارت سمجھتے تھے؛ لیکن جب اسلام نے اس کو منع کیا؛ کیوں کہ اس میں غریبوں کا استحصال ہے، تو یک لخت لوگوں نے اس حکم کو قبول کرلیا اور جو سود پہلے سے لوگوں کے ذمہ باقی تھا، اس سے بھی باز آ گئے — یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا، یہ عقیدہ انسان کی فکر کو بدلتا ہے، اس سے انسان میں یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ ہر کام کو مادی نفع ونقصان کی ترازو میں نہ تولا جائے؛ بلکہ وہ بہت سے کاموں کو خدا کی خوش نودی اور خلق خدا کی بھلائی کے لیے انجام دے۔ انسان کے بارے میں اسلام نے دو بنیادی تصورات پیش کیے ہیں، ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایسا نہیں ہے کہ پیدائشی طور پر ان میں کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا ہو؛ چناں چہ قرآن مجید نے کہا ہے: يَآاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (النساء: ١) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا ہے، اسی سے ان کا جوڑا بنایا ہے اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت بنا دیئے ہیں۔ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تعلیمات کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے فرمایا: ان ربکم واحد و ان اباکم واحد۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ٢٣٤٨٩) تمہارا خدا بھی ایک ہے اور تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ یعنی اللہ کی توحید اور انسانی وحدت — اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انقلابی تصور عطا فرمایا کہ جو باتیں اتفاقی طور پر پیش آتی ہیں، جس میں اس کے اپنے ارادہ وعمل کا دخل نہیں ہوتا، جیسے کسی خاص خاندان میں پیدا ہونا، سفید فام یا سیاہ فام ہونا وغیرہ، تو اس کی وجہ سے کسی شخص کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں

ہوسکتی، انسان اپنے عمل و کردار کی وجہ سے بہتر ہوتا ہے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا: **لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی، ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ**۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۴۸۹) کسی عربی کو غیر عربی پر اور غیر عرب کو عربی پر، نیز کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر (نسل و رنگ کی وجہ سے) کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، ہاں! تقویٰ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام انسان بحیثیت انسان قابل احترام ہیں؛ چناں چہ قرآن مجید کہتا ہے: **وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ**۔ (بنی اسرائیل: ۷۰) ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔ انسان کے تخلیقی ڈھانچے کے بارے میں فرمایا گیا: **لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ**۔ (التین: ۴) ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ (**مسلم، کتاب الجنائز**، حدیث نمبر: ۱۶۹) عورتیں اپنے بالوں کو بڑا ظاہر کرنے کے لیے اپنے بال کے ساتھ دوسروں کے بال ملایا کرتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا؛ (**ترمذی، کتاب اللباس**، حدیث نمبر: ۱۷۵۹) کیوں کہ انسان کے کسی جزء کو دوسرا انسان اپنے لیے استعمال کرے، یہ انسان کی عظمت و حرمت کے مغائر ہے۔ غیر مسلموں کے متعلق قرآن مجید نے جو اس بات پر زور دیا ہے کہ ''تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں'' اس سے انسانی اخوت کا رشتہ واضح ہوتا ہے، جیسے ایک رشتہ خاندانی اخوت و بھائی چارے کا ہے، اسی طرح بھائی چارے کا ایک وسیع تر رشتہ وہ ہے، جو پوری انسانیت کو ایک لڑی میں پروتا ہے؛ اس لیے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، وہ بحیثیت انسان بھائی بھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے: **لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ**. (**الممتحنة: ۸**) جو لوگ تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو

ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ آیت اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے، مسلمانوں کے بعض غیر مسلم رشتہ دار مسلمان ہونے کو تیار نہیں تھے، مسلمان رشتہ دار پہلے سے ان کی کفالت کیا کرتے تھے، انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کی بنیاد پر ان کی مالی مدد کرنا چھوڑ دیا، قرآن مجید نے اس بات سے منع کیا کہ وہ کسی رشتہ دار کے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چھوڑ دیں، اس سلسلہ یہ آیت نازل ہوئی: **لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ ط وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ** ۔(البقرۃ:۲۷۲) ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں، اللہ جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں، اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لیے، اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوش نودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔ (یعنی اس کا پورا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے عمل سے اس حسن سلوک کی مثال پیش فرمائی، مکہ کے لوگوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر کتنے مظالم ڈھائے؛ لیکن جب مکہ میں قحط پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ریلیف جمع کی اور پانچ سو دینار ان کی مدد کے لیے بھیجے، (**السیر الکبیر** :۱/۶۹) بیس دینار ساڑھے ستاسی گرام سونا ہوتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی رقم تھی؛ حالاں کہ مسلمان خود اس وقت فقر و فاقہ سے گذر رہے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے بارے میں ایک اصولی بات فرمائی کہ جیسے ہم اپنے خون کو قابل احترام سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمیں ان کی زندگی کا بھی احترام کرنا چاہیے، اور جیسے ہمارے مال کی حرمت ہے، اسی طرح ان کا مال بھی قابل احترام ہے: **دماء ھم کدمائنا و اموالھم کاموالنا** ۔(نصب الرایہ:۴/۳۶۹) قرآن نے کسی بھی نفس انسانی کے قتل ناحق کو حرام قرار دیا ہے۔ (بنی اسرائیل:۳۳) اور ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل کہا ہے۔

(المائدۃ:۲۳) جو غیر مسلم حملہ آور نہ ہو؛ بلکہ پُر امن طور پر مسلمانوں کے ساتھ رہتا ہو، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس کو قتل کرے گا، وہ جنت کی خوش بو سے بھی محروم رہے گا۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۳۰) یا جو ان کے مال میں سے لے لے گا، یا ان کے ساتھ حق تلفی کرے گا، قیامت کے دن میں اس کی طرف سے فریق بن کر کھڑا ہوں گا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۳) اسی طرح اسلام کی نظر میں کوئی مسلمان بہن ہو یا غیر مسلم خاتون، دونوں کی عزت وآبرو برابر ہے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے مذہبی جذبات کا بھی لحاظ رکھنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ جن دیویوں دیوتاؤں کو پوجتے ہیں تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔ (الانعام: ۱۰۸) قرآن نے کسی کی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، چاہے وہ مسلمانوں کی ہو یا کسی غیر مسلم گروہ کی۔ (الحج: ۴۰) قرآن نے ہدایت دی کہ جہاں معاملہ انصاف کا ہو تو اس میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے، اگر کوئی گروہ تمہارا مخالف ہو، تمہاری نظر میں ان کا طور وطریق اچھا نہ ہو، یا ان کی سوچ غلط ہو، پھر بھی تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کرو۔ (المائدۃ: ۸)

مسلمانوں کے لیے ایمانی اعتبار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ مخلوق پرستی کے بجائے خالق پرستی، انسانوں کے درمیان اُونچ نیچ کے بجائے مساوات و برابری، انفرادی اور قومی غلامی کے بجائے آزادی، مادیت کی جگہ روحانیت اور بے حیائی کی جگہ شرم وحیا اور پاکیزگیِ اخلاق کا نہ صرف آپ نے درس دیا؛ بلکہ دنیا میں ان ہی اقدار پر مبنی عظیم الشان انقلاب آپ کے ذریعہ وجود میں آیا، مگر افسوس کہ بعض لوگ آپ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے کر غیر مسلموں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں اور رواداری کے بجائے دل آزاری کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات پات کی تقسیم کو غلط ٹھہراتے ہوئے انسانی وحدت کی تعلیم دی ہے، تمام انسانیت کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیتے ہوئے انہیں رشتۂ اُخوت سے جوڑا ہے اور خاص کر ایک تکثیری اور ہمہ مذہبی سماج میں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام و

رواداری اور باہمی تعاون کے ذریعہ امن و آشتی کو قائم رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو مستند و معتبر کتابوں کے ذریعہ پڑھا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلاب انگیز تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اس طرح محسوس ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امن اور مساوات کے داعی تھے اور آپ کا اُسوہ ہمارے لیے موجودہ حالات میں بہترین رہنما ہے۔

مسلمان اپنی زندگی کو اخلاقِ نبوی کا آئینہ بنائیں اور اسلام نے سماج کے تمام طبقات کے ساتھ جس حسنِ سلوک اور انسانی بنیادوں پر برادرانہ برتاؤ کی تعلیم دی ہے، اس کا نمونہ بنیں۔

پیغمبر اسلام — دوستوں اور ہم عصروں کے ساتھ

انسان عام طور پر اپنے بزرگوں سے جھک کر ملتا اور تواضع اختیار کرتا ہے، اکثر اس جھکاؤ اور بچھاؤ میں مذہب، زبان اور علاقہ کا فرق بھی رکاوٹ نہیں بنتا، اسی طرح انسان چھوٹوں اور بچوں کے ساتھ شفقت اور پیار سے پیش آتا ہے، اس میں بھی مذہب، علاقہ، زبان کا کوئی فرق نہیں ہوتا، یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے، جیسے پھول کو دیکھ کر انسان کو اس کو دیکھنے اور سونگھنے کی رغبت ہوتی ہے؛ اسی طرح بچوں کو دیکھ کر دل میں شفقت کا جذبہ ابھرتا ہے اور اس سے پیار کرنے کو دل چاہتا ہے، مگر انسان کے برتاؤ اور مزاج کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ اللہ نے اس کو اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں کے مقابلہ میں بلند مقام و مرتبہ سے نواز دیا ہو، جو لوگ کم ظرف ہوتے ہیں، وہ ایسے مواقع کو اپنی بڑائی کے اظہار اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ جہاں زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بہترین اسوہ ہے؛ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں دوستوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کے سلسلہ میں بھی بہترین رہنمائی موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے محبت کا اظہار کرتے، ان کی خوبیوں کا اعتراف فرماتے، ان کے خصوصی وصف اور امتیازی مقام کو برسر عام بیان کرتے، جیسے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے بارے میں فرمایا کہ یہ اہل زمین میں میرے وزیر ہیں: ”**واما وزیر ای من اھل الارض فابو بکر و عمر**“ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۳۶۸۰) حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں فرمایا کہ وہ سب سے زیادہ حیاء کرنے والے ہیں: ”**احیاھم عثمان**“ (**کنز العمال**، حدیث نمبر: ۱۲۱۳۳) حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے: ”**انا مدینة العلم وعلی بابھا**“ (**المعجم الکبیر**، حدیث نمبر: ۱۶۰۱۱) حضرت زبیر بن عوامؓ کو اپنا حواری قرار دیا۔ (**صحیح البخاری، کتاب الجھاد**، حدیث نمبر: ۱۹۶۲) حضرت

حذیفہ بن یمانؓ کو اپنا محرم راز بنایا۔(**صحیح البخاری، باب مناقب عمار و حذیفہ،** حدیث نمبر:۳۳۵۳) حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کو امین امت کہا۔(**صحیح البخاری، باب قصة اهل نجران،** حدیث نمبر:۱۳۱۴) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں فرمایا کہ جو بات ان کو پسند ہے میں نے بھی اس کو اپنی امت کے لیے پسند کیا:"**رضیت لامتی مارضی لها ابن ام عبد**" (مستدرک حاکم:۳/۳۱۷) اس طرح کے توقیر واحترام کے بہت سے الفاظ ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اپنے مختلف رفقاء کے لیے ارشاد فرمائے ہیں، اس سے سبق ملتا ہے کہ ایک مسلمان کے اندر اپنے ہم عصروں کی خوبیوں، صلاحیتوں اور کارناموں کے اعتراف کا جذبہ ہونا چاہیے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں مبالغہ نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر اور اشرف الانبیاء ہیں، اس کے باوجود آپ نے خود اپنے بارے میں مبالغہ کرنے سے منع فرمایا، آپ نے فرمایا: تم میری تعریف میں اس طرح کا مبالغہ نہیں کرنا، جو عیسائیوں نے عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔(**صحیح البخاری، عن ابن عباس، باب قول اللّٰه واذکر فی الکتاب مریم،** حدیث نمبر:۳۴۴۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء سے گہرا رابطہ رکھتے تھے، ایسا تعلق ہوتا جیسے گھر کے افراد کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ ایسا دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ ہر ساتھی کو گمان ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبت مجھ ہی سے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نسبتاً نوعمر صحابی حضرت عبداللہ بجلیؓ کا بیان ہے کہ آپ جب بھی ان کو دیکھتے تبسم فرماتے، یہاں تک کہ ان کو خیال ہو گیا کہ آپ ان کو تمام صحابہ میں سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں؛ چناں چہ انھوں نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ ہی لی کہ آپ کو سب سے زیادہ محبت کس سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر سے۔(**کنز العمال**:۱۳/۱۲۳، حدیث نمبر:۳۶۴۴۶) اسی دوستانہ رفاقت کا اثر تھا کہ آپ اپنے رفقاء کے ساتھ کھانے پینے میں شریک رہتے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ میں اپنے گھر

میں بیٹھا ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے پاس سے گذر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اشارہ کیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام لیا، ہم دونوں چلے، یہاں تک کہ بعض ازواج مطہرات کے حجرہ کے پاس تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر چلے گئے، پردہ گرادیا، پھر مجھے حاضری کی اجازت دی، میں بھی اندر داخل ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کھانے کی کوئی چیز ہے؟ عرض کیا گیا: ہاں، اور روٹی کے تین ٹکڑے لائے گئے، ایک ٹکڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے رکھا، ایک میرے سامنے، تیسرے کے دو حصے کردیئے، آدھا خود رکھا، آدھا مجھے عنایت فرمایا، پھر دریافت کیا: کوئی سالن بھی ہے؟ جواب ملا: نہیں، صرف سرکہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاؤ تو سہی، یہ تو بہت اچھا سالن ہے۔ (**مسلم، باب فضیلة الخل و التادم به**، حدیث نمبر: ۲۰۵۲)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے تکلف اپنے رفقاء کی دعوت قبول فرماتے تھے، اگر دوسرے رفقاء بھوکے ہوں، تو جو بھی میسر ہوتا، ان میں سب کو شامل فرماتے، غزوۂ خندق کے موقع سے بڑی تنگی تھی، صحابہ فاقہ سے دوچار تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت بھی یہی تھی، اس موقع پر حضرت جابرؓ نے تنگی کے باوجود آپ کے لیے تھوڑا سا کھانا بنایا، اور دعوت پیش کی، ان کا منشا تھا کہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ کو دعوت دے دی، حضرت جابرؓ اس صورتِ حال سے پریشان ہوگئے؛ لیکن اہلیہ نے اطمینان دلایا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صورتِ حال سے واقف ہونے کے باوجود سبھوں کو دعوت دی ہے تو ان شاء اللہ کمی نہیں ہوگی؛ چناں چہ یہی ہوا کہ آپ کی برکت سے تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔ (**بخاری، کتاب الجهاد و السير**، حدیث نمبر: ۲۰۳۹)

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رطب کھجور پیش کی، جو وہاں کی عمدہ کھجور سمجھی جاتی تھی، آپ نے

اس کے بارے میں دریافت فرمایا: حضرت سلمانؓ نے عرض کیا: یہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے صدقہ ہے، ارشاد ہوا: اسے اٹھالو؛ کیوں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے، حضرت سلمانؓ نے اٹھالیا، اگلے دن پھر اسی طرح کھجور لائے، خدمت اقدس میں پیش کیا، آپ نے آج بھی کھجور کے بارے میں دریافت فرمایا، کہنے لگے: یہ آپ کے لیے ہدیہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دسترخوان بچھاؤ؛ چناں چہ سب نے مل کر تناول کیا۔ (**مسند احمد، عن بریدہ اسلمی، حدیث نمبر: ۲۲۹۹۷**)—— دراصل حضرت سلمان فارسیؓ تورات کے بڑے عالم تھے اور وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نبوت صحیح ہے یا نہیں؛ کیوں کہ انبیاء صدقہ نہیں کھاتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ساتھیوں کی ضیافت کرنے اور ان کے ہم طعام ہونے کے بہت سے واقعات حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔

غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام معاملات میں ان کے ساتھ شریک رہتے تھے، تقریبات میں بھی، کھانے پینے میں بھی، خوشی اور غم میں بھی؛ اسی لیے آپ کا اپنے صحابہؓ سے بے حد قریبی تعلق تھا اور وہ آپ کو اس طرح ٹوٹ کر چاہتے تھے کہ گویا ایک شمع کے گرد پروانے ہوں، ابوسفیان نے مسلمان ہونے سے پہلے اس بات کا اعتراف کیا کہ جس طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی ان سے محبت کرتے ہیں، میں نے کسی شخص کو دوسرے شخص کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا: ''**مارایت من الناس احد ایحب احدا کحب اصحاب محمد محمداً**'' (سیرت ابن ہشام: ۲/۱۷۲)

باوجودیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خود قناعت کے ساتھ گذرتی اور کئی کئی وقت فاقہ کی نوبت آجاتی؛ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے ساتھیوں کی مالی اعانت کا بھی خیال رکھتے، کوئی تحفہ آتا تو اسے لوگوں میں تقسیم کردیتے، یہاں تک کہ رمضان المبارک میں آپ کا جود وسخا تیز ہوا سے بھی بڑھ جاتا۔ (**کنز العمال: ۶/۵۱۵**) دوستوں کے ساتھ داد ودہش کا مختلف انداز اختیار فرماتے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سفر میں آپ کے ساتھ تھے، ان کی اونٹنی بڑی سست رفتار تھی، آپ نے ان سے ڈنڈا لیا اور چند دفعہ اونٹنی کو ہلکے طور پر مارا، پھر کیا تھا اونٹنی

اتنی تیز چلی کہ وہ آپ کی اونٹنی کے برابر میں چلنے لگی، آپ نے ان سے پوچھا: کیا وہ اونٹنی فروخت کریں گے؟ حضرت جابرؓ نے پیش کش کی کہ آپ اسے ہدیتاً قبول فرمالیں؛ لیکن آپ نے اسے خریدنے پر ہی اصرار کیا، ایک درہم سے بات شروع ہوئی، آپ قیمت بڑھاتے چلے گئے، یہاں تک کہ چالیس درہم تک بات پہنچی، پھر مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے پیسے بھی ادا کردیئے اور اونٹنی بھی ہدیتاً واپس کردی۔ (**مسلم، باب استحباب نکاح البکر**، حدیث نمبر: ۷۱۵)—ایک موقع پر حضرت عمرؓ سے ایک سامان خریدا، اور ان ہی کے صاحب زادے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو ہدیہ کردیا۔ (**کنز العمال**: ۲۸۳/۴)

یہ عطا کرنے کے مختلف طریقے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ آپ کے پاس کثرت سے مالِ غنیمت آتا، مختلف علاقوں کے محصولات آتے؛ لیکن کوئی چیز آپ کے پاس باقی نہیں رہتی، ایک دن چند درہم بچ گئے، تو آپ بے چین تھے، حضرت عائشہؓ نے آپ کی بے چینی دیکھ کر خیال کیا کہ شاید کوئی تکلیف ہوگی، آپ نے فرمایا: نہیں، میں اس لیے بے قرار ہوں کہ کہیں اس حال میں میری موت نہ آجائے کہ یہ سکے میرے پاس موجود ہوں۔ (مسند حمیدی، حدیث نمبر: ۲۸۳، بخاری، حدیث نمبر: ۱۱۶۳) خاص طور پر نومسلموں کا آپ اتنا گراں قدر تعاون فرماتے کہ خود انہیں بھی حیرت ہوتی، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی مانگا جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمادیتے، ایک ایسے ہی صاحب آئے تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان موجود پوری بکریاں انہیں عطا فرمادیں، وہ جب اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے تو کہنے لگے: اے لوگو! اسلام قبول کرلو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا عطا فرماتے ہیں کہ اپنے فقر وفاقہ کا بھی کوئی خوف نہیں کرتے۔ (**مسلم، باب ماسئل رسول اللہ شیئاً قط**....الخ، حدیث نمبر: ۲۱۳۲)

دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک پہلو بے تکلفی ہے، اس بے تکلفی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھیوں سے مزاح بھی فرمایا کرتے تھے، اور آپ کی بے تکلفی کو دیکھتے ہوئے آپ کے رفقاء بھی آپ سے مزاح کرتے تھے، حضرت انسؓ سے

روایت ہے کہ زاہر نام کے ایک صاحب دیہات سے آتے تھے اور دیہات کی چیزوں کا تحفہ آپ کو پیش کرتے تھے، پھر جب واپس ہونے لگتے تو آپ ان کو سامان واسباب دے کر رخصت فرماتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: زاہر ہمارے دیہاتی ساتھی ہیں اور ہم ان کے شہری ساتھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، وہ خوش شکل آدمی نہیں تھے، ایک دن جب وہ اپنا سامان بیچ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور ان کو پیچھے سے اس طرح اپنی گود میں لے لیا کہ وہ دیکھ نہ سکے، کہنے لگے: مجھے چھوڑ دو، یہ کون شخص ہے؟ پھر انہوں نے محسوس کرلیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: کون ہے جو اس غلام کو خرید لے؟ حضرت زاہر نے عرض کیا: اللہ کے رسول تب تو آپ مجھے کھوٹا مال پائیں گے، ارشاد ہوا؛ لیکن تم اللہ کے پاس کھوٹے نہیں ہو، یا فرمایا: تم اللہ کے پاس بہت قیمتی ہو: "**لکن عند اللّٰہ انت غالی**" (**مسند احمد، عن انس**، حدیث نمبر: **۱۲۶۶۹**)

جیسا کہ عرض کیا گیا، آپ کی خوش اخلاقی اور بے تکلفی سے حوصلہ پا کر بعض دفعہ خود صحابہ بھی آپ سے مزاح کر لیتے تھے، غزوۂ تبوک کے موقع سے حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، سلام کیا، آپ نے جواب دیا اور فرمایا: اندر آجاؤ، حضرت عوف ابن مالکؓ نے از راہِ مزاح عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا پورا کا پورا آجاؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پورے پورے آجاؤ؛ چناں چہ عوف ابن مالک اندر تشریف لائے۔ (**ابو داود، باب ماجاء فی المزاح**، حدیث نمبر: **۵۰۰۰**) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صہیبؓ کو کھجور کھاتے ہوئے دیکھا؛ حالاں کہ ان کے آنکھ میں تکلیف تھی، آپ نے فرمایا: تمہاری آنکھ میں تکلیف ہے، پھر بھی کھجور کھاتے ہو؟! حضرت صہیبؓ نے عرض کیا: جس طرف تکلیف نہیں ہے، اس طرف سے کھاتا ہوں، آپ ان کے اس بے ساختہ جواب پر ہنس پڑے۔ (**مستدرک حاکم، باب ذکر مناقب صہیب**، حدیث نمبر: **۳۰۳۵**)

لیکن مزاح میں بھی آپ کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلتی تھی، جو حق اور سچائی

کے خلاف ہو، آپ کے مزاح کرنے پر تعجب کرتے ہوئے بعض صحابہ نے دریافت کیا: کیا آپ بھی ایسا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں؛ لیکن میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا، جو حق اور سچائی کے خلاف ہو: ''انی لا اقول الا حقا۔'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۸۴۸۱)

البتہ آپ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ ہنسی مذاق تکلیف دہ اور اہانت آمیز ہو جائے، یا کسی کو اس بہانے سے دل آزار بات کہی جائے، عبداللہ نام کے ایک صاحب تھے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتے تھے، ایک دن ان پر آپ کے حکم سے شراب پینے کی سزا جاری کی گئی، لوگوں میں سے ایک صاحب کہنے لگے: یہ کس قدر بار بار یہ حرکت کرتا ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر لعنت نہیں بھیجو، خدا کی قسم! جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ (بخاری، کتاب الحدود، حدیث نمبر: ٦٣٩٨) اسی طرح جب بھی آپ کے سامنے کوئی ایسی بات آتی، جس سے بے توقیری کا پہلو ظاہر ہوتا ہو تو آپ اس کی نفی فرماتے، ایک بار حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ مسواک توڑنے کے لیے ایک درخت پر چڑھے، ان کی پنڈلیاں بہت پتلی تھیں، ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہوا ان کو اڑا لے جائے گی، لوگ ہنسنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیوں ہنستے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: ان کی پتلی پتلی پنڈلیوں کی وجہ سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اللہ کی ترازو میں ان کا وزن احد پہاڑ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ (مسند احمد، عن عبد اللہ ابن مسعود، حدیث نمبر: ۳۹۹۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قدم قدم پر اپنے ساتھیوں کی دل داری کا خیال رکھتے تھے، غزوۂ حنین کے بعد جب مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں انصار میں سے بعض نوجوانوں کو شکوہ پیدا ہوا تو آپ نے ان کو الگ جمع کیا اور ایسا اثر انگیز خطبہ دیا کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں، آپ نے اس موقع پر جہاں انصارِ مدینہ پر اسلام کے احسانات کا ذکر فرمایا، وہیں انصار کے احسانات کا بھی کھلے دل سے اعتراف فرمایا اور اخیر میں ارشاد فرمایا: کیا تمہیں یہ

بات پسند نہیں ہے کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر جائیں اور تم نبی کو اپنے کجاوہ میں لے کر جاؤ؟ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی میں پیدا ہوا ہوتا، اگر لوگ ایک وادی میں چلیں تو میں اس وادی میں چلوں گا، جس میں انصار چلیں، میرے لیے انصار کی حیثیت اس لباس کی سی ہے، جو اوپر سے پہنا جاتا ہے: "الانصار شعار والناس دثار." (**بخاری، عن عبد اللہ ابن زید، باب غزوۃ الطائف**، حدیث نمبر: ۴۳۳۰)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھتے، ایک صاحب کی کھجوروں کی فصل خراب ہوگئی اور ان پر بہت سارا دَین ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء سے فرمایا، ان کی مدد کرو، لوگوں نے مدد کی؛ لیکن دَین ادا نہیں ہو پایا، آپ نے ان کے قرض خواہوں سے کہا: جو موجود ہو، وہ لے لو، اور تم کو صرف اسی کا حق حاصل ہے۔ (**مسلم، باب استحباب وضع الدین**، حدیث نمبر: ۱۵۵۶)

اگر آپ کے رفقاء میں سے کسی کو تکلیف دہ بات پیش آئی تو ان کی تسلی اور دل داری کا پورا اہتمام فرماتے، عبد اللہ ابن جحشؓ نے جب ہجرت کی تو مکہ مکرمہ میں ان کے مکان پر ابوسفیان نے قبضہ کرلیا اور بیچ ڈالا، جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ اللہ تم کو اس کے بدلے جنت میں اس سے بہتر گھر عطا فرمادے، انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو یہ چیز، یعنی: اس کے بدلہ میں جنت ملے گی۔ (سیرت ابن ہشام: ۱۲۸/۳، **الروض الانف**: ۱۶۶/۴) — ایک صاحب اپنے چھوٹے بچے کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتے تھے، بچہ آپ کی پشت مبارک کی طرف آجاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سامنے بٹھالیا کرتے، بچے کا انتقال ہوگیا، اس صدمہ سے ان کے والد حاضر نہ ہوسکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہیں تھا، ان کے بارے میں دریافت کیا، بتایا گیا کہ ان کے صاحب زادہ کا انتقال ہوگیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ملاقات کی، ان کے بچہ کے بارے میں دریافت فرمایا اور تعزیت کی، پھر آپ نے فرمایا: تمہیں یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ وہ

تمہارے ساتھ زندگی گذارتا، یا یہ بات کہ تم جنت کے کسی دروازے پر آؤ، اور تم دیکھو کہ وہ تم سے پہلے پہنچ چکا ہے اور تمہارے لیے دروازہ کھول رہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یہ دوسری بات مجھے زیادہ محبوب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چیز تم کو حاصل ہوگئی، صحابہؓ نے عرض کیا: یہ صرف ان کے لیے ہے یا سبھوں کے لیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبھوں کے لیے۔ (**نسائی، عن قرہ بن ایاس، باب فی التعزیہ،** حدیث نمبر: **۲۰۸۸**)

اسی طرح آپ مشکل کاموں میں بھی صحابہؓ کے ساتھ شریک رہتے، غزوۂ خندق کے موقع سے سرد موسم تھا، صحابہ بھوکے پیاسے خندق کھودنے میں مشغول تھے اور تھک کر چور ہو جاتے تھے، ایسے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور فرماتے: **اللّٰھم ان العیش عیش الآخرۃ، فاغفر للانصار والمھاجرۃ۔** (**بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق،** حدیث نمبر: **۴۰۹۹**) اے اللہ! عیش و آرام تو آخرت ہی کا عیش و آرام ہے؛ اس لیے انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما دیجیے۔ ہم لوگ جواب میں کہتے کہ ہم نے آخری دم تک کے لیے جہاد پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے بیعت کی ہے۔ (**بخاری، عن انس، باب التحریض علی القتال،** حدیث نمبر: **۲۸۳۴**) — ایک موقع پر مدینہ میں شور مچ گیا، لوگوں کو خیال ہوا شاید دشمن حملہ آور ہو گیا ہے، سب سے آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑھے اور اس حال میں واپس آئے کہ آپ حضرت ابوطلحہؓ کے گھوڑے پر تھے، جس پر زین بھی نہیں تھی اور گردن مبارک سے تلوار لٹکی ہوئی تھی، آپ فرما رہے تھے کہ کیوں گھبراتے ہو؟ کیوں گھبراتے ہو؟ (**بخاری، عن انس، باب الحمائل وتعلیق السیف بالعنق،** حدیث نمبر: **۲۹۰۸**)

ایک دفعہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سفر پر تھے؛ چناں چہ ایک بکرا کو ذبح کرنے کی بات طے پائی، ایک صحابی نے کہا: اس کو ذبح کرنا میرے ذمہ ہے، دوسرے نے کہا: اس کے چمڑے نکالنے کا کام میں کروں گا، تیسرے نے کہا: میں اسے پکاؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میں ایندھن کی لکڑیاں جمع کروں گا، صحابہ نے عرض کیا: آپ کا کام ہم کر دیں گے،

یعنی: آپ زحمت نہ فرمائیں! ارشاد فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ میری طرف سے کفایت کردوگے؛ لیکن مجھے پسند نہیں ہے کہ میں تم لوگوں کے مقابلہ میں امتیاز اور بڑائی اختیار کروں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے ہیں، جو اپنے ساتھیوں میں بڑے بنتے ہوں:"**فان اللّٰہ سبحانہ وتعالٰی یکرہ من عبدہ ان یراہ متمیزا بین اصحابہ.**"(**کشف الخفاء**:۱۵۲/۱)

آپ اپنے رفقاء کے ساتھ اس طرح رہتے تھے کہ گویا آپ ان ہی میں سے ایک ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے یہاں تشریف لے جاتے تھے، ان کے بچوں کو سلام کرتے تھے، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے اور انھیں دعائیں دیتے تھے۔(**سنن بیھقی، عن انس، باب ابناء الانصار،** حدیث نمبر:۱۹۲۸) حضرت سہل بن حنیفؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں سے کمزور لوگوں کے پاس تشریف لاتے تھے، ان سے ملاقات کرتے تھے، ان کے بیماروں کی عیادت فرماتے تھے اور ان کے جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔(**مستدرک حاکم، باب تفسیر سورۃ قٓ،** حدیث نمبر: ۳۷۳۵) حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیواؤں اور مسکینوں کے لیے چلنے اور ان کی ضرورت پوری کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ (**نسائی، باب مایستحب من تقصیر الخطبۃ،** حدیث نمبر:۱۴۱۳)

بہت سے لوگ جو دیہاتوں کے رہنے والے تھے، عام طور پر تہذیب ناآشنا ہوتے تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی باتوں کو بھی خندہ پیشانی سے سہ جاتے تھے، ایک موقع پر ایک دیہاتی شخص نے اس زور سے چادر مبارک کھینچ دی کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا، آپ نے صرف اس قدر فرمایا کہ تم اسے بھلے طریقہ پر بھی تو کہہ سکتے تھے۔(**بخاری، کتاب فرض الخمس،** حدیث نمبر:۳۱۴۹) حضرت جبیر ابن مطعمؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ حنین سے واپس ہوئے تھے جب ڈھیر سارا مال غنیمت آیا تھا، لوگوں نے آپ سے مانگتے ہوئے اس قدر دِق کردیا کہ آپ ایک درخت سے جا لگے، ایک دیہاتی نے چادر مبارک تک کھینچ لی، آپ

کھڑے ہوگئے اور ارشاد فرمایا: اگر میرے پاس ان درختوں کے میدان کے برابر جانور ہوتے تو میں اس کو بھی تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا، تم مجھے بخیل، جھوٹا اور بزدل نہیں پاؤ گے۔ **(صحیح البخاری، باب ما کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعطی المؤلفة قلوبھم....الخ، حدیث نمبر:۳۱۴۸)**

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے ساتھ نہ صرف مالی جہت سے حسن سلوک کرتے تھے؛ بلکہ ان کو مشورہ میں بھی شامل رکھتے تھے؛ حالاں کہ آپ کا ہر عمل وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا؛ اس لیے آپ کو مشورہ کی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن اپنے ساتھیوں کی دل داری اور مشورہ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آپ مشورہ فرمایا کرتے تھے، کثرت سے اپنے ساتھیوں سے کہتے تھے: اے لوگو! مجھے مشورہ دو: **"اشیروا علیَّ ایھا الناس" (مسلم، باب نقض الکعبة وبنائھا، حدیث نمبر:۲۰۴)** چناں چہ غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے ہوا؛ بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات اپنی رائے پر اپنے رفقاء کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، جیسا کہ غزوۂ احد میں ہوا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ۶۰/۲) حالاں کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے درست تھی؛ لیکن کبھی آپ نے ان ساتھیوں پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، جن کے مشورہ پر عمل کیا گیا تھا اور جو بظاہر مسلمانوں کے لیے نقصان کا سبب ہوا۔

جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کی مادی ضرورتوں کا اور دل داری وحسن سلوک کا لحاظ رکھتے تھے، وہیں ان کی دینی تربیت پر بھی متوجہ رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تیز تیز نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، پوری توجہ سے ان کی نماز کا جائزہ لیا اور پھر ان کو اعتدال ومیانہ روی کے ساتھ نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ **(مسلم، کتاب الصلاۃ، حدیث نمبر: ۳۹۷)** ایک موقع پر اپنے رفقاء سے فرمایا: جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو، اسی طرح نماز پڑھا کرو: **"صلوا کما رایتمونی اصلي" (بخاری، باب رحمة الناس والبھائم، حدیث نمبر:۶۰۰۸)** حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: شاید اس کے

بعد پھر میرا اور تمہارا حج ایک ساتھ نہ ہو پائے؛ اس لیے مجھ سے ضرور ہی حج کا طریقہ سیکھ لو: "لتاخذوا مناسکم" (مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۹۷) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن پڑھوا کر سنا۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۸) حضرت ابوبکرؓ سے اپنے سامنے ایک مقدمہ کا فیصلہ کروایا۔ (کنزالعمال: ۱۲۸/۵) حضرت معاذ بن جبلؓ کو اجتہاد کے اصول بتلائے۔ (ترمذی، کتاب الاحکام، حدیث نمبر: ۱۳۲۷) حضرت علیؓ کو قضاء کا کام سپرد کرتے ہوئے نئے پیش آنے والے مسائل کے حل کا منہج سمجھایا کہ ان مسائل میں انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے اجتماعی غور وفکر کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ (المعجم الاوسط: ۱۶۱۸)

دینی تربیت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر نرمی، رحم دلی، تواضع اور خوش اخلاقی کے باوجود احکام شریعت کے معاملہ میں سختی سے کام لیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بہت چاہتے تھے، عرب کے ایک معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے چوری کر لی تھی اور اس پر شرعی سزا جاری کرنے کا مسئلہ تھا، حضرت اسامہؓ نے اس کے حق میں سفارش کی، تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آپ نے نہ صرف ان کو تنبیہ کی؛ بلکہ اس موقع سے خطبہ بھی ارشاد فرمایا: گذشتہ قومیں اسی بنیاد پر ہلاک کر دی گئیں کہ ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو لوگ انہیں چھوڑ دیتے اور کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے، خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔ (بخاری، باب حدیث الغار، حدیث نمبر: ۳۴۷۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ اگر اپنے رفقاء کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اسے دور فرما دیں، ایک بار تو ایسا ہوا کہ آپ قبیلہ بنوعوف میں صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کوشش میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ حضرت بلالؓ نے نماز کے لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو آگے بڑھا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں آکر شریک ہوئے۔ (بخاری، عن سهل ابن سعد ساعدی، باب من دخل ليوم من الناس ....الخ، حدیث نمبر: ۴۸۶) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہؓ کے درمیان، مہاجرین و

انصار کے درمیان، اور انصار کے دو قبائل اوس وخزرج کے درمیان اختلاف کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی اور میل ملاپ کے ماحول کو باقی رکھنے کا سبق دیا۔

اپنے احباب کے ساتھ اس حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ ہر صحابی کا دل آپ کی محبت سے لبریز ہوتا، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ بعض لوگ وہ تھے، جو دنیاوی مفاد کے لیے اسلام قبول کرتے تھے؛ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو مسلمان ہونا دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے عزیز تر ہو جاتا تھا۔(**مسلم، باب ما سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شیئا قط، فقال: لا، و کثرۃ عطائہ**، حدیث نمبر:۲۱۳۲)

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات اپنے دوستوں، بے تکلف ساتھیوں، ہم عمروں اور رفقائے کار کے ساتھ خوش گوار برتاؤ کی ایک بہترین مثال ہے!

نبی رحمت ــــ بچوں کے درمیان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک بڑی نعمت اولاد ہے، انسان کے پاس راحت وآرام کی ساری چیزیں موجود ہیں؛ لیکن وہ اولاد سے محروم ہے تو اسے اپنی دنیا نامکمل اور ناتمام محسوس ہوتی ہے، دنیا کے بعض مذاہب میں انسان کا صاحب اولاد ہونا اور بیوی بچوں کی شرکت کے ساتھ زندگی گزارنا ناپسندیدہ اور اس کو روحانی ترقی میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے؛ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے ارشاد؛ بلکہ اپنے عمل سے بھی اس تصور کی تردید فرمائی، ایک شفیق باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟ آپ نے اس کی عملی مثال پیش فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے سلسلہ میں یہ اسوہ پیش کیا کہ انسان کو ماں باپ بننے پر خوش ہونا چاہیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تو آپ کو آپ کے آزاد کردہ غلام ابو رافعؓ نے ولادت کی خوش خبری سنائی، آپ اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں اس خوش خبری پر ایک غلام عطا فرمایا: ''**وبشره به ابو رافع مولاه فوهب له عبداً**'' (زادالمعاد: ۱/۱۰۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدائش کے بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کے کلمات کہہ کر کسی میٹھی چیز جیسے کھجور سے تحنیک فرماتے، اچھا خوب صورت سا نام رکھتے، اس کا بال مونڈاتے اور بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ فرماتے۔ (**زاد المعاد: ۲/۲-۴**)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بچوں اور ان کی اولاد کے ساتھ بے حد شفقت کا معاملہ فرماتے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ مرض وفات میں حاضر خدمت ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش آمدید میری بیٹی کو، پھر ان کو دائیں یا بائیں بیٹھایا، اور ان سے رازداری کے ساتھ باتیں کی: ''**مرحباً یا بنتی، ثم اجلسها عن یمینه او عن شماله ثم اسر الیها حدیثاً**'' (**مسلم، کتاب فضائل الصحابه، باب من فضائل فاطمهؓ**، حدیث نمبر: ۲۴۵۰) اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول مبارک تھا؛ چناں

چہ روایت ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ حاضر ہوتیں تو آپ ان کے لیے کھڑے ہوتے، ان کا ہاتھ تھامتے، بوسہ دیتے، انہیں اپنے دائیں طرف بٹھاتے اور کبھی ان کے لیے اپنا کپڑا بچھا دیتے۔ (**کنز العمال**، حدیث نمبر: ۳۴۴۰۹) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل جہاں اولاد کی محبت کو ظاہر کرتا ہے، وہیں اس بات کو بھی بتاتا ہے کہ جیسے بیٹے قابل محبت ہیں، اسی طرح بیٹیاں بھی محبت کیے جانے کے لائق ہیں؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں کی پرورِش اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو بیٹوں کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی اور فرمایا: جو شخص بیٹیوں کی بہتر طور پر پرورِش کرے، وہ جنت میں مجھ سے اتنا قریب ہوگا، جیسے یہ دونوں اُنگلیاں ہیں، (**ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء في النفقة على البنات**، حدیث نمبر: ۱۹۱۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؑ کو جو خاتون دودھ پلاتی تھیں وہ مدینہ میں تین میل کے فاصلہ پر عوالی کے علاقہ میں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے، اور اپنے بیٹے کا بوسہ لیتے اور ان کو سونگھتے، پھر وہاں سے واپس ہوتے: "**والعوالي على بعد ثلاثة اميال من المدينة ليزور ابنه ابراهيم فيقبله ويشمه ثم يعود**" (**مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمة صلى الله عليه وسلم على الصبيان**، حدیث نمبر: ۲۳۱۶)

جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اولاد سے محبت فرماتے تھے، اولاد کی اولاد سے بھی ایسی ہی محبت اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، ایک بار حضرت حسن بن علیؓ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لے رہے تھے حضرت اقرع بن حابسؓ نے دیکھا تو غالباً ان کو خیال ہوا کہ اس طرح بچوں سے پیار کرنا مقام نبوت کے شایانِ شان نہیں؛ اس لیے انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو رحم دلی کا تقاضا ہے اور جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا: "**من لا يرحم لا يرحم**" (بخاری، حدیث نمبر: ۱۵۶۵) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ یا حسینؓ سے کھیلتے، ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر انہیں اپنے سینے پر چڑھا لیتے، پھر ان کا بوسہ لیتے۔ (**طبرانی في**

الکبیر، حدیث نمبر:۲۶۵۳) ایسا بھی ہوا کہ آپ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو پشت مبارک پر سوار کرلیا اور فرمایا: تمھاری سواری کیا بہتر سواری ہے اور تم دونوں کیا ہی بہتر سوار ہو؟ (طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر:۱۶۶۲) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اسی درمیان حسنؓ و حسینؓ لوگوں کو پھاندتے ہوئے آپ کے قریب آ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ روک کر انہیں گود میں لے لیا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ کہا کہ مال واولاد آزمائش ہیں۔ (تغابن: ۱۵) میں نے ان دونوں کو دیکھا تو صبر نہیں کر پایا، پھر آپ خطبہ دینے لگے۔ (ابوداؤد، عن عبداللہ بن بریدہؓ، حدیث نمبر:۱۱۰۹) حضرت یعلی بن مرہؓ سے روایت ہے کہ آپ اپنے رفقاء کے ساتھ کھانے پر مدعو تھے، اتفاق سے حضرت حسینؓ گلی میں کھیل رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیا، حضرت حسینؓ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، آپ انہیں ہنساتے رہے، یہاں تک کہ انہیں پکڑ لیا اور ان کا ایک ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھا، ایک سر کے پیچھے، پھر انہیں بوسہ دیا اور فرمایا: حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں، جو حسین سے محبت رکھے گا، اللہ ان سے محبت رکھے گا۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۱۱۸)

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر یا عصر کی نماز کے لیے تشریف لائے، اس وقت آپ نے حضرت حسنؓ یا حضرت حسینؓ کو اُٹھا رکھا تھا، آپ نے ان کو اپنے قدم مبارک کے پاس رکھا اور نماز میں مصروف ہوگئے، جب سجدہ فرمایا تو بہت طویل سجدہ فرمایا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں نے اپنا سر اٹھایا تو دیکھا کہ آپ سجدے میں ہیں اور حضرت حسینؓ آپ کی پشت پر بیٹھے ہوئے ہیں، میں پھر سجدہ میں چلا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مکمل کی تو لوگوں نے پوچھا: آپ نے آج معمول کے خلاف سجدہ فرمایا ہے، کیا آپ کو اس کا حکم دیا گیا تھا یا آپ پر وحی نازل ہورہی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہیں تھا؛ لیکن مجھ پر میرا بیٹا سوار ہوگیا تھا، مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ میں عجلت سے کام لوں، اس لیے میں نے تاخیر کی؛ تا کہ وہ اپنا شوق پورا کرلے۔ (نسائی، کتاب صفة الصلاة، باب هل يجوز ان تكون سجدة اطول من سجدة؟ حدیث نمبر:۱۱۴۱)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار دن میں نکلے، نہ آپ مجھ سے کچھ بات کر رہے تھے اور نہ میں آپ سے کچھ عرض کر رہا تھا؛ چناں چہ بنی قینقاع کے بازار میں آئے، حضرت فاطمہؓ کے مکان کی دیوار کے پاس بیٹھ گئے اور حضرت حسنؓ کے بارے میں دریافت کیا: کیا وہ یہاں موجود ہے؟ تھوڑی دیر ہوئی، غالباً حضرت فاطمہؓ ان کو کپڑے پہنا رہی تھیں یا نہلا رہی تھیں، پھر وہ بھاگتے ہوئے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گلے لگایا، بوسہ دیا اور فرمایا: اے اللہ! اس سے محبت فرما اور جو لوگ اس سے محبت کریں، ان کو بھی اپنا محبوب رکھ۔ (**بخاری، عن ابی ھریرۃؓ**، حدیث نمبر:۲۱۲۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سلوک اپنے نواسوں کے ساتھ تھا، وہی سلوک اپنے خادم خاص حضرت زیدؓ کے صاحب زادے حضرت اسامہؓ کے ساتھ بھی ہوا کرتا تھا؛ چناں چہ ایک موقع پر آپ نے اپنی ایک ران پر حضرت اسامہؓ کو بٹھایا، ایک ران پر حضرت حسنؓ کو، اور ان دونوں کو اپنے ساتھ چمٹا کر فرمانے لگے: اے اللہ! آپ ان دونوں کے ساتھ مہربانی کیجیے؛ کیوں کہ میں بھی ان دونوں پر مہربان ہوں۔ (بخاری، حدیث نمبر:۳۰۰۶)

یہ عمل آپ کا صرف حضرات حسنینؓ ہی کے ساتھ نہیں تھا؛ بلکہ خاندان کے دوسرے بچوں اور عام بچوں کے ساتھ بھی تھا، ایسا بھی ہوتا کہ آپ اس حال میں نماز پڑھتے کہ حضرت امامہ بنت زینبؓ کو اٹھائے ہوتے جب سجدے میں جاتے تو ان کو رکھ دیتے اور جب سجدے سے اٹھتے تو ان کو اٹھا لیتے۔ (**بخاری، عن قتادۃ، کتاب ابواب سترۃ المصلیٰ، باب اذا عمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلاۃ**، حدیث نمبر:۴۹۴) حضرت عباسؓ کے صاحب زادوں حضرت عبداللہؓ، حضرت عبیداللہؓ وغیرہ کو بلاتے اور فرماتے: جو پہلے میرے پاس پہنچے گا، اس کو یہ اور یہ انعام ملے گا، سب دوڑ لگا کر آپ کے پاس آتے، کوئی سینہ پر چڑھ جاتا، کوئی پشت پر، آپ ان سب کو چمٹاتے اور ان سب کا بوسہ لیتے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر:۱۸۳۶) یہی معاملہ آپ کا اپنے رفقاء کے بچوں کے ساتھ بھی ہوتا، حضرت اُم خالد ہمیشہ اپنے ایک واقعہ کا ذکر کرتی تھیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، میں نے زرد رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا ہے، اچھا ہے، میں آپ کی مہر نبوت (جو دونوں مونڈھوں کے درمیان تھیں) سے کھیلنے لگی، میرے والد نے مجھے منع کیا، آپ نے فرمایا: چھوڑ دو، پھر آپ نے مجھے تین دفعہ دعا دی: ''پرانا اور بوسیدہ کرو'' یعنی یہ کپڑا بہت دنوں تک تمہارے کام آئے۔ (بخاری، حدیث نمبر:۳۰۷۱) ایسا بھی ہوتا کہ آپ بعض دفعہ بچوں کو لیتے اور وہ آپ ہی کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے؛ لیکن آپ اس کا بُرا نہیں مانتے۔ (مسند احمد، عن ام کرز خزاعی، حدیث نمبر: ۲۶۸۳۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ خوش طبعی بھی فرماتے، ایک کم سن صحابی حضرت ابوعمیرؓ کے پاس ایک پرندہ تھا، جس سے وہ کھیلتے تھے، جب آپ ان کے پاس تشریف لاتے تو فرماتے: ''**یا ابا عمیر ما فعل النغیر؟**'' (ترمذی، **کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی الصلاۃ علی البسط**، حدیث نمبر:۳۳۳) یعنی اے ابوعمیر! تمہارے ساتھ گوریئے نے کیا کیا؟ — حضرت محمود ابن ربیعؓ فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ جب میری عمر پانچ سال کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول سے منھ میں پانی لیا اور اس کی پچکاری میرے منھ پر ماری، (مسلم، **کتاب الوضوء، باب استعمال فضل وضوء الناس**، حدیث نمبر:۱۸۶) اس میں تبرک کا بھی پہلو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھوٹے سے بڑھ کر کسی مسلمان کے لیے برکت وسعادت کی چیز اور کیا ہوسکتی ہے اور خوش طبعی کا پہلو بھی ہے۔

آپ اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ بچوں کے نام اچھے اور بامعنی رکھے جائیں، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو میں نے ان کا نام ''حرب'' رکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں ان کا نام ''حسن'' ہوگا، پھر جب حضرت حسینؓ پیدا ہوئے تو آپ نے نام پوچھا، میں نے پھر وہی کہا ''حرب'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اس کا نام ''حسین'' ہوگا، پھر جب تیسرے صاحب زادے پیدا ہوئے تو میں نے اس کا نام ''حرب'' رکھنا چاہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اس کا نام ''محسن'' ہے۔ (السنن

الکبریٰ للبیھقی، باب الصدقة فی ولد البنین و البنات، حدیث نمبر۱۱۷۰۶)جب حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے آپ کے صاحب زادے پیدا ہوئے تو آپ نے ان کا نام ابراہیم رکھا اور فرمایا: میں نے اس کا نام اپنے باپ حضرت ابراہیم کے نام پر رکھا ہے: "**سمیته باسم ابی ابراهیم**" (**کنز العمال** :۱۲/۵۰۷،حدیث نمبر:۳۵۵۵۰) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بیٹا پیدا ہوا، وہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے،آپ نے ان کا نام بھی ابراہیم رکھا، کھجور سے تحنیک کی اور ان کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔(**بخاری، کتاب العقیقة،** حدیث نمبر:۵۱۵۰)ایک لڑکی خدمت اقدس میں لائی گئی،آپ نے لڑکی نام پوچھا بتایا گیا: "عاصیہ" جس کے معنی نافرمان کے ہوتے ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا نام "جمیلہ" ہے۔(**ترمذی، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء،** حدیث نمبر:۲۸۳۸)

آپ بال بچوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھتے تھے،ایک بار آپ فاقہ سے تھے، ایک صحابی نے آپ کو مدعو کیا،آپ نے وہاں سے کچھ کھانا حضرت فاطمہؓ کو بھی بھجوایا۔(اسد الغابة:۱/۱۵۵) حضرت ابراہیمؓ کی والدہ حضرت ماریہ قبطیہؓ کو دودھ کم آتا تھا تو آپ نے ان کے لیے دودھ پلانے والی خاتون کا انتظام کیا۔(**مسلم، کتاب الفضائل،** حدیث نمبر: ۲۳۱۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ آدمی سفر سے آئے،تو گھر میں کچھ تحفہ لے کر آئے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی اور چیز میسر نہ ہو تو کوئی خوب صورت پتھر ہی لے آؤ، جو بچوں کے کھیلنے میں کام آجائے۔(**کنز العمال** ،حدیث نمبر: ۲۷۹۵۹)اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار آپ کو ایک خوب صورت ہار تحفہ میں پیش کیا گیا، جس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا، اُس وقت بارگاہِ اقدس میں تمام ازواج مطہرات اکٹھا تھیں اور گھر کے ایک کونے میں آپ کی نواسی حضرت امامہ بنت ابی العاصؓ کھیل رہی تھیں، آپ نے ازواج مطہرات سے دریافت فرمایا: تم لوگوں کو یہ ہار کیسا لگتا ہے؟ سبھوں نے کہا: بہت خوب، اس سے اچھا اور اس سے خوب صورت ہار تو ہم نے دیکھا ہی

نہیں، آپ نے فرمایا: مجھے واپس کرو، پھر آپ نے ہار اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: یہ میں اس کو دوں گا، جو مجھے اپنے گھر میں سب سے زیادہ محبوب ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: میرے اوپر اس ڈر سے اندھیرا چھا گیا کہ کہیں آپ میرے بجائے کسی اور زوجہ کو نہ دے دیں، اور میرا خیال ہے کہ یہی حال آپ کی دوسری بیویوں کا بھی تھا، ہم سب پر خاموشی چھا گئی، آپ امامہ کی طرف بڑھے اور ہار ان کے گلے میں ڈال دیا، اب جا کر مجھ سے یہ کیفیت ختم ہوئی۔ **(مجمع الزوائد: ۲۵۴/۹)**

آپ اپنی اولاد کی خوشی اور رنجش کا بھی خیال رکھتے تھے، حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کو تکلیف پہنچے، خدا کی قسم! اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتی، اسی طرح ہشام بن مغیرہ کے لوگوں نے حضرت علیؓ سے اپنی لڑکی کے نکاح کی اجازت چاہی تو آپ نے دو دفعہ فرمایا: نہیں، پھر فرمایا: اگر علی ایسا چاہتے ہی ہوں تو میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ان کے یہاں نکاح کرلیں؛ کیوں کہ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۲۹) آپ کے منع کرنے میں دو مصلحتیں تھیں، ایک یہ کہ ابوجہل اور مغیرہ کا خاندان فتح مکہ تک اسلام کا بدترین دشمن رہا، ایسے دشمنانِ رسول کی بیٹی کا اس گھر میں آنا، جس میں جگر گوشہ رسالت حضرت فاطمہؓ ہوں، مصلحت کے خلاف تھا، دوسرے: انسان کے جو طبعی جذبات ہوتے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بھی رکھے گئے تھے اور یہ فطری بات ہے کہ سوکن کا وجود عورت کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے اور بیٹی کی تکلیف باپ کو متأثر کر دیتی ہے؛ اس لیے اس عمل کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ سے تکلیف پہنچتی اور کسی مسلمان سے اللہ کے پیغمبر کو تکلیف پہنچ جائے، یہ اس کے لئے دنیا وآخرت میں سخت نقصان کا باعث تھا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر چاہیں تو نکاح کرلیں؛ کیوں کہ میں کسی حلال کو حرام نہیں کرسکتا؛ لیکن ایسی صورت میں وہ میری

بیٹی کو طلاق دے دیں، اس ارشاد میں حضرت فاطمہؓ کی محبت کے ساتھ ساتھ حضرت علیؓ کو دنیا و آخرت کے خسارے سے بچانا بھی مقصود تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچوں کے ساتھ حسن سلوک اوران کی رعایت کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات مسجد نبوی میں خواتین کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی آجاتے تھے اور بچے اپنی عادت کے مطابق رونے لگتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وجہ سے اپنی نماز مختصر کردیتے تھے؛ چناں چہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بعض دفعہ میں طویل قراءت کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن جب بچوں کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو مختصر کردیتا ہوں کہ اس سے ان کی ماؤں کو تکلیف نہ ہو: ''**قال صلی اللہ علیہ وسلم: انی لادخل فی الصلاۃ وانا ارید اطالتھا فاسمع بکاء الصبی فا تجوز فی صلا تی مما اعلم من شدۃ وجد امہ من بکائہ**'' (**بخاری، باب من اخف الصلاۃ** ....الخ، حدیث نمبر: ۶۷۷)

آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب بناتے ہوئے فرمایا:

اے ابراہیم! اگر موت برحق بات نہیں ہوتی، اللہ کا وعدہ سچا نہیں ہوتا، اور ایک دن سب کو جمع کرنے والا نہیں ہوتا، عمر محدود نہیں ہوتی اور وقت مقررہ طے نہیں ہوتا، تو تمہاری جدائی پر مجھے اس سے بھی زیادہ غم ہوتا، اے ابراہیم! ہم غم زدہ ہیں، آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمگین ہے؛ لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے، جو پروردگار کو ناراض کردے۔

پھر حضرت ابراہیمؓ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا: جب تک میں اسے دیکھ نہ لوں، کفن میں نہ لپیٹنا، آپ تشریف لائے، ان پر جھک گئے اور رونے لگے۔(**مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان** ....الخ، حدیث نمبر: ۲۳۱۵)

آپ اپنے ایک نواسے کے انتقال کے وقت تشریف لائے، بچہ آخری سانس لے رہا تھا، آپ نے اسے ہاتھوں میں لیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ جذبہ رحم ہے، جو اللہ نے اپنے بندوں

کے دلوں میں رکھا ہے، اللہ کے بندوں میں جو رحم دل ہوتا ہے، اسی پر اللہ رحم فرماتے ہیں۔ (بخاری، عن اسامہ بن زید، حدیث نمبر:۱۲۳۸) اسی طرح بال بچوں کی صحت اور اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ کا بھی خیال کرتے تھے، غزوۂ بدر کا موقع ایسا موقع تھا، جب ایک ایک فرد کی اہمیت تھی؛ لیکن اس وقت حضرت رقیہؓ بہت علیل تھیں، وہ حضرت عثمان غنیؓ کے نکاح میں تھیں، آپ نے حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمانؓ کو مدینہ میں چھوڑ دیا، (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب :۵۹/۲،السیرۃ النبویۃ :۵۰۹/۲) گھر کے چھوٹے بچوں کو آپ دَم بھی کیا کرتے تھے؛ چناں چہ حضرت حسنؓ و حسینؓ کو دَم کرتے ہوئے یہ دعا پڑھتے تھے: **اعیذ کما بکلمات اللّٰہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ ومن کل عین لامۃ**۔ (بخاری، حدیث نمبر:۱۹۱۳) میں تم دونوں کو اللہ کے مکمل کلمات کے واسطہ سے ہر شیطان، موذی جانور اور تکلیف پہنچانے والی نظر سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں۔

جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ شفقت و محبت اور بے تکلفی کا معاملہ فرماتے، وہیں ان کی دینی اور اخلاقی تربیت پر بھی پوری توجہ فرماتے تھے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کو عزت دیا کرو اور ان کو بہتر ادب سکھاؤ: ’’**اکرموا اولادکم واحسنوا ادبھم**‘‘ (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۶۷۱) حضرت حسنؓ نے ایک بار زکوٰۃ کی کھجور میں سے ایک کھجور کھانی چاہی تو آپ نے ان کو منع فرمادیا۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۶۹) بعض روایات میں ہے کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ نے کھجوریں اپنے منھ میں رکھ لی تھیں، آپ نے ان کے منھ سے اُگلوادیں اور فرمایا: تمھیں معلوم نہیں کہ آلِ محمد زکوٰۃ نہیں کھاسکتے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۲۵) حضرت عباسؓ کے صاحب زادے حضرت فضل زمانۂ جاہلیت کے رواج کے مطابق نظر بد سے حفاظت کے لیے دھاگہ لٹکائے ہوئے تھے اور اس وقت بہت کم عمر تھے، آپ نے اس دھاگے کو توڑ دیا۔ (مصنف عبدالرزّاق، حدیث نمبر:۲۰۳۴۲)

قربانی کے موقع سے حضرت فاطمہؓ سوئی ہوئی تھیں، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے، ان کو بیدار کیا اور فرمایا: اٹھ جاؤ اور اپنی قربانی کے وقت موجود رہو۔ (سنن بیہقی، حدیث

نمبر:۱۸۹۴۴) ایک موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ڈھیر سارا مالِ غنیمت آیا ہوا تھا، حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا: مشکیزے کھینچنے کی وجہ سے میں اپنے سینے میں تکلیف محسوس کرتا ہوں، حضرت فاطمہؓ نے کہا: چکی پیستے پیستے مجھے بھی تکلیف ہورہی ہے، حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خادم مانگ لو، بعض روایتوں کے مطابق دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ مجھ سے خادم مانگنے کے لیے آئے ہو؟ میں تم کو اس سے بہتر چیز بتاتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳/ دفعہ سبحان اللہ ۳۳/ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴/ دفعہ اللہ اکبر پڑھا کرو، اور جب رات میں بستر پر جاؤ، اس وقت بھی پڑھ لو، اس طرح کل سو تسبیحات ہو جائیں گی۔ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر:۴۲۵۵) بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو دے دوں اور صفہ والوں کو چھوڑ دوں: "**لا اعطیکما وادع اهل الصفة**" (مسند احمد:۱/۱۰۶، حدیث نمبر:۸۳۸)

حضرت عمر بن ابی سلمہؓ اپنی والدہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورِش میں تھے، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور بچوں کی عادت کے مطابق کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے لقمہ اُٹھاتے تھے، آپ نے نرمی کے ساتھ ان کو کھانا کھانے کا طریقہ بتایا: اے بچے! بسم اللہ کہو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے قریب سے کھایا کرو: "**کل مما یلیک**" (**بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمية الطعام**، حدیث نمبر:۱۶۰۵) — حضرت جابرؓ بھی کم عمر صحابہؓ میں تھے، ایک بار سیدھے گھر میں داخل ہوگئے، آپ نے فرمایا: باہر جاؤ، سلام کرو، پھر اجازت لے کر داخل ہو۔

حالاں کہ بچوں سے اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ مسجد کے احترام کا لحاظ نہ کر پائیں، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے مسجد آنے کی حوصلہ افزائی فرماتے اور مردوں اور عورتوں کے درمیان بچوں کی صف رکھتے۔ (**السنن الکبریٰ للبیهقی، کتاب الصلاة**، حدیث نمبر:۴۹۴۷) سرپرستوں کو بھی ایسے کسی عمل سے منع فرماتے، جو تربیتی نقطۂ نظر سے مناسب نہ

ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بہت کم سن تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھائے ہوئے تھے، آپ نے ان سے بڑی نصیحت آمیز باتیں فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! میں تم کو چند نصیحتیں کرتا ہوں، تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، اللہ تمہاری حفاظت کریں گے، اللہ کو یاد رکھو، تم اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے اور جب بھی مانگنا ہو، اللہ ہی سے مانگو، اور جان لو کہ اگر تمام لوگ مل کر بھی تم کو نفع پہنچانا چاہیں تو جو نفع تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے، وہی تم کو ملے گا، اور اگر سب مل کر تم کو نقصان پہنچانا چاہیں تو اتنا ہی نقصان پہنچے گا، جو اللہ نے تمہارے لیے طے کر دیا ہے۔ (**سنن ترمذی، کتاب صفة القیامة**، حدیث نمبر: ۲۵۱۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک شب حضور صلی اللہ علیہ وسلمکے ساتھ گزاری، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ان کی خالہ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے گھر میں تھا، آپ نے تہجد کی نماز میں ان کو اپنے ساتھ رکھا، آپ نماز پڑھا رہے تھے، وہ آپ کے بائیں جانب کھڑے ہوگئے، آپ نے ان کا کان پکڑ کر ان کو دائیں جانب کر دیا۔ (**مسلم، باب الدعاء فی صلاة اللیل و قیامه**، حدیث نمبر: ۷۶۳) — حجۃ الوداع میں حضرت فضل بن عباسؓ آپ کی سواری پر آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، قبیلہ بنو خثعم کی ایک لڑکی آپ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئی، حضرت فضل ان کی طرف دیکھنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ان کا چہرہ دوسری طرف موڑ دیا۔ (**بخاری، عن عبد اللّٰہ بن عباسؓ، باب وجوب الحج و فضله**، حدیث نمبر: ۱۴۴۳)

غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بچوں کی ضروریات اور جذبات کا خیال رکھتے تھے، ویسے ہی ان کی تربیت کی طرف بھی متوجہ رہتے تھے؛ لیکن تربیت میں بھی بچوں کے حقوق کا پورا خیال رکھتے تھے، حضرت سہل ساعدی سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی پینے کی چیز لائی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے نوش فرمایا، آپ کے داہنے

طرف ایک بچہ تھا اور بائیں طرف عمر رسیدہ لوگ تھے، آپ نے بچے سے پوچھا: کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں انھیں دے دوں؟ اس نے کہا: خدا کی قسم! میں آپ کے جھوٹے کے معاملہ میں ایثار نہیں کر سکتا؛ چناں چہ آپ نے ان ہی کو عطا فرمایا۔(**ترمذی، باب مایقول اذا اکل طعاماً**، حدیث نمبر: ۳۴۵۵)

بچوں کے لیے رشتہ کے انتخاب میں بھی دین داری، حسن اخلاق اور سن وسال کی مناسبت کا لحاظ رکھتے تھے، آپ نے اپنی صاحب زادی حضرت زینبؓ کا نکاح ابوالعاص سے فرمایا، آپ نے بحیثیت داماد ان کی تعریف کی؛ کیوں کہ جب وہ غزوۂ بدر میں گرفتار ہو کر آئے، آپ نے ان کا فدیہ متعین کیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ پہنچا دیں اور انہوں نے اس وعدہ کو پورا کیا؛ چناں چہ جب ابوالعاص ایمان لے آئے تو آپ نے دوبارہ حضرت زینبؓ کو ان کے نکاح میں دے دیا۔(**مستدرک حاکم، کتاب الطلاق**، حدیث نمبر: ۱۱۸۲) حضرت رُقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ کو یکے بعد دیگرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے نکاح میں دیا، جو نہ صرف اسلام کی خدمت میں نمایاں مقام رکھتے تھے؛ بلکہ صاحب ثروت بھی تھے اور ان کی سخاوت بھی مشہور تھی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے نکاح کا پیغام دیا؛ لیکن آپ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ ان کی عمر کم ہے، یعنی عمر کے اعتبار سے مناسبت نہیں ہے؛ چناں چہ حضرت علیؓ نے نکاح کا پیغام دیا اور آپ نے اسے قبول فرمایا۔(**نسائی، عن بریدة**، حدیث نمبر: ۱۲۲۳) اور حضرت علیؓ عالی نسبی، اسلام میں سبقت کا شرف اور فہم وذکاوت میں جو مقام تھا، وہ عہد صحابہؓ میں بھی مسلّم تھا۔

داماد کا رشتہ بیٹی کی نسبت سے ہوتا ہے اور داماد سے خوش گوار تعلق کا اثر بیٹی پر بھی پڑتا ہے؛ چناں چہ آپ نے اپنے تمام دامادوں سے بے حد خوش گوار تعلق رکھا اور ہمیشہ سلوک میں ان کا لحاظ کرتے رہے، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں ایک بار کچھ کہا سنی ہوگئی، آپ حضرت فاطمہؓ کے یہاں تشریف لے گئے اور ان کو موجود نہیں پایا، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ ناراض ہو کر کہیں چلے گئے ہیں، آپ تلاش میں نکلے، حضرت علیؓ مسجد میں ملے، وہ زمین ہی پر

لیٹ گئے تھے اوران کی پیٹھ میں مٹی لگ گئی تھی، آپ محبت سے ان کی پیٹھ صاف کرنے لگے، ساتھ ہی ساتھ خوش طبعی کے طور پر کہتے جاتے تھے: **یا ابا تراب یا ابا تراب** ''اے مٹی والے، اے مٹی والے'' (**بخاری، باب نوم الرجال فی المسجد**، حدیث نمبر: ۴۳۰)

جہاں آپ بچوں کے ساتھ شفقت فرماتے اوران کی تربیت پر توجہ رکھتے، وہیں ان کے لیے دعا کا بھی اہتمام کرتے، صحابہؓ اپنے بچوں کو آپ کی خدمت میں لے کر آتے، آپ انھیں برکت کی دعا دیتے، حضرت انسؓ آپ کے خاص خادموں میں تھے، آپ نے انہیں ایک موقع پر خوش ہوکر دعا دی: اے اللہ! ان کو قرآن مجید کا خصوصی فہم عطا فرما اور دین کے تفقہ سے سرفراز کر: ''**اللّٰهم علمه التاويل وفقهه في الدين**'' (**مستدرک حاکم، کتاب الفضائل، باب مناقب عبد الله بن عباسؓ**، حدیث نمبر: ۶۲۸) حضرت انسؓ آپ کے خاص خادموں میں تھے اوران کی والدہ ماجدہ نے اس وقت ان کو آپ کی خدمت میں دے دیا تھا، جب ان کی عمر صرف دس سال تھی، آپ نے ان کو مال واولاد اور عمر میں برکت کی اور مغفرت کی دعا دی؛ چناں چہ مال میں برکت کا اثر یہ ہوا کہ ان کے دو باغ میں سال میں دو بار پھل آتا تھا، اولاد میں برکت کا حال یہ تھا کہ آپ کے ۸۷ لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں، نیز عمر تقریباً ۱۱۰ ر سال پائی۔ (**الاستیعاب فی معرفة الصحابةؓ**: ۱/ ۳۵)

غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ایک شفیق ماں باپ، ایک کامیاب مربی اور ذمہ دار سرپرست کے لیے بہترین نمونہ ہے، جس میں بچوں کے جذبات کی رعایت، دینی و اخلاقی تربیت اور مادی نگہ داشت، تمام پہلوؤں کا لحاظ ہے؛ کیوں کہ بچے ہی سماج کا مستقبل ہیں اور وہ ماں باپ کے لیے ایسے ہی ہیں، جیسے کسی کاشت کار کے لیے کھیت کی پیداوار، کسی باغ بان کے لیے اس کے باغ کے لگائے ہوئے پھل اور کسی مالی کے لیے اس کے لگائے ہوئے گلستان کے پھول۔

ازدواجی زندگی اور اسوۂ نبوی

میزبان کا مہمان کے ساتھ، تاجر کا گاہک کے ساتھ، ملازم کا افسر کے ساتھ اور ایک دوست کا دوسرے دوست کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنا دشوار نہیں، ان لوگوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی کا ثبوت دینا آسان ہے، جن سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی ہو؛ لیکن شوہر اور بیوی کا رشتہ ایسا رشتہ ہے، جس میں ہر وقت کا ساتھ ہے، خلوت میں اور جلوت میں، دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں، صبح و شام اور شب و روز، اس ہمہ وقتی رفاقت میں خوشی کے لمحات بھی آتے ہیں، رنج و غم کی ساعتیں بھی آتی ہیں، اور غصہ و ناراضگی کے واقعات بھی پیش آتے ہیں؛ اس لیے انسان دوسروں کے ساتھ تو مصنوعی خوش اخلاقی برت کر کام چلا سکتا ہے اور دو چہروں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے، ایک اس کا مصنوعی چہرہ جس میں نرمی، خوش اخلاقی، شرافت اور اِظہارِ محبت ہو، وہ باہر کی دنیا میں اسی چہرے سے اپنا تعارف کرائے، دوسرا چہرہ اس کا حقیقی چہرہ ہو، جس میں بد اخلاقی، سخت کلامی، غیظ و غضب اور درشتی و تند خوئی ہو۔

لیکن شوہر اور بیوی کا تعلق چوں کہ ہر سرد و گرم میں ہوتا ہے؛ اس لیے یہاں مصنوعی اخلاق کے ذریعے اپنی بد اخلاقی کو چھپایا نہیں جا سکتا؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین شخص اُس کو قرار دیا، جس کے اخلاق اچھے ہوں، پھر فرمایا کہ تم میں بہتر شخص وہ ہے، جس کا رویہ اس کے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہو، اور یہ کہ میں تم سب سے زیادہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنے والا ہوں "**خیر کم خیر کم لاھلہ و انا خیر کم لاھلی**" (**سنن ترمذی، بہ سند صحیح**، حدیث نمبر: ۳۸۹۵، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۹۷۷) اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا بہترین نمونہ ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "دعوتِ دین" علوم نبوت کی اشاعت اور مختلف قبائل کی دل داری کے مقصد سے خصوصی طور پر چار سے زیادہ نکاح کی اجازت دی گئی تھی؛ چناں چہ بحیثیت مجموعی گیارہ پاک بیویاں آپ کے نکاح میں رہیں: حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ، حضرت

سودہ بنت زمعہؓ، حضرت عائشہ بنت ابی بکرؓ، حضرت حفصہ بنت عمرؓ، حضرت زینب بنت خزیمہؓ، حضرت اُمّ سلمہ بنت ابی امیہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہ بنت حارثہؓ، حضرت اُمّ حبیبہ بنت ابی سفیانؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت میمونہؓ۔

ازواج کی کثرت کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج کے ساتھ ہمیشہ اعلیٰ درجے کا سلوک رہا، اور کیوں نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم فرمایا ہے: ''**وعاشروھن بالمعروف**'' (النساء:۱۹) یعنی بیویوں کے ساتھ بہتر طریقہ پر زندگی گزارو، یہ ایک جامع تعبیر ہے، جس میں خوش اخلاقی، مروت اور پاس ولحاظ کی تمام صورتیں داخل ہیں اور حیاتِ طیبہ بیویوں کے ساتھ اس مثالی طرز زندگی کی عملی شکل پیش کرتی ہے۔

بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے اور اس سے محبت کا اظہار ہو، یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اس کی تعریف کی جائے یا اس سے محبت کا اظہار کیا جائے تو اس کو خوشی ہوتی ہے؛ لیکن خاص کر اگر شوہر اپنی بیوی کی تعریف کرے تو یہ اس کے لیے سب سے قیمتی سوغات ہوتی ہے، اس کو لگتا ہے کہ اس کی محنت وصول ہوگئی؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے لیے تعریفی کلمات بھی فرمایا کرتے تھے؛ چناں چہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں فرمایا: جیسے تمام کھانوں میں ثرید عمدہ ہوتا ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ تمام عورتوں میں بہترین عورت ہے: ''**ان فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام.**'' (**بخاری، عن ابی موسیٰ الاشعریؓ، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۲۳۰، مسلم، باب من فضل عائشه، حدیث نمبر: ۲۴۴۶**)

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی آپ ہمیشہ ان کا ذِکر خیر فرماتے تھے؛ اسی لیے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حالاں کہ میں نے حضرت خدیجہؓ کو نہیں دیکھا؛ لیکن مجھے ان ہی پر سب سے زیادہ رشک آتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بار بار تذکرہ فرماتے، بکرا ذبح کرتے تو خود سے اس کے ٹکڑے کرتے اور حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھیجتے، حضرت عائشہؓ نے ایک بار غلبہ رشک میں عرض کیا کہ گویا دنیا میں خدیجہ کے سوا کوئی عورت ہی نہیں

تھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''**انھا کانت و کانت و کان لی منھا ولد**'' (**بخاری، باب تزویج النبی خدیجه و فضلھا**، حدیث نمبر:۳۶۰۷)یعنی وہ بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔(فتح الباری:۷/۱۳۷)اوران ہی سے مجھے اولاد حاصل ہوئی،ایک اور موقع پرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکرِخیر کرتے ہوئے فرمایا: جب لوگوں نے انکار کیا، اُس وقت وہ ایمان لائیں، جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا،اُس وقت انہوں نے میری تصدیق کی،جب لوگوں نے مجھے محروم کرنا چاہا،اُس وقت انہوں نے اپنے مال سے میری غمگساری کی اوراللہ نے ان کے ذریعے مجھے اولاد عطا فرمائی۔(مسند احمد،حدیث نمبر:۲۴۹۰۴)—— اکثر جب کسی شخص کی بیوی کا انتقال ہوجاتا ہے اور وہ دوسرا نکاح کرتا ہے تو اپنی پہلی بیوی کی خدمات اوراس کی قربانیوں کوفراموش کردیتا ہے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے اس بات کا سبق دیا کہ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ نئے رشتے کی وجہ سے پرانے رشتے کوفراموش کردیا جائے۔

آپ ازواجِ مطہرات سے اپنی محبت کا اظہار بھی فرماتے تھےاوراس میں تکلف سے کام نہیں لیتے تھے؛ چناں چہ آپ نے حضرت خدیجہؓ کے بارے میں فرمایا کہ مجھ کوان کی محبت عطا فرمائی گئی ہے:''**انی رزقت حبھا**'' (**مسلم، کتاب الفضائل**، حدیث نمبر:۲۴۳۵) —— حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک موقع پر دریافت فرمایا کہ آپ کوسب سے زیادہ محبت کس سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: عائشہ سے۔(دیکھیے :**اللو لو والمرجان**، حدیث نمبر:۱۵۲۴) پھر آپ اپنے سلوک کے ذریعے بھی محبت کا احساس دلاتے تھے؛ چناں چہ آپ بعض دفعہ اپنی کم سن زوجہ مطہرہ کو پیار سے ''یا عائش'' کہتے تھے۔(**مسلم، کتاب الفضائل**، حدیث نمبر۲۴۴۷)—— اِظہارِ محبت کی ایک تعبیر یہ ہے کہ آپ نے ایک بار حضرت عائشہؓ سے فرمایا: یہ جان لینے کے باوجود کہ جنت میں بھی تم میری بیوی رہوگی، مجھے موت کی پرواہ نہیں رہی:''**ما ابا لی بالموت بعد ان عرفت انک زوجتی بالجنة**'' (**کنز العمال**، حدیث نمبر:۳۴۳۶۴)—— غور کیجیے کہ محبت کے اس بول نے حضرت عائشہؓ کوکس قدر شاد کام

کیا ہوگا کہ اس میں جنت میں رفاقت نبوی کا مژدہ بھی ہے اور آپ سے محبت کا اظہار بھی، ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ آپ کی مجھ سے کیسی محبت ہے یعنی آپ مجھ سے کس درجہ محبت فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رَسّی کی گرہ کی طرح، یعنی گرہ جیسی مضبوط ہوتی ہے اور کھولے نہیں کھلتی، اسی طرح تم سے میری محبت ہے، حضرت عائشہؓ نے استفسار کیا: یہ گرہ کیسی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جیسی تھی ویسی ہی ہے، یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ (حلیۃ العلماء: ۲/۴۴)

اِظہارِ محبت کی ایک ادا وہ بھی تھی، جو حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کا برتن ہاتھ میں لیتے اور قسم دیتے کہ میں اس میں سے کھاؤں، پھر آپ برتن لیتے اور جہاں سے میں نے منھ لگایا تھا، اسی جگہ سے تناول فرماتے: **"ویتحری موضع فمي ویضع فمه علی موضع فمي من الناء"** (مسلم، کتاب الحیض، حدیث نمبر: ۳۳۰) اور ایسا بھی ہوتا کہ ہڈی والے گوشت میں سے جہاں سے حضرت عائشہؓ کھینچ کر تناول فرماتیں، آپ وہیں سے گوشت تناول فرماتے: **"وکان اذا تعرقت عرقا، وهو العظم الذي علیه لحم اخذه فوضع فمه موضع فمها"** (مسلم، کتاب الحیض، حدیث نمبر: ۳۰۰) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود ازواج مطہرات کے ساتھ اس طرح محبت اور لگاؤ کا اظہار کیا؛ بلکہ اُمت کو بھی اس کی تلقین فرمائی؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جو بھی خرچ کروگے، اس پر اجر پاؤگے، یہاں تک کہ جو لقمہ اپنی بیوی کے منھ میں رکھوگے، اس میں بھی اجر ہے: **"انک لن تنفقه نفقة الا اجرت علیها حتی اللقمة ترفعها الی في امراتک"** (نسائی، کتاب عشرۃ النساء، حدیث نمبر: ۶۸۱۹) اس میں یوں تو انفاق کی ترغیب دینا مقصود ہے؛ لیکن ایک لطیف اشارہ بیوی کے ساتھ اظہار محبت کا بھی ہے کہ شوہر اپنے ہاتھوں سے بیوی کو لقمہ کھلائے، یہ لقمہ محبت پیٹ ہی کی نہیں دل کی بھی غذا بن جاتا ہے۔

آپ قدم قدم پر ازواج مطہرات کی دل داری کا لحاظ رکھتے تھے، یہاں تک کہ سن و

سال کے تقاضوں کا بھی خیال فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ جب آپ کے نکاح میں آئیں تو ان کی عمر کم تھی اور انہیں اس طرح کے کھیل کا شوق تھا، جو کم عمر بچیوں میں ہوا کرتا ہے، ایک دفعہ عید کے موقع سے حضرت ابوبکرؓ حاضر خدمت ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑا اوڑھ رکھا تھا اور دو کم عمر لڑکیاں حضرت عائشہؓ کے سامنے دف بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اس پر ناگواری ظاہر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روئے انور سے کپڑا ہٹا دیا اور حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: انہیں چھوڑ دو، یہ عید کا دن ہے — حبشی لوگ ایسے خوشی کے موقع پر اپنے کرتب دکھاتے تھے، حضرت عائشہؓ کو ان کے دیکھنے کی خواہش ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے، اور حضرت عائشہؓ آپ کے مونڈھے پر ٹیک لگا کر حبشیوں کا نیزے کا کھیل دیکھتی رہیں اور جب تک خود تھک نہ گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رعایت میں کھڑے رہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۸)

حضرت عائشہؓ کی ہم عمر سہیلیاں ان کے پاس آتیں اور ساتھ کھیلتیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو مارے شرم کے بھاگ جاتیں؛ لیکن آپ ان کو حضرت عائشہؓ کے پاس بھیج دیتے: ''**فکان یسر بھن الیّ**'' (**مسلم، کتاب الفضائل**، حدیث نمبر: ۲۴۴۰) — حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی وجہ سے اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصی طور پر ایسی باتوں میں ان کا لحاظ فرماتے تھے؛ لیکن حسن سلوک اور دل داری کا یہ معاملہ ہر بیوی کے ساتھ ہوتا، اُمّ المؤمنین حضرت صفیہؓ کو اونٹ پر بیٹھنا تھا، تو آپ نے اپنا گھٹنہ کھڑا کر دیا؛ تاکہ آپ کے گھٹنے پر قدم رکھ کر حضرت صفیہؓ اونٹ پر چڑھ سکیں: ''**ثم یجلس عند بعیرہ فیضع رکبتہ فتضع صفیة رجلھا علی رکبتہ حتی ترکب**'' (بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر: ۳۹۴۷) — ایک سفر میں انجشہ نامی ایک غلام اس سواری کو ہانک رہا تھا، جس میں بعض اُمہاتُ المؤمنین سوار تھیں، انجشہ اس طرح نظم پڑھ رہے تھے کہ اونٹ بہت تیز دوڑنے لگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انجشہ! آہستہ آہستہ، تم آبگینوں کو لے کر جا رہے ہو: ''**رویدک یا انجشہ سوقک بالقواریر.**'' (**بخاری، کتاب الادب**، حدیث نمبر:

۵۸۰۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں تھے، حضرت صفیہؓ آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائیں، جب واپس ہونے لگیں تو آپ ان کو رخصت کرنے کے لیے مسجد کے دروازے تک آئے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۹۳۰، مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۷۵) یہ بھی اظہارِ محبت کا ایک انداز تھا، ازواج مطہرات کے درمیان بھی کبھی کبھی چشمک ہو جاتی تھی، یہ فطری بات ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسی تمام باتوں کا پیش آنا ضروری تھا، جن سے امت کو سابقہ پیش آسکتا ہو؛ چناں چہ ایک بار حضرت حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ کو یہودی کی بیٹی کہہ دیا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب پوچھا، انھوں نے حضرت حفصہؓ کی بات نقل کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا: تم ایک نبی (حضرت ہارون علیہ السلام) کی بیٹی ہو، ایک نبی (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کی بھتیجی ہو، اور ایک نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیوی ہو، تمہارے مقابلہ میں کیسے کوئی فخر کر سکتا ہے؟ پھر آپ نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا: اللہ سے ڈرو۔ (سنن ترمذی، باب فضل ازواج النبی، حدیث نمبر: ۳۸۹۴، بسند صحیح) — ایک سفر میں حضرت صفیہؓ آپ کے ساتھ تھیں اور اس دن ان ہی کی باری تھی، اتفاق سے سست رفتار سواری پر ان کا سفر ہوا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا تو وہ رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں: آپ نے مجھے ایک سست رفتار سواری پر بیٹھا دیا، آپ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھنے اور ان کو خاموش کرنے لگے: ''**فجعل رسول اللّٰہ یمسح بیدیہ عینیھا ویسکتھا۔**'' (**اسد الغابۃ: ۱/۱۳۶۷**)

بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک مظہر وہ بے تکلفی ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برتا کرتے تھے، جس کو آپ روا رکھتے تھے؛ چناں چہ دو موقعوں پر حضرت عائشہؓ کے ساتھ آپ نے دوڑ بھی لگائی، پہلی بار حضرت عائشہؓ آگے بڑھ گئیں، اس وقت ان کا جسم ہلکا تھا، پھر دوسری مرتبہ جب حضرت عائشہؓ کا جسم بھاری ہو گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے

بڑھ گئے، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اس کا بدلہ ہوگیا: **"ھذہ بتلک"** (**ابوداود، کتاب الجهاد**، حدیث نمبر: ۲۵۷۸) — اس بے تکلفی کا اظہار اس وقت بھی ہوتا تھا، جب کوئی نوک جھونک ہو جاتی، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضرت عائشہؓ کے درمیان کوئی بات ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تم عمر (رضی اللہ عنہ) کو حَکَم بناؤ گی؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: نہیں؛ کیوں کہ حضرت عمرؓ سخت مزاج کے آدمی ہیں، پھر آپ نے پوچھا: کیا تم اس بات سے راضی ہو کہ تمہارے والد میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کریں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا: ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو بلا بھیجا، جب حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تم بات کروگی یا میں بات کروں؟ اُمّ المؤمنین نے عرض کیا: آپ ہی بات کریں؛ لیکن صحیح صحیح بولیں، حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر بے قابو ہو گئے، اور حضرت عائشہؓ کی ناک پر تھپڑ رسید کر دیا، حضرت عائشہؓ بھاگیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ کے پیچھے چُھپنے لگیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلایا تھا، پھر جب حضرت ابوبکرؓ تشریف لے گئے تو آپ نے حضرت عائشہؓ کو قریب بلایا، مگر انہوں نے آنے سے انکار کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ابھی کچھ پہلے تو تم میری پیٹھ سے چمٹی جا رہی تھیں، پھر جب حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھا، تو فرمایا: آپ دونوں نے اپنے اختلاف میں ہمیں شریک کیا تھا، تو اپنی صلح میں بھی ہمیں شریک کرلیں: **"اشرکانی فی سلمکما کما اشرکتمانی فی حربکما۔"** (**ابوداؤد، کتاب الادب**، حدیث نمبر: ۴۹۹۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازدواجی زندگی میں اُمہاتُ المؤمنین کو روٹھنے کا حق دیتے تھے؛ تاکہ خواتین کی فطرت میں ناز کرنے کا جو وصف پایا جاتا ہے، یا وہ سمجھتی ہیں کہ ان کو شوہر سے سوال و جواب کا حق ہے، اس کی رعایت ہو اور اُمت کے لیے نمونہ مہیا ہو؛ چناں چہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنی بیوی پر غصہ کا اظہار کیا تو اہلیہ نے بھی پلٹ کر جواب دیا، حضرت عمرؓ نے اس بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ تم میری بات کا جواب

دیتی ہو؟ زوجہ محترمہ نے عرض کیا: آپ میرے اس عمل پر کیوں نکیر کرتے ہیں، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج آپ کو جواب دیتی ہیں، اور بعض تو رات تک گفتگو ترک کر دیتی ہیں؟ ''**ان احداھن لتھجرہ الیوم حتی اللیل ۔**'' (سیرت ابن حبان: ۱/۳۶۰، امیر المومنین عمر الخطاب: ۱/۶۷، حیاۃ الصحابہؓ: ۳/۵۶) ـــ پھر اگر کوئی بیوی ناراض ہوجاتیں تو آپ کا رویہ نہایت مشفقانہ، کریمانہ اور دل دارانہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مونڈھے پر دست مبارک رکھتے اور دعائیہ کلمات ارشاد فرماتے: **اللھم اغفر لھا ذنبھا و اذھب غیظ قلبھا و اعذھا من الفتن ۔** (**کنز العمال**، حدیث نمبر: ۱۸۴۰۹)

اے اللہ! ان کو معاف فرما دیجیے، ان کے دل کے غصے کو دور کر دیجیے اور ان کو فتنوں سے محفوظ رکھیے۔

ازواج مطہرات کے ساتھ بے تکلفی اور زنانہ ناز و انداز کے پاس ولحاظ کا ایک لطیف مظہر حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہے کہ ایک بار سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور جب ناراض ہوتی ہو، دونوں کو میں اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، میں نے پوچھا: آپ کیسے سمجھ لیتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: جب تم خوش رہتی ہو اور قسم کھانی ہوتی ہے تو کہتی ہو: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم! اور جب ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم! میں نے کہا: اللہ کے رسول! خدا کی قسم میں صرف آپ کا نام ہی چھوڑتی ہوں: ''**ما اھجر الا اسمک**'' (بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۴۹۳۰) یعنی یہ صرف زبان سے ہوتا ہے؛ لیکن دل میں ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر بسا رہتا ہے۔

ازواج کے ساتھ بے تکلفی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آپ بعض دفعہ ان کی آپسی نوک جھونک اور ایک دوسرے کے ساتھ تفریح سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے، اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ ایک بار حضرت سودہؓ میرے پاس آئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم دونوں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے کہ آپ کا ایک پاؤں میری گود میں تھا اور

ایک پاؤں ان کی گود میں، میں نے ان کے لیے حریرہ بنایا اور ان سے کھانے کو کہا، انہوں نے انکار کیا، میں نے کہا: یا تو آپ کھائیں یا میں آپ کے چہرے پر مَل دوں گی، انہوں نے پھر انکار کیا تو میں نے پیالے میں سے تھوڑا سا حریرہ لے کر ان کے چہرے پر مَل دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گود سے اپنا پاؤں ہٹالیا؛ تاکہ وہ بھی مجھ سے بدلہ لے سکیں؛ چناں چہ انہوں نے بھی تھوڑا سا حریرہ لے کر میرے چہرے پر بھی مَل دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کو دیکھتے اور ہنستے رہے۔ (نسائی، کتاب عشرة النساء، حدیث نمبر: ۱۹۸۷)

اسی طرح بعض اوقات ایک ہی برتن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ غسل فرماتے اور دونوں اس سے پانی لیتے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ سے فرماتے کہ تم میرے لیے پانی چھوڑ دو، اور کبھی حضرت عائشہؓ حضور سے عرض کرتیں کہ آپ میرے لیے پانی چھوڑ دیں: ''حتی یقول لها دع لی و تقول له دع لی ۔'' (مسلم، کتاب الحیض، حدیث نمبر: ۱۲۳) — کبھی کبھی آپ ازواج مطہرات سے مزاح بھی فرماتے تھے، ایک زوجہ مطہرہ نے ایسا کپڑا پہنا، جو بہت ڈھیلا ڈھالا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہنو اور اللہ کا شکر ادا کرو، اور فرمایا کہ تمہارا دامن اس طرح گھسٹ رہا ہے، جیسے لباس عروسی کا دامن ہو: ''وجری من ذیلک هذا کذیل العروس '' (کنز العمال: ۲۰۶/۷، حدیث نمبر: ۱۸۶۴۶) — حضرت عائشہؓ جب حرم مبارک میں آئیں تو کم عمر تھیں اور گڑیا بھی بناتی تھیں، انہوں نے ایک گھوڑا بنایا اور اس میں پَر بھی لگا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ کر مسکرائے اور ارشاد فرمایا: اس گھوڑے کے پر بھی ہیں؟ حضرت عائشہؓ بھی بڑی ذہین اور ذکی خاتون تھیں، کہنے لگیں: حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کے تو پَر ہوتے تھے۔ (ابو داؤد، کتاب الادب، حدیث نمبر: ۲۳۹۴)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے محبت کرنے والے شوہر تھے، جو نہ صرف بیویوں کی دل داری کا خیال رکھتے تھے؛ بلکہ ان کے کاموں میں بھی مدد فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ جب اپنے گھر میں ہوتے تو کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

گھر کے کاموں میں مدد فرماتے "**کان فی مھنة اھلہ**" (بخاری، حدیث:۶۷۶، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۸۹) ایک اور روایت میں ہے: کپڑے میں پیوند لگا دیتے، بکری کا دودھ دوہ دیتے اور عام طور پر مرد اپنے گھر میں جو کام کرتے ہیں، اسے انجام دیتے تھے: "**وکان یرقع ثوبہ ویحلب الشاۃ ویعمل ما یعمل الرجال فی بیتہ**" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۹۴۷، مسند ابی یعلی، حدیث نمبر: ۴۸۷۴)

یہ بھی معمول مبارک تھا کہ روزانہ دو دفعہ تمام ازواج مطہرات کے یہاں تشریف لے جاتے، ان کی خیریت دریافت کرتے اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزارتے، ایک تو عصر کے بعد آپ کی تشریف آوری ہوتی: "**وکان اذا صلی العصر دار علی نسائہ، فدنا منھن واستقراء احوالھن**" (**بخاری، کتاب النکاح**، حدیث نمبر: ۴۹۱۸) چناں چہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے، اظہارِ محبت کے لیے ان پر ہاتھ رکھتے اور ایسا عمل کرتے جس سے تعلق کا اظہار ہو، یہاں تک کہ آخری گھر تک پہنچتے، اور جن کی باری ہوتی، ان کے یہاں قیام فرماتے: "**قلّ یوم الا وھو یطوف علی نسائہ فیذ نومن اھلہ فیضع یدہ ویقبل کل امراء من نسائہ حتی یاتی علی آخرھن فان کان یومھا قعد عندھا**" (**ابو داؤد، کتاب النکاح**، حدیث نمبر: ۲۱۳۵) — دوسرے: فجر کے بعد مسجد میں تشریف فرما ہوتے اور صحابہؓ استفادہ کے لیے آپ کے گرد بیٹھ جاتے، پھر جب سورج طلوع ہو جاتا تو ایک ایک بیوی کے پاس تشریف لے جاتے، ان کو سلام کرتے، انہیں دعا دیتے اور جس کی باری ہوتی، ان کے پاس مقیم ہو جاتے۔ (فتح الباری: ۶۹/۱۵)

مغرب بعد معمول مبارک تھا کہ جن زوجہ مطہرہ کی باری ہوتی، آپ ان کے یہاں مقیم ہو جاتے اور تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں، کبھی کبھی ایک ساتھ اجتماعی کھانا ہوتا، جب آرام فرماتے تو جن کی باری ہوتی، ان کے حجرہ میں آرام فرماتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی بیوی کی گود میں سر رکھ کر سہارا لیتے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۴)

عورتوں میں زینت و آرائش کا جذبہ بہ مقابلہ مردوں کے زیادہ ہوتا ہے؛ اسی لیے شریعت میں انہیں سونا اور ریشم کی بھی اجازت دی گئی ہے، جس سے مردوں کو منع فرمایا گیا ہے، آپ عورتوں کے اس فطری جذبہ کا بھی پورا خیال رکھتے تھے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جب ہم واپس لوٹے اور مدینہ میں داخل ہونا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہر جاؤ، رات ہو جانے دو؛ تاکہ جن کے بال بکھرے ہوئے ہوں، وہ کنگھی کرلیں اور جسم کو صاف ستھرا کرلیں: ''**حتی تمتشط الشعثة وتستحد المغيبة**'' (**ابوداؤد، کتاب الجهاد**، حدیث نمبر: ۲۷۷۸) — حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے؟ اگر تم نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو یہ آگ کے کنگن ہیں۔ (**ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ**، حدیث نمبر: ۱۵۶۵، **ترمذی، کتاب الزکوٰۃ**، حدیث نمبر: ۶۳۷) یعنی آپ نے کنگن پہننے کو ناپسند نہیں کیا؛ بلکہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ناگواری ظاہر فرمائی، اسی طرح واقعہ افک مشہور ہے، جس میں حضرت عائشہؓ کا ایک قیمتی ہار گم ہو گیا تھا، غرض کہ باوجود اس کے کہ آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی اور ازواج مطہرات کے یہاں تعیش کا کوئی تصور نہیں تھا؛ لیکن عورتوں میں زیب وزینت کا جو فطری جذبہ ہوتا ہے، آپ نے اپنی ازواج مطہرات کے لیے اس کا لحاظ رکھا؛ تاکہ اُمت کے لیے نمونہ ہو۔

جیسے شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی اس کے لیے زیب وزینت اختیار کرے، اسی طرح بجا طور پر عورتوں کو بھی یہ چاہنے کا حق ہے کہ اس کا شوہر اس کے لیے جائز حدود میں بن سنور کر رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلمکے یہاں اس کا بھی لحاظ تھا، یوں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے حسن سے نوازا تھا، جس کی تاریخ انسانی میں کوئی مثال ہی نہیں، یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق آپ کے رخ روشن کی روشنی میں بعض ازواج مطہرات سوئی میں دھاگہ بھی پہنا لیا کرتی تھیں۔ (خصائص الکبریٰ: ۱/۱۰۹) لیکن اس کے علاوہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی آپ کو اس کا لحاظ تھا، آپ زلف مبارک میں تیل لگانے اور کنگھی کرنے کا اہتمام فرماتے،

ریش مبارک میں بھی کنگھی کرتے، صاف ستھرے کپڑے پہنتے، کبھی کبھی قیمتی لباس بھی زیب تن فرماتے؛ حالاں کہ آپ کے پسینے کی خوش بو بھی مشک سے بڑھی ہوئی تھی؛ لیکن اس کے باجود آپ عطر کا بھی بکثرت استعمال کرتے اور مسواک کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے۔

مرد ہوں یا عورت، ان میں ایک جذبہ تفریح کا بھی رکھا گیا ہے، آدمی جب نئے مقامات کو دیکھتا ہے تو اس کو نشاط حاصل ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج کے معاملے میں اس کو بھی ملحوظ رکھتے تھے اور سفر میں ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے، پھر اپنی طرف سے کسی ایک زوجہ کا انتخاب کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کیا کرتے تھے؛ قرعہ میں جن کا نام نکل آیا، ان کو ساتھ لے جاتے تھے، کبھی ایک ساتھ دو بیویاں بھی ہمراہ ہوتی تھیں: ''**کان اذ خرج اقرع بین نسائه، فطارت القرعة لعائشة و حفصة**'' (بخاری، حدیث نمبر: ۱۱۲۵، مسلم، حدیث نمبر: ۲۴۴۵) — سفر کا رفیق بنانے میں جہاں اپنے تعاون کا پہلو ہے، وہیں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے مرد تفریح کے لیے جاتے ہیں، جائز حدود میں بیویوں کے لیے بھی اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

مخلص شریکِ زندگی وہی ہے جو سکھ کے ساتھ ساتھ دکھ میں بھی شریک ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا، جس سال اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال کو ''عام الحزن'' (غم کا سال) قرار دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُمّ المؤمنین کی علالت کے زمانے میں آپ نے کس قدر محبت و غمگساری کا معاملہ فرمایا ہوگا، اسی طرح جب اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ منافقین کے تہمت لگانے کے صدمہ سے بیمار ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کی خیریت دریافت کرتے رہتے، اور جب وہ اپنے والدین کے گھر چلی گئیں، ان کے گھر جاکر عیادت کی، آپ خبر گیری کرنے کے ساتھ ساتھ اہل خانہ میں سے بیماروں کو دعا پڑھ کر دم بھی فرمایا کرتے تھے؛ چناں چہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب آپ کے اہل خانہ میں سے کوئی بیمار ہوتا تو آپ اس پر معوذات پڑھ کر پھونکتے تھے: ''**کان اذا مرض احد من**

اهل بيته نفث عليه بالمعوذات۔" (مسلم، كتاب السلام، حدیث نمبر:۲۱۹۲)

بیوی کا ایک اہم حق اس کی مالی ذمہ داریاں ہے، جس کو اسلام نے شوہر پر لازم قرار دیا ہے، عام طور پر لوگ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کو ثواب کا کام نہیں سمجھتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی کی اور ارشاد فرمایا: بہترین صدقہ وہ دینار (سونے کا سکہ) ہے، جو تم اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے ہو: "**اعظم الصدقة دينار تنفقه على اهلک**" (مسلم، حدیث نمبر:۱۱۳۲) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنی بیوی کو پانی پلائے تو اس میں بھی اجر ہے: "**ان الرجل اذا سقى امراته من الماء اجر**" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۱۹۵) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب فدک کے باغات سے کھجوریں آتیں تو آپ تمام ازواج مطہرات کو ان کی ضرورت کے بقدر نفقہ عطا فرما دیتے۔ (**المغازی**:۱۷۳/۱) لیکن چوں کہ آپ کو اپنی زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی عملی نمونہ پیش کرنا تھا، جو معاشی اعتبار سے کمزور ہوں؛ اس لیے آپ کی زندگی بہت سادہ ہوتی تھی، اور ازواج مطہرات پوری خوش دلی کے ساتھ اس میں آپ کا تعاون کرتی تھیں، جب وسعت پیدا ہوئی، خوش حالی آئی اور لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہوا تو ازواج مطہرات کو بھی خیال ہوا کہ اب ہمارے گھر میں بھی اس خوش حالی کا اثر آنا چاہیے؛ چناں چہ انہوں نے اجتماعی طور پر آپ سے اس کا مطالبہ کیا، آپ اس پر ناراض نہیں ہوئے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں تنبیہ کی گئی اور ان کو اختیار دیا گیا کہ اگر چاہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہونے سے مشرف رہیں یا الگ ہو جائیں، ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ خدانخواستہ اس لیے نہیں تھا کہ انھیں حضور کی رفاقت عزیز نہیں تھی؛ بلکہ انہوں نے گنجائش دیکھتے ہوئے ایک جائز حق کا مطالبہ کیا تھا؛ اس لیے تمام ہی ازواج اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو گئیں اور انہوں نے آپ کی رفاقت کو ترجیح دی، آپ کی حیاتِ طیبہ میں اس طرح کے واقعات اللہ کی طرف سے اس لیے پیش آئے؛ کہ جو مسائل آئندہ پیش آئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ان کا نمونہ موجود ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات سے بعض اہم امور میں مشورے بھی فرماتے

تھےاوران کے مشوروں کواہمیت دیتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہؓ کواحساس تھا کہ یہ صلح مشرکین مکہ کی شرطوں پر ہوئی ہے، اور ایک طرح سے مسلمانوں نے اپنی شکست کوتسلیم کرلیا ہے، اس لیے دینی حمیت کے تحت ان کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اعلان کردینے کے باوجود کہ ''احرام کھول دیا جائے'' صحابہؓ نے احرام نہیں کھولا، وہ چاہتے تھے کہ عمرہ کرکے ہی واپس ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ سے صورتِ حال بیان کی، حضرت اُمّ سلمہؓ نے عرض کیا: آپ کسی سے کچھ کہیں نہیں؛ بلکہ خود باہر نکل کر اپنے جانور کی قربانی کردیں اور بال مونڈانے والے کو بلاکر بال مونڈالیں، آپ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا اور اسی پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہؓ نے بھی اپنے جانوروں کی قربانی کردی، بال منڈالیا اور احرام کھول دیئے۔(**بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحه مع اهل الحرب وكتابة الشروط**، حدیث نمبر:۱۸۵۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا بھی پورا خیال رکھتے تھے کہ ازواج مطہرات کو آپ کے ذریعہ کوئی تکلیف نہ پہنچے، حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بیوی یا خادم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، کبھی ان کے رخسار پر تھپڑ نہیں لگایا، نہ آپ کسی کو برا بھلا کہتے تھے، نہ ترش زبانی کرتے تھے، نہ سخت دل تھے: ''**ما ضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم امراة له ولا خادماً ولا ضرب بيده شيئاً قط** ''(ابوداؤد، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۲۱۲۴، نسائی، کتاب عشرۃ النساء، حدیث نمبر: ۴۶۱۹)—اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ ہمیشہ بیویوں کے درمیان عدل کا خیال فرماتے تھے، جس دن جس کی باری ہوتی، اس کے یہاں قیام فرماتے، ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے: ''**كان لا يفضل بعضنا على بعض فی مكثه عند هن فی القسم**'' (ابوداؤد، **کتاب النکاح**، حدیث نمبر: ۲۱۳۵) یہاں تک کہ مرض وفات میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقلی دشوار ہونے لگی تو آپ نے دوسری ازواج مطہرات کی اجازت سے حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام فرمایا۔

سفر میں ازواج مطہرات کو ساتھ رکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ آپ کو سہولت ہو، صلاحیت وقوت کے لحاظ سے بعض عورتیں سفر کی رفاقت کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں؛ اس لیے آپ چاہتے تو اپنی طرف سے کسی زوجہ مطہرہ کو نامزد فرما دیتے؛ لیکن آپ اپنی طرف سے نامزد کرنے کے بجائے ہمیشہ قرعہ اندازی فرماتے اور قرعہ اندازی میں جس کا نام نکل آئے، ان ہی کو اپنے ساتھ لے جاتے؛ تاکہ دوسری ازواج کو یہ احساس نہ ہو کہ آپ کی ان کی طرف رغبت نہیں ہے۔

عدل وانصاف کے معاملے میں احتیاط کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ کی ذہانت اور صلاحیت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کی طرف زیادہ رغبت تھی، تو اگرچہ ظاہری سلوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے؛ لیکن قلبی جھکاؤ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں جس چیز کا مالک ہوں، یہ اس میں میری (مساویانہ) تقسیم ہے؛ لیکن خداوندا! جس چیز کے آپ مالک ہیں، میں مالک نہیں ہوں، اس کے بارے میں آپ گرفت نہ فرمائیے: "**ھذا قسمی فی ما املک فلا تلمی فیما تملک ولا املک**" (ترمذی، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۱۱۴۰)

جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کی ضروریات اور ان کی دل داری کا خیال رکھتے تھے، اسی طرح آپ ان کی تربیت پر بھی متوجہ رہتے تھے، رمضان المبارک کے اخیر عشرے میں ازواج مطہرات کو آخر شب میں بیدار کرتے تھے؛ تاکہ وہ عبادت میں شامل ہوں: "**کان یوقظ اھلہ فی العشر الاواخر من رمضان**" (ترمذی، کتاب الصوم، حدیث نمبر: ۷۹۵) حضرت عائشہؓ کو شب قدر کی دعا سکھائی: "**اللّٰھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی**" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۸۵۰) ــــ ایک موقع پر حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ گن کر خرچ نہ کرو؛ تاکہ تم کو بھی اللہ کی طرف سے حساب کتاب سے گن کر نہ ملے، یعنی خوب خرچ کرو؛ تاکہ اللہ کی طرف سے خوب ملے: "**انفقی ولا توکی فیوکیٰ علیک**" (بخاری، کتاب الھبۃ، حدیث نمبر: ۱۵۴۲)

جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو عبادت کی تلقین فرمائی، وہیں غلو سے منع بھی فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب بنت جحشؓ کے یہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان رَسّی باندھی ہوئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سبب پوچھا، عرض کیا گیا: یہ حضرت زینب نے باندھ رکھی ہے، جب نماز پڑھنے کے دوران تکان ہوجاتی ہے تو اس سے لٹک جاتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور حکم دیا کہ اسے کھول دو، جب تک نشاط ہو، اُس وقت تک نماز پڑھو، اور جب نشاط نہ ہو چھوڑ دو۔

(بخاری، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ، حدیث نمبر:١٠٩٩)

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسانیت کے لیے آئیڈیل تھے، اسی طرح اپنی ازدواجی زندگی میں بھی ایک محبت کرنے والے شفیق و کریم، قدردان ومزاج شناس اور بردبار و ذی فہم شوہر تھے؛ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے نمونہ تھے اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کا ریکارڈ بھی اللہ کی طرف سے محفوظ ہوگیا، اور اللہ تعالیٰ بے حد رحمتیں نازل فرمائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں اور امت کی محسن ماؤں پر کہ انھوں نے قیامت تک آنے والے صاحب ایمان بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اسوہ کو پیش فرمایا اور نجی زندگی کی جو باتیں نقل کی جاسکتی تھیں، ان کو بھی ذکر کرنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ رضی اللہ عنھن!

اظہارِ محبت کا صحیح طریقہ

ربیع الاوّل کا مہینہ شروع ہو چکا ہے، اسی مہینے میں آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، اسی ماہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور اسی ماہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم آخرت کی طرف کوچ فرمایا، اس طرح اس ماہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے ایک خاص مناسبت ہے، یوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی دن اور کوئی لمحہ ایسا نہ ہو، جب اس کے دل کی دنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے آباد نہ ہو؛ لیکن حیاتِ محمدی سے اس ماہ کی خصوصی نسبت کی وجہ سے عام طور پر اس موقع پر زیادہ جلسے کیے جاتے ہیں، اخبارات و رسائل کے نمبرات نکلتے ہیں اور مختلف طریقوں پر سیرتِ طیبہ کے تذکرہ کو تازہ کیا جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ صرف ایمان لانا ضروری ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کی بے انتہاء عظمت اور تمام چیزوں سے بڑھ کر محبت ہمارے دلوں میں ہو، یہ محبت ہمارے ایمان کا جزو اور ہمارے دین کی اساس ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ اس امت کے دل میں آپ کی محبت کا جو غیر معمولی جذبہ کارفرما ہے، دوسرے مذاہب کے متبعین میں اپنے پیشواؤں سے متعلق اس کا سوواں حصہ بھی نہیں ملتا، اور کیوں نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے بعد ہر مسلمان کے لیے آپ ہی کی ذات سب سے محبوب ترین ہستی ہے، اس کو اپنے وجود سے بھی بڑھ کر آپ سے محبت ہے اور اگر اس کا سینہ اس جذبہ سے خالی ہو تو وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہے گا۔

محبت کے تقاضوں میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ انسان محبت کا اظہار کرے، اللہ اور رسول کی محبت تو مؤمن کے لیے معراج ہے؛ لیکن انسان تو دنیا میں بھی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے اِظہارِ محبت کے بغیر چین نہیں ملتا؛ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا فطری تقاضہ آپ سے محبت کا اظہار بھی ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اِظہارِ محبت کا طریقہ کیا ہو؟ — محبوب کے لحاظ سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے، انسان کو اپنے والدین سے بھی محبت

ہوتی ہے اور اولاد سے بھی، استاذ اور شیخ سے بھی محبت ہوتی ہے اور شاگرد و مرید سے بھی، شوہر و بیوی بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اور دوستوں میں بھی باہم محبت کا تعلق ہوتا ہے؛ لیکن ہر جگہ اِظہارِ محبت کا ایک ہی انداز نہیں ہوتا، اِظہارِ محبت میں دو باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے، محبوب کا مقام و مرتبہ اور محبوب کی پسند، مقام و مرتبہ کا لحاظ بے حد ضروری ہے، ایک شخص اپنے بچوں سے پیار کرتے ہوئے محبت کے جو بول بولتا ہے اور جو طریقۂ کار اختیار کرتا ہے، اگر وہی الفاظ اپنے ماں باپ سے کہے اور وہی طریقہ ان کے ساتھ اختیار کرے تو یہ محبت کی بجائے بے ادبی اور گستاخی ہو جائے گی، اسی طرح کسی شخص کو جو شئے پسند نہ ہو، آپ اس کی پسند و ناپسند کی پرواہ کیے بغیر اس کی ناپسندیدہ شئے بطورِ اِظہارِ محبت کے اس کے سامنے پیش کر دیں تو یا تو اسے بے وقوفی سمجھا جائے گا یا تمسخر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے اظہار میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، ہمارے بعض شعراء نعتیہ اشعار کچھ اس طرح کہتے اور پڑھتے ہیں کہ جیسے اپنی محبوبہ کے گیسو و عارض کی تعریف کر رہے ہوں اور اس کے سراپا کا نقشہ کھینچ رہے ہوں، ظاہر ہے کہ یہ اِظہارِ محبت کا ناشائستہ طریقہ ہے، اخبارات میں ایک طرف ایسا اشتہار ہوتا ہے، جس کا تعلق ملبوسات کی دکان سے ہے اور جس میں نیم عریاں شکل میں آنچل لہراتی ہوئی ایک عورت کھڑی ہوئی ہے اور ٹھیک اسی کی پشت پر یا اوپر نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ذکر ہے، سوچیے کیا یہ بے ادبی نہیں ہے؟ کاغذ کی ایسی جھنڈیاں تیار کی جائیں، جن پر کلمہ طیبہ ہو اور جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام ہو اور یہی جھنڈیاں چند دنوں کے بعد زمین میں قدموں سے پامال کی جائیں، کیا یہ بے احترامی نہیں ہے؟ اِظہارِ محبت کے نام پر کتنی ہی ایسی حرکتیں کی جاتی ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کے خلاف ہیں۔

بہت سی باتیں جو اختیار کی جاتیں ہیں، وہ ایسی ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے، آپ نے کسی بھی انسان کو تکلیف پہنچانے کے عمل سے منع فرمایا، آپ نے درخت کو کاٹنے سے منع فرمایا؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے انسان سایہ سے محروم ہوتا ہے اور

ماحولیاتی توازن متأثر ہوتا ہے، آپ نے گھر کی نالی راستے پر نکالنے سے روکا؛ تاکہ تعفن پیدا نہ ہو، آپ نے راستہ میں کچرا اور تکلیف دہ چیزیں ڈالنے سے منع فرمایا، یہاں تک کہ ارشاد ہوا کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی ایمان میں داخل ہے: ''**وادناھا اماطة الاذی عن الطریق**'' (**صحیح مسلم، باب شعب الایمان**، حدیث نمبر:١٦٢) تکلیف دہ چیزوں میں راستہ کی رکاوٹ بھی ہے، راستہ میں ایسی چیزیں رکھ دینا کہ ٹریفک کا بہاؤ متأثر ہو جائے، اس طرح کھڑا ہو جانا کہ چلنے والوں کے لیے رکاوٹ پیدا ہو جائے اس اذیٰ (تکلیف دہ چیز) میں داخل ہے، جس کے ہٹانے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

ایسی ریکارڈ نگ لگانا کہ محلّہ کے لوگوں کے لیے سونا دشوار ہو جائے یا بیماروں کو تکلیف ہونے لگے، ایذا ہی کی ایک شکل ہے، حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت کسی جگہ جاتے تو ایسی آواز میں سلام فرماتے کہ جو لوگ بے دار ہوں وہ سن لیں اور جو لوگ سوئے ہوئے ہوں، ان کی نیند میں خلل واقع نہ ہو: ''**فیجیء من اللیل فیسلم تسلیما لا یوقظ نائما ویسمع یقظان**'' (مسلم، حدیث نمبر:٢٠٥٥) یہاں تک کہ آپ نے قرآن مجید بھی بہت اونچی آواز میں پڑھنے کو پسند نہیں فرمایا، حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، آپ نے صحابہؓ کو زور زور سے قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا تو پردہ ہٹایا اور فرمایا کہ تم سب اپنے پروردگار سے سرگوشی کر رہے ہو؛ لہٰذا ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے سے آواز بلند نہ کرو: ''**الا ن کلکم مناج ربکم فلا یوذین بعضکم بعضا، ولا یرفع بعضکم علی بعض فی القراة**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر:١٣٣٢) آپ نے تکبیر کہنے میں بھی بہت بلند آواز کو پسند نہیں فرمایا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جب ہم بلندی پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے، آپ نے فرمایا: تم لوگ اپنے آپ پر نرمی سے کام لو، تم کسی ایسی ذات کو نہیں بلا رہے ہو، جو سنتا نہ ہو یا موجود نہ ہو؛ بلکہ اس خدا کو پکار رہے ہو، جو خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا اور تم سے قریب ہے: ''**لا**

تدعون اصم ولا غائبا تدعون سمیعا بصیرا قریبا" (بخاری، حدیث نمبر: ٦٨٣٨، مسلم، حدیث نمبر: ٢٧٠٤) اس سے معلوم ہوا کہ ایسے ریکارڈ بجانا کہ جس کی آواز لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہو اور جلسوں کے اسپیکر اتنی دور دور تک پھیلا دینا کہ لوگوں کی نیند میں خلل ہو جائے، ایسے طریقے ہیں جو ہمارے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فضول خرچی نہایت ناپسند تھی، قرآن مجید میں تقریباً بیس آیتوں میں فضول خرچی کو منع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھانے اور کپڑے ہی میں نہیں؛ بلکہ صدقہ کرنے میں بھی اسراف نہ ہونا چاہیے: "**کلوا وتصدقوا والبسوا فی غیر اسراف**" (**نسائی عن عبد اللہ بن عمروؓ**، حدیث نمبر: ٢٣٩٩) —— صدقہ میں اسراف کا مطلب یہ ہے کہ کسی خیر کے کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا جائے، یا اتنا خرچ کر دیا جائے کہ خود دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے حالات پیدا ہو جائیں، فضول خرچی کی دو صورتیں ہیں: کسی جائز کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے یا کسی بے جا کام میں خرچ کیا جائے —— اب غور کریں تو ربیع الاوّل میں اِظہارِ مسرت کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان میں بعض صورتیں یقیناً فضول خرچی کے دائرے میں آجاتی ہیں، یہ اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کرنے والی بات ہے نہ کہ ان کو خوش کرنے والی۔

ایک بات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی ناپسند تھی، وہ ہے غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنا، یوں تو آپ لباس و پوشاک اور تہذیب و تمدن میں بھی غیر مسلموں کی مماثلت کو ناپسند فرماتے تھے؛ لیکن خاص کر دینی امور میں تو آپ کو یہ بات حد درجہ ناپسند تھی؛ چناں چہ آپ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی اور قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ ان ہی میں شامل ہے: "**من تشبہ بقوم فھو منھم**" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ١٣٠٤) آپ نے سورج کے نکلنے، سورج کے نصف آسمان پر رہنے اور سورج کے ڈوبنے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا؛ اس لیے کہ جو قومیں آفتاب کی پرستار تھیں، وہ ان ہی اوقات میں آفتاب کی پوجا کیا کرتی تھیں،

یہودی دیر سے روزہ افطار کرتے تھے تو آپ نے اپنی امت کو افطار میں عجلت کا حکم دیا، یہودی دس محرم کو روزہ رکھتے تھے، تو آپ نے اس کے ساتھ مزید ایک روزہ ملا کر روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ٧٦٠) اگر اس پس منظر میں دیکھیں تو دیپ جلانا، چراغاں کرنا ہندوؤں کا شعار ہے، وہ چراغ جلا کر دیوالی مناتے ہیں اور اس سے ان کا ایک مذہبی تصور متعلق ہے، عیسائی حضرات کرسمس کے موقع پر پنج پہلو ستاروں کی شکل میں روشنی کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کے یہاں بھی اس سے ایک مذہبی تصور متعلق ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تربیت یافتہ صحابہؓ نے کسی اسلامی تقریب کے لیے اس کی دعوت نہیں دی یا اس طرح کا عمل نہیں کیا، اسی طرح رنگ پھینکنا ہندوؤں کا طریقہ رہا ہے اور وہ اس کے لیے مستقل طور پر ہولی کا تہوار مناتے ہیں، اسلام میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکنے کا کوئی تصور نہیں ہے، غور کیجیے کہ کہیں ہم غیر مسلموں کے مذہبی اور تہذیبی شعائر کی طرف تو قدم بڑھاتے نہیں جا رہے ہیں؟

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات چھپی ہوئی نہیں ہے؛ بلکہ وہ روشن آفتاب کی طرح ہم سب کے سامنے ہیں، ہم ان کو پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند و ناپسند کو جان سکتے ہیں، اور اس کی ترازو میں اِظہارِ محبت کے ان طریقوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں، جن کو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

ہم اس ماہ میں ضرور اپنی خوشی کا اظہار کریں؛ لیکن طریقہ ایسا ہو کہ وہ شریعت کی میزان میں بھی درست ہو اور اس سے دینی نفع بھی ہو۔

اِظہارِ مسرت کا ایک بہتر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ اس یادگار مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے پڑھنے اور اپنی نئی نسل تک اس کو پہنچانے کا اہتمام کریں، اللہ کا شکر ہے کہ ہر زبان میں سیرت کا لٹریچر موجود ہے، یہ کتابیں مختصر بھی ہیں، متوسط ضخامت کی بھی ہیں اور ضخیم بھی ہم خود ان کا مطالعہ کریں اور اپنے مطالعہ کو نئی نسل تک پہنچائیں، خواتین اور بچوں کو سنائیں، آج صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں، اسکولوں، کالجوں اور

یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اولاد اور پاک بیویوں کے نام تک یاد نہیں، اگر ان سے آپ کے صحابہؓ کا نام دریافت کیا جائے تو چاروں خلفاء کے بعد کم لوگ ہوں گے جو کسی پانچویں صحابی کا نام بتاسکیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دس بیس واقعات بھی ان کو معلوم نہیں ہیں، کیا یہ بات محبت کے تقاضے میں داخل نہیں ہے کہ انسان اپنے محبوب کو جانے، پہچانے اور دوسروں سے اس کا تعارف کرائے؟ پس آیئے کہ اس مہینے کو ہم لوگ سیرت کے پڑھنے اور اپنی نئی نسل تک سیرتِ نبوی کو پہنچانے کا مہینہ بنائیں، اس کے لیے ایک منصوبہ بنائیں، کوئز پروگرام منعقد کریں اور بچوں کو انعام دے کر انھیں سیرتِ نبوی سے واقف کرائیں۔

اِظہارِ محبت کا دوسرا مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت نواز تعلیمات کو پہنچائیں، اس وقت مغرب کی جانب سے ایک منظّم کوشش کی جارہی ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی توہین کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جارہے ہیں، جب اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں تو ہم لوگ احتجاج کرتے ہیں اور ہم اس احتجاج میں حق بجانب بھی ہیں؛ لیکن یہ اس مسئلہ کا پائے دار اور مستقل حل نہیں ہے، اس کا اصل حل یہ ہے کہ غیر مسلموں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پہنچائی جائے، خاص کر آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی بلند اخلاقی کے واقعات اور انسانیت نواز تعلیمات کو عام کیا جائے، مقامی زبانوں میں سیرت کا لٹریچر زیادہ سے زیادہ مقدار میں شائع کیا جائے اور ایک ایک غیر مسلم تک اس کو پہنچانے کی کوشش کی جائے، اگر ہر صاحب استطاعت مسلمان یہ طے کرلے کہ وہ انگریزی، ہندی یا ہندوستان کی کسی مقامی زبان میں موجود سیرت کی کتاب کے ایک سو تا ایک ہزار نسخے اپنے غیر مسلم برادران وطن تک پہنچائے گا، ہاسپٹل جاکر مریضوں میں، ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈوں پر جاکر مسافروں میں، اسکولوں اور کالجوں میں جاکر اساتذہ اور طالبات میں تقسیم کرے گا، تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم سے محبت کا حقیقی اظہار ہوگا، اس طرح غلط فہمیوں کے بادل چھٹیں گے، لوگ آپ کی ہستی کو پہچانیں گے اور آپ کی محبت وعظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوگی۔

اِظہارِ محبت کا تیسرا طریقہ — جس کی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے — درود شریف کی کثرت ہے، گھروں میں ایسا ماحول بنایئے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھیں، ہر مسلمان خاندان طے کریں کہ کم سے کم اس ماہ میں ہم سب مل کر ایک لاکھ دفعہ درود شریف پڑھیں گے اور آئندہ بھی سہولت کے لحاظ سے اس کا سلسلہ جاری رکھیں گے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی احسان شناسی کا مناسب اظہار ہوگا؛ کیوں کہ امت کا درود شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور درود کی یہ کثرت ان شاء اللہ آخرت میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں حصہ دار بنائے گی۔

اگر ہم سیرت کا پیغام مسلمانوں تک پہنچا کر، غیر مسلموں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے واقف کرا کر اور درود شریف کی کثرت کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و تعلق کا اظہار کریں تو یہ اِظہارِ محبت کی کتنی بہتر، مفید اور ثمر آور صورت ہوگی، کاش! ہم ٹھنڈے دل سے اور دینی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر غور کریں۔

سیرت رسول کی روشنی میں موجودہ حالات کا حل

مسلمانوں پر مصائب کا آنا اور مسائل کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ خدا کی سنت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تیرہ سالہ مکی دور اور ہجرت کے بعد مدینہ میں آٹھ سال یعنی اکیس سالوں تک اس قسم کے مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے، اس زمانے میں مسلمانوں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام پر خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ مسلمان باقاعدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رات میں نگرانی کیا کرتے تھے، اور صحابہ کرامؓ بغرضِ حفاظت ہتھیار ساتھ رکھ کر سوتے تھے، نیز شعب ابی طالب کی قید و بندش اور مختلف مواقع سے کفار کا حملہ آور ہونا اسی رودادِ غم والم کی داستان ہے، قرآنی الفاظ ”من الخوف و الجوع“ میں جوع سے صرف بھوک ہی مراد نہیں ہے بلکہ وہ تمام وسائل معاش اس میں شامل ہیں جن سے زندگی وابستہ ہے؛ جیسے سرکاری و غیر سرکاری نوکریاں، بزنس وتجارت، اچھی تعلیم کے ذریعے اونچے عہدوں کا حصول وغیرہ۔

دنیا میں مسلمانوں پر مصیبت آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسلمان اللہ کی نظر سے گر گیا ہے، یا اس امت کی مقبولیت ومحبوبیت میں کمی آگئی ہے؛ بلکہ ان مصائب پر صبر و استقامت کے ذریعے مزید مقبول ہوا جا سکتا ہے، ایک عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی خیر خواہی کے لیے جو چیز بھی مناسب ہوتی ہے انجام دیتا ہے۔

ایسے حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز صبر و استقامت ہے اور صبر و استقامت صرف عبادات ہی میں نہیں بلکہ تمام دینی احکام میں مطلوب ہے، ہمارا ایمان دین کے معاملے میں اتنا پختہ اور مضبوط ہونا چاہیے کہ دین کے ادنیٰ سے ادنیٰ حکم کے بارے میں ہمارے دل و دماغ میں شک وشبہ کا کانٹا باقی نہ رہے، بلکہ شریعت کا ہر حکم اور دین کی ہر بات دل وجان سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے کہ یہی اصل ایمان کا تقاضہ ہے، ہمیں اپنے مسائل علماء کرام مفتیان عظام اور قاضیوں سے حل کرانا چاہیے، ان کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں سنت رسول ہے غیروں کے پاس اپنے مسائل لے کر جانے ہی سے

سارے مسائل کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جتنے مسائل اس وقت مسلمانوں کے عدالت میں چل رہے ہیں ان سب کے قصوروار ہم ہی ہیں، غیر مسلموں نے وہ معاملات عدالت تک نہیں پہنچائے ہیں۔

آج کل کا ماحول یقیناً ہمارا ساتھ نہیں دیتا، لیکن پھر بھی دو باتیں نہایت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک بچوں کے ساتھ وقت گزار کر ان کی صحیح دینی تربیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے دین اور پیغام سے شناسائی۔ دوسرے تعلیمی میدان میں دینی و اسلامی اسکول کھول کر ان میں دینیات کا اضافہ۔ کیوں کہ بچوں کے دل کی تختی بالکل سادہ ہوتی ہے جو اس پر لکھ دیا جائے وہ نقش ہو جاتا ہے۔

اسی طرح موجودہ حالات میں ہمت نہیں ہارنا چاہیے، ہمت شکنی بہت بری بلا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت سے سخت حالات میں بھی اپنے صحابہؓ کی ہمت بندھائی، جنگ احد کے موقع پر شکست کے باوجود آپ نے دشمن کا تعاقب کرنے کے لیے ایک جماعت بھیجی؛ جس کا مقصد دشمن پر اپنی جرأت کے اِظہار کے ساتھ صحابہ کرامؓ سے حوصلہ شکنی کی کیفیت کو دور کر کے ہمت بڑھانا بھی تھا، اسی طرح ایک مرتبہ کچھ صحابہؓ کسی معرکہ سے واپس آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے میں ہچکچا رہے تھے اور ملاقات کے وقت پشیمانی سے کہا "نحن الفرارون" کہ ہم بھاگے ہوئے لوگ ہیں تو آپ نے دل بستگی کی اور ہمت بڑھاتے ہوئے کہا "بل انتم کرارون" نہیں بلکہ تم لوگ پیچھے ہٹ کر دوبارہ حملہ کرنے والے ہو آپ نے ہمیشہ حوصلہ برقرار رکھا۔

ہمیں ہر ایک سے اپنے تعلقات استوار کرنا چاہیے اور اپنی رواداری اور برادرانہ تعلقات کا مظاہرہ کرنا چاہیے، ہر ایک کی خدمت اور مدد کرنا چاہیے، جس طرح ایک مسلمان کو پانی پلانا کارِ ثواب ہے، اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی پلانا ثواب کا کام ہے، آپ صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی میں ایسی رواداری اور خدمت خلق کے ہزاروں نمونے موجود ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کی ان کی دشمنی کے باوجود قحط کے زمانے میں غریب مسلمانوں سے

پانچ سو دینار جمع کر کے ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کے پاس غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے بھیجا، آپ نے کافروں کے لیے اپنا بستر اور تکیہ بھی پیش کر دیا، فتح مکہ کے معاً بعد کافروں کو کھانے کی دعوت بھی دی، یہ نمونے اس بات کے لیے کافی ہیں کہ خدمت خلق میں اپنے اور غیر میں تمیز نہیں کرنی چاہیے، ہم اگر خدمت کے ذریعے ان کا دل جیت لیتے ہیں تو ہماری فتح کے لیے دوسرے ہتھیار کی ضرورت نہیں۔

مسلمان فاتحین نے اپنی مفتوح قوموں پر اتنا گہرا اخلاقی اثر ڈالا کہ ان کی فوجیں وہ اثر نہ ڈال سکیں، محمد بن قاسم جب سندھ فتح کر کے گئے تو وہاں کے لوگ ان کی مورتی بنا کر دو سو سال تک ان کی پوجا کرتے رہے، یہ صرف اور صرف ان کی رواداری اور اخلاق کا نتیجہ تھا۔ نفرت کا جواب نفرت سے دینا دانش مندی نہیں ہے، اس آگ کو محبت کے پانی سے ہی بجھایا جا سکتا ہے، آگ کو آگ سے بجھانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس لیے ہم تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ حالات کو سمجھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی میں موجود نمونوں سے کام لیں اور اپنے اعمال کو صحیح کرنے کی فکر میں لگے رہیں، کیوں کہ مصیبت ہمیشہ نہیں رہتی اس کا خاتمہ جلد ہی ہو کر رہے گا بقولِ جگر:

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں!

صحابہؓ اور اہل بیتؓ کے باہمی تعلقات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے مصطفیٰ اور مجتبیٰ یعنی چنے ہوئے تھے، اللہ نے نبوت کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا تھا، جیسے اللہ نے آپ کو نبوت جیسی عظیم ذمہ داری کے لیے منتخب فرمایا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور صحبت کے لیے بھی انسانیت کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص کا انتخاب ہوا، اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کی صحابیت کے لیے منتخب فرمایا ہے "**اختارھم اللّٰہ لصحبة نبیہ**" اسی طرح اللہ کی جانب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور پاک بیویاں بھی سرد و گرم کی رفاقت اور امت کے لیے خانگی اور نجی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لیے اللہ کی جانب سے منتخب تھے، ان ہی اہل بیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیاں تھیں اور ان صاحب زادیوں میں آپ کی چہیتی اور چھوٹی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین جنت کی سردار قرار دیا اور جن کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی گواہی ہے کہ آپ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہؓ سے تھی، حضرت فاطمہؓ اپنے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھیں اور آپ پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا کہ عہد صحابہؓ میں بھی شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔

حضرت فاطمہؓ کے شوہر چوتھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علیؓ تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی اعتبار سے قریب ترین تعلق رکھنے کے علاوہ اسلام میں سبقت سے مشرف تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جس کا دوست ہوں، علی اس کے دوست ہیں، گویا حضرت علیؓ سے تعلق اور محبت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کا معیار بنایا، اہل سنت والجماعت کے معتبر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد میں کچھ یہودیوں کی سازش سے جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، اس میں حضرت علیؓ حق پر تھے؛ چناں چہ حضرت علیؓ کے مخالفین کو حدیث میں "فـئـة

باغية'' (باغی گروہ) قرار دیا گیا۔

حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحب زادے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پیدا ہوئے، جو باحیات رہے اور ان ہی دونوں حضرات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا، یہ روایت اہل سنت کے یہاں کثرت سے منقول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو پکڑتے اور کہتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت کیجیے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۴۷) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو مجھ سے محبت ہوگی، وہ ان دونوں سے محبت رکھے گا۔ (مجمع الزوائد، عن ابی ہریرةؓ: ۱۸۰/۹) عجیب بات ہے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو جسمانی طور سے بھی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مماثلت تھی؛ چناں چہ جب حضرت حسینؓ کی شہادت ہوئی تو صحابہؓ اور صالحین کو ناقابل بیان صدمہ پہنچا، حضرت ام سلمہؓ کو جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع پہنچی، تو اہل عراق پر لعنت بھیجی اور ان کے لیے ہلاکت کی دعاء فرمائی۔ (مجمع الزوائد: ۱۹۴/۹) امام ابراہیم نخعیؒ نے خوب فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں قاتلان حسین میں سے ہوتا اور میری مغفرت کردی جاتی، نیز میں جنت میں داخل کیا جاتا تب بھی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا کرنے سے شرم محسوس ہوتی۔ (حوالہ سابق: ۱۹۵/۹)

حقیقت یہ ہے کہ اہل بیت سے محبت کے بغیر کوئی ایسا شخص رہ ہی نہیں سکتا، جو واقعی مسلمان ہو اور جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا کوئی درجہ حاصل ہو، صحابہؓ چوں کہ سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے اور آپ کی نسبت پر وارفتہ تھے، اس لیے اہل بیت سے ان کو خاص تعلق تھا، بنی اُمیہ کا حکمراں مروان ایک بار حضرت ابوہریرةؓ سے کہنے لگا کہ جب سے ہمیں آپ کی رفاقت حاصل ہوئی ہے، مجھے آپ کی کسی بات سے ناگواری نہیں، سوائے اس سے کہ آپ حسن وحسین رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے ہیں، حضرت ابو

ہریرہؓ سمٹ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز سنی، حضرت فاطمہؓ بھی ساتھ تھیں، آپ تیز تیز چل کر وہاں پہنچے اور فرمایا کہ ہمارے بیٹوں کو کیا ہوا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا کہ یہ پیاسے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشکیزے میں دیکھا تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء سفر سے پانی کے بارے میں فرمایا تمام ہی لوگ پانی کے برتن کی طرف لپکے؛ لیکن اتفاق کہ کسی کے پاس پانی موجود نہیں تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باری باری حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو اپنی زبان مبارک کو چسایا، جب انہیں سکون ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا، حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ اسی لیے میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں۔ (طبرانی بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۹/۱۸۰) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ گلشن محمدی کے ان غنچہ ہائے سدابہار اور گل ہائے مشک بار سے کیسی محبت رکھتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کا خوف بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہوتا تھا۔

لیکن کیا حضرات حسنینؓ سے امت کی یہ محبت اور دربار رسالت مآب میں ان کا یہ درجہ ومقام صرف اسی وجہ سے تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؟ — یقیناً یہ نسبت بھی اس محبت میں کارفرما ہے؛ لیکن اس سے بڑھ کر حضرات حسنینؓ کا اسوہ اور ان کا کردار ہے، جو قیامت تک کے لیے نقش لافانی ہے، حضرت ابوبکرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر اقدس پر تھے اور آپ کے پہلو میں حضرت حسنؓ تھے، آپ ایک دفعہ لوگوں کی طرف دیکھتے اور ایک دفعہ حضرت حسنؓ کی طرف اور ارشاد فرماتے: میرا یہ بیٹا سید (سردارِ امت) ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۳۷۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب خلیفہ راشد سیدنا حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اہل شام حضرت معاویہؓ کی کمان میں آگے بڑھے اور ادھر

اہل حجاز اور اہل عراق حضرت حسن بن علیؓ کی قیادت میں، عام طور پر صحابہؓ اور اکابر تابعینؒ حضرت حسنؓ کے ساتھ اور ان کے مؤقف کے مؤید تھے اور بقول حضرت عمرو بن العاصؓ پہاڑوں کی طرح لشکر جرار حضرت حسنؓ کی رکاب میں تھا اور یہ ایسے جان نثار لوگ تھے، کہ بہ ظاہر ان کا پشت دکھا کر بھاگنا ہرگز متوقع نہیں تھا، بہ ظاہر حضرت حسنؓ کے غالب آنے کی توقع زیادہ تھی؛ لیکن جب حضرت معاویہؓ کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوئی، تو حضرت حسنؓ نے اپنے بہت سے رفقاء کی مخالفت؛ بلکہ ایک گونہ طعن و تشنیع کے باوجود اس پر لبیک کہا اور اپنا ہاتھ امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں دیا؛ تاکہ مسلمانوں کی خوں ریزی نہ ہو اور اسلامی دنیا ایک جھنڈے کے نیچے آجائے، اس طرح وہ پیشین گوئی شرمندۂ تعبیر ہوئی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے سلسلہ میں فرمائی تھی، یہ کچھ معمولی قربانی نہیں تھی اور اس قربانی نے اسلام کی تاریخ میں حضرت حسنؓ کو ایسی عظمت عطاء کی کہ اگر وہ پورے عالم اسلام کے متفق علیہ تاج ور بن جاتے، تب بھی شاید ان کو یہ مقام حاصل نہ ہوا ہوتا اور لوگوں کے قلوب پر ان کی حکمرانی قائم نہ ہوئی ہوتی۔

چناں چہ ایک بار پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے آگیا اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مسلمان فاتحانہ پیش قدمی کرنے لگے، اس سے کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کرسکتا کہ اس میں بنوامیہ کے تدبر سے زیادہ حضرت حسنؓ کے ایثار کا حصہ ہے!

حضرت حسینؓ کا یزید بن معاویہؓ کے مقابلہ میں کھڑا ہونا اس لیے نہیں تھا کہ آپ حکومت کی حرص و طمع رکھتے تھے، حضرت حسنؓ کو خانوادۂ نبوی سے نسبت کا جو شرف حاصل تھا، اس پر ہزار حکومتیں قربان اور نچھاور تھیں؛ بلکہ اصل یہ ہے کہ اسلام جس دور میں آیا، وہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا دور تھا، اس وقت کی معلوم دنیا میں جہاں بھی چھوٹی بڑی حکومت تھی، ان کی اساس خاندانی بادشاہت پر تھی، اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح کی، وہیں نظام سیاست کی بھی اصلاح کی اور خلافت کا تصور دیا۔

خلافت میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس منصب کے لیے ایسے شخص

کا انتخاب کیا جائے، جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہو، دوسرے مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد نے اس کا انتخاب کیا ہو، اسی اُصول پر حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابوبکرؓ نے اکابر صحابہؓ کے مشورہ سے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا، حضرت عمرؓ نے چھ رکنی کمیٹی بنادی اوران حضرات نے عام مسلمانوں سے مشورہ اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا، پھر حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل مدینہ اور اکابر صحابہؓ نے بہ اصرار حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علیؓ سے جن صحابہؓ کو اختلاف تھا، وہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کے بارے میں تھا، ورنہ ان کی لیاقت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں تھا اوراس لیے علمائے اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت تک وہی خلیفہ برحق تھے، حضرت حسنؓ نے بھی آپ اپنی خلافت کا اعلان نہیں فرمایا؛ بلکہ اس عہد کے اکابر صحابہؓ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تیس سالہ خلافت راشدہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ حضرت حسنؓ کے چھ ماہی عہدِ خلافت پر مکمل ہوجاتی ہے۔

یزید کی حکمرانی سے ایک نئے طریقہ کا آغاز ہوا کہ بعض ایسے لوگ جو اس سلسلہ میں اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے اوران کو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکی صحبت حاصل نہیں تھی، انہوں نے حضرت معاویہؓ کو باور کرایا کہ آئندہ کے لیے یزید کو خلیفہ نامزد کردیا جائے؛ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور اکابر صحابہؓ جو اُس وقت موجود تھے، ان کو حکمرانی کے اس نئے طریقہ سے اس قدر اختلاف تھا، جتنا حضرت حسینؓ کو؛ لیکن بعض صحابہؓ نے فتنہ کے اندیشہ سے خاموشی اختیار کی اور بعض نے امت کو اختلاف سے بچانے کے لیے بہ کراہت خاطر اس تجویز کو قبول کرلیا، اب اگر تمام صحابہؓ اس صورتِ حال پر یہی رویہ اختیار کرتے اور کسی کی طرف سے مزاحمت پیش نہ آتی، تو آئندہ یہ بات سمجھی جاتی کہ اسلام میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ ساتھ عہدِ جاہلیت کی مروّجہ ملوکیت کی بھی گنجائش ہے؛ چناں چہ حضرت حسینؓ نے اس کی مزاحمت کو ضروری سمجھا، یہاں

تک کہ اپنے رفقاء اور اہل خاندان کے ساتھ نہایت ہی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے اور قاتلانِ حسین نے جہاں آخرت میں اپنے لیے اللہ کے عذاب اور ابدی خسران کو محفوظ کر لیا وہیں دنیا میں بھی قیامت تک کے لیے اہل ایمان کی نگاہ میں ملعون و مغضوب قرار پائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت حسینؓ کی یہ مہم بہ ظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی؛ لیکن حضرت حسینؓ کو معنوی فتح حاصل ہوئی؛ چناں چہ امت کے علماء وفقہاء اور اربابِ نظر آج اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام جس نظام حکمرانی کا داعی ہے، وہ خلافت ہے نہ کہ خاندانی بادشاہت، حالاں کہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی بادشاہت کا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آج اسے اسلامی فکر کے خلاف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور کیوں اس رویہ کو قبول نہیں کیا گیا؟ یقیناً اس میں بڑا حصہ حضرت حسینؓ اور آپ کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی مزاحمت اور اسی راہ میں شہادت کا ہے، ورنہ بعد کے لوگ سمجھتے کہ اس مدت پر مسلمانوں کا اجماع واتفاق ہو چکا ہے۔

پس حضرت حسنؓ کا اسوہ یہ ہے کہ امت کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لیے اپنے اقتدار کی قربانی کو گوارا کیا جائے اور ایثار سے کام لیا جائے اور حضرت حسینؓ کا اسوہ یہ ہے کہ جب دین میں کوئی طاقت کمی بیشی کرنا چاہے اور اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے درپے ہو تو چاہے اس کے لیے اپنی رگِ گلو کٹانی پڑے؛ لیکن بہتر قیمت اللہ کے دین اور شریعت کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے، آج کے حالات میں یہ دونوں نمونے امت کے لیے مشعلِ راہ ہیں، امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے عہدہ وجاہ کا ایثار اور دین کی حفاظت و صیانت کے لیے اپنی جان عزیز تک کی قربانی!!

مسیح ومہدی سے متعلق پیشین گوئیاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین وشریعت کی جو تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں، وہ اسلام کا سب سے آخری اور سب سے مکمل ایڈیشن ہے، جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور جس کی انتہاء حضور ختمی مرتبت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی، اسی کو قرآن مجید نے ''اکمال دین'' یعنی دین کو مکمل کرنے اور ''اتمام نعمت'' یعنی نعمت وحی کو پوری کردینے سے تعبیر کیا ہے۔ (المائدۃ:۳) آپ سے پہلے ہر عہد میں نبی آیا کرتے تھے اور وہ اُمت کی نہ صرف دینی رہنمائی کرتے تھے؛ بلکہ بعض اوقات ان کی سیاسی قیادت بھی فرمایا کرتے تھے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نبوت کا مقام مخلوق میں سب سے اعلیٰ ترین مقام ہے، یہاں تک کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہے؛ لیکن نبوت کا تعلق کسب ومحنت، جدوجہد اور مجاہدات سے نہیں تھا؛ بلکہ یہ اللہ کی طرف سے انتخاب ہوا کرتا تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اجتباء اور اصطفاء کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ (الانعام:۸۷، آلِ عمران:۳۳) جس کے معنی چن لینے اور منتخب کرلینے کے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب اُمت کو ہادی ونمونہ اور مصلح کی ضرورت نہیں رہی، یہ ضرورت باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی صراحت فرمادی کہ اس اُمت میں مصلحین کا تسلسل رہے گا: **''لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الی یوم القیامة''** (**مسلم، عن جابر بن عبد اللہ، کتاب الایمان**، حدیث نمبر:۲۴۷) لیکن اُمت کے یہ مصلحین مجاہدات کے ذریعہ اپنے فریضے کو انجام دیں گے اور جدوجہد کے ذریعہ اس مقام پر پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ اُمت کو نفع پہنچائیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا منتخب عہدہ نہیں ہوگا کہ جس کا دعویٰ کیا جاسکے، وہ شخص یہ کہہ سکے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا گیا ہوں اور تم لوگوں

کو ہماری اطاعت واتباع کرنی ہے، ان مصلحین میں سب سے اعلیٰ درجہ خلفائے راشدینؓ کا تھا اور خلافت راشدہ کا دور حدیث کی صراحت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیس سال کا تھا، جو حضرت حسن بن علیؓ کی خلافت سے دستبرداری پر مکمل ہوتا ہے۔(سنن الترمذی، باب ماجاء فی الخلافة، حدیث نمبر:۲۲۲،العرف الشذی :۴۲۰/۲)ان کے بعد امراء وسلاطین آئے، جن میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی، جن میں خادمین دین و شریعت بھی تھے اور ہادمین دین وشریعت بھی، عادل بھی تھے اور ظالم بھی؛ چناں چہ خلافت راشدہ کے بعد دینی اور سیاسی اقتدار آہستہ آہستہ تقسیم ہوگیا، بادشاہوں نے حکومت سنبھالی اور اُمت کے مصلحین، علمائے ربانیین اور داعیانِ دین نے تعلیم وتربیت، تزکیہ واحسان، دعوت و تبلیغ، احکام شریعت کا اجتہاد واستنباط، اسلامی علوم کی نشر واشاعت، اسلام کے خلاف اُٹھنے والے ارتداد وانحراف کے فتنوں کا مقابلہ، یہ سارے اہم فرائض انجام دیئے اور ان ہی کے ذریعہ دین کی امانت ہم تک پہنچی ہے، یہ دراصل وہ کام ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید دین قرار دیا ہے، یعنی دین کی بنیادوں کو بار بار تازہ کرنا، مخالفانہ تحریکوں سے اس کی حفاظت کرنا اور دین وشریعت کو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے بچائے رکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر صدی میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، حدیث نمبر:۱۹۲۴) کیوں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، تو اب اُمت میں ایسے مجدد دین و مصلحین کا تسلسل ضروری ہے۔

کارِتجدید واصلاح کے لیے مستقبل میں صرف دو ایسی شخصیتوں کی آمد ہونے والی ہے، جن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور وہ انتہائی نازک حالات میں اسلام کی سربلندی، اعداء اسلام کی سرکوبی اور غیر معمولی حالات میں اُمت کی رہنمائی اور قیادت کے لیے دُنیا میں تشریف لائیں گے، جن کا اصل ہدف یہودیوں اور نصرانیوں کی طرف سے مسلمانوں پر ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرنا ہوگا؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’لن تهلک

امة انا فی اولها وعیسیٰ بن مریم فی آخرها والمہدی فی وسطها۔"(**کنز العمال، خروج المہدی**، حدیث نمبر:۳۸۶۸۲)وہ اُمت ہلاک نہیں ہوگی، جس کی ابتدا مجھ سے ہوئی ہے، جس کی انتہاء میں حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے اور درمیان میں امام مہدی آئیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کے مکمل ہوجانے کا ایک بڑا فائدہ اس اُمت کو جمعیت اور اور یک سوئی کی شکل میں حاصل ہوا ہے، یعنی اب کسی نبی کا انتظار باقی نہیں رہا، اگر نبوت کا سلسلہ جاری رہتا تو ہمیشہ لوگوں کو اگلے نبی کا انتظار ہوتا، یہ یقیناً اِنتہائی آزمائش کی بات ہوتی، پھر جب کوئی نیا نبی آتا تو کچھ ایمان لاتے اور کچھ لوگ انکار کرتے، جیسا کہ گذشتہ انبیاء کے ساتھ ہوتا رہا، اس کی وجہ سے ہمیشہ اُمت اختلاف وانتشار، بے اطمینانی اور امتحان وآزمائش سے گذرتی رہتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کی تکمیل نے اس راستہ کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا؛ اسی لیے مسلمانوں میں فکر ونظر کے ہزار اختلاف کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نقطۂ اتفاق بنی رہی، یہ وحدت اُمت کی ایسی اساس ہے جو دوسری قوموں کو حاصل نہیں۔

جن دو غیر معمولی شخصیتوں کی آمد اور ظہور کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا ہے، آپ نے ان کی علامتوں کو بھی بہت زیادہ واضح فرمادیا ہے؛ کیوں کہ آپ کو اندازہ رہا ہوگا کہ جو بد بخت آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے گا، مسلمان کسی تامل وتردّد کے بغیر اس کو رَدّ کردیں گے؛ لیکن یہ اندیشہ تھا کہ کوئی بہروپیا اپنے آپ کو مسیح یا مہدی قرار دے، اور آپ کی پیشین گوئیوں کو اپنے لیے بہانہ بنائے؛ اس لیے آپ نے ان دونوں شخصیتوں کی اتنی وضاحت کے ساتھ نشان دہی فرمادی، جتنی عام طور پر ایک پیغمبر اپنے بعد آنے والے پیغمبر کی بھی نہیں کیا کرتا تھا، قرآن مجید کا خود بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی اور کہا تھا کہ آنے والے نبی کا نام "احمد" ہوگا؛ لیکن آپ کے والدین کے کیا نام ہوں گے، آپ کا خاندان کیا ہوگا، آپ کی ولادت کہاں ہوگی، کہاں آپ

کی وفات ہوگی، کتنے سال دنیا میں آپ کا قیام رہے گا؟ اس کی صراحت اس پیشین گوئی میں نہیں ہے؛ لیکن مسیح و مہدی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ہمیں ان تمام باتوں کی صراحت ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاندان کے ذکر کی ضرورت تو اس لیے نہیں تھی کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، آپ کی والدہ حضرت مریم، آپ کے معجزات، آپ کی دعوتی جدوجہد، یہودیوں کے ساتھ آپ کے سلوک اور پھر آپ کے آسمان پر اُٹھائے جانے کا ذکر وضاحت وصراحت کے ساتھ موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اس کو مزید واضح کرتی ہیں، اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا یہ حصہ باقی رہ گیا تھا کہ جب وہ جو قیامت کے قریب آسمان سے اُتریں گے — جس کے قائل مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی — تو ان کی اُترنے کی کیا کیفیت ہوگی؟ چناں چہ احادیث میں تفصیل موجود ہے کہ آپ کا نزول دمشق میں ہوگا، آپ سفید منارہ پر اُتریں گے، آپ کو ایک بادل نے اُٹھا رکھا ہوگا، آپ کے جسم پر دو چادریں ہوں گی، آپ دجال (جو ایک یہودی فریب کار ہوگا) کو قتل فرمائیں گے، تشریف آوری کے اکیس سال بعد حضرت شعیب علیہ السلام کے قبیلہ میں آپ کا نکاح ہوگا، آپ ہی کے عہد میں یاجوج ماجوج کا اسلامی سلطنت پر حملہ ہوگا، اور وہ پورے مشرقِ وسطی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے، اپنی تشریف آوری کے بعد چالیس سال تک دنیا میں قیام فرمائیں گے، آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر میں آپ کی تدفین ہوگی، یہ بات بڑی اہم ہے کہ قرآن مجید میں کتنے ہی انبیاء کا ذکر آیا ہے؛ لیکن ان کے نام کے ساتھ ان کی ولدیت کا ذکر نہیں کیا گیا، مثلاً: اسماعیل بن ابراہیم، یعقوب بن اِسحٰق یا یوسف بن یعقوب نہیں فرمایا گیا، یہی صورتِ حال احادیث کی ہے؛ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن وحدیث میں زیادہ تر عیسیٰ بن مریم کے نام سے ہے، اور یہ ان حدیثوں میں بھی ہے جن میں قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی ہے، یہ اس بات کی صراحت ہے کہ جو مسیح پہلے دنیا سے اُٹھائے جا چکے

ہیں، وہی حضرت مریم کے بیٹے مسیح پھر آسمان سے اُتارے جائیں گے، یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جیسا یا آپ کی صفات کا حامل شخص موجودہ لوگوں میں ظاہر ہوگا، یہ علامتیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی حقیقت پسند شخص اس کی جھوٹی تاویل نہیں کرسکتا، اس کی تاویل وہی شخص کرسکتا ہے، جو دن کو رات کہنے سے بھی نہ شرماتا ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے نازل ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس پر ڈھیر ساری حدیثیں موجود ہیں اور نقل حدیث کی جو سب سے اعلیٰ صورت ہوتی ہے جس کو ''تواتر'' کہتے ہیں، اس سے اس کا ثبوت ہے، ہندوستان کے ایک بڑے محدث اِمامُ العصر علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ نے ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' کے نام سے ان ساری روایتوں کو جمع فرمایا ہے، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت محمدیہ کی تائید و تقویت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام من جانب اللہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، اس بات نے بچپن ہی میں آپ کی دُور دُور تک شہرت پہنچائی، پھر آپ کے ہاتھوں پر ایسے حیرت انگیز معجزے ظاہر ہوئے، جس سے شہر شہر قریہ قریہ آپ کا چرچا ہونے لگا، پھر جب آپ شہرت وتعارف کی بلند چوٹی پر پہنچ گئے تو آپ کی زبان مبارک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بشارت سنائی گئی؛ تاکہ یہ پیغام دُور دُور تک پہنچے؛ کیوں کہ جب کسی شخص سے حیرت انگیز باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو اس کی ہر بات کان لگا کر سنی جاتی ہے؛ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے گئے تو نہ صرف یہودیوں کے اور عیسائیوں میں بلکہ عربوں میں بھی یہ چرچا تھا کہ کوئی نبی ظاہر ہونے والا ہے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اوپر اُٹھالیے گئے، اب پھر جب آپ قیامت کے قریب اُتارے جائیں گے تو اس کا مقصد بھی اُمت محمدیہ کی تقویت اور اسلام کو غلبہ عطا کرنا ہوگا، یہاں تک کہ آپ خود نماز کی امامت کرنے کے بجائے امام مہدی کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے اور مسلمانوں کی خواہش کے باوجود امامت کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

دوسری شخصیت جن کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری دی ہے، ''امام مہدی''

کی ہے، امام مہدی نہ نبی ہوں گے، نہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام کا نزول ہوگا، نہ اللہ کی طرف سے ان سے کہا جائے گا کہ: ''میں نے تم کو مہدی بنایا ہے،'' نہ یہ نبی کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشا ہوا کوئی ایسا عہدہ ہوگا، جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے، یا ان کی مہدویت کو کلمہ کا جزء بنالیا جائے؛ بلکہ ان کی حیثیت ایک خلیفہ راشد کی ہوگی، ان کا سب سے اہم کارنامہ اللہ کے راستہ میں جہاد اور عدل وانصاف کا قیام ہوگا، وہ اس اُمت کے آخری مجدد اور خلیفہ راشد ہوں گے، نہ وہ مہدویت کا دعویٰ کریں گے اور نہ لوگوں کو اپنے آپ پر ایمان لانے کے لیے کہیں گے؛ بلکہ وہ صلحائے اُمت میں سے ایک عظیم شخصیت ہوں گے، لوگ ان کے ہاتھوں پر اطاعت اور جہاد کی بیعت کریں گے، جیسا کہ خلفائے راشدینؓ کے ہاتھوں پر صحابہؓ نے کی تھی، لوگ انہیں اُن علامتوں سے پہچانیں گے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں اور اصرار کر کے ان کے ہاتھوں پر بیعت کریں گے۔

چوں کہ امام مہدی اُمت ہی کے ایک فرد ہوں گے اور عام انسانوں ہی کی طرح ان کی پیدائش ہوگی؛ اس لیے اس بات کا اندیشہ تھا کہ کچھ طالع آزما، جھوٹے، دھوکہ باز اور فریبی قسم کے لوگ اپنے آپ کو امام مہدی قرار دینے لگیں اور اس کو جاہ ومال کی سوداگری کا ذریعہ بنائیں، غالباً اسی مصلحت کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تفصیل سے امام مہدی کے بارے میں بتایا کہ ان کا نام ''محمد'' ہوگا، ان کے والد کا نام عبداللہ ہوگا، وہ حضرت فاطمہؓ کے بڑے صاحب زادے حضرت حسن بن علیؓ کی نسل سے ہوں گے، مدینہ منورہ میں ولادت ہوگی، مکہ مکرمہ میں رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان لوگ آپ کے ہاتھوں پر بیعت کریں گے، آپ کے ظہور سے پہلے دریائے فرات (عراق) میں ایک سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا، جس کے لیے ایک خوں ریز جنگ ہوگی، ان کے خلاف شام کی طرف سے سفیان نام کا ایک ظالم حکمراں مکہ پر حملہ آور ہوگا اور بری طرح شکست کھائے گا، امام مہدی عیسائیوں کو شکست دیں گے، ان کا قیام دمشق کی جامع مسجد میں ہوگا، جب ان کی شناخت ہو جائے گی تو اس کے چھ سال بعد دجال کا خروج ہوگا، آپ کی مدد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتارے جائیں

گے اور یہودیوں کو فیصلہ کن شکست دیں گے، امام مہدی اپنے ہاتھوں پر بیعت کے بعد سات سے نو سال تک زندہ رہیں گے۔

یہ تو امام مہدی کے بارے میں وہ باتیں ہیں، جو دو اور دو چار کی طرح واضح ہیں، یہاں تک کہ حدیث میں بعض ایسی شخصیتوں کے نام بھی ظاہر کیے گئے ہیں، جو آپ کی مدد میں پیش پیش ہوں گے، ان کے علاوہ امام مہدی کے اوصاف بھی واضح طور پر احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں، ان صراحتوں کا مقصد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص اس اُمت کا استحصال نہ کر سکے اور جھوٹی حیلہ بازیوں کے ذریعہ مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے اُمت میں انتشار کا سبب نہ بن سکے، افسوس کہ ایسی وضاحت کے باوجود ان پیشین گوئیوں کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مختلف گمراہ فکر لوگ مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں، اور اُمت کو انحراف و انتشار میں مبتلا کرتے رہے ہیں، انھوں نے احادیث کو ایسا معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ الفاظ کی ایسی بازی گری کے ذریعہ تو سفید کو سیاہ اور انسان کو گدھا بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، اور چوں کہ حدیث میں دو شخصیتوں کا ذکر آیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی، ان دونوں کو جمع کرنا مشکل تھا، یا شاید ان مدعیوں کو خود ایک عہدہ لے کر دوسرے کو کوئی عہدہ دینا گوارہ نہیں تھا؛ اس لیے انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ میں ہی مہدی بھی ہوں اور مسیح بھی، اس تحریف اور بے جا تاویل کی سب سے بڑی مثال مرزا غلام احمد قادیانی ہے، جس نے عیسائی قوتوں کے شہ پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

اسی طرح کی ایک مثال ابھی کچھ عرصہ پہلے شکیل نام کے ایک شخص کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے، جس کے والد کا نام حنیف ہے، جو بہار کے شہر دربھنگہ کا رہنے والا ہے، جس نے دہلی سے اپنی انحرافی کوششوں کا آغاز کیا، اپنے مسیح اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، احادیث نبوی کی نہایت نامعقول و بے بنیاد تاویلیں کیں، جو زیادہ تر قادیانی لٹریچر سے ماخوذ ہیں اور اسی طرح کی تاویلات ہیں، جو ایران میں 'باب' اور 'بہاء' کے ماننے والے مرتدین نے کی تھی، اب اس نے مہاراشٹر کے شہر اورنگ آباد کو اپنا مرکز بنایا ہے اور ملک کے مختلف حصوں خاص کر جنوبی ہند

کے علاقوں میں لوگوں کی دین سے ناواقفیت کا فائدہ اُٹھا کر اس فتنہ کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے، یہ دعویٰ اس قدر نامعقول، گمراہانہ اور نادرست ہے کہ اہل علم کے لیے اس پر قلم اُٹھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؛ لیکن اصل خوف مسلمانوں کی ناواقفیت و جہالت سے ہے اور اس بات سے ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کے غلبہ کی وجہ سے مسلمان اس وقت سخت نا اُمیدی کی حالت میں ہیں، ان کے حوصلے ٹوٹے ہوئے ہیں، ان کی ہمتیں شکستہ ہیں اور وہ کسی مردِ غیب کے انتظار میں ہیں، جو اس بھنور سے اُمت کی کشتی کو نکال لے جائے، اس لیے وہ ایسے جھوٹے دعوے کرنے والوں کے گرد آسانی سے جمع ہو جاتے ہیں اور مصیبت کی اس گھڑی میں سراب کو آب اور پیتل کو سونا سمجھنے لگتے ہیں، اس طرح کے بعض اور واقعات بھی کہیں کہیں پیش آرہے ہیں اور بعض لوگ مسیح و مہدی کے انتظار میں اس درجہ بے قرار ہیں کہ وہ کسی بھی مصنوعی نجات دہندہ کا دامن تھامنے کے لیے تیار ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی ایسے ہی حالات میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، جب کہ انگریزوں کا غلبہ تھا اور مسلمان سخت مایوسی کی حالت میں تھے۔

اس لیے علماء کو چاہیے کہ اچھی طرح اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھائیں اور مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اُتارا جانا ایک بنیادی عقیدہ ہے، متواتر حدیثوں سے ثابت ہے اور اس کا انکار آخری درجہ کی گمراہی اور حدیث کا انکار ہے، نیز مہدی کوئی ایسا منصب نہیں جس پر نبی کی طرح ایمان لایا جاتا ہو، جو نبی کی طرح معصوم ہو اور جس پر اللہ کی طرف سے احکام اُتارے جاتے ہوں، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی ایسے شخص کی چرب زبانی کا شکار ہو جائیں جو دُشمنانِ اسلام کے آلہ کار ہوں اور جن کو اس اُمت میں انتشار پیدا کرنے کے لیے اُٹھایا گیا ہو۔ **وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان!**

قادیانیوں کو مسلمان قرار دینے کی نازیبا کوشش

اسلام دشمن طاقتیں مختلف جہتوں سے اسلام اور مسلمانوں پر یلغار کر رہی ہیں؛ لیکن انہوں نے فکری یلغار کے لیے دو راستے اختیار کیے ہیں، ایک یہ کہ اسلام کو بے وزن اور بے وقعت قرار دیا جائے، جیسے قرآن مجید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تورات و انجیل کا چربہ ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر کے بجائے سماجی مصلح قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے، شریعت اسلامی کو بعثت نبوی کے وقت سماجی حالات کا رَدّ عمل قرار دیا جاتا ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کے کارناموں کو یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے یا اسے محض فلاسفہ یونان کے افکار کی تشریح کا نام دیا جاتا ہے۔

دوسرا طریقۂ کار یہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے، ان کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ گویا وہی اسلام کے حقیقی ترجمان ہیں، اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ مغربی طاقتیں ہمیشہ قادیانیت کو خصوصی اہمیت دیتی رہی ہیں، قادیانوں کے ساتھ خصوصی دوستانہ اور خیر خواہانہ تعلق رکھتی ہیں اور انہیں ایک مسلمان کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں؛ تاکہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین نے اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جو ناپاک کوششیں کی ہیں، اسے اسلام اور مسلمانیت کا لبادہ اوڑھایا جائے، اسی طرح کی ایک ناپاک کوشش ابھی حکومت ہند کی طرف سے سامنے آئی ہے کہ 2011 میں ہندوستان کی مردم شماری کا جو خلاصہ سامنے آیا ہے، اس میں مسلمانوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے ''احمدی مسلمانوں'' یعنی قادیانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، پہلے مسلمان فرقوں کی حیثیت سے سنی، شیعہ اور اسماعیلی کا ذکر ہوتا تھا؛ لیکن اس بار اس میں اس فرقہ کا اضافہ کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے جذبات کو زخمی کرنے اور ان پر ایک ایسی بات تھوپنے کی کوشش ہے، جس کے غلط اور نا قابل قبول ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور ایک ایسے گروہ کو مسلمان قرار دیا جا رہا ہے جس کو مسلمانوں کے تمام فرقے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں؛ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود اس فتنہ کی سنگینی کو سمجھیں اور دوسرے بھائیوں کو اس سے واقف

کرائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت نبی اور رسول سب سے بڑی خصوصیت اور امتیازی وصف آپ کا ''خاتم النبیین'' ہونا ہے، یعنی نبوت کا سلسلہ آپ کی ذات اقدس پر ختم ہو چکا ہے، آپ کے بعد نہ کوئی نبی آیا ہے اور نہ آئے گا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر کے بعد دوسرے پیغمبر کی آمد یا تو اس لیے ہوتی ہے کہ پہلے پیغمبر کے ذریعہ انسانیت کو جو تعلیم حاصل ہوئی، وہ محفوظ نہ رہے اور اس میں ملاوٹ اور آمیزش ہو جائے، یا اس لیے کہ پہلے پیغمبر کی شریعت میں جو احکام نازل ہوئے ہوں، اس میں اللہ کی طرف سے کوئی تبدیلی یا کمی بیشی عمل میں آنے والی ہو، عام طور پر ان ہی دو اسباب کے تحت ایک پیغمبر کے بعد دوسرے پیغمبر کی آمد ہوتی ہے، پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ پر نازل ہونے والی کتابِ الٰہی پوری طرح محفوظ و موجود ہے، اور خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے: ''**انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون**'' (سورۃ حجر: ۹) اور جہاں تک شریعت اسلامی میں ترمیم و تغیر کی بات ہے تو شریعت پایۂ کمال کو پہنچ چکی ہے اور احکام شرعیہ کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی جو نعمت ہدایت انسانیت کو عطا کی جاتی تھی، وہ تمام ہو چکی ہے ''**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**'' (سورۃ مائدۃ: ۳) یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شریعت آخری شریعت ہے، اب اس میں کسی قسم کی ترمیم اور اِضافہ و کمی کی گنجائش نہیں۔

اس لیے ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی نبی کے آنے کی نہ ضرورت باقی رہی اور نہ اس کی گنجائش ہے؛ اسی لیے خود قرآن مجید نے پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ محمد اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں ''**ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین**'' (سورۃ احزاب: ۴۰) قرآن کے اس صریح اور واضح اعلان کی مزید تائید و تشریح احادیث نبویہ سے ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنو اسرائیل میں انبیاء قیادت و انتظام کا فریضہ انجام دیتے تھے، جب کسی نبی کی وفات ہو جاتی تو اس کے بعد

دوسرا نبی آجاتا؛ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، البتہ خلفاء ہوں گے ”**انہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء**“ (**بخاری، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل**) حضرت ابوہریرہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد مروی ہے کہ مجھے انبیاء پر چھ چیزوں میں فضیلت دی گئی ہے، اس میں ایک خصوصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ذکر فرمائی کہ سلسلۂ نبوت مجھ پر ختم ہوچکا ہے ”**وختم بی النبیون**“ (**مسلم**) ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رسالت ونبوت کا سلسلہ ختم ہوچکا، اب نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی ”**ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول ولا نبی**“ (**ترمذی، باب ذھاب النبوة**) حضرت ثوبانؓ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، جو نبوت کے دعویدار ہوں گے؛ حالاں کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ (**ابوداؤد، کتاب الفتن**)

آخری نبی ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام ”عاقب“ ہے، عاقب کے معنی ”بعد میں آنے والے“ کے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ”عاقب“ ہوں، جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا ”**انا العاقب الذی لیس بعدہ نبی**“ (**ترمذی، باب اسماء النبی**) ہر نبی کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس کی امت بھی ہوتی ہے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو ”**انا اخر الانبیاء وانتم آخر الامم**“ (**ابن ماجه، باب الدجال**) ایک حدیث میں یہ بات بھی ارشاد فرمائی کہ میری مسجد نبوت سے نسبت رکھنے والی آخری مسجد ہوگی ”**ان مسجدی آخر المساجد**“ (**مسلم، باب فضل الصلاة بمسجدی مکة والمدینة**)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ نبوت کے اختتام کو بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے پیغمبروں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر تعمیر کیا، خوب عمدہ اور نہایت خوب صورت، لیکن کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، لوگ آتے ہیں، اس کے حسن وجمال پر حیرت زدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ

بھی کیوں نہیں لگا دی گئی ؟ تو میں وہی ''اینٹ'' ہوں اور خاتم النبیین ہوں ۔(**بخاری، باب خاتم النبیین**) گویا اللہ تعالیٰ نے بہترین انسانوں کا انتخاب کر کے ایک قصر نبوت تعمیر کیا، اس عظیم الشان محل میں صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی ، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے پُر ہوگئی، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر طرح کی نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی صاحب شریعت آ سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا نبی جو آپ کے تابع ہو اور آپ ہی کی شریعت کا متبع ہو، یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اور ارشادات سے بھی واضح ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے بعد سلسلۂ نبوت جاری رہتا تو عمر بن خطاب نبی ہوتے ''**لو کان بعدی نبیا لکان عمر بن الخطاب**'' (**ترمذی، کتاب المناقب**) اسی طرح ایک موقعہ پر حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم میرے مقابلہ میں ایسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ہارون علیہ السلام؛ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا ''**الا انہ لا نبی بعدی**'' (**بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ**) غور فرمایئے کہ اگر ذیلی اور غیر مستقل نبوت کی گنجائش آپ کے بعد باقی رہتی تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اس سے کیوں نہ سرفراز کیے جاتے؟ حضرت ہارون علیہ السلام کوئی صاحب شریعت نبی نہیں تھے؛ بلکہ شریعت موسوی ہی کے متبع تھے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ہارون علیہ السلام کی سی نبوت کو بھی حضرت علیؓ کے لیے ناممکن قرار دیا، معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی طرح کی نبوت کو باقی مانتا ہو، تو وہ ایک ایسی گمراہی کی بات کرتا ہے کہ خدا کے ساتھ شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اور گمراہی نہیں ہوسکتی !

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کا اس بات پر اجماع و اتفاق تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے؛ چناں چہ جب مسیلمہ کذاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مانتے ہوئے اپنی نبوت کا بھی دعویٰ کیا تو صحابہؓ نے بالاتفاق اسے مرتد قرار دیا، اس سے جنگ کی گئی اور بالآخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا، اسی لیے امام

ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نبوت کا دعویدار ہو اور کوئی مسلمان اس سے معجزہ اور نبوت کی علامت طلب کرے تو یہ مطالبہ ہی اس کو ایمان سے محروم کردے گا؛ کیوں کہ گویا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کو ممکن تصور کیا۔

دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام انسانیت کے لیے ہے، قرآن کا ارشاد ہے: "وما ارسلنک الا کافة للناس" (سورۃ سباء: ۲۸) تمام لوگوں میں قیامت تک آنے والے انسان داخل ہیں، گویا یہ اس بات کا اعلان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرۂ نبوت قیامت تک وسیع ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت محفوظ ہے اور آپ کی شریعت میں کسی نسخ اور تبدیلی واضافہ کا امکان نہیں تو آپ کے بعد کسی پیغمبر کی بعثت کے کوئی معنی نہیں، اگر آپ کے بعد بھی سلسلۂ نبوت جاری ہوتا تو ضرور تھا کہ جیسے ہر پیغمبر نے بعد میں آنے والے پیغمبر کے بارے میں اطلاع دی اور اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، آپ بھی اس کا اعلان فرماتے؛ لیکن یہی نہیں کہ آپ نے آئندہ کسی نبی کی پیشین گوئی نہیں فرمائی؛ بلکہ یہ بھی اعلان فرمادیا اور اس کو بار بار واضح کردیا کہ آپ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔

بدقسمتی سے انگریزوں کے تسلط کے دور میں پنجاب کی سرزمین سے حکومت وقت کی شہ پر ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا، جس کے غلامانہ مزاج و مذاق کا حال یہ تھا کہ خود ہی اپنے آپ کو حکومت انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا کہا کرتا تھا اور حکمرانوں کی چوکھٹ پر جبیں سائی سے اسے ذرا بھی عار نہ تھا، افسوس کہ آج تک یہ گمراہ فرقہ موجود ہے اور وہ ناواقف مسلمانوں کو دھوکہ دے کر ان کو نبوت محمدی کے سایہ سے محروم کرنا چاہتا ہے، یہ ایک ایسا فتنہ ہے، جس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں، اور یہ ایسی گمراہی ہے جس سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں، اگر اس دنیا میں اعتقاد وعمل کی نجاستیں محسوس پیکر میں ڈھل سکتیں اور اس کو محسوس کیا جاسکتا تو یہ ایسی بات ہوتی کہ اگر اسے سمندر میں ملادیا جاتا تو وہ بھی متعفن ہوجاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت امت کے لیے ایک بڑی رحمت ہے، یہ اس امت کی عالمگیریت، اس کی وحدت، اپنے عقیدہ پر جماؤ، استقامت نیز اعتقادی انتشار اور فرقہ بندیوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے؛ کیوں کہ اگر سلسلۂ نبوت باقی ہوتو ہمیشہ ایک نئے نبی کا انتظار ہوگا اور اپنے عقیدہ پر استقامت نہ ہوگی، پھر جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کے سچے اور جھوٹے ہونے کو جانچنا اور پرکھنا خود ایک امتحان ہے؛ کیوں کہ حقیقی نبی کا انکار بھی کفر ہے اور جھوٹے نبی پر ایمان لانا بھی کفر؛ اس لیے جب بھی کوئی نبی آئے گا، تو کچھ اس پر ایمان لانے والے ہوں گے اور کچھ اس کے منکر ہوں گے، اور اس سے فرقہ بندیاں جنم لیں گی؛ اس لیے ختم نبوت مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔

مگر اعدائے اسلام چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ کو اس عظیم نعمت سے محروم کر دیں؛ لیکن وہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے، ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو بھی اور برادرانِ وطن کو بھی ختم نبوت کی حقیقت سے واقف کرایا جائے؛ تا کہ وہ بکرے کی کھال میں آنے والے بھیڑیوں کو پہچان سکیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ ختم نبوت کا عقیدہ ایمان اور کفر کی اساس اور ہدایت و گمراہی کے درمیان خط فاصل ہے، اور قادیانیت مسلمانوں کے فرقوں میں سے ایک فرقہ نہیں؛ بلکہ ایک علاحدہ باطل مذہب ہے۔

اس پس منظر میں عام مسلمانوں، مذہبی اداروں اور ملیّ تنظیموں کو چاہیے کہ وہ حکومت ہند کے خلاف پُر امن احتجاج کریں، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور اپوزیشن لیڈران کو خطوط لکھ کر صحیح صورتِ حال سے واقف کرائیں اور مطالبہ کریں کہ قادیانیوں کو پارسیوں، جینوں اور سکھوں کی طرح ایک الگ قوم اور مذہب شمار کیا جائے، انہیں مسلمانوں میں شامل نہ کیا جائے؛ کیوں کہ وہ مسلمان ہیں ہی نہیں، جیسے کسی مسلمان کو ہندو، سکھ یا عیسائی قرار دینا اس کے لیے تکلیف دہ اور اہانت آمیز تعبیر ہے، اسی طرح قادیانیوں کو مسلمان قرار دینا مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ اور اہانت آمیز ہے۔

اسلامی کیلنڈر

اسلامی کیلنڈر ''ہجری کیلنڈر'' کہلاتا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت کی طرف اس کی نسبت ہے، عربی زبان میں ''ہجر'' کے معنی چھوڑنے کے ہیں، اسی سے ہجرت کا لفظ ماخوذ ہے، ہجرت ایک اسلامی اصطلاح ہے، ایمان کی حفاظت یا دین کی اشاعت کی غرض سے ترکِ وطن کرنے کو ''ہجرت'' کہتے ہیں ''تارکین وطن'' آج کل ایک بین الاقوامی اصطلاح ہے، ہر ملک میں تارکین وطن موجود ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، یہ وہ تارکین وطن ہیں، جنھوں نے معاشی اور سیاسی مقاصد کے تحت اپنا وطن چھوڑا ہے، ان کو مہاجرین کہنا ''ہجرت'' کے مقدس لفظ کے ساتھ نا انصافی ہے۔

ہجرت دراصل پیغمبروں کی سنت ہے، شاید ہی کوئی پیغمبر ہو جس کو ہجرت نہ کرنی پڑی ہو، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہم السلام وغیرہ کی ہجرت کے واقعات تو خود قرآن مجید میں مذکور ہیں؛ لیکن تاریخ میں ہجرت کے نام سے جو شہرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کو ہوا، کسی اور پیغمبر کی ہجرت کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔

ہجرت کا یہ واقعہ ایک طرف مسلمانوں کی قربانی اور دین کی حفاظت واشاعت کے لیے پیغمبر اسلام اور ان کے رفقاء عالی مقام کے ایثار وفدا کاری کی یادگار ہے اور دوسری طرف آئندہ اسلام کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا مقدمہ، یہ محض مکہ سے مدینہ کی طرف سفر نہیں تھا؛ بلکہ مغلوبیت سے غلبہ وظہور کی طرف اور مقہوریت سے طاقت وشوکت کی طرف سفر تھا، بظاہر مسلمانوں پر زمین تنگ ہو رہی تھی؛ لیکن خدا نے اسی تنگی میں آفاق کی وسعت کو سمو رکھا تھا، یہ واقعہ نا اُمیدیوں میں اُمید کی کرن سے روشناس کرتا ہے اور حوصلہ شکن حالات میں اُمید وحوصلہ کا چراغ جلاتا ہے اور اس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کیسی کیسی قربانیوں اور جانثاریوں سے خدا کے اس دین کو سربلند کیا گیا ہے اور کس قدر خون ولہو کے ذریعہ حق و صداقت کے اس شجرۂ طوبیٰ کی آب یاری فرمائی گئی ہے؟!

حضرت عمرؓ کے سامنے بحیثیت خلیفہ ایک فائل آئی، جس میں تاریخ درج تھی، سال

درج نہ تھا، آپؓ کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا اپنا کیلنڈر ہونا چاہیے، آپؓ نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز رکھی اور غالباً حضرت علیؓ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ اسلامی کیلنڈر واقعہ ہجرت پر مبنی ہونا چاہیے؛ چناں چہ مہینوں کی ترتیب وہی قائم رہی جو اسلام سے پہلے عربوں میں مروّج تھی، محرم سے آغاز اور ذوالحجہ پر اختتام اور سال کا آغاز واقعہ ہجرت کے سال سے مانا گیا، اس طرح ۱۴۱۹ھ کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت کو اتنے سال گزر چکے۔

کیلنڈر بھی کسی قوم کی اپنی شناخت ہوتی ہے، اس سے قوم وملت کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے، ہجری کیلنڈر پر غور کر جایئے، اس میں اکثر مہینوں کے نام وہ ہیں جو اسلامی عبادات اور مسلمانوں کی مذہبی روایات کی نشان دہی کرتے ہیں اور نام ہی سے ان مہینوں سے متعلق عبادات اور واقعات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، دوسری قوموں کے جو کیلنڈر مروّج ہیں، وہ بھی ان کے مذہبی افکار وروایات کا مظہر ہیں، یہی حال مہینوں اور ہفتوں کے نام کا ہے، مثلاً: Sunday اور Monday کے الفاظ ہی پر غور کیجیے، ان کے معنی ہیں سورج کے دن اور چاند کے دن؛ چوں کہ اہل یونان کے یہاں ایک دن سورج کی پرستش کے لیے مقرر تھا اور ایک دن چاند کی پرستش کے لیے، اسی لیے مختلف دیوتاؤں کے نام سے دنوں کے نام ہوا کرتے تھے، کچھ اسی طرح کا معنی مہینوں کے نام کے پیچھے بھی کارفرما ہے، اسی لیے حضرت عمرؓ نے ان کیلنڈروں کو قبول نہیں فرمایا، جو اُس زمانہ میں مروّج تھے۔

پس اسلامی کیلنڈر مسلمانوں کی اپنی ایک پہچان ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس کیلنڈر کو رواج دیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے پس منظر اور اس کی دینی وملّی حیثیت سے واقف کرائیں، علماء نے لکھا ہے کہ ہجری کیلنڈر کے چلن کو باقی رکھنا اور اس کی ترویج کی سعی کرنا فرضِ کفایہ یعنی اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے، یہ کیلنڈر ہمیں ہمارا تشخص یاد دلاتا ہے اور ہجرت کے عبرت آمیز اور موعظت انگیز واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

آمد فصل بہار

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، جونیکیوں کی فصل بہار ہے اور تہی دامانِ عمل کو بقدرِ توفیق اس فصل گل سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ماہِ مبارک کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کی آمد سے پہلے ہی آپ لوگوں کو اس ماہ کی برکتوں اور سعادتوں کے بارے میں خبردار فرماتے اور عبادت کی طرف خاص طور پر انہیں متوجہ کرتے، اس ماہ کا اصل اور بنیادی عمل روزہ ہے، یعنی صبح طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے، پینے اور دوسرے نفسانی تقاضوں سے اپنے آپ کو باز رکھنا، یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے، انسان کے لیے گھنٹے دو گھنٹے بھی بھوکا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، بیمار ہو تو پرہیز مشکل ہو جاتا ہے، دنیا کی ساری لذتیں ان ہی خواہشات سے متعلق ہیں، آدمی بطورِ خود اپنے آپ کو ان سے روک لے، حالاں کہ اس کو روکنے کے لیے نہ کوئی چوکیدار ہو، نہ کوئی قانونی پہرہ دار اور نہ جسمانی مضرت ونقصان کا اندیشہ۔

یہ انسان کی تربیت کا نہایت مؤثر اور بے مثال طریقہ ہے، جس سے محض روحانی مقاصد کے تحت اپنے آپ پر قابو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لیے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ نفس کے گھوڑے کی لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھے، جو شخص نفس کی آواز کو دبانے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لے اس کے لیے کسی بھی گناہ سے بچنا چنداں دشوار نہیں، اسی لیے روزہ کو تقویٰ کا باعث قرار دیا گیا اور رمضان کے مہینہ کو صبر کا مہینہ فرمایا گیا۔

لیکن دنیا کی ہر چیز میں صورت اور حقیقت کا ایک فرق پایا جاتا ہے، شیر کی تصویر میں شیر کی طاقت اور آگ کی تصویر میں آگ کی حرارت نہیں آسکتی، شیر کی خوف ناک اور بھیانک اسٹیچوں سے دن رات بچے کھیلتے ہیں اور آگ کی تصویر سے لوگ اپنے گھر سجاتے ہیں؛ لیکن اگر جاں بہ لب زندہ شیر بھی ہو تو اچھے اچھے بہادر بھی قریب جانے کی ہمت نہیں پاتے اور آگ کی ایک چنگاری بھی ہو تو پورے مکان کو سلگانے کے لیے کافی ہے۔

ہاں عبادات میں بھی صورت اور حقیقت کا فرق ہے، محض بھوکا، پیاسا رہنا روزہ کی صورت ہے نہ کہ حقیقت، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جھوٹ بولے اس کا روزہ نہیں، جو غیبت کرے اس کا روزہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزہ داروں کو روزہ سے بھوک و پیاس کے سوا کوئی چیز حاصل نہیں، یہ روزہ کی صورتیں ہیں، ایسی صورت جو روح اور زندگی سے خالی ہیں، روزہ تو اس لیے ہے کہ انسان کا سینہ خدا کی محبت سے معمور ہو جائے، اس کا دل سب کچھ کھو کر خدا کو پانے کے جذبہ سے لبریز ہو اور گناہوں کی نفرت اس کے دل میں سما جائے، اس کی نگاہ ایک پاک دامن نگاہ ہو، اس کی زبان قند و نبات کی مٹھاس سے ہم کنار اور ہر طرح کی بدگوئی سے محفوظ ہو، اس کے اعضاء و جوارح کو نیکی سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا ایک عاشق ہے جو اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لیے بھوکا، پیاسا اور دنیا کی لذتوں سے بیگانہ بنا ہوا ہے، اگر روزہ اس کیفیت کے ساتھ رکھا جائے تو یقیناً اس سے نفس کی تربیت ہوگی، انسان کے اندر برائی سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور انسان اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو سکے گا، یہ تربیتی نظام اسے آئندہ گیارہ مہینوں میں بھی خدا کی مرضیات پر قائم رکھے گا، اس لیے روزہ کو حقیقت کی سطح پر رکھنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ یہ خدا کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنے کا ایک عنوان ہے!

اس ماہِ مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید کے ایک ختم کا آپ سے مذاکرہ فرماتے، جس سال وفات ہوئی اس سال آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دو دور فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس ماہ کو قرآن مجید سے ایک خاص مناسبت ہے، اسی لیے اس مہینہ میں خاص طور پر تراویح کی نماز رکھی گئی کہ اس میں پورا قرآن مجید ختم کیا جائے، تہجد میں بھی زیادہ طویل قیام اور اسی نسبت سے قرأت کا معمول مبارک تھا؛ اسی لیے سلف صالحین کے یہاں اس ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت کا بھی خاص اہتمام رہا ہے، اس لیے جہاں رمضان کے دن روزہ کے نور سے منور ہوں، وہیں رمضان کی راتیں تلاوتِ

قرآن سے آباد ہونی چاہیے، یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ خدا کی آخری اور کائنات میں موجودہ واحد سچی کتاب اس امت کے پاس ہے، جس کا حق یہ تھا کہ مسلمان کا کوئی دن اس کی تلاوت سے خالی نہ ہو؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ پورا سال گذر جاتا ہے اور بہت سے بے توفیقوں کو قرآن مجید کے ایک ختم کی توفیق بھی میسر نہیں آتی، اس لیے یوں تو پورے سال تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرنا چاہیے؛ لیکن اگر یہ نہ ہوسکے تو کم سے کم رمضان کو تو ضائع نہ ہونے دیا جائے، عام طور پر بیس منٹ میں ایک پارہ مکمل ہو جاتا ہے، اگر روزانہ صرف ایک گھنٹہ تلاوت کا وقت رکھا جائے تو بآسانی ہر دس دن میں ایک ختم ہوسکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی وقت ایک گھنٹہ قرآن کے ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کے لیے بھی رکھ لیا جائے تو کیا کہنا!!! ہونا تو یہ چاہیے کہ سال بھر ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کا اہتمام ہو؛ لیکن اگر یہ نہ ہوسکے، تو کم سے کم رمضان میں کسی ایک بڑی سورت، یا منتخب سورتوں ہی کا مطالعہ کرلیا جائے، تاکہ بندہ یہ جان سکے کہ اس کا خدا اس سے کیا کہہ رہا ہے، یہ کیسی محرومی ہے کہ ہمارا خدا ہم سے مخاطب ہو اور ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ وہ ہم سے بات کرے اور ہم اپنے کان بند کرلیں، اس کا کلام اپنی جلوہ فرمائیوں کے ساتھ ہم پر آشکار ہو اور ہم اپنی آنکھیں موند لیں، کیا اس سے زیادہ حق ناشناسی کی بھی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟

رمضان المبارک کا تیسرا اہم عمل دعاء ہے، یہ دعاء کی قبولیت کا مہینہ ہے، رمضان کی راتوں میں اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں؟ کوئی ہے رزق کا خواست گار کہ میں اسے روزی دوں؟ ہے کوئی ضرورت مند کہ میں اس کی حاجت روائی کروں؟ اس سے زیادہ کم نصیبی کیا ہوگی کہ داتا خود سائل کو طلب کرے اور سائل اپنا دست سوال نہ پھیلائے، تہجد کا وقت دعاء کی قبولیت کا ہے، افطار کے وقت دعاء قبول ہوتی ہے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ جس میں شبِ قدر کا امکان ہے، دعاء کی قبولیت کی خاص ساعتوں پر مشتمل ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ پوری ملت اسلامیہ زخم سے چور ہے اور پورا عالم اسلام

یہود و نصاری کے پنجہ استبداد سے کراہ رہا ہے، اور ہر جگہ مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا ہیں، ان حالات میں دعاء مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مگر بدقسمتی سے افطار کے لیے ایک سے ایک کھانے کا انتخاب اور دسترخوان کو خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؛ لیکن یہ وقت دعاء کی قبولیت اور اللہ سے مانگنے اور اپنے خالق کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا ہے، اسی کو فراموش کر دیا جاتا ہے، اس لیے ہم اس ماہ کو دعاء کا مہینہ بنالیں، خدا سے مانگنے اور خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا مہینہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ماہ کو غم گساری کا مہینہ (شہر المواساۃ) بھی فرمایا ہے، یعنی جیسے یہ خدا کو راضی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کا مہینہ ہے، اسی طرح یہ خدا کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر برتاؤ کا مہینہ بھی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اس ماہ میں تیز ہوا سے بھی بڑھ جاتی تھی، اسی لیے بعض صحابہؓ اس ماہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے اور آج کل بھی لوگ خاص طور پر اسی مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن زکوٰۃ تو ایک لازمی فریضہ ہے اور انفاق کا وہ کم سے کم درجہ ہے جس سے انسان جواب دہی سے بچ سکتا ہے؛ لیکن جیسے رمضان میں فرائض کے ساتھ نوافل کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کے ساتھ عمومی انفاق پر بھی توجہ ہونی چاہیے بہت سے لوگ محتاج وضرورت مند ہوتے ہیں؛ لیکن زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے، بہت سے دینی کام ایسے ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، ایسے مواقع پر عمومی انفاق امت کے لیے ایک ضرورت ہے اور اصحابِ ثروت کو محسوس کرنا چاہیے کہ یہ بھی ان پر ایک حق ہے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں، **ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ**۔

آیئے ہم عہد کریں کہ ایمان وعمل کی اس فصل بہار سے ہم اس کے تقاضہ کے مطابق فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی عملی زندگی کو اس کی خوش بو سے عطر بار کریں گے!

تقویٰ — روزہ کا اصل مقصود

اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں، ان میں انسان کی تربیت اور اصلاح کا پہلو بھی ملحوظ ہے، روزہ بھی ان ہی عبادتوں میں سے ایک ہے، جس میں نفس کی تربیت اور تزکیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے، قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پر روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں؛ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو: ''**كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ**'' (البقرۃ: ۱۸۳)

''تقویٰ'' کا لفظ عربی زبان میں ''وقایہ'' سے ماخوذ ہے، وقایہ کے معنی انتہائی درجہ حفاظت کے ہیں، تقویٰ کے معنی جہاں بچنے کے ہیں وہیں خوف اور خشیت کے بھی ہیں اور قرآن مجید میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: النساء: ۱، الشوریٰ: ۱۰۶، آل عمران: ۱۰۲) گویا محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

اسی کو سلف صالحین نے مختلف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، خود حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جب تک بندہ گناہ کی باتوں سے بچنے کے لیے ازراہ احتیاط بعض جائز باتوں سے بھی اجتناب نہ کرے متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ (تفسیر کبیر: ۱۸۳/۱) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حضرت ابیؓ سے تقویٰ کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت اُبیؓ نے ایک مثال کے ذریعہ تقویٰ کو سمجھایا، حضرت اُبیؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ کبھی کسی خاردار راستہ سے گذرے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں، حضرت اُبی نے دریافت کیا کہ اس موقعہ سے آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے پائینچے اٹھا لیے اور احتیاط سے کام لیا ''تشمرت وحذرت'' حضرت اُبیؓ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۶۲/۱) گویا دنیا ایک رہگذر ہے جو خاردار جھاڑیوں سے گھری ہوئی ہے، یہ جھاڑیاں خواہشات اور گناہوں کی ہیں، جو انسان کے دامن عمل سے لپٹ جانا چاہتی ہیں، متقی شخص وہ ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے دامن کو خدا کی نافرمانیوں اور عصیان شعاریوں سے بچا کر دنیا کا یہ سفر طے کرلے۔

اس طرح تقویٰ ایک جامع لفظ ہے، جو خیر کی تمام باتوں کو شامل ہے۔ (قرطبی: ۱/ ۲۶۲) چناں چہ مشہور بزرگ شیخ ابویزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ متقی وہ ہے کہ جو کچھ کہے، اللہ کے لیے کہے، اور جو کچھ کرے اللہ تعالیٰ کے لیے کرے: "**من اذا قال قال لله و من اذا عمل عمل لله**" (حوالہ سابق: ۱/۱۶۱) تقویٰ کے اسی وسیع مفہوم کو قرآن مجید نے سورۃ البقرۃ کے شروع میں بیان فرمادیا ہے کہ:

"متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔" (البقرۃ: ۳-۴)

اس سے معلوم ہوا کہ تین باتوں کو تقویٰ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان میں پہلی چیز عقیدہ و ایمان کی اصلاح ہے، یہ اسلام کی خشت اوّل ہے اور اسی پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہے، ایمان کا حاصل یہ ہے کہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی ان دیکھی باتوں پر اس کا یقین ایسا ہو جیسا انسان کو دیکھی ہوئی باتوں کا یقین ہوتا ہے، "یقین" بہ ظاہر ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے؛ لیکن درحقیقت کسی بات کا یقین انسان کی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا داعی ہوتا ہے، اگر لوگوں کے مجمع میں پلاسٹک کا مصنوعی سانپ بنا کر رکھ دیا جائے یا کسی عجائب خانہ میں شیر کا بھیانک مجسمہ بنا ہوا ہو تو کتنے ہی بڑے اور چھوٹے، بچے اور جوان، مرد اور عورت اس کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں اور بعض منچلے تو اس کی سواری کرنے سے بھی نہیں چوکتے؛ لیکن اگر لوگوں کے مجمع میں اس سے بہت چھوٹا حقیقی اور زندہ شیر آ جائے یا سانپ نکل آئے تو ہر شخص کا خوف سے بُرا حال ہوگا، اچھے اچھے بہادروں کو بھی راہِ فرار مطلوب ہوگی، نہ کھیل ہوگا نہ تماشہ ہوگا، نہ تبصرہ کی ہمت ہوگی، یہ "یقین" کا فرق ہے؛ حالاں کہ شکل و صورت کے اعتبار سے دونوں شیر اور سانپ ہیں؛ لیکن آدمی جس چیز کے بارے میں شیر اور سانپ ہونے کا یقین نہ رکھتا ہو تو خواہ بہ ظاہر وہ کتنا ہی بھیانک نظر آئے؛ اس سے کوئی خوف اور ڈر

نہیں ہوتا ہے اور جب شیر ہونے کا یقین ہو جائے تو سوچ کے انداز ہی بدل جاتے ہیں۔

''ایمان'' ایسے ہی انقلاب انگیز یقین کا نام ہے، جو دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دے اور فکر و نظر کی کائنات میں انقلاب کا پیغمبر ثابت ہو، خدا پر ایمان انسان میں ایسی کیفیت پیدا کر دے کہ گویا وہ اپنے خالق کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے دامن کو تھامے ہوا ہے، خدا کی محبت اس کے دلوں سے اُمنڈنے لگے، اللہ تعالیٰ کی خوش نودی پر چل کر وہ اتنا خوش ہو کہ گویا اس نے سب سے بڑی نعمت پالی ہے، خدا کے عذاب کا خوف اس کو لرزا دے اور اس کی آنکھوں کو اشکبار کیے بغیر نہ رہے، اسے ایسا لگے کہ جیسے جنت اور دوزخ اس کے سامنے رکھی ہوئی ہے، خدا کی کتاب پر اس کو اس درجہ کا یقین حاصل ہو کہ آنکھوں دیکھی باتوں پر بھی آدمی کو اس درجہ اطمینان نہیں ہوتا، اسے یوں لگے کہ جیسے یہ کتاب اسی کو مخاطب کر رہی اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام اور سرگوش ہے، اس کیفیت کے بغیر ہمارا ایمان ناقص اور نا تمام ہے، ایک بے روح ایمان جو نہ گناہوں سے ہمارے قدموں کو روک سکے اور نہ نیکیوں کی طرف ہمیں لے جاسکے، تقویٰ کے لیے یہ پہلا زینہ ہے!

دوسری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: نمازوں کا قائم کرنا ہے، نماز کیا ہے؟ اپنے آپ کو خدا کے آگے بچھا دینا اور سر سے پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سانچہ میں ڈھال لینا! زبان خدا کے ذکر سے تر ہے، ہاتھ نیاز مندانہ خدا کے سامنے بندھے ہوئے ہیں، آنکھیں ایک غلام کی طرح جھکی ہیں، جسم بے حرکت کھڑا ہے، پھر جب نمازی رکوع میں جاتا ہے تو فروتنی اور بڑھ جاتی ہے، پشت خمیدہ، سر افگندہ، زبان پر تسبیح، اب سجدہ کی منزل ہے، جو عجز و انکساری اور بے بسی کا نقطۂ عروج ہے، سر، پیشانی اور ناک انسان کے عزت و وقار کا سب سے بڑا مظہر ہیں؛ لیکن خدا کے سامنے یہ سب زمین پر خاک آلود ہیں، ہاتھ بچھے ہوئے ہیں، جسم کے ایک ایک انگ سے خود سپردگی اور غلامی و بندگی ظاہر ہے، قدم قدم پر خدا کی کبریائی کا نعرہ ہے، اس کی حمد و ثناء کا زمزمہ ہے، الحاح والتجا ہے، تضرع و دعاء ہے، اپنی گنہ گاری کا اقرار و اعتراف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نماز خدا کی بندگی کا ایسا فطری اور اثر انگیز طریقہ ہے کہ اس کی ایک

ایک کیفیت سے روح وجد میں آئے اور انسان کو خدا سے اپنی قربت کا احساس ہونے لگے، اس کو یوں محسوس ہونے لگے جیسے وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

پس یہ نماز ایک عنوان ہے اور اس کے ذریعہ انسان کو ان تمام اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنا ہے کہ خدا کا کوئی حکم مسلمان سے ٹوٹنے نہ پائے، ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہشات اور چاہتوں کا ایسا دیوانہ ہو جائے کہ اللہ کی مرضیات اور اس کی چاہتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، وہ خدا کے حکم کو ہر حکم پر مقدم رکھے اور جہاں نفس کو گراں گذرے وہاں بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو اپنے آپ پر نافذ کرے۔

متقیوں کی تیسری صفت ''انفاق'' ہے، انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہیں، قرآن کے بیان کے مطابق تقویٰ والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی کم وبیش عطا ہوتا ہے، وہ اس کا ایک حصہ اپنے غریب بھائیوں پر خرچ کرتا ہے، دراصل دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال ودولت ہے، اس کی حرص اَوّلاً خدا سے بے توجہ کرتی ہے، پھر دولت وثروت کا نشہ دل ودماغ پر چڑھتا ہے اور کبر وغرور انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، یہی کبر دین واخلاق کے لیے سم قاتل ہے، اس سے خودغرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے اور وہ لوگوں کے حقوق کو ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے ''انفاق'' اسی کا علاج ہے، گویا انفاق سے صرف دوسرے انسانوں کی مالی اعانت ہی مراد نہیں ہے؛ بلکہ یہ ''حقوق العباد'' کے لیے ایک عنوان کے درجہ میں ہے کہ جیسے انسان خدا کے حقوق ادا کرے، اسی طرح خدا کی مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کرے، اس لیے کہ خدا کا حق اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرے، اسی طرح خدا کی مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کرے، اس لیے کہ اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرنا ہے، خدا انسان کی عبادت اور بندگی کا محتاج نہیں اور لوگوں کے حقوق کا ادا کرنا لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر ہے کہ انسان محتاج اور ضرورت مند ہے، اسی لیے بعض وجوہ سے حقوق الناس کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی زیادہ ہے۔

اس طرح تقویٰ تین باتوں کو شامل ہے، دل میں ایمان ویقین کی حقیقی کیفیت کو پیدا کرنا، ایسا یقین جو دل کی دنیا کو بدل دے اور خدا کی مرضیات کو بجالانے میں اسے لطف آنے لگے، دوسرے وہ اللہ کے حقوق کو ادا کرنے والا ہو، فرائض و واجبات کو پورا کرتا ہو اور گناہوں سے بچتا ہو، تیسرے وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، مال کے ذریعہ بھی غریب بھائیوں کا تعاون کرتا ہو اور اپنی زبان سے بھی لوگوں کی عزت وآبرو کو محفوظ رکھتا ہو، اس طرح تقویٰ پوری انسانی زندگی کو شامل ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔

انسان کو چاہیے کہ جیسے وہ اپنی جسمانی بیماریوں کو تلاش کرتا ہے، اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو بھی تلاش کرے اور ان کے علاج کی طرف متوجہ ہو، کسی کی بیماری ایمان و عقیدہ میں چھپی ہوئی ہے وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے؛ لیکن توہمات کا شکار ہے اور خدا سے نفع ونقصان کے بجائے دنیا کی چیزوں سے نفع ونقصان کا یقین اپنے دل میں بٹھائے ہوئے رہے، خدا کے خزانۂ غیبی سے زیادہ دنیا کے اسباب پر اس کا یقین ہے، تو اس کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی اصلاح کرے، اگر ایک شخص نیکیوں کے تمام کام کرتا ہو؛ لیکن نماز کی توفیق سے محروم ہو تو نماز کا اہتمام ہی اس کے لیے تقویٰ کی کسوٹی ہے، عبادت کا اہتمام کرتا ہو؛ لیکن لوگوں کے حقوق میں غافل ہو، غریب بھائیوں پر خرچ کرنا اس کی ڈکشنری میں نہ ہو تو اس کے لیے تقویٰ کا معیار ''انفاق'' ہے، اگر نماز وروزہ کی بھی توفیق ہو، اللہ کے راستہ میں خرچ بھی کرتا ہو؛ لیکن اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں، اس کی زبان لوگوں کی عزت ریزی پر کمر بستہ رہتی ہو، اس کا سینہ کینوں اور کدورتوں سے معمور ہو، لوگ اس کی ترش روئی سے گھبراتے اور اس کی تند کلامی سے خوف کھاتے ہوں تو اخلاق میں اس کا تقویٰ چھپا ہوا ہے، اگر وہ اس کی اصلاح کرلے، تو ''متقی'' ہے۔

غرض تقویٰ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے اور تقویٰ کی منزل تک پہنچنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان اپنی روحانی بیماری کی شناخت کرے اور جہاں گناہ کا پیپ ہے وہیں اصلاح کا نشتر لگائے، اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ نیکیوں کی توفیق فرمائی، تو اس سے دھوکہ نہ کھائے

کہ کسی مریض کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند تصور کرنے لگے، روزہ کا مقصد ایک مسلمان کو تقویٰ کی منزل تک پہنچانا ہے، اب جب کہ رمضان المبارک کے آخری ایام ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور احتساب کا آئینہ اپنے رخِ زندگی کے سامنے کردیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے تقویٰ کی طرف سفر شروع کردیا ہے اور اگر شروع نہیں کیا تو کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟؟؟

زکوٰۃ کے مصارف اور موجودہ حالات

زکوٰۃ ایک اہم ترین عبادت ہے، جس کا بنیادی مقصد ہے: غرباء کی ضرورتوں کو پوری کرنا؛ لیکن زکوٰۃ خرچ کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ جس پر چاہیں، اس رقم کو خرچ کردیں؛ بلکہ خود زکوٰۃ کے مصارف متعین فرمادیئے، سورہ توبہ کی آیت نمبر: ۶۰ میں اس کا ذکر موجود ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب زکوٰۃ کے طلب گار ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو زکوٰۃ کے معاملہ یہ بات پسند نہیں آئی کہ پیغمبر یا کوئی اور شخص اس کا مصرف متعین کرے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی مستحقین زکوٰۃ کی آٹھ مدات متعین فرمادیں، اگر تم اس میں سے ہو تو میں تمہیں اس میں سے دوں گا: '' **فان کنت من اهل تلک الاجزاء اعطیتک**'' (ابوداود، عن زیاد بن حارث صداعی، باب من یعطی من الصدقۃ وحد الغنی، حدیث نمبر: ۱۶۳۲)

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے مصارفِ زکوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: ''**انما الصدقات**'' عربی گرامر کے رو سے 'انما' کا لفظ حصر اور محدودیت کو بتاتا ہے، یعنی زکوٰۃ صرف ان ہی آٹھ مصارف میں خرچ کی جاسکتی ہے، کسی اور مصرف میں نہیں؛ اس لیے مصارف زکوٰۃ کی بڑی اہمیت ہے!

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں پہلا اور دوسرا مصرف فقراء اور مساکین ہیں، فقیر و مسکین میں سے ایک کے معنی ضرورت مند کے ہیں اور دوسرے کے بہت زیادہ ضرورت مند کے؛ لیکن اس غربت کا معیار کیا ہے، جس کی بنیاد پر کسی کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نظر ہے کہ اس شخص کے پاس نصابِ زکوٰۃ کے بقدر مال موجود نہ ہو؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے والی کو زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے سلسلہ میں حکم دیا کہ زکوٰۃ مسلمان مال داروں سے لی جائے اور ان ہی کے فقراء میں تقسیم کردی جائے: ''**تواخذ من اغنیاء هم وترد فی فقراء هم**'' (**بخاری، عن ابن عباس، باب وجوب الزکوٰۃ**، حدیث نمبر: ۱۳۹۵) اس سے معلوم ہوا کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہوجائے،

وہ شریعت کی نظر میں غنی یعنی مال دار ہے، اور جس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو وہ فقیر اور مستحق زکوٰۃ ہے؛ لیکن موجودہ حالات میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ روپیہ، مالِ تجارت اور سونے یا چاندی کے نامکمل نصاب میں چاندی کے نصاب چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا یا سونے کے نصاب ساڑھے ستاسی گرام سونے کا؟ عام طور پر علماء ہند نے چاندی کے نصاب کو معیار مانا ہے، اور عرب علماء وفقہاء نے سونے کے نصاب کو، موجودہ زمانہ میں چاندی کے نصاب کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے، بہت سی دفعہ نہایت محتاج حضرات بھی اس نصاب کے حامل ہوتے ہیں؛ اس لئے اس حقیر کا رجحان دوسری رائے کی طرف ہے، بہر حال جو لوگ نصابِ زکوٰۃ کے بہ قدر مال کے مالک نہ ہوں اور اس معیار کے مطابق غریب ومحتاج ہوں، ان ہی کے لئے زکوٰۃ جائز ہے، افسوس کہ آج کل اچھے خاصے، کھاتے کماتے لوگ اپنے لئے زکوٰۃ کے طلب گار ہو جاتے ہیں، کبھی اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے زکوٰۃ کی بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنی ضرورت پوری ہو جانے کے باوجود سوال کا ہاتھ پھیلایا، وہ اپنے لئے دوزخ کی آگ میں اضافہ کرتا ہے: "**من سأل وعنده مايغنيه فانما يستكثر من النار**" **وقال النفيلي في موضع آخر: "من جمر جهنم**" (تفسیر قرطبی: ۱۷۳/۸)

زکوٰۃ دینے والوں کو بھی چاہئے کہ زکوٰۃ چاہے کسی فرد کو دیں یا کسی ادارہ کو؟ اچھی طرح تحقیق کر لیں کہ کیا واقعی یہ شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے؟ کیا یہ ادارہ عالم واقعہ میں موجود ہے؟ ان کے یہاں زکوٰۃ کے مدات ہیں یا نہیں؟ اگر خود تحقیق نہ کر سکیں تو معتبر لوگوں اور اداروں کی تحقیق پر بھروسہ کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن بہتر یہی ہے کہ خود تحقیق کر کے مطمئن ہو جائیں، اگر بلا تحقیق زکوٰۃ دے دی؛ حالاں کہ وہ شخص یا ادارہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی: "**انه اذا دفعها اليه وهو شاک ولم يتحر او تحّر ولم يظهر له انه مصرف او غلب على ظنه انه ليس بمصرف فهو على الفساد**" (تبیین الحقائق: ۳۰۴/۱)

اسی طرح پیشہ ور بھکاریوں کو بھی زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ضرورت

کی بنا پر نہیں ؛ بلکہ پیشے کے طور پر بھیک مانگتے ہیں ؛ حالاں کہ ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں موجود ہوتی ہیں، ان کو زکوٰۃ دینا گداگری کی خُو کو بڑھانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کی شفقت و رحمت ہوسکتی ہے؟ لیکن جب آپ کے سامنے ایک صاحب نے دست سوال پھیلایا تو آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ان کو محنت کر کے کھانے کی تدبیر بتائی۔ (ابن ماجہ، عن انس، حدیث نمبر: ۲۱۹۸) اس لیے بھکاریوں کی اس خو کو بڑھا کر ملت کی ذلت و رسوائی میں اضافہ کا سبب نہیں بننا چاہئے۔

زکوٰۃ کا تیسرا مصرف 'عاملین' یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے ہیں، اصل عاملین تو اسلامی حکومت کی طرف سے ہوا کرتے تھے؛ لیکن نہ صرف ہندوستان بلکہ خود مسلم ممالک میں بھی آج نہ اسلامی حکومت ہے اور نہ بیت المال؛ اس لئے جو لوگ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے حساب و کتاب وغیرہ کا کام انجام دیتے ہیں، ان کو زکوٰۃ میں سے اجرت ادا کی جاسکتی ہے، یہ رقم ان کو اعانت اور زکوٰۃ کے طور پر نہیں ؛ بلکہ بطور اجرت اور حق الخدمت کے دی جائے گی ؛ کیوں کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کا کام کرتے ہیں؛ اس لئے مستحقین زکوٰۃ کے اجیر ہونے کی حیثیت سے انھیں اجرت دی جاتی ہے؛ اسی لئے عاملین کا غریب اور مستحق زکوٰۃ ہونا ضروری نہیں ہے؛ کیوں کہ نتیجہ کے اعتبار سے انھیں یہ رقم بطور زکوٰۃ کے نہیں دی جاتی، زکوٰۃ کے مالک تو وہ لوگ ہیں جن پر زکوٰۃ خرچ کی جاتی ہے؛ لیکن وہ اس مال کے مالک کی حیثیت سے لوگوں کو ان کا محنتانہ ادا کرتے ہیں۔

اجرت کے سلسلہ میں اصول ہے کہ اجیر کا کام متعین ہو اور اس کی اجرت مقرر ہو؛ لہٰذا آج کل مدارس اور دوسرے دینی اداروں کے جو سفراء ہیں، ان کی تنخواہ مقرر ہونی چاہئے نہ کہ کمیشن، جیسا کہ آج کل بعض چھوٹے چھوٹے اداروں کے سلسلہ میں سننے میں آتا ہے، ہاں ا اس بات کی گنجائش ہے کہ تنخواہ مقرر کرتے ہوئے وصولی کی ایک مقدار مقرر کردی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اگر آپ اس سے زیادہ وصول کریں گے تو آپ کو خصوصی انعام بھی دیا جائے گا، اس طرح ان کو محنت کرنے کی ترغیب ہوگی، یہ تنخواہ ان کی وصولی کی صلاحیت کے لحاظ سے

مقرر ہوسکتی ہے اور جیسے جیسے وصولی بڑھتی جائے ، ان کی تنخواہ بڑھائی جاسکتی ہے، اس سے کام کرنے والوں میں اخلاص کی کیفیت بھی باقی رہے گی ، شرعی قباحت بھی پیدا نہ ہوگی اور محنت سے کام کرنے کی ترغیب بھی ہوگی ؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اپنے پانچویں سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں بالاتفاق چندہ وصولی پر کمیشن کے ناجائز ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

یہ بات بھی ضروری ہے کہ محصلین اپنی وصول کردہ رقومِ زکوٰۃ پہلے مدرسہ یا ادارہ میں جمع کردیں ، پھر ذمہ دار ادارہ جیسے دوسرے عملہ کو تنخواہ دیتا ہے، اسی طرح ان کی بھی تنخواہ ادا کرے ؛ تاکہ ان کے حق الخدمت میں اجرت کی کیفیت برقرار رہے ، رقم ادا کئے بغیر اپنے طور پر وصول شدہ رقم سے مختتانہ وصول کر لینا گویا زکوٰۃ کی رقم لینا ہے ؛ حالاں کہ اس کو جو کچھ دیا جائے گا ، وہ بطور حق المحنت کے ہے نہ کہ بطور زکوٰۃ کے — یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ زکوٰۃ کا اصل مصرف فقراء و مساکین ہیں ، عاملین کی حیثیت ضمنی ہے ؛ کیوں کہ وہ فقراء کے لئے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں تو ان کی ایسی اجرت مقرر نہیں ہونی چاہئے کہ گویا زکوٰۃ ان ہی کے لئے وصول کی گئی ہے ، زکوٰۃ دینے والے ، مدرسہ یا ادارہ کو زکوٰۃ دیتے ہیں کہ وہ اس کو ضرورت مندوں پر خرچ کریں نہ کہ محصلینِ زکوٰۃ کی ضروریات کے لئے ؛ اس لئے اس کام پر اجرت کی غیر معمولی مقدار شریعت کے مزاج کے بھی خلاف ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے کے منشاء کے بھی مغائر ہے۔

چوتھا مصرف ’ مؤلفۃ القلوب ‘ ہیں ، تالیف قلب سے دل جوئی کرنا مراد ہے، مفسرین کے یہاں اس سلسلہ میں خاصا اختلاف ہے کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں ؟ فقہاء کے ایک گروہ کے نزدیک اس میں غیر مسلموں کے بھی دو گروہ شامل ہیں ، ایک : وہ جن کے بارے میں امید کہ مالی اعانت سے متاثر ہوکر وہ دامن اسلام میں آجائیں گے ، دوسرے : وہ لیڈر اور زور آور قسم کے لوگ ، جن کی اعانت کر کے ان کو خاموش رکھا جاسکتا ہو ، مسلمانوں کے بھی دو گروہوں کا فقہاء نے ذکر کیا ہے ، ایک : مسلم ملک کی سرحد پر آباد لوگ ، کہ وہ اپنی جگہ جمے رہیں ، چھوڑ کر شہر کی طرف نہ آجائیں ؛ کیوں کہ اس زمانہ میں ملک کی حفاظت کے لئے تنخواہ

دار فوجیوں کا انتظام نہیں تھا، رضا کارانہ طور پر ہر شخص ملک کے دفاع کی خدمت انجام دیتا تھا، اس لئے سرحدی آبادیوں کی بڑی اہمیت تھی اور گویا ان کی حیثیت ایک دفاعی لائن کی ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ اب یہ صورت باقی نہیں رہی، دوسرے: وہ نو مسلم حضرات جن کے بارے میں امکان ہو کہ مالی اعانت کی وجہ سے ان کے ایمان میں پختگی اور ثابت قدمی پیدا ہوگی، نیز ان کی بہتر صورت حال کو دیکھ کر سابق سماج سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوگی، سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس سلسلہ کو اس لئے بند فرمادیا کہ اس وقت اسلام کو ایسا غلبہ حاصل ہو چکا تھا کہ اس مد کی ضرورت باقی نہیں رہی؛ لیکن موجودہ حالات میں اس کا حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس میں اہل علم کے درمیان اختلاف رائے ہے، تاہم اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو نو مسلم غربت و افلاس سے دوچار ہوں، اپنے سابق سماج کو چھوڑنے کی وجہ سے بے سہارا ہو گئے ہو، ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور ان کو ترجیحی طور پر زکوٰۃ دینی چاہئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں، انہیں بعض اوقات جسمانی تکلیف بھی پہنچائی جاتی ہے اور ایسا نہ بھی ہو تو کم سے کم انھیں سماج سے الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے، گھر سے نکال دیا جاتا ہے، رشتہ دار ترک تعلق کر لیتے ہیں، ملازمت سے ہٹا دیا جاتا ہے، نئی ملازمت بھی نہیں مل پاتی ہے، اگر ان کا تعلق نیچی ذات سے ہو تو جو خصوصی مراعات حاصل تھیں، وہ ختم کر دی جاتی ہیں، ان حالات میں اگر مسلمان انھیں سہارا نہ دیں اور اپنے سینے سے نہ لگائیں تو کون ہے جو ان کے لئے سہارا بنے؟ بعض دفعہ ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ اس کسمپرسی سے تنگ آکر وہ کفر کی طرف واپس ہو جاتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ خاندانی مسلمان نہ تو ان کو اپنی لڑکیاں دیتے ہیں اور نہ ان کی لڑکیاں اپنے یہاں لاتے ہیں، وہ مسلمان ہو کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ دوسرے درجہ کا مسلمان ہے؛ اس لئے جو لوگ واقعی نو مسلم ہیں اور وہ بطور پیشے کے ہاتھ نہیں پھیلاتے؛ بلکہ حقیقت میں ضرورت مند ہیں، ان کا زکوٰۃ و صدقات کے ذریعہ تعاون کرنا چاہئے؛ البتہ تحقیق ضروری ہے؛ کیوں کہ بعض ایسے حضرات بھی ہیں کہ کئی

پشت پہلے ان کے آباء واجداد مسلمان ہوئے اور اب وہ بہتر زندگی گذار رہے ہیں؛ لیکن پھر بھی اپنے آپ کو نومسلم کہہ کر چندہ وصول کرتے پھرتے ہیں، اسی طرح بعض نومسلموں نے اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا ہے، وہ صحت مند ہونے کے باوجود کام کاج نہیں کرتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں، ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دے کر ان کی ہاتھ پھیلانے کی خو کو بڑھانا نہیں چاہئے؛ بلکہ ان کی تربیت کرنی چاہئے کہ وہ محنت مزدوری کر کے حلال روزی کمائیں کہ یہ بھی ایک شرعی فریضہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دین فطرت بنایا ہے اور ہمیشہ اس کی اشاعت، اس کی فطری تعلیمات، روحانیت اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے ہوئی ہے، یہ دین اپنی اشاعت میں نہ دولت کا محتاج ہے اور نہ طاقت کا، پوری اسلامی تاریخ اس پر شاہد ہے؛ البتہ برادرانِ وطن کو اسلام کی دعوت دینے اور اسلام کی طرف لانے میں مالی اخراجات بھی مطلوب ہوتے ہیں، اور انھیں غیر مسلم مدعوئین پر بھی خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس کے لئے مسلمانوں کو عطیات کی رقم پیش کرنی چاہئے، مسلمان اصحابِ خیر، تجار، اور سرکاری ملازمین تیس فی صد سے ستر فی صد تک انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں تو کیا وہ دین کے اتنے اہم مقصد کے لئے اپنی آمدنی کا ایک دو فیصد خرچ نہیں کر سکتے؟ یہ بات بڑی ہی افسوس ناک ہے کہ ملت میں سارے اجتماعی کاموں کو زکوٰۃ کی رقم سے پورا کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے، آخر اس ڈھائی فی صد رقم سے کیا کیا کام ہو سکے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے: ''ان فی المال حق سوی الزکوٰۃ'' (ترمذی، عن فاطمۃ بنت قیس، باب ماجاء ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ، حدیث نمبر: ٦٦٠) اس حق کو بالکل فراموش کر دینا اور سارے کام کو اسی ڈھائی فی صد پر منحصر کر دینا کیا شریعت کی پیروی اور دین سے حق محبت کی ادائیگی کے لئے کافی ہے؟

زکوٰۃ کے پانچویں مصرف کو قرآن نے ''وفی الرقاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ''رقبۃ'' کے معنی گردن کے ہیں، یعنی اگر کسی کی گردن پھنسی ہوئی ہو تو اس کو چھڑایا جائے، یہ عربی زبان کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے 'غلام' مراد ہیں، مطلب یہ ہے کہ غلام کی مدد کی جائے

کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کرا سکیں، یا ان کو خرید کر آزاد کر دیا جائے، اسلام بنیادی طور پر انسانوں کو غلام بنانے یا غلام بنائے رکھنے کا قائل نہیں ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں تشریف لائے، اس وقت بیک جنبشِ قلم غلامی کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی، مختلف ایسی تدبیریں مقرر کیں کہ غلاموں اور باندیوں کی آزادی کا راستہ فراہم ہو جائے، جن غلاموں کو آزادی حاصل کرنے میں پیسوں کی ضرورت تھی، ان کی مدد کرنے کی تلقین فرمائی، جنگوں میں جو لوگ قید ہو کر آتے تھے، عام طور پر انھیں غلام بنالیا جاتا تھا، آپ نے ان کو کبھی یوں ہی رہا کر دیا، کبھی فدیہ لے کر رہا کیا، کچھ لوگوں کو جنگی قیدیوں کے تبادلہ میں رہا فرمایا اور بہت کم قیدی تھے جن کو غلام اور باندی بنایا گیا؛ کیوں کہ ان کو آزاد کر دینا مصلحت کے خلاف تھا؛ بہر حال ان بالواسطہ تدابیر کا اثر یہ ہوا کہ غلامی کا جو رواج نا معلوم تاریخ سے موجود تھا، وہ دنیا سے ختم ہو گیا؛ البتہ اب بھی مغرب نے غلام بنانے کا نظام باقی رکھا ہے، پہلے افراد کو غلام بنایا جاتا تھا اور اب وہ پوری پوری قوم کو غلام بناتے ہیں۔

ہمارے موجودہ معاشرہ میں غلامی سے ملتی جلتی بلکہ اس سے بھی بدترین بعض شکلیں پائی جاتی ہیں، اور وہ ہیں جیل کی کوٹھریوں میں بند لوگ، ان میں بہت سے وہ مسلمان نوجوان ہیں جن کو بالکل جھوٹے مقدمات میں پھنسایا گیا ہے، ان کے پسماندگان کا تکفل اور مقدمات کی چارہ جوئی میں ان کا تعاون مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے، اسی طرح بہت سے مسلمان جرمانے کی معمولی مقدار پانچ دس ہزار ادا نہ کرنے کی وجہ سے جیل کی سلاخوں میں پڑے ہوئے ہیں، ان غریب ومحتاج مسلمان قیدیوں کی زکوٰۃ سے مدد کرنی چاہئے؛ کیوں کہ وہ بھی ''رقاب'' کے درجہ میں ہیں؛ بلکہ جو لوگ جیل میں وقت گذار کر اور باعزت طور پر رہا ہو کر باہر آتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ بہت سے غیر مسلم بھائی بھی جرمانہ کی تھوڑی سی رقم نہ ادا کرنے کی وجہ سے جیل میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ عمومی طور پر دَلت ہیں؛ کیوں کہ مسلمانوں کے بعد سب سے مظلوم طبقہ ان ہی لوگوں کا ہے، زکوٰۃ کی رقم تو مسلمانوں پر ہی خرچ کی جاسکتی ہے؛

لیکن عطیات کی رقم کے ذریعہ ہمیں ان پریشان حال بھائیوں کی طرف بھی مدد کا ہاتھ بڑھانا چاہئے اور اسلام نے انسانی بنیاد پر حسن سلوک کی جو تعلیم دی ہے، اس کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہئے، خلیجی ملکوں میں بھی بہت سے مسلم نوجوان جیلوں میں سڑ رہے ہیں، ان میں اکثر و بیشتر ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی میں یا ایکسیڈنٹ کی بنیاد پر ہلاکت کی وجہ سے گرفتار ہوئے، جو مسلمان خلیجی ممالک میں کام کررہے ہوں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی خبر گیری کریں اور ان کے مسائل حل کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں۔

البتہ قیدی ہندوستان میں ہوں یا بیرونِ ملک میں، جو لوگ واقعی سنگین جرائم کے مرتکب ہیں اور قتل، آبروریزی، رہزنی اور ناجائز قبضہ وغیرہ کی وجہ سے گرفتار کئے گئے ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی مظلوموں کے ساتھ ناانصافی ہے، ان کے قرار واقعی سزا پانے میں ہی سماج کی بھلائی ہے، اس لئے ان کی رہائی کی کوشش اور اس کے لئے مدد مناسب نہیں؛ ہاں، ان کے مجبور و مفلس پسماندگان کی ضروریات پوری کرنے میں مدد کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کا چھٹا مصرف ''غارمین'' ہیں، غارمین سے مراد وہ مقروض ہیں، جن کے اندر قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں ہو، اور قرض دینے والے قرض معاف کرنے کو تیار نہ ہوں، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکے زمانہ میں ایک صاحب کے پھلوں کی فصل متاثر ہوگئی اور قرض بہت زیادہ ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے صحابہؓ سے فرمایا: انہیں صدقہ دو؛ چنانچہ صحابہؓ نے انہیں صدقہ دیا: ''**فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم تصدقوا عليه فتصدق الناس عليه.** '' (**سنن ابن ماجه، باب تفليس المعدوم والبيع عليه لغرمائه، عن ابی سعید الخدریؓ**، حدیث نمبر: ۲۴۴۲)

البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں، ایک یہ کہ مقروض اس وقت زکوٰۃ کا مستحق ہے کہ اگر اس کی املاک سے اس کا سارا قرض ادا کردیا جائے تو وہ نصاب کے بقدر مال کا مالک باقی نہ رہے، ایسے شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ پہلے تو وہ بنیادی ضرورت کے علاوہ املاک فروخت کرکے قرض ادا کرنے کی کوشش کرے؛ لیکن اگر وہ کافی نہ ہوسکے اور بقیہ قرض کو

قرض دینے والے معاف کرنے کو تیار نہ ہوں تو ان قرضوں کی ادائیگی میں زکوٰۃ کی رقم سے ان کا تعاون کیا جاسکتا ہے، دوسری بات وہ ہے جو مشہور مفسر علامہ قرطبی نے لکھی ہے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے جائز کاموں کے لئے قرض لیا ہو، اگر ناجائز کام کے لئے قرض لیا ہو تو اس کی مدد نہیں کرنی چاہیے، سوائے اس کے کہ وہ توبہ کرلے، توبہ کرا کر اور آئندہ اس سے بچنے کا عہد لے کر پھر اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۸۳/۸) موجودہ دور میں اس کی ایک مثال بینک سے لئے جانے والے سودی قرض ہیں، ایسے لوگوں کا اسی وقت تعاون کیا جائے جب ان سے توبہ کرالی جائے، اور بہتر ہے کہ یہ توبہ تحریری طور پر ہو، افسوس کہ بعض لوگ اس طرح قرض لیتے ہیں کہ انھوں نے قرض کو آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے، وہ قرض کے ذریعہ اپنی فضول خرچی کے جذبات کی تسکین کرتے ہیں اور غیر ضروری چیزیں خرید خرید کر اپنے اوپر قرض کا بوجھ بڑھاتے جاتے ہیں، پھر لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے ہیں، ایسے لوگ تنبیہ اور اصلاح کے مستحق ہیں نہ کہ تعاون کے۔

ساتواں مصرف ''فی سبیل اللہ'' ہے، فی سبیل اللہ کے معنی ہیں: اللہ کے راستہ میں جدوجہد کرنے والے، اگرچہ اس کا معنی عام ہے؛ لیکن اصطلاح میں اس سے مجاہدین مراد ہیں، جیسے صلوٰۃ کے لغوی معنی دعاء کے ہیں؛ لیکن اصطلاح میں اس سے نماز مراد ہے نہ کہ دعاء، اسی طرح فی سبیل اللہ میں یوں تو ہر کارِ خیر شامل ہے؛ لیکن یہاں اس سے جہاد مراد ہے؛ کیوں کہ قرآن و حدیث میں عام طور پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے؛ اسی لئے جمہور علماء کی رائے یہی ہے اور شروع سے رہی ہے کہ اس سے مجاہدین مراد ہیں، ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس مصرف کا کوئی محل نہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس مد کو ہر طرح کے کارِ خیر میں استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسے: ہاسپٹل، کتابوں کی طباعت، دعوتی کوششیں، ٹی وی چینل وغیرہ، یہ نقطہ نظر جمہور فقہاء و محدثین کی رائے کے خلاف ہے، اس پر قرآن و حدیث کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں، اور غور کیجئے کہ اگر اس مصرف میں اس درجہ عموم ہوتا تو زکوٰۃ کے آٹھ مصارف کو بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہی ایک صورت ان تمام مصارف کو شامل ہو جاتی، صرف لغوی

معنی کی بنیاد پر اس لفظ کے مفہوم میں اس درجہ کی وسعت ایسے ہی ہوگی کہ جیسے کوئی ''صلوٰۃ'' کے لفظ کی وجہ سے نماز کی ادائیگی کے لئے دعاء کو کافی سمجھ لے۔

ہاں ! البتہ مولفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ کے تذکرہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ زکوٰۃ کے دو بنیادی مقاصد ہیں ، ایک : غرباء کی ضرورت کو پورا کرنا ، دوسرے : اسلام کی حفاظت و سربلندی ؛ لہٰذا جو اشخاص یا ادارے دین کی سربلندی کا کام کرتے ہوں ، ان کو اس لئے زکوٰۃ دینا کہ وہ اس کام میں شامل محتاج لوگوں کی اعانت کریں ، زیادہ بہتر ہے ، جیسا کہ آج کل دینی درس گاہیں علم دین حاصل کرنے والے طلباء و طالبات پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرتے ہیں اور انھیں آئندہ اسلام کی اشاعت وحفاظت کی وسیع تر خدمت کے لئے تیار کرتے ہیں ، امام غزالیؒ وغیرہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے ، یا ان دینی تنظیموں کی جو خدمت خلق کا کام کرتی ہیں اور مستحقین زکوٰۃ کو زکوٰۃ کی رقم کا مالک بنا دیتی ہیں ۔

زکوٰۃ کا آٹھواں مصرف 'مسافر' ہیں ، جن کو عربی زبان میں ''ابن سبیل'' بھی کہا جاتا ہے اور قرآن مجید نے بھی مصارفِ زکوٰۃ کے ذیل میں ان کے لئے یہی لفظ استعمال کیا ہے ، انسان چاہے اپنے وطن میں صاحب ثروت ہو ؛ لیکن بعض دفعہ سفر میں پیسے پیسے کا محتاج ہوجاتا ہے ، اگر واقعی کوئی شخص ایسی صورت حال سے دوچار ہو اور اس کے لئے اپنے گھر سے فوری طور پر رقم منگوانی ممکن نہ ہو تو اتنی مقدارِ زکوٰۃ سے اس کا تعاون کیا جاسکتا ہے کہ وہ گھر پہنچ جائے ؛ لیکن آج کل بعض لوگوں نے اس کو پیشہ بنا رکھا ہے ، یہاں تک کہ ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگوں نے دھوکہ کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے روپیہ کے بجائے ٹکٹ بنا کر دے دیا ؛ لیکن مصنوعی مسافر نے ٹکٹ واپس کر کے پیسے واپس لے لئے ، موجودہ دور میں اے ، ٹی ، ایم اور بینک کا نظام کچھ ایسا سہولت بخش ہوگیا ہے کہ لمحوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم پہنچ جاتی ہے ، نیز مسافر جو پتہ بتاتا ہو ، فون کے ذریعہ اس کے بارے میں معلومات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں ؛ اس لئے مناسب تحقیق کے بغیر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم نہیں دینی چاہئے ۔

یہ تو وہ مصارف ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے ؛ لیکن بعض ترجیحی

مصارف ہیں، ان میں سے دینی مدارس اور دینی اداروں کا ذکر پہلے آچکا ہے، دوسرا ترجیحی مصرف اپنے قرابت دار اور رشتہ دار ہیں، رشتہ داروں کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اُصول یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی اور ان کے اوپر کا سلسلہ ہو تو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، اسی طرح فروع یعنی اولاد، اولاد کی اولاد اور ان کے نیچے کے سلسلہ کو بھی زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، اسی طرح شوہر و بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، باقی تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، جیسے: بھائی، بہن، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ، ساس، سسر، سالے اور سالی، ان سبھوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور ان کو زکوٰۃ دینے میں دہرا اجر ہے، ایک: زکوٰۃ کی ادائیگی کا، دوسرے: صلہ رحمی کے تقاضہ کو پورا کرنے کا، یہ حکم صرف زکوٰۃ ہی کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ تمام صدقات کے لئے ہے، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ پوری کی پوری زکوٰۃ اپنے رشتہ دار ہی کو دے دی جائے؛ بلکہ جو مصارف موجود ہیں، ان سب پر خرچ کرنے کی کوشش کی جائے؛ البتہ مستحق زکوٰۃ رشتہ داروں کو خصوصی اہمیت دی جائے۔

تیسری ترجیح پڑوسیوں کی ہوسکتی ہے — ''زکوٰۃ پڑوسیوں پر خرچ کی جائے'' خاص اس سلسلہ میں تو غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت منقول نہیں ہے؛ لیکن عمومی طور پر پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اور حسن سلوک کی ایک شکل زکوٰۃ کے ذریعہ اعانت بھی ہے؛ اس لئے پڑوسی اور قرب و جوار کے لوگوں کو زکوٰۃ میں یاد رکھنا چاہئے؛ لیکن بعض ناسمجھ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زکوٰۃ دینی مدارس اور اداروں کو نہ دی جائے، پڑوسیوں کو ہی دی جائے، یا ایک شہر کی زکوٰۃ اسی شہر میں خرچ ہو، دوسری جگہ خرچ نہ ہو، یہ دین سے ناواقفیت اور اسلام کے آفاقی مزاج سے محرومی کا نتیجہ ہے، ہمارے ملک میں کتنے ہی مدارس اور دینی و ملی کام ہیں، جن کی ضروریات کی تکمیل بیرونِ ملک کے تعاون سے ہوتی ہے، اور یہ تعاون قانونی طور پر آتا ہے، پھر بعض ایسے شہر ہیں جس میں مسلمان اصحابِ ثروت، تجار اور صنعت کار بڑے پیمانہ پر زکوٰۃ نکالتے ہیں اور پورے ملک کے دینی کاموں کو وہاں سے غذا حاصل ہوتی ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر ممبئی کا نام لیا جاسکتا ہے تو اگر ہر علاقہ کے لوگ

اپنے تعاون کو اپنے شہر تک محدود کردیں، تو ملک میں پھیلی ہوئی اتنی بڑی ملت کی دینی اور معاشی ضروریات کیسے پوری ہوسکتی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن اور بعض دور دراز کے علاقوں سے زکوٰۃ وصول کرکے مدینہ لائی جاتی تھی اور اس کا بیشتر حصہ اہل مدینہ پر خرچ ہوتا تھا، خلفاء راشدین کے عہد میں بھی عالم اسلامی کے چپہ چپہ سے زکوٰۃ وصول کرکے بیت المال پہنچتی تھی اور بیت المال سے ہر جگہ وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے مدد پہنچتی تھی۔

مسلمان ایک آفاقی امت اور عالمی خاندان ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکی نسبت نے آپس میں جوڑ رکھا ہے، اسے اس معاملہ میں کنواں نہیں بننا چاہئے، سمندر بننا چاہئے، سمندر اپنا سینہ جلاکر اور بھاپ جمع کرکے ہواؤں کے حوالہ کرتا ہے؛ تاکہ وہ بادل بن کر دور دور تک برسے، مسلمانوں کا مزاج یہی ہونا چاہئے کہ ان کا تعاون دور دور تک پہنچے اور دین کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ان کی شرکت ہو، یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا تو انھیں نصیحت کی کہ پہلے انھیں ایمان کی دعوت دینا، جب وہ ایمان لے آئیں تو نماز کا حکم دینا اور نماز پڑھنے لگیں تو زکوٰۃ کا حکم دینا، ان کے مال داروں سے زکوٰۃ لینا اور ان ہی کے غریبوں میں تقسیم کردینا۔ (بخاری، عن ابن عباسؓ، حدیث نمبر: ۱۳۹۵) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دعوتی مصلحت کے تحت تھا کہ ان کو یک لخت دین کے تمام احکام کی طرف لانے کے بجائے بتدریج اسلامی تعلیمات کی تلقین کرو؛ تاکہ وہ بوجھ نہ محسوس کریں اور زکوٰۃ لے کر وہیں تقسیم کردو؛ تاکہ کہیں ان کو غلط فہمی نہ ہوجائے کہ اس دین کا مقصد ہم سے پیسہ وصول کرنا ہے؛ تاہم یہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے کہ جہاں کی زکوٰۃ ہو، لازماً وہیں خرچ کردی جائے۔

بہرحال زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے، یہ ایک عظیم الشان عبادت ہے اور اس سے خالق اور مخلوق دونوں کا حق متعلق ہے، اس عبادت کو اہتمام کے ساتھ انجام دینا چاہئے اور تحقیق کے بعد صحیح مصرف تک پہنچانا چاہئے۔ وباللہ التوفیق!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُسوہ

اسلام کے اصل معنی افگندگی اور تسلیم و رضا کے ہیں، انسان اپنے آپ کو خالق کے حکم کے سامنے بچھادے، اپنی خواہشات کو خدا کی رضا جوئی کی چوکھٹ پر قربان کردے اور یہ عقیدہ وایمان سے لے کر جان و مال اور اس سے بڑھ کر اولاد و عیال تک ہو جائے تو یہ بندگی کا کمال اور عبدیت کی معراج ہے، عبدیت و بندگی کا یہ درجہ و مقام انسان کے جس گروہ کو سب سے بڑھ کر حاصل ہے، وہ حضراتِ انبیاء کرام ہیں جو اللہ کے سب سے محبوب بندے اور انسان کے لیے اسوۂ کامل ہیں، ان کا ایک ایک عمل زمین پر اللہ کی مرضیات کی زندہ شہادت ہے، یہ انبیاء زمین پر ہدایت کی روشنی اور مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت انبیاء کرام علیہم السلام میں بھی کسی قدر مرتبہ و مقام کا فرق رکھا ہے، نبوت کے سلسلۃ الذہب میں ایک نہایت عظیم اور برگزیدہ شخصیت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے، اللہ کی رضا و خوش نودی کے لیے قربانی کی کوئی قسم نہیں جو ان سے چھوٹی ہو اور امتحان و آزمائش کی کوئی بھٹی نہیں جس میں ان کو تپایا نہ گیا ہو، انہوں نے اپنے خالق کے ساتھ وفا شعاری، عبدیت و بندگی، خدا کی محبت میں خلائقِ دنیا سے بے نیازی، خودسپردگی، شرک سے نفرت، دعوتِ حق اور بیت الٰہی کی تعمیر و تجدید کے ایسے زندہ و تابندہ نقوش خدا کی زمین پر چھوڑے کہ خود خدا کو بھی اپنے اس وفا شعار بندے کی ادائیں محبوب و مرغوب ہو گئیں اور اُمتِ محمدیہ کے لیے سنن ابراہیمی کو تازہ رکھنے کا سامان کیا گیا، حج دراصل اللہ کے اسی نیک بندے کی یادگار اور خدا کے سامنے تسلیم و رضا کا شعار ہے، کعبہ جس کی نبیادیں تک مٹ چکی تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، آج بھی مقام ابراہیم کعبہ کے سامنے موجود ہے، زم زم کا چشمہ حیوان حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے نصرتِ الٰہی کی یاد دلاتا ہے، صفا اور مروہ کی سعی سے ایک بندیِ صالحہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی بے چینی اور بے تابی کی یاد تازہ ہوتی ہے، پھر منیٰ کی قربانی اس ذبحِ عظیم کی یادگار ہے، جس میں ایک پیغمبر نے اپنے لختِ دل کو اپنے تئیں خدا کی خوش نودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا، جمرات کی کنکریاں عزمِ ابراہیمی اور وسوسہ شیطانی

سے پنجہ آزمائی کا اظہار ہے۔

یہی اسوۂ ابراہیمی ہے کہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی چوکھٹ پر قربان ہو جائے، اپنی اور اپنوں کی خواہش، دوستوں اور قرابت داروں کی خوشی، انسانی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں، کہ اللہ کا حکم اور ہوتا ہے، انسان کی خواہش کچھ اور! نفس چاہتا ہے کہ یہ حلال ہو مگر شریعت اسے حرام قرار دیتی ہے، یہی وقت ہے انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے، شادی بیاہ کا موقع دیکھیے، نوشہ کی طرف سے خطیر رقم کا مطالبہ ہے، نوشہ کے والد کی خواہش ہے کہ کھانا کا خوب سے خوب تر اور اچھا سے اچھا انتظام رہے، نوشہ کی والدہ کی طرف سے زیورات کی طلب ہے، بھائی بہنوں کا شوق ہے کہ اچھی قسم کی گاڑی ضرور ملے، دوست احباب کہتے ہیں کہ اگر اس موقع سے بھی رقص وسرور نہ ہو تو تقریب میں کیا لطف آئے گا؟ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ان سب کے خلاف ہے، شریعت اس لین دین کو رشوت قرار دیتی ہے، گانے بجانے کو منع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ موقع خدا کا شکر بجالانے کا ہے، اس کے سامنے سر جھکانے کا ہے، خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کا ہے، یہی وقت ہے کہ انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے کہ کیا وہ اپنے جذبات کو خدا کی مرضی پر قربان کرنے اور اپنے متعلقین کی خواہش کو خدا کے رسول کی خواہش کے سامنے بھینٹ چڑھانے تیار ہے؟

انسان کے لیے بڑے امتحان کا موقع کسبِ معاش کے ذرائع ہیں، ان میں حلال وحرام کا امتیاز، حرص وہوس کے اس دور میں تقویٰ کی اصل کسوٹی ہے، امام محمدؒ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، زہد وتقویٰ کے موضوع پر آپ نے قلم نہیں اُٹھایا؟ امام محمدؒ نے اپنی اس کتاب کا حوالہ دیا جس میں معاملات اور کسبِ معاش کے احکام ہیں اور فرمایا کہ وہی زہد وتقویٰ کی کتاب ہے، یعنی معاش کے معاملہ میں اپنے آپ کو حلال کی حدود میں قائم رکھنا اور حرام سے بچائے رکھنا ہی انسان کی دکھتی رگ ہے اور اس میں اپنے آپ کو حکم شریعت کا پابند بنالینا اصل تقویٰ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان کے

لیے نماز روزہ کا اہتمام آسان ہوتا ہے، آدمی حسبِ توفیق کچھ ذکر و تسبیح بھی کر لیتا ہے؛ لیکن اپنے آپ کو اس نفع سے دست کش رکھنا دُشوار ہوتا ہے جس کو شریعت جائز نہ رکھتی ہو اور جس کو آج کا سودی نظام حلال کیے ہوئے ہے، یہ مواقع ہیں کہ جہاں اسوۂ ابراہیمی ایک صاحبِ ایمان کے سامنے آئینہ بن کر آجاتا ہے، وہ اس میں اپنے ایمان، حکم خداوندی کے سامنے تسلیم و رضا اور شریعتِ الٰہی کے سامنے سرافگندگی کی تصویر دیکھے اور خود اپنے آپ کو تولے کہ اس نے جانور کی قربانی کر کے علامتی طور پر خدا سے خود سپردگی کا جو وعدہ کیا تھا، کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس وعدہ کو وفا کر رہا ہے؟

موجودہ حالات کے پس منظر میں حیات ابراہیمی کا پیغام

قرآن مجید خدا کی کتاب ہے اور یہ کتاب قیامت تک کے لیے ہے، اس لیے قرآن مجید میں جو مضامین آئے ہیں ان کا تعلق ایمانیات سے ہو، انبیاء کے قصص و واقعات سے ہو، عملی زندگی کے احکام سے ہو یا کائنات کے حقائق سے! وہ سب قیامت تک کے لیے نشانِ راہ ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف عہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیے جانے والے پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر رہی ہے، ان میں سے صرف چند پیغمبروں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور ان میں بھی بعض ہی پیغمبر ہیں جن کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، ان انبیاء کرام علیہم السلام کا خصوصی طور پر ذکر اس بات کی علامت ہے کہ ان سے متعلق واقعات میں امت محمدیہ کے لیے خاص طور پر عبرت وموعظت کے پہلو موجود ہیں، جن انبیاء کے واقعات کو قرآن مجید میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان میں ایک سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں ۶۹ بار آیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ انبیاء میں صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی ذات ہے جن کے بارے میں قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ یہ امت کے لیے اسوہ ہیں: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَه (الممتحنة:۴)

گویا یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمان مستقبل میں جن حالات سے دوچار ہوں گے، ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی ایک نقش راہ کا درجہ رکھے گی اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے میں اس امت کی فلاح وکامیابی مضمر ہوگی۔

اگر غور کیا جائے تو آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ حیاتِ ابراہیمی سے بڑی مماثلت رکھتے ہیں، آج پوری دنیا میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کے احکام کے بجائے قومی روایات پر عمل کریں اور اپنے آپ کو اس تہذیب کے سانچہ میں ڈھال لیں جو آج پوری دنیا پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمانا چاہ رہی ہے اور اس میں مسلمانوں کے سوا اور کسی کی مزاحمت درپیش نہیں ہے، عالمی سطح پر ان سے مطالبہ ہے کہ وہ

مغربی تہذیب کو قبول کرلیں، شرافت و اخلاق اور حیاء پر مبنی طریقۂ زندگی کو بنیاد پرستی اور قدامت پسندی کا نام دیا جارہا ہے، سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی ابتداء یہیں سے ہوئی، عراق کا معاشرہ چاہتا تھا کہ وہ اس مشرکانہ طریقۂ زندگی پر قانع ہوجائیں، جس میں سورج، چانداور ستاروں کی پرستش سے لے کر بے شمار چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی اور اس روایتی فکر کے خلاف بغاوت نہیں کریں، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ضمیر نے اس کو قبول نہیں کیا کہ وہ توحید کے بجائے شرک پر قانع ہوجائیں، انھوں نے ستارہ پرستی، چاند پرستی، سورج پرستی اور بت پرستی کے خلاف پوری قوت اور دلیل کے ساتھ آواز اٹھائی، اس کا رَدِّ عمل یہ ہوا کہ پہلے آپ کو زندہ جلانے کی کوشش کی گئی، مگر جب اللہ کی طرف سے آپ کی حفاظت کے غیبی انتظام نے انہیں ناکام کردیا، تو آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، یہاں تک کہ آپ کے بت گر والد نے بھی آپ کو سنگسار کردینے کی دھمکی دی: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (مریم:۶۴)

یہ وہی رویہ ہے جو ہر عہد میں باطل کی طاقتوں نے حق اور سچائی کے خلاف استعمال کیا ہے، آج بھی مسلمانوں کو مختلف ملکوں میں دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا جارہا ہے، فلسطین میں فلسطینی پناہ گزینوں کو خود ان کے وطن میں واپس آنے کی اجازت نہیں دی جارہی ہے اور ہندوستان میں فرقہ پرست طاقتیں ''کہاں جائے گا مسلمان؟ قبرستان یا پاکستان'' کا نعرہ لگا رہی ہیں، یہ قوم ابراہیمی کے اسی رویہ کا اعادہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب عراق سے ہجرت کی تو راستہ میں مصر سے بھی گزرے، جہاں آپ کی زوجہ حضرت سارہ علیہا السلام کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد سے یہ فتنہ ٹل گیا، پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام شام پہنچے اور بڑھاپے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حکم ہوا کہ شیر خوار بیٹے اور نئی نویلی دلہن شہزادی مصر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو شام و فلسطین کے مرغزاروں کو چھوڑ کر مکہ کے بے آب و گیاہ صحرا میں پہنچا دیا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں بھی پورے اترے اور

ان دونوں کو مکہ مکرمہ میں چھوڑ آئے، جہاں اس وقت پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا، مکہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پرورش ہوئی اور جب انہوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور امتحان ہوا جو آخری امتحان تھا کہ اللہ کی رضا کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھینٹ چڑھا دیا جائے، رضائے خداوندی کے طالب باپ اور وفا شعار بیٹے نے اس جاں گسل امتحان پر بھی لبیک کہا اور وہ قربانی پیش کی جس کی محبت و جاں نثاری کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی:

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا ضیاع ہے سو ایسا ضیاع نہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اگر اللہ چاہتے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان آزمائشوں سے گزارے بغیر بھی وہ مقاصد حاصل ہو جاتے جو مقصود تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ کو ابتلاؤں اور آزمائشوں کا سفر طے کرنا پڑا، یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی ملتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے، اہل ایمان کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ جب ایمان و ہدایت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں اور حق وراستی پر قائم ہیں تو وہ اس دنیا میں مشقتوں اور آزمائشوں میں کیوں مبتلا کیے جائیں گے؟ جیسے خدا نے ان کے لیے آخرت میں جنت بنائی ہے، اسی طرح وہ دنیا میں بھی راحت و آسائش کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے نہایت تاکید کے ساتھ فرمایا ہے:

''اور ہم تمہیں ضرور ہی آزمائیں گے، کچھ بھوک اور خوف سے، نیز مال، جان اور پھلوں کی کمی سے بھی، اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیجیے، وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور ہم سب کو اللہ ہی طرف لوٹنا ہے۔'' (البقرۃ:۱۵۵)

اس آیت میں صحابہ کرامؓ سے خطاب ہے، جن کا ایمان بعد میں آنے والی امت

سے یقیناً بڑھا ہوا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے لیے پھولوں کی سیج بچھے گی، بلکہ پوری قوت کے ساتھ فرمایا گیا کہ ہم تمہیں ضرور ہی ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹی میں تپائیں گے، یہ آزمائش بھوک اور فاقہ مستی کی بھی ہوگی، یعنی معاشی ناکہ بندی ہوگی، ملازمت کے دروازے بند کیے جائیں گے، تعلیمی پسماندگی سے بھی دوچار کیا جائے گا، کیوں کہ یہ پسماندگی انسان کو معاشی زوال وانحطاط تک لے جاتی ہے، خوف و دہشت سے بھی آزمایا جائے گا، حکومتوں کا خوف، انٹیلی جنس اور پولیس کا خوف، ظالمانہ قوانین کا خوف، انسانی حقوق سے محروم کیے جانے کا خوف، غرض طرح طرح کے خوف و دہشت سے مسلمانوں کو گزرنا پڑے گا، مال کا نقصان بھی برداشت کرنا ہوگا، تجارتوں اور کاروباروں پر حملے بھی ہوں گے، جان کا نقصان بھی اٹھانا ہوگا، اور مسلمانوں کے خون کی ارزانی ہوگی، پھل کا نقصان ہوگا، زمین کے پھل میں جیسے سیب اور آم اور چاول اور گیہوں داخل ہیں، اسی طرح پیٹرول اور دوسرے معدنی ذخائر بھی شامل ہیں، آج حقیقی معنوں میں پیٹرول کے ذخیرہ پر مغربی طاقتوں کا قبضہ ہے، مسلم ممالک کو زراعتی ٹیکنالوجی سے محروم رکھنا، بلکہ مختلف کیمیکل کے استعمال کے ذریعہ عالم اسلام کی زمینوں کو ناکارہ بنانا، یہ سب زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کو نقصان پہنچانا اور قرآن مجید کی زبان میں (وَنَقصٍ مِنَ الثَّمَرَاتِ) ہے، غرض کہ آج پوری دنیا میں مسلمان جن مصیبتوں سے گزر رہے ہیں وہ باعث حیرت نہیں ہے اور قرآن مجید نے شروع ہی سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایسے واقعات پر مسلمانوں کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے موقع پر امت کو صبر کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، صبر سے مراد ثابت قدمی ہے، یعنی حالات کتنے بھی ناموافق ہوں اور کتنی بھی دشواریاں راہِ حق میں آئیں انسان باطل کی قوت کو دیکھ کر متزلزل نہ ہو، وہ حوصلہ نہ ہارے اور اللہ کے دین پر اس کے یقین میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہونے پائے، بلکہ وہ پوری طرح ثابت قدم رہے، قرآن مجید نے ایک اور موقع پر صحابہؓ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ان کا حال یہ ہے کہ جب انہیں دشمن کی کثرت کا

حوالہ دے کر خوف زدہ کرنے اور دہشت میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو گھبرانے اور خوف کھانے کے بجائے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے:

"وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَاناً وَتَسْلِيْماً (الاحزاب:۲۲) پھر صبر کے اس مرحلہ میں مردِ مومن اپنے درجہ و مقام کا اعلان کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف واپس جانا ہے، جس تمدن کی بنیاد عیش پرستی اور عشرت کوشی پر ہو، اور جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفسانی خواہشات کو پورا کرنا ہو وہ بنیادی طور پر "بے خدا تمدن" ہوتا ہے، ایک ایسا تمدن جس میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی، جس میں انسان اپنے آپ کو خدا سے بھی آگے سمجھنے لگتا ہے، جس میں خدا کو چرچوں اور عبادت گاہوں تک محدود کر دیا جاتا ہے اور پوری دنیا کو انسان اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، لیکن اسلام جس تمدن کی دعوت دیتا ہے، وہ "باخدا تمدن" ہے، جس میں انسان اپنی پوری زندگی کو اللہ کے حوالہ کر دیتا ہے، اسی لیے قرآن؛ دین حق پر ثابت قدم رہنے والوں کے طرز فکر کو بیان کرتا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

"اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرۃ:۱۵۶) یعنی: "ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہماری واپسی ہے۔" یہ اس بات کا اعلان ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں، ہم خدا کی فرماں برداری سے آزاد نہیں ہو سکتے، اور ہم ایسے تمدن کو قبول نہیں کر سکتے جس میں خدا کو عبادت گاہ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ "(الانعام: ۱۶۲)

"میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لیے ہے، جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔"

ایک اور موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

"اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفاً وَمَا اَنَا

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام:۹۷)

''میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف رکھا ہے، جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے اور میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانے والا نہیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت اللہ سے تعلق اور خودسپردگی تھی اور نمرودی معاشرہ میں یہی بات سب سے زیادہ نا قابل برداشت اور نا قابل عفو تھی، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس فکر اور نظام حیات کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے، جس میں حقیقی خدا کا کوئی تصور نہ ہو، جس میں انسان مذہب واخلاق کی طرح کی قید و بند سے آزاد ہو، جس میں مذہب ایک رسمی چیز ہو اور جس کا زندگی میں کوئی عمل دخل نہ ہو، جس میں انسان کی پیشانی اس کی مصنوعی دیویوں، دیوتاؤں، نیز لذتوں اور شہوتوں کے سامنے جھکا کرتی ہو، جس میں ایسی بے جان چیزوں کی پرستش کی جاتی ہو جس سے نہ انسان کو ڈرنے کی ضرورت ہو اور نہ اس کے اعمال وافکار پر کوئی پابندی عائد ہو، آج بھی مسلمانوں سے نفرت وعناد اور انہیں بدنام ورسوا کرنے کی کوششوں کا اصل سبب یہی ہے کہ جس گھر میں سب لوگ بے لباس ہیں، یہ مذہب اور خدا پرستی کا لباس کیوں پہنے ہوئے ہیں؟ یہ ہمارے بے خدا تمدن کے سامنے سر جھکانے کے بجائے خدا پرستی اور خدا ترسی کی بات کیوں کرتے ہیں؟ یہ آخرت کا نام لے کر ہماری خوش عیشیوں میں کیوں بھنگ ڈالتے ہیں؟ یہ مسجد اور نماز تک اپنے آپ کو محدود کر کے زندگی کے دوسرے مسائل میں مذہب سے کیوں آزادی حاصل نہیں کرتے اور انسان کی آزادی میں کیوں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں؟

یہ بنیادی فکری اختلاف ہے، جس نے خدا بےزار قوموں اور تہذیبوں کو اسلام کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا ہے اور وہ اس کے بغیر راضی نہیں ہو سکتے کہ مسلمان اپنے تہذیبی اور مذہبی تشخص سے باز آ کر اقوام مغرب کو اپنا قبلہ بنالیں:

''وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ''
(البقرۃ:۱۲۰)

اس لیے آج کے ماحول میں مسلمانوں کے لیے وہی اسوہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا، یعنی مشکلات پر صبر واستقامت اور ہر طرح کی مشکلات کو سمجھنے کے باوجود خدا کے تعلق پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا، اگر مسلمان اسوۂ ابراہیمی پر قائم رہیں تو ان شاء اللہ وہ امتوں کی امانت سے سرفراز کیے جائیں گے اور مسلمانوں کو کتنا ہی بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کی جائے، خدا کی طرف سے ان کو عزت وسربلندی حاصل ہوگی، جیسا کہ خدا کا یہ وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا۔ (قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً) (البقرۃ:۱۲۴)

حج کے پانچ دن — احکام و مسائل

پہلا دن (۸/ذوالحجہ)

جن لوگوں نے حج افراد یا قران کا احرام باندھا ہو، وہ پہلے ہی سے حالت احرام میں ہوں گے، جو لوگ ''تمتع'' کا اِرادہ رکھتے ہوں، اُن کو ۸/ذوالحجہ کو احرام باندھ لینا ہے، احرام مکہ ہی سے باندھ لیں — جو لوگ سعی پہلے کرنا چاہتے ہوں، وہ ۸/ذوالحجہ کو طواف اور سعی کرلیں اور طواف میں رمل اور اضطباع کریں، اب طوافِ زیارت کے ساتھ ''سعی'' کی ضرورت نہیں رہے گی ''حج قران'' کرنے والوں کے لیے افضل طریقہ یہی ہے کہ حج سے پہلے ہی سعی کرلیں، افراد اور تمتع کرنے والوں کو حج کے بعد سعی کرنا افضل ہے، آج کل حج کے بعد اژدحام بہت بڑھ جاتا ہے اور حج سے پہلے نسبتاً کم ہجوم ہوتا ہے، اس لیے خواتین اور ضعیف و بیمار لوگ شریعت کی اس آسانی سے فائدہ اُٹھائیں تو کوئی حرج نہیں، احرام کے بعد اب تین کام کرنے ہیں:

(۱) نمازِ ظہر سے پہلے منیٰ پہنچنا۔ (۲) ۸/ذوالحجہ کو ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور ۹/ذوالحجہ کی فجر کی نمازیں منیٰ میں ادا کرنا — جو لوگ منیٰ کو نکلنے سے کم از کم پندرہ دنوں پہلے مکہ مکرمہ آگئے تھے، وہ منیٰ عرفات وغیرہ میں ظہر، عصر اور عشاء چار رکعت ادا کریں گے اور جو لوگ اتنے دنوں پہلے نہیں آسکے تھے وہ دو رکعت؛ البتہ اگر مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہوں تو چار رکعت پوری کریں گے۔ (منحۃ الخالق علی البحر: ۱۳۲/۲)۔ (۳) ۸/ذوالحجہ کا دِن گزار کر جو شب آئے، وہ منیٰ میں گزارنا۔

منیٰ میں قیام کے درمیان تلبیہ، ذِکر، استغفار، تلاوتِ قرآن اور دُعا کی کثرت کرنی چاہیے اور زیادہ مشقت نہ ہو تو مسجد خیف میں نماز اَدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے، منیٰ میں تین رات یعنی (۸، ۹، ۱۰ ذوالحجہ) اور (۱۱، ۱۲/ذوالحجہ) کی درمیانی شب میں قیام کرنا مسنون ہے؛ لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے منیٰ میں قیام نہیں کرسکے، مثلاً منیٰ کی جگہ تنگ پڑ جائے اور حدودِ منیٰ سے باہر قیام کی جگہ ملے تو کوئی کراہت نہیں؛ کیوں کہ عذر کی بناء پر منیٰ میں قیام کو ترک کیا

جاسکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں اور زمزم کے کنویں سے پانی پلانے والوں کو اِجازت دِی تھی کہ وہ منیٰ میں قیام نہ کریں، بلا عذر منیٰ کے قیام کو ترک کردینا البتہ مکروہ ہے۔

دُوسرا دِن (۹؍ذوالحجہ)

یہ حج کا اَصل دِن ہے، آج دِن میں تین کام کرنے کے ہیں:

(۱) آفتاب نکلنے کے بعد منیٰ سے عرفات کے لیے نکلنا۔ (۲) زوال کے بعد سے غروبِ آفتاب تک عرفات میں ٹھہرنا۔ (۳) اگر مسجد نمرہ میں جماعت سے نماز اَدا کرنے کا موقع ملے تو ظہر و عصر کو ایک ساتھ اَدا کرنا۔

وقوفِ عرفہ کے ضروری مسائل

اس دِن کے لیے خاص خاص ہدایات و مسائل یہ ہیں:

منیٰ سے عرفات آتے ہوئے تلبیہ اور ذِکر کی کثرت رکھے، میدانِ عرفات جہاں سے شروع ہوتا ہے، آج کل بہت بڑے بورڈوں پر اس کی صراحت موجود ہے، اس کے اندر ہی وقوف کرنا چاہیے، ۹؍ذوالحجہ کو زوال سے ۱۰؍ذوالحجہ کی طلوعِ صبح سے پہلے تک ایک لمحہ کے لیے بھی عرفات میں قیام یا گزر ہوگیا تو وقوفِ عرفہ کا فرض اَدا ہوجائے گا، بہتر ہے کہ زوال ہی سے عرفہ میں رہے اور غروبِ آفتاب کے بعد ہی عرفہ سے نکلے، غروب سے پہلے نکلنا دُرست نہیں، میدانِ عرفات میں یوں تو کہیں بھی قیام کرسکتا ہے؛ مگر ''جبلِ رحمت'' کے قریب وقوف کرنا اَفضل ہے؛ بشرطیکہ سہولت ہو، خود مشقت اُٹھا کر یا دُوسروں کو مشقت میں ڈال کر اس کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، میدانِ عرفات سے متصل 'بطنِ عرنہ' ہے، اس میں وقوف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اِس لیے یہاں وقوف نہ کرنا چاہیے، آج کل بورڈ پر نمایاں تحریروں کے ذریعہ اس مقام کو مشخص کردیا گیا ہے، بہتر ہے کہ وقوفِ عرفہ میں اَپنی اِستطاعت کے بقدر دھوپ میں کھڑا ہوکر وقت گزارے، ویسے سایہ میں اور بیٹھ کر وقوف کرنے میں بھی قباحت نہیں، یہ دِن دُعاؤں کے اہتمام اور اُن کی قبولیت کا ہے؛ اِس لیے اللہ کے سامنے خوب

گڑگڑائے، روئے، رونا نہ آئے تو رونے کی کوشش کرے، اپنی آخرت کے لیے، دُنیا کے لیے، دُوسرے اعزہ، رِشتہ داروں اور اہلِ حقوق کے لیے، مسلمانانِ عالم اور عالم اِسلام کے لیے خوب خوب دُعائیں کرے، موقع میسر ہو تو زوال سے پہلے غسل کرنا بھی بہتر ہے کہ اس سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے؛ بشرطیکہ اِتنا پانی موجود ہو کہ آپ کے غسل کرنے کی وجہ سے دُوسروں کو مشقت نہ ہو، عورتیں اگر حیض کی حالت میں ہیں تو بھی غسل کرلیں؛ البتہ یہ نظافت اور صفائی ستھرائی کے لیے ہے، اس غسل سے وہ پاک نہیں ہوجائیں گی، مسجدِ نمرہ میں نماز اَدا کرنے کی کوشش کی جائے؛ بشرطیکہ اس کی وجہ سے اتنی مشقت نہ ہوجائے کہ اس کے بعد ذِکر اور دُعا کرنے سے محروم ہوجائے، عرفات میں ظہر وعصر کی نماز جمع کرکے اَدا کی جائے گی؛ بشرطیکہ جماعت کے ساتھ پڑھ رہا ہو، اگر جماعت میں شریک نہ ہوسکے، اپنے خیموں میں اَدا کرے تو حنفیہ کے نزدِیک دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت پر اَدا کی جائیں گی، وقوفِ عرفہ میں عورتوں کا مردوں کے ساتھ کھڑے ہوکر نماز پڑھنا یا دُعائیں کرنا مکروہ ہے اور اُن کے لیے اپنے خیموں میں ہی قیام بہتر ہے، عرفات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعائیں منقول ہیں:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ المُلْکُ وَلَہُ الحَمْدُ، وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر. (ترمذی: ۳۵۸۵، باب دعاء یوم عرفة، کتاب الدعوات)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کا کوئی شریک ہے، اسی کے لیے ملک بھی ہے اور تمام تعریفیں بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یومِ عرفہ کی بہترین دُعا قرار دِیا ہے:

اَللّٰھُمَّ اجعَل فِیْ قَلْبِیْ نُوْراً وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْراً وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْراً، اَللّٰھُمَّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِی وَیَسِّرلِیْ اَمْرِیْ، اَعُوْذُ بِکَ مِن وَسَاوِسِ الصَّدْرِ وَشَتَاتِ الاَمْرِ وَفِتْنَةِ القَبرِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِن شَرِّ مَا یَلِجُ فِی النَّھَارِ وَشَرِّ مَا تَحصِبُ بِہِ الرِّیحُ وَشَرِّ بَوَائِقِ الدَّھْر. (تلخیص الحبیر: ۲/۲۵۴، حصن

حصین: ۱۸۳)

اے اللہ! میرے دِل، کان اور آنکھ کو نور سے معمور فرمادے، خداوندا! میرا شرح صدر فرمادے، میرے لیے میرے معاملہ کو آسان فرما، میں دِل کے وسوسوں، کاموں کی پراگندگی اور قبر کی آزمائش سے آپ کی پناہ کا خواست گار ہوں، اِلٰہی! میں دِن میں آنے والے شر، ہوا کے ساتھ چلنے والے شر اور زمانہ کی ہلاکتوں کے شر سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

عرفات کی شام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ کثرت یہ دُعا کرنا منقول ہے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَالَّذِیْ تَقُوْلُ وَخَیْراً مِمَّا نَقُوْلُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ صَلوٰتِی وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ وَاِلَیْکَ مَاٰبِیْ وَلَکَ رَبِّیْ تُرَاثِی، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَوَسْوَسَةِ الصَّدرِ وَشَتَاتِ الاَمْرِ. (**غنیة السالک: ۳۸۱**)

اے اللہ! آپ کے لیے وہ سب تعریفیں ہیں، جو خود آپ نے فرمائی ہیں، اس سے بہتر جو ہم کہہ سکیں، خداوندا! میری نماز، حج وقربانی، زندگی اور موت آپ ہی کے لیے ہے، آپ ہی میری پناہ گاہ ہیں اور آپ ہی کے لیے مرے بعد باقی رہ جانے والے ہیں، اِلٰہی! میں عذابِ قبر، وسوسہ قلب اور معاملات کی پراگندگی سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

یہ چند دُعائیں تو خصوصیت سے اس موقع کے لیے منقول ہیں، ان کے علاوہ پورے دِن اَپنی ضروریات وحالات کے مطابق دُعا کرتے رہیں، عربی الفاظ یاد نہ ہوسکیں یا نہ پڑھ پائیں تو اُردو ترجمہ پڑھ لینا یا زبانی اس کا خلاصہ خدا کے حضور پیش کردینا کافی ہے۔

۹/ذوالحجہ کا دِن گزار کر شب کے اعمال:

۹/ذوالحجہ کو آفتاب غروب ہونے کے بعد چار کام کرنے ہیں:

(۱) آفتاب ڈُوبنے کے بعد عرفات سے مزدلفہ کے لیے نکلنا۔ (۲) پوری شب بلکہ ۱۰/ذوالحجہ کو طلوعِ آفتاب سے کچھ پہلے تک کے اوقات کا مزدلفہ میں گزارنا۔ (۳) مزدلفہ میں آکر ہی مغرب وعشاء کی نماز اَدا کرنا اور عشاء کے وقت مغرب وعشاء کو جمع کرنا۔ (۴) مزدلفہ

میں تینوں دنوں کی رمی کے لیے ۴۹ عدد کنکریاں چن لینا۔

وقوفِ مزدلفہ کے ضروری مسائل:

بہتر ہے کہ نہ آفتاب ڈُوبنے سے پہلے عرفات سے چلے، نہ آفتاب ڈُوبنے کے بعد عرفات سے نکلنے میں تاخیر کرے، مزدَلفہ میں ''جبلِ قزح'' کے قریب ٹھہرنا مستحب ہے، مزدلفہ کے راستہ میں نماز اَدا نہ کرے، مزدلفہ پہنچے کے بعد عشاء کے وقت میں مغرب وعشاء کو اس طرح جمع کرے کہ دونوں کے لیے ایک ہی اذاں دے، ایک ہی اقامت کہے اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی سنت یا نفل بھی نہ پڑھے، مزدلفہ میں مغرب وعشاء کو جمع کرنے کے لیے جماعت شرط نہیں ہے، اِنفراداً نماز پڑھے، تب بھی دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھی جائیں گی، اَگر مزدلفہ پہنچنے میں اِتنی دیر لگ جائے کہ فجر کا وقت شروع ہوجانے کا اندیشہ ہوتو راستہ میں ہی مغرب وعشاء اَدا کرلی جائے، اس رات جاگنا، ذِکر کرنا، تلاوت، تلبیہ، دُعا اور نوافل کا اہتمام کرنا مسنون ہے، حنفیہ کے نزدیک وقوفِ مزدلفہ کا اَصل وقت صبح صادق سے سورج نکلنے تک ہے، ان اوقات میں ایک لمحہ کے لیے بھی مزدلفہ میں وقوف کرلیا یا مزدلفہ کے علاقہ سے گزر گیا تو ''وقوفِ مزدلفہ'' کا وجوب اَدا ہوجاتا ہے، ۱۰/ذوالحجہ کو اَوّل وقت میں نمازِ فجر اَدا کرنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنی چاہیے اور آفتاب نکلنے سے پہلے تک یہ سلسلہ قائم رکھنا چاہیے — آج کل بعض لوگ جلدی کرتے ہیں، بغیر کسی عذر کے نصف شب کو یا فجر سے پہلے ہی نکل جاتے ہیں، بعض حضرات نمازِ فجر قبل از وقت اَدا کر کے نکل جاتے ہیں، ان صورتوں میں حنفیہ کے نزدِیک ''وقوفِ مزدلفہ'' کا ''واجب'' اَدا نہیں ہوتا اور ''دم'' واجب ہوتا ہے؛ البتہ عورتوں، مریضوں، معذوروں، بہت ضعیف لوگوں اور ان سبھوں کے ساتھ ان کی مدد کرنے والوں کے لیے گنجائش ہے کہ وہ نصف شب کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوجائیں۔ (رَدّالمحتار: ۵۲۹۱/۳) چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ المؤمنین حضرت سوداء رضی اللہ عنہا کو نصف شب کے بعد مزدلفہ سے نکلنے کی اِجازت دے دِی تھی۔ (بخاری: ۱۵۹۶) اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مکہ میں پانی پلانے کے نظم کے لیے اس

کی اِجازت مرحمت فرمائی تھی۔ (بخاری: ۱۵۹۴۷) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا عمل منقول ہے۔

تیسرا دِن (۱۰؍ذوالحجہ)

۱۰؍ذوالحجہ کو آپ کو چھ کام کرنے ہیں:

(۱) صبح طلوع ہونے سے اَچھی طرح روشنی پھیل جانے تک مزدلفہ میں ٹھہرنا اور دُعا میں مشغول رہنا۔ (۲) طلوع آفتاب سے پہلے مزدلفہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہو جانا— دو رکعت کے بقدر طلوع آفتاب سے پہلے نکل جائے۔ (فتح القدیر: ۲؍۴۸۴) (۳) منیٰ میں آخری جمرہ (جس کو بڑا شیطان کہتے ہیں) پر سات کنکریاں مارنا۔ (۴) کنکری مارنے کے بعد قربانی کرنا۔ (۵) قربانی کرنے کے بعد بال منڈانا۔ (۶) مکہ جا کر طوافِ زیارت کرنا۔

رمیِ جمرات کے ضروری احکام:

کنکری چنے کے دانے یا کھجور کی گٹھلی کے برابر ہونی چاہیے، بڑے ڈھیلے پھینکے جائیں تو اگر چہ رمی ہو جاتی ہے؛ لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے (بحر: ۲؍۳۴۳)۔ کنکری مٹی، پتھر وغیرہ کی ہو یعنی زمین کی جنس سے ہو (عنایہ مع الفتح: ۲؍۴۸۶) جوتے چپل کا پھینکنا کافی نہیں اور چوں کہ اس سے دُوسروں کو اذیت پہنچ سکتی ہے؛ اِس لیے ایسا کرنا مکروہ ہے، آج کل جمرہ کے چاروں طرف حصار بنا ہوا ہے، کنکری اس حصار کے اَندر گرنی چاہیے، اگر اس سے پہلے ہی گر جائے یا کسی آدمی کو لگ جائے یا ستون کو لگ کر حصار کے باہر واپس آجائے تو کافی نہیں ہوگا، کنکری مارنے والے اور کنکری مارنے کی جگہ کے درمیان بہتر ہے کہ پانچ ہاتھ کا فاصلہ ہو (بحر: ۲؍۳۴۳) کنکری اَگر اِحاطہ کے اَندر صرف ڈَال دِی جائے تو رمی نہ ہوگی، پھینکنے کی کیفیت پائی جانی ضروری ہے۔ (بحر: ۲؍۳۴۳) رمی کے لیے کنکری کو کسی خاص طرح پکڑنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے، ہجوم میں یہ طریقہ آسان ہے کہ انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑ کر پھینکے، اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ (فتح القدیر: ۲؍۴۸۷) مسنون ہے کہ رمی سیدھے ہاتھ سے کی جائے۔ (فتح القدیر: ۲؍۴۸۷) ہر کنکری پھینکتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہنا

چاہیے کہ مختلف صحابہؓ سے اس موقع پر یہی کہنا منقول ہے۔ (ہدایہ مع الفتح: ۴۸۶/۲) ہاں! اگر ''اللہ اکبر'' کی جگہ ''سبحان اللہ'' یا ''لا اِلٰہ الا اللہ'' بھی پڑھ دے تو کافی ہے۔ (فتح القدیر: ۴۸۶/۲) جوں ہی رمی شروع کرے، اَب تک جو تلبیہ پڑھتا آیا تھا، وہ بند کردے، ۱۰/ذوالحجہ کو رمی کے بعد وہاں ٹھہر کر دُعا نہ کرنی چاہیے؛ کیوں کہ اُس دِن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں پر دُعا کرنا ثابت نہیں ہے، ۱۰/ذوالحجہ کو صرف اسی آخری جمرہ کی رمی ہے، باقی اور جمرات کی رمی نہیں ہے۔

رمیِ جمرات کے اوقات

آج کل رمی میں بہت اژدحام ہوجاتا ہے، جانیں بھی جاتی ہیں؛ کیوں کہ لوگ ایک ہی وقت میں اُمڈ آتے ہیں؛ اِس لیے مناسب ہے کہ حجاج ۱۰/ذوالحجہ کی رمی کی بابت اوقات اَپنے ذہن میں رکھیں اور ایسے وقت کا اِنتخاب کریں جب اژدحام کم ہو۔

رمی جمرات کے وقت کی تفصیل یہ ہے:

فجر کا وقت شروع ہونے سے طلوع آفتاب تک رمی کراہت کے ساتھ جائز ہے، طلوع آفتاب تا زوال آفتاب (۱۰/ذوالحجہ) رمی کا مسنون وقت ہے، بعد زوال تا غروب آفتاب بلا کراہت جائز ہے، غروبِ آفتاب تا طلوع صبح (۱۱/ذوالحجہ) کراہت کے ساتھ جائز ہے، طلوع صبح سے آفتاب نکلنے تک اور آفتاب ڈُوبنے کے بعد دُوسرے دِن کی فجر تک رمی کرنے میں بھی اس وقت کراہت ہے جب کہ کوئی عذر نہ ہو۔ (فتح القدیر: ۵۰۱/۲) آج کل جو اژدحام ہوتا ہے وہ خود ایک عذر ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے ان اوقات میں رمی کرنی مکروہ نہیں ہے، عورتوں کے حق میں فقہاء نے اژدحام کے عذر ہونے کا صراحتاً ذِکر کیا ہے۔ (فتح القدیر: ۴۸۳/۲) لہٰذا ۱۰/ذوالحجہ کو طلوع صبح سے ۱۱/ذوالحجہ کی طلوع صبح تک کسی بھی وقت رمی کرلینی چاہیے، اگر ۱۰/ذوالحجہ کی رمی ۱۱/ذوالحجہ کی صبح ہونے تک بھی نہ کرپایا تو اب گیارہ کو آخری جمرہ پر ۱۰/ذوالحجہ کی سات کنکریاں بھی مارے اور تاخیر کی وجہ سے دم بھی دے، یعنی ایک بکری کی قربانی دے (ہدایہ مع الفتح: ۵۰۰/۲) جو لوگ ۱۰/ذوالحجہ کو طلوع آفتاب سے زوال تک اژدحام

کی وجہ سے رمی نہ کرسکیں اور زوال کے بعد یا غروب آفتاب کے بعد رمی کرنے پر قادر ہوں، اس کے لیے کسی کو نائب بنا کر رمی کرنا جائز نہیں، وہ ۱۱ر ذوالحجہ کی صبح سے پہلے تک خود رمی کریں، اگر کوئی شخص خود رمی کرنے سے عاجز ہو، جیسے بہت بیمار، معذور یا سن رسیدہ وضعیف ہو یا کسی وجہ سے رمی کرنا اس کے لیے سخت دُشوار ہو تو ایسے شخص کی طرف سے نیابتاً دُوسرا آدمی رمی کرسکتا ہے: **سواء رمی بنفسه او لغیره عند عجزه عن الرمی بنفسه ۔** (بدائع الصنائع: ۲ر۱۳۷)

رمی سے عاجز ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ہاتھ سے کنکری پھینکنے کی بھی طاقت نہیں ہو، دُوسری یہ کہ کنکری پھینک سکتا ہو؛ لیکن جمرات تک پیدل نہ جاسکتا ہو اور سواری میسر نہ ہو۔ (المدونۃ الکبریٰ: ۱ر۳۲۶) آج کل صورتِ حال یہی ہے، اژدحام کی وجہ سے سوارِی یا وہیل چیئر کو جمرات تک لے جانے کی ممانعت ہے اور خیموں سے جمرات کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے، اِس لیے جو لوگ واقعی اتنا نہیں چل سکتے، وہ دُوسرے کو نائب بنا سکتے ہیں؛ لیکن صرف سستی اور آسانی کے لیے ایسا کرنا دُرست نہیں۔

قربانی کے ضروری احکام

حج قران اور حج تمتع کرنے والوں پر قربانی واجب ہے اور حج افراد کرنے والوں کے لیے مستحب ہے، قربانی بکرے یا دُنبہ کی بھی کی جاسکتی ہے اور گائے، اُونٹ وغیرہ میں بقرعید کی قربانی کی طرح حصہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ (بحر: ۲ر۳۵۹) حج اور دَم کی قربانی حدودِ حرم ہی میں کی جانی ضروری ہے، منیٰ میں اس کے لیے قربان گاہ بنی ہوئی ہے، مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ میں بھی قربانی کا نظم ہے، وہاں بھی قربانی کی جاسکتی ہے، اگر کسی شخص نے حج قران یا تمتع کیا؛ لیکن اِتنی اِستطاعت نہیں کہ قربانی کرسکے تو اس کو ۹ر ذوالحجہ تک تین روزے رکھ لینے چاہئیں، بہتر ہے کہ یہ روزے ۷، ۸، ۹ کو رکھے جائیں، تاہم شوال شروع ہونے اور احرام باندھ لینے کے بعد ۹ر ذوالحجہ تک کبھی بھی تین روزے رکھ لے کافی ہے، یہ تین روزے تو حج سے پہلے کے ہیں، اس کے علاوہ سات روزے ۱۳ر ذوالحجہ کے بعد رکھنے ہیں، چاہے حرم میں

رکھ لے یا گھر واپس آنے کے بعد! وقت اور مقام کی کوئی قید نہیں۔ (ہدایہ مع الفتح: ۵۳۰/۲) اگر روزے نہ رکھ پایا کہ ۱۰/ذوالحجہ کی تاریخ آ گئی تو اب قربانی ہی ضروری ہے، روزے رکھنا کافی نہیں، حج کی یہ قربانی ۱۰/ سے ۱۲/ذوالحجہ تک کی جاسکتی ہے؛ البتہ دم والی قربانی کبھی بھی دِی جاسکتی ہے، آج کل ''شرکۃ الراجحی'' کی طرف سے قربانی کا نظم کیا گیا ہے، اس کے لیے ٹوکن فروخت کردیا جاتا ہے اور اس کی طرف سے یہ اِدارہ قربانی کردیتا ہے اور قربانی کا وقت مقرر کردیتا ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے کی گنجائش ہے؛ البتہ اِدارہ یہ سہولت دیتا ہے کہ اگر دس آدمیوں کا گروپ ہو تو وہ ایک شخص کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر بھیجیں اور وہ خود جا کر سبھوں کی طرف سے قربانی کردیں، یہ صورت اِختیار کرنی بہتر ہے، بہت سے لوگ شخصی طور پر حجاج سے پیسے لیتے ہیں اور قربانی کرانے کا وعدہ کرتے ہیں، اُن پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور خوب تحقیق کے بعد ہی ان کو پیسے دینے چاہئیں، بقرعید کی قربانی مسافر پر واجب نہیں ہوتی، مقیم پر واجب ہوتی ہے اور جو شخص ایک جگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کی نیت کرلے، وہ مقیم شمار کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اگر منیٰ کی روانگی سے پندرہ دنوں پہلے مکہ آ گیا تھا اور وہیں مقیم تھا تو اس پر بقرعید کی قربانی بھی واجب ہوگی، خواہ وہیں دے یا اپنے ملک میں اور اگر منیٰ کی روانگی سے پہلے ۱۵/ دنوں سے کم کا قیام رہا، تو بقرعید کی قربانی واجب نہیں ہوگی؛ کیوں کہ وہ مسافر ہے۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ: ۴۶۵/۲)

بال کٹانے کے ضروری مسائل

تمتع اور قران کرنے والوں کو قربانی کے بعد اور افراد کرنے والوں کو ۱۰/ذوالحجہ کی رمی کے بعد ہی بال کٹانا بہتر ہے؛ لیکن مزید بہتر ہے کہ ۱۲/ذوالحجہ کی شام تک احرام کی حالت کو قائم رکھے۔ (بحر: ۳۴۶/۲) سر کو یا تو مکمل مونڈانا چاہیے یا پورے سر سے اُنگلی کے پور کے بقدر کٹانا چاہیے، مونڈانے کی فضیلت زیادہ ہے، مونڈوانے والوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دُعا دِی ہے اور بال ترشوانے والوں کو ایک بار، احناف کے یہاں سر کے ایک چوتھائی حصہ کے بال کا مونڈانا یا تراشوانا کافی ہے؛ لیکن سنت کے خلاف ہے، سنت پورے سر کے بال

مونڈانا یا ترا شوانا ہے، (ہدایہ مع الفتح: ۴۹۰/۲) اور اسی میں احتیاط ہے؛ کیوں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدِیک پورے سر کا بال کٹانا واجب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس سے کم بال مونڈانے یا کٹانے کا کوئی ثبوت موجود نہیں؛ اِس لیے زینت کے جذبہ کے تحت پورا سر نہ مونڈوانا ہرگز مناسب نہیں، ایک مسلمان کو حج وعمرہ کی سعادت حاصل ہو اور وہ اپنی خواہش کی اتنی بھی قربانی نہ دے سکے، یہ افسوس ناک ہے، کسی کے سر میں بال نہ ہوں تو یوں ہی سر پر اُسترا پھیر لینا چاہیے۔ (عنایہ علی الہدایہ: ۴۹۰/۲) مستحب ہے کہ سر مونڈانے کے بعد ناخن اور مونچھ کی بھی اِصلاح کر لے۔ (بحر: ۳۴۶/۲) عورتیں اپنے چوٹی کے کنارے سے ایک اُنگلی کے بقدر بال کاٹ لیں، رمی اور قربانی کے بعد محرم اپنا بال خود بھی کاٹ سکتا ہے۔ (بحر: ۳۴۶/۲) دُوسرے محرم —— جو ان افعال کو پورے کر چکے ہوں —— کے بال بھی کاٹ سکتا ہے، عورتوں کو خاص طور پر یہ مسئلہ یاد رکھنا چاہیے کہ رمی وقربانی کے بعد خود بال کاٹ لیں یا شوہر یا محرم رشتہ دار سے کٹوائیں، غیر محرم لڑکے جو قینچی لیے کھڑے رہتے ہیں، ان سے بال کٹانا جائز نہیں، بال کٹانے کے بعد احرام ختم ہو جاتا ہے، اب سلے ہوئے کپڑے اور خوش بو وغیرہ کا اِستعمال جائز ہے، صرف بیوی اب بھی حرام ہے۔

طوافِ زیارت

۱۰/ ذوالحجہ کا ایک اہم عمل طوافِ زیارت ہے، یہ فرض ہے، یہ طواف ۱۰/ ذوالحجہ کی طلوعِ صبح سے ۱۲/ ذوالحجہ کو غروب آفتاب سے پہلے تک کر سکتے ہیں؛ البتہ اگر دُشوارِی نہ ہو تو اَفضل ۱۰/ ذوالحجہ کو طواف کرنا ہے۔ (بحر: ۳۴۷/۲) اگر ۱۲/ ذوالحجہ کو غروبِ آفتاب تک بھی طواف نہ کر پایا، تو اس کے بعد بھی کر سکتا ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدِیک تاخیر کی وجہ سے دم واجب ہو جائے گا اور اس کا یہ فعل مکروہ بھی ہوگا۔ (ہدایہ: ۴۹۷/۲) البتہ امام ابوحنیفہؒ کے دونوں ممتاز شاگرد امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نیز امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدِیک تاخیر کی وجہ سے دم واجب نہیں ہوگا —— اِس لیے حجاج کو چاہیے کہ ۱۲/ ذوالحجہ کی شام تک طواف کر لیں، طوافِ زیارت میں بھی سات طواف کرنا ہے، اگر احرام کے لباس میں ہو تو اضطباع

کرے گا، یعنی دائیں مونڈھے کو کھلا رکھتے ہوئے اس کے نیچے سے چادر نکال کر بائیں مونڈھے کے اُوپر رکھے گا، اِبتدائی تین چکر میں رمل کرنا ہے، طواف کے بعد دو رکعت نماز اَدا کرنی ہے، پھر سات دفعہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنی ہے جو صفا سے شروع ہوگی اور مروہ پر ختم، حج اِفراد یا حج قران کرنے والے حاجی نے طوافِ قدوم کے ساتھ سعی کرلی تھی یا حج تمتع کرنے والے حاجی نے حج کا احرام باندھنے کے بعد کوئی نفل طواف کرکے اس کے ساتھ سعی کرلی، تو اَب طوافِ زیارت کے ساتھ سعی واجب نہیں اور نہ طواف میں ''رمل'' اور ''اضطباع'' کرے گا۔ (ہدایہ مع الفتح: ۲/۴۹۴) آج کل چوں کہ اژدحام بہت بڑھ جاتا ہے، اِس لیے حج تمتع کرنے والے حجاج ۷ یا ۸/ ذوالحجہ کو احرام باندھ کر نفلی طواف کرکے اس کے ساتھ سعی کرلیں تو آسانی ہوگی، ''طوافِ زیارت'' رمی، قربانی یا بال کٹانے سے پہلے بھی کیا جاسکتا ہے، ان تینوں کاموں کے پورے ہونے کے بعد ہی طواف کرنا ضروری نہیں۔ (بحر: ۲/ ۳۴۷) طوافِ زیارت کا طریقہ وہی ہے، جو طواف کی دُوسری صورتوں کا ہے، طوافِ زیارت کے بعد شوہر کے لیے بیوی بھی حلال ہوجاتی ہے، طوافِ زیارت حج کا نہایت اَہم رُکن ہے، اَگر کوئی شخص طواف کیے بغیر گھر چلا گیا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدِیک اُس وقت تک اس پر اس کی بیوی حرام رہے گی، جب تک کہ دُوبارہ حرم شریف آکر طواف نہ کرلے اور تاخیر کی وجہ سے دَم الگ واجب ہوگا، خواتین اگر دسویں تاریخ کو ماہ وارِی کی حالت میں تھیں اور بارہویں یا اس کے بعد بھی ماہ واری آتی رہی تو اُن کے لیے خصوصی رِعایت ہے کہ جب پاک ہوں، طوافِ زیارت کرلیں، اَگر دسویں تاریخ کو اِتنا مناسب وقت مل گیا کہ اس میں وہ طواف کرسکتی تھیں، مگر بلا عذر نہ کیا اور ماہ واری شروع ہوگئی یا بارہویں تاریخ کو ماہ واری بند ہوگئی اور طواف کے لیے مناسب وقت موجود تھا، مگر بلا عذر طواف نہ کیا اور بارہ تاریخ گزرگئی تو پاک ہونے کے بعد طواف بھی کرنا ہوگا اور بلا عذر تاخیر کرنے کی وجہ سے دَم بھی واجب ہوگا۔ (بحر: ۲/۳۴۸) اس سلسلہ میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''خواتین سے متعلق احکام'' اَگر کسی شخص نے طوافِ زیارت نہیں کیا؛ لیکن ''طوافِ وداع'' کرلیا تو یہی طوافِ زیارت بن جائے گا؛ البتہ

طوافِ وداع نہ کرنے پر دم واجب ہوگا۔ (درّ مختار:۲/۲۰۶)

قابلِ توجہ بات

احناف کے یہاں ۱۰/ذوالحجہ کے افعال رمی، قربانی اور بال کٹانے میں واجب ہے کہ ان کو اسی ترتیب سے انجام دیا جائے، اگر ان میں سے بعد کے کام کو پہلے کرلیا جائے، مثلاً رمی سے پہلے قربانی کرلی یا قربانی سے پہلے بال کٹالیا، تو دم واجب ہوجاتا ہے؛ لیکن آج کل اژدحام اور قربان گاہ کی دُورِی کی وجہ سے علمائے ہند کی رائے ہے کہ اگر مشقت ہو تو ترتیب کی رِعایت ضرورِی نہیں ہے، جیسا کہ دُوسرے فقہاء اور حنفیہ میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مسلک ہے، ''اِسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' اور ''اِدارۃ المباحث الفقہیہ'' نے علماء کے اِجتماع میں بہ اِتفاق رائے یہی فیصلہ کیا ہے۔ (اہم فقہی فیصلے:۱۲۰) پھر بھی اگر ترتیب کی رِعایت ہو تو بہتر ہے؛ البتہ اس پر اِتفاق ہے کہ ''طوافِ زیارت'' میں ترتیب نہیں، وہ ان تینوں کاموں سے پہلے بھی کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد بھی اور درمیان میں بھی؛ البتہ رمی سے پہلے اور قران و تمتع کرنے والے کے لیے قربانی سے پہلے طوافِ زیارت مکروہ ہے۔ (درّ مختار:۲/۲۰۸)

چوتھا دِن (۱۱/ذوالحجہ)

۱۱/ذوالحجہ کو منیٰ میں دُعا اور ذِکر کا اہتمام کرنا چاہیے، شب منیٰ میں گزارنی چاہیے کہ یہ سنت ہے، اس دن کا خصوصی عمل تینوں جمرات پر رمی کرنی ہے، ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے جمرہ اولیٰ پر، پھر درمیانی جمرہ پر اور آخر میں آخری جمرہ پر رمی کی جائے، منیٰ سے مکہ کی طرف آتے ہوئے پہلے جو جمرہ ملتا ہے، وہ ''اُولیٰ'' ہے، اس کے بعد ''وسطیٰ'' ہے اور مکہ کی طرف سے پہلا جمرہ ''جمرۂ عقبہ'' ہے، آج کل ان جمرات پر بہت نمایاں بورڈ لگے ہوئے ہیں، ہر جمرہ پر سات کنکریاں اسی طرح سے پھینکنی ہیں، جس طرح سے کہ کل آخری جمرہ پر پھینکی گئی تھیں؛ البتہ آج پہلے اور درمیانی جمرہ پر رمی کے بعد کنارے ہوکر تھوڑی دیر دُعا کرنی ہے، آخری جمرہ (جمرۂ عقبہ) پر رمی کے بعد دُعا نہیں کرنی ہے، ۱۱/ذوالحجہ رمی کے اوقات اس طرح ہیں:

طلوع صبح تا زوالِ آفتاب: امام ابو حنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق اس وقت ۱۱، ۱۲/

ذوالحجہ کو بھی رمی کی جا سکتی ہے؛ البتہ بلا عذر ایسا کرنا مکروہ ہے۔ (فتح القدیر: ۴۹۹/۲) زوال تا غروبِ آفتاب: اس وقت رمی کرنا افضل ہے، غروب آفتاب تا طلوع صبح ۱۲/ذوالحجہ: اس وقت عذر ہو تو رمی بلا کراہت جائز ہے، بلا عذر اس وقت رمی کرنا مکروہ ہے، اگر ۱۱/ذوالحجہ کو رمی نہ کر پایا تو بارہ کو گیارہ کی بھی رمی کرے گا اور تاخیر کی وجہ سے دم دے گا۔

پانچواں اور چھٹا دِن (۱۲، ۱۳/ذوالحجہ)

۱۲/ذوالحجہ کو بھی رمی وغیرہ کے احکام اور اوقات وہی ہیں، جو ۱۱/ذوالحجہ کے ہیں؛ البتہ اگر ۱۳/ذوالحجہ کے قیام کا اِرادہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ آج رمی کر کے غروبِ آفتاب سے پہلے ہی حدودِ منیٰ سے باہر نکل جائے، اگر ۱۳/ذوالحجہ کی صبح منیٰ میں طلوع ہوگئی تو ۱۳/ذوالحجہ کو بھی رمی کرنی واجب ہوگئی اور رمی کیے بغیر نکل جائے تو دم دینا ہوگا، یہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر ہے، دُوسرے فقہاء کے نزدِیک منیٰ میں آفتاب غروب ہوگیا تو اَب منیٰ سے نکلنا مکروہ ہے اور ۱۳/ذوالحجہ کی رمی واجب ہے؛ اِس لیے جو لوگ تیرہ کو رمی کے لیے رُکنا نہیں چاہتے ہوں وہ بارہ کو غروبِ آفتاب سے پہلے ہی نکل جائیں، ان کے لیے ۱۳/ذوالحجہ کو منیٰ میں رُکنا ضرورِی نہیں، رُک کر رمی کر لے تو زیادہ بہتر ہے اور ثواب ہے، حنفیہ کے نزدِیک اگر کوئی شخص تیرہ کو رُک گیا تو اُس دِن زوالِ آفتاب سے پہلے بھی رمی کر سکتا ہے۔

طوافِ وداع

''وداع'' کے معنی رُخصت ہونے کے ہیں، گویا یہ طواف بیت اللہ شریف سے فراق اور رُخصتی کا ہے، جو لوگ حدودِ میقات سے باہر کے رہنے والے ہوں اُن کے لیے حج کے بعد ''طوافِ وداع'' واجب ہے، اس کو ''طوافِ صدر'' بھی کہتے ہیں، عمرہ کرنے والے پر یہ طواف نہیں ہے۔ (فتح القدیر: ۵۰۴/۲)

طوافِ وداع کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے، تکمیل حج کے بعد کبھی بھی کیا جا سکتا ہے، بہتر ہے کہ مکہ سے رُخصت ہوتے ہوئے آخر میں طوافِ وداع کرے، اس طواف میں سعی نہیں، کعبۃ اللہ کے ساتھ چکر لگائے، اس کے بعد طواف کی دو رکعتیں پڑھ لے، پھر سیر

ہو کر زم زم پیے، حجر اسود اور کعبۃ اللہ کے دروازہ کا درمیانی حصہ ''ملتزم'' کہلاتا ہے، یہ دُعا کی قبولیت کی جگہ ہے، یہاں آ کر اَپنا چہرہ اور سینہ دِیوار سے لگا کر خوب گریہ وزارِی کے ساتھ دُعا کرے اور بیت اللہ سے فراق میں حزین وغمگین مسجدِ حرام سے باہر آئے؛ بلکہ کوشش کرے کہ گنہ گار آنکھوں سے حسرت وافسوس کے چند آنسو بھی ٹپک جائیں۔ (ہدایہ مع الفتح: ۵۱۰/۲)

عورتیں اَگر حیض کی حالت میں ہوں تو طوافِ وداع معاف ہے، طوافِ زیارت ہی ان کے لیے کافی ہے۔

زادِ سفر — حجاج کے لیے!

ترا جب سامنا ہوگا تڑپ اُٹھے گا میرا دِل
مری آنکھوں سے اشکِ غم مسلسل بہہ رہا ہوگا
ندامت کے پسینے میری پیشانی پہ اُبھریں گے
مرا دِل اَپنی عصیاں پرورِی پر جل اُٹھا ہوگا
لپٹ کر تیرے دامن سے کہوں گا اَپنی سب حالت
نہ جانے کس طرح مجھ سے بیانِ مدعا ہوگا

پروانۂ شمع نبوت مولانا احمد عروج قادری مرحوم کے یہ اشعار عازمین حرم کے جذبات واحساسات کی کیسی خوب ترجمانی ہے! حرمِ کعبہ کیا ہے؟ تجلیاتِ اِلٰہی کا مظہر جلیل، اہلِ اِیمان کے احترام و تقدیس کا دُنیا میں سب سے بڑا مرکز، اُمت مسلمہ کی وحدت و اِجتماعیت کا نشانِ عالی شان، جہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے بارگاہِ ربانی کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھ دی ہے اوراس کے گناہ گار ہاتھوں میں کعبہ کا غلاف نہیں؛ بلکہ خدائے رحیم وکریم کا دامن رحمت آ گیا ہے، جہاں عاصی و نافرمان پیشانیوں میں بھی سجدے مچلنے لگتے ہیں اور جہاں گونگ زبانیں بھی خدائے ذوالجلال سے ہم کلام ہونا چاہتی ہیں، مکہ مکرمہ سے قریب ہی شہرِ جاناں ''مدینہ منورہ'' ہے، یہاں کعبہ ابراہیمی تو موجود نہیں اور قبلۂ عبادت بھی یہ نہیں ہے، لیکن یہ مسلمانوں کا کعبہ محبت اور قبلۂ مقصود ہے، جس کے ذرّہ ذرّہ سے محبت کی بوئے شمیم اُٹھتی ہے اور ہر مسلمان کے مشامِ جان کو عطر بیز کر دیتی ہے، جس کا تصور بھی قلب کے لیے سامانِ سکون ہے اور جس کی گردِ راہ چشمِ محبت کا سرمہ اور مریض عشق کے لیے اکسیر ہے، کہنے والے نے خوب کہا ہے:

تمنا ہے درختوں پہ ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ رُوحِ مقید کا

کہ اسی کی آغوش میں وہ پاک اور عظیم ہستی آسودۂ خواب ہے، جس کی غلامی کا طوق

بادشاہوں کے لیے تمغہ اِفتخار اور وسیلہ عزت و وقار ہے، پھر اسی شہر جاناں میں شمع نبوت کے ہزاروں پروانے آرام فرما ہیں، یہاں کی فضاؤں میں بھی جاں نثارانِ اِسلام اور فدا کارانِ محمدی کے لہو کی خوش بو رَچی بسی ہے:

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو، یہ تیرا باغ نہیں!

کتنے خوش بخت اور سعادت نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں اس دیارِ مقدس میں حاضری کا اور اس کوچہ محبت میں دِیدۂ دِل بچھانے کا شرف حاصل ہوا، کہ اگر اِنسان یہاں سر کے بل چل کر جائے، تب بھی شاید اس زمین کے تقدس کا حق اَدا نہ ہو، جہاں امام مالکؒ پورِی زندگی رہنے کے باجود ہمیشہ برہنہ پا چلا کیے اور چپل پہننا گوارہ نہیں فرمایا، اس سعادت کا حال اُن عاشقانِ نامراد سے پوچھا چاہیے جن کے سینوں میں تمنائیں کروٹ لیتی ہیں اور بعض دفعہ یہ آرزو اور اِشتیاق موتی بن کر دِیدۂ دِل سے دِیدۂ چشم تک پہنچ جاتا ہے، لیکن ان کے خواب تشنہ تعبیر رہ جاتے ہیں، شاید ان کی یہ چاہت اور آرزو ہی ان کے حق میں حرمین شریفین کی حاضری کا بدل بن جائے کہ لذتِ ہجر کا مقام لذتِ وصال سے بھی سوا ہے۔

لیکن جیسے زیارتِ حرمین کی سعادت ''سعادتِ عظمیٰ'' ہے، اِسی طرح اُسی قدر اس کی رِعایت اور پاس ولحاظ بھی ضروری ہے، جو نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کی ناقدری اور مرتبہ ناشناسی اسی قدر نقصان دہ بھی ہوتی ہے، اِس لیے جو لوگ حج کو جائیں، ضرور ہے کہ ان آداب کی رعایت بھی رکھیں، جو اس سفر سعادت اور سفر شوق و محبت کے لیے مطلوب ہیں اور یہی ان کا اصل توشہ سفر ہے، ایسا نہ ہو کہ دُنیا کی متاعِ حقیر اور مادّی توشہ سفر سے تو آپ خوب آراستہ ہوں، لیکن جو سامانِ سفر اس سے زیادہ اہم ہے اور جو قلب ورُوح کی غذا ہے، اسی سے آپ محروم ہوں، راحت وآسائش کے سامان کہیں بھی خریدے جاسکتے ہیں اور قرار وسکون کے لمحات کے لیے ساری عمر پڑی ہے، لیکن جب آپ بے قراری کے خریدار ہیں اور خدا کی راہ میں تڑپنے اور بے سکون ہونے کی راہ منتخب کر رہے ہیں، تو ضروری ہے کہ پہلے دِل ورُوح کے

لیے توشہ سفر تیار کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نوجوان آئے اور عرض کیا کہ میں حج کے لیے نکل رہا ہوں، آپ تھوڑی دُور اُن کے ساتھ ساتھ چلے، پھر سر مبارک اُٹھایا اور اُس نوجوان سے مخاطب ہوتے ہوئے اِرشاد فرمایا: ''**یا غلام! قبل ا حجتک و کفر ذنبک و اخلف نفقتک۔**'' (مجمع الزوائد، عن ابن عمر: ۳/۱۱۲)

اے لڑکے! اللہ تمہارا حج قبول فرمائے، تمہارے گناہ معاف کرے اور تمہارے اخراجات کا بدل عطا کرے۔

دیکھا آپ نے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عازم حج کو جو زادِ سفر عطا کیا، وہ تقویٰ اور دعاء کا تھا، تقویٰ گناہوں اور اللہ کو ناراض ہونے والی باتوں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے، اِس لیے ضروری ہے کہ حج خالص اور غیر مشتبہ مال سے کیا جائے اور حرام تو کجا؛ انسان اپنے آپ کو مشکوک سے بھی بچائے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا:

''جس نے حرام کمائی سے بیت اللہ شریف کا اِرادہ کیا، تو جب وہ احرام باندھتا ہے، اپنا پاؤں رکاب میں رکھتا ہے اور سواری اسے لے کر چلتی ہے، پھر وہ کہتا ہے: لبیک اللّٰھم لبیک تو آسمان سے ایک ندا دینے والا ندا لگاتا ہے لا لبیک ولا سعدیک (تمہاری حاضری قبول نہیں) تمہاری کمائی حرام، تمہارا توشہ سفر حرام اور تمہاری سواری حرام، گناہوں کا بوجھ لے کر اور اجر و ثواب سے محروم لوٹ جاؤ اور ایسی خبر سنو جو تم کو غمگین کرے اور جب حاجی مالِ حلال کے ذریعہ سفر شروع کرتا ہے، اپنا پاؤں رکاب میں رکھتا ہے اور سواری اسے لے کر چلتی ہے، پھر وہ کہتا ہے: لبیک اللّٰھم لبیک! تو منادی آسمان سے ندائے غیبی لگاتا ہے: لبیک وسعدیک (میں نے تمہارا آنا قبول کیا) تمہاری سوارِی حلال ہے، تمہارا کپڑا حلال ہے اور تمہارا توشہ سفر حلال ہے، اجر کے ساتھ گناہ کے بوجھ سے محفوظ لوٹ جاؤ اور ایسی خبر سنو جو تمہارے لیے خوش کن ہو۔ (مجمع الزوائد: ۳/ ۲۰۹–۲۱۰، باب فی الحج والاحرام)

سود کا پیسہ ہو، رِشوت کی رقم ہو، ناجائز تجارت یا ملازمت کی آمدنی ہو، زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے فروخت کیا گیا ہو، شادی میں بیوی یا بہو کے والدین سے رقمیں اینٹھی گئی ہوں، بہنوں کو میراث سے محروم کر کے جائیداد بڑھائی گئی ہو، یا کسی اور طور پر مالِ حرام حاصل کیا گیا ہو، نہ ان کو حج میں اِستعمال کرنا جائز ہے اور نہ یہ دُرست ہے کہ حاجی اپنے کاندھوں پر یہ بارِ گناہ رکھ کر ساتھ لے جائے اور اس سے تائب نہ ہو۔

حج کے ذریعہ مؤمن کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور اِیمان کی تجدید عمل میں آتی ہے، اِسی لیے اِسلام کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلے گناہوں کو ختم کرنے والا قرار دیا ہے اور حج کو بھی!

نئی زندگی کے لیے زندگی میں اِنقلاب اور صالح تبدیلی کا آنا ضروری ہے اور اس اِنقلاب کی اِبتداء توبہ سے ہوتی ہے، توبہ کیا ہے؟ اپنے گناہوں پر شرمساری اور اس کی تلافی کی کوشش، خاص کر جہاں لوگوں کے حقوق کا معاملہ ہو، وہاں ضروری ہے کہ حقوق کو اَدا کیا جائے یا حقوق معاف کرائے جائیں، ورنہ ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں: خداوندا! میں حاضر ہوں اور خدا کی طرف سے جواب آئے: بندے! تیری حاضری قبول نہیں، یہ کیسی محرومی و نامرادی اور کم نصیبی و بدبختی ہوگی؟؟

حج کا مقصد رُوح کو غذا پہنچانا اور اس کے لیے قوت و تازگی کا سروسامان مہیا کرنا ہے، اگر انسان وہاں پہنچ کر بھی سامانِ دُنیا کی خریداری کے لیے بے چین ہو اور لوگوں کے لیے دعاؤں اور نیک تمناؤں کی سوغات لے جانے کی بجائے کپڑے اور میووں کا تحفہ خریدتا پھرے، تو اس سے زیادہ ناموزوں بات اور کیا ہوگی؟ یہ متاعِ ناپائے دار تو ہر جگہ میسر ہے، وہاں تو دِین و اِیمان کی متاعِ گراں مایہ جمع کرنی ہے، لیکن افسوس! کہ ارکانِ حج پورے بھی نہیں ہوتے ہیں کہ بہت سے حجاج واپسی کا اور واپس ہوتے ہوئے اپنے قرابت داروں اور رشتہ داروں کے لیے تحائف کے خریدنے کا پروگرام بنانا شروع کر دیتے ہیں، حج کا اصل تحفہ دُعا ہے اور میسر ہو تو ارضِ مبارک کے تبرکات ''زمزم، کھجور'' اور بس!

اللہ کا شکر ہے کہ حجاج کی تعداد میں ہر سال اِضافہ ہی ہوتا جاتا ہے، حج کی مشقتیں بھی نسبتاً کم ہوتی جاتی ہیں، کسی زمانہ میں حج کو بڑھاپے کی عبادت سمجھا جاتا تھا، لیکن آج نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد حج کا سفر کرتی ہے، لیکن اُمت کی ذِلت ورُسوائی اوراس کی حرماں نصیبی بھی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے، ہمارِی دُعائیں، ہمارِی اِلتجائیں اورآہ وزاریاں لگتا ہے کہ بارگاہِ ربانی سے واپس کردی جاتی ہیں، آخر یہ کیوں ہے؟ اِس لیے کہ ہماری عبادتیں بے رُوح ہوگئی ہیں، وہ اِخلاص واہتمام سے عارِی ہیں، اِسی لیے وہ بے تاثیرسی ہوگئی ہیں؛ کیوں کہ جو صورتیں حقیقت سے محروم ہوں، وہ بے تاثیر ہی ہوا کرتی ہیں۔

حج — کچھ اہم آداب واحکام

وارفتگانِ عشق کا کارواں سوئے حرم رواں دواں ہے، **لبیک اللّٰھم لبیک** کی صدائیں -کیا فضائیں، کیا سمندر اور کیا خشکی؟- ہر طرف گونج رہی ہیں، خدا کے بندے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم پر تنہا ہی لبیک کی آواز لگائی تھی؛ لیکن کیسی مقبول تھی یہ آواز جو آج مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پوری دنیا کا احاطہ کیے ہوئی ہے اور ہر طرف سے راہِ محبت کے مسافر کفن لپیٹے ہوئے صحرائے عرب کے ایک چوکور پتھر کے مکان کی طرف بڑھ رہے ہیں، یہ سادہ نقشہ کی عمارت قبلۂ نماز بھی ہے، قبلۂ محبت بھی اور قبلۂ احترام بھی، مبارک ہیں وہ لوگ جو اس سفر سعادت سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، قابل رشک ہیں وہ ہستیاں جنہیں اس در تک حاضری کی سعادت نصیب ہو رہی ہے، خوش قسمت ہیں وہ اہل ایمان جو حرمین شریفین کے دیدار سے اپنے دیدۂ چشم کو سجائے ہوئے ہیں اور ربّ کائنات سے محبت کرنے والوں کی فہرست میں اپنا نام لکھائے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سفر جتنا مبارک ہے اس کے تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ ہیں، اگر اس سفر کا حق ادا نہیں کیا گیا تو خدا کی طرف سے پکڑ کا اندیشہ بھی اسی قدر ہے، جو عمل جس قدر اونچا ہوتا ہے اس میں کوتاہی اسی قدر نقصان بھی پہنچاتی ہے، اگر کوئی شخص دو فٹ کی بلندی سے گر جائے تو معمولی چوٹ سے دوچار ہوگا؛ لیکن اگر کوئی شخص دو سو فٹ کی بلندی سے گرے تو جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا؛ اسی لیے مسافرانِ حرم کو چاہیے کہ حج جیسی عبادت کو اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کریں اور زیادہ سے زیادہ احتیاط کا راستہ اختیار کریں؛ کیوں کہ عمر بھر میں ایک ہی بار حج فرض ہے، اس کے بعد اگر آپ کو سفر حج نصیب ہو تو وہ حج نفل ہوگا فرض نہیں ہوگا، حج ایسی عبادت ہے جس میں کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور جسمانی مشقت بھی نماز روزہ سے کہیں بڑھ کر ہے؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حج بھی ایک طرح کا جہاد ہے، ''**الحج جهاد**'' (**سنن ابن ماجة، کتاب المناسک، باب الحج جهاد النساء**، حدیث نمبر: ۲۰۹۲)، نیز بعض روایتوں کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں فرمایا کہ حج ان کے لیے

جہاد کے درجہ میں ہے؛ لہٰذا جو عبادت اتنے اخراجات اور اتنی مشقت سے کی جارہی ہے اور جسے آئندہ پھر کبھی بطورِ فرض کے ادا کرنے کا موقع نہیں ہے، اس میں جس قدر احتیاط سے کام لیا جائے اور مستحبات و آداب کا اہتمام کیا جائے کم ہے، اسی پس منظر میں چند ضروری امور کی طرف حج کے لیے جانے والے عازمین کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ بعض مسائل وہ ہیں جن میں قرآن وحدیث کے احکام بالکل واضح ہیں، ان میں فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے نہیں پایا جاتا، بعض مسائل میں ایسی تعبیر اختیار کی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ رایوں کی گنجائش ہے؛ اس لیے ان میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے کہ دُشواری کے وقت علماء اس اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس رائے کو اختیار کر سکتے ہیں، جس میں سہولت ہو، جیسے دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں تین عمل کرنے ہوتے ہیں، جمرات پر کنکری مارنا، قربانی کرنا اور بال منڈانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب سے ان تینوں کاموں کو انجام دیا ہے، بعض صحابہؓ اس ترتیب کو باقی نہیں رکھ سکے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صورتِ حال عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے، "**افعل و لا حرج**" (**صحیح البخاری، کتاب العلم، باب الفتیا وهو واقف على الدابة وغيرها**، حدیث نمبر: ۸۳) —— اب حرج نہ ہونے کا دو مطلب ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ اس میں کوئی دم واجب نہ ہوگا؛ گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی حرج کو دور فرمایا، دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، یعنی اخروی حرج کی نفی کی گئی، اب بعض فقہاء نے پہلا معنی مراد لیا اور انہوں نے کہا کہ دسویں تاریخ کے ان تینوں افعال میں ترتیب واجب نہیں اور کوئی شخص ترتیب کی رعایت نہ کر پائے تو دم واجب نہ ہوگا، امام ابوحنیفہؒ نے دوسرا معنی مراد لیا، یعنی ترتیب واجب تو ہے اور اس کی رعایت نہ کرنے پر دم بھی واجب ہوگا؛ لیکن گناہ نہیں ہوگا، آج کل اژدہام کی کثرت، شرعی احکام سے ناواقفیت، لوگوں کی قیام گاہ سے قربان گاہ کی دوری کے باعث اس ترتیب کو باقی رکھنے میں قابل لحاظ مشقت ہوتی ہے، اس لیے موجودہ دور کے اکثر علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سلف صالحین کے اختلاف سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے پہلی رائے پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایسے مسائل میں جہاں تک ممکن ہو بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس رائے میں زیادہ احتیاط ہو اس پر عمل کیا جائے؛ تاکہ حج جیسی عبادت کی ادائیگی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو جائے، اسی کی ایک مثال عمرہ اور حج کے افعال مکمل ہونے کے بعد بال کٹانے کی ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک محض تین بال کا کاٹ لینا بھی کافی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم از کم چوتھائی حصہ کے بال کا کٹانا ضروری ہے، امام مالکؒ کے نزدیک پورے سر کا منڈانا یا کٹانا ضروری ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے سر کے بال منڈائے ہیں، پہلے دونوں نقطۂ نظر کے حاملین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو استحباب کے درجہ میں رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں احتیاط پورے سر کا بال منڈانے یا کٹانے میں ہے: کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل رہا ہے اور اس کے درست بلکہ کم سے کم افضل ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں؛ اس لیے اگر کسی مسئلہ میں اختلافِ رائے ہو اور اربابِ افتاء نے لوگوں کی مشکلات پر نظر کرتے ہوئے آسان رائے پر عمل کرنے کی گنجائش نکالی ہو تو اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، اور اگر آپ کا کوئی ساتھی اس رائے پر عمل کر رہا ہو تو اس کو خطا کار یا حقیر سمجھنا قطعاً غلط ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اُمت کے لیے آسانی کے پہلو کو اختیار کرتے تھے؛ لیکن کوشش بہر حال ایسی رائے پر عمل کرنے کی ہونی چاہیے، جس میں احتیاط کا پہلو ہو اور جس پر عمل کر کے انسان اختلاف سے بچ سکتا ہو، یہ بات اس لیے اہم ہے کہ حج کے درمیان بعض لوگ حاجیوں کو اختلافی مسائل میں کسی معقول ضرورت کے بغیر ایسے عمل کا مشورہ دیتے ہیں جو جمہور فقہاء کے نزدیک درست نہیں؛ اس لیے مسائل ان علماء اور اربابِ افتاء سے معلوم کرنے چاہییں جن کے علم وفضل پر آپ کو تجربہ کی بنیاد پر اعتماد ہو، نہ یہ کہ ہر مسئلہ بتانے والے کی بات کو قبول کرتے چلے جائیں۔ عبادتوں کا مقصد اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب کرنا ہے، اگر وہاں بھی انسان اپنی خواہش کا غلام بنا رہے تو یہ افسوس کی بات ہے، بہت سے موقعوں پر اس کی مثالیں سامنے آتی ہیں، جیسے حج میں بال کا منڈانا بھی جائز ہے اور کٹانا بھی؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار بال

منڈانے والوں کے حق میں رحمت خداوندی کی دعا کی ہے اور ایک بار بال کٹانے والے کے حق میں۔(**مسلم: عن عبد اللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر:۴۶-۳۱۴۵**) یقیناً ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ ایک دفعہ کے بجائے تین دفعہ اپنے آقا کی دعا پائے؛ لیکن بعض نوجوانوں پر بال کی محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ حج جیسے مبارک موقع پر بھی وہ اپنی اس چاہت کو قربان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حج جیسی عبادت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس میں خالص حلال مال خرچ ہو، مالِ حرام کی آمیزش نہ ہو، جہاں سود اور قمار کے ذریعہ حاصل ہونے والا پیسہ حرام ہے، وہیں رشوت، جبری وصولی اور ناجائز قبضہ وغیرہ کے ذریعہ بھی حاصل ہونے والے مال سے حج کرنا درست نہیں، اگر کسی شخص نے ایسے مال سے حج کیا تو گو فریضہ حج ادا ہو جائے گا؛ لیکن اندیشہ ہے کہ اس کی عبادت اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہو: "**ویجتهد فی تحصیل نفقة حلال فانه لا یقبل بالنفقة الحرام کما ورد فی الحدیث مع انه لیسقط الفرض عنه معها**" (**ردالمحتار:۳/۴۵۳**) اس لیے حج کے لیے حلال مال کے استعمال کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، نیز حرام سے توبہ کرنی چاہیے اور توبہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو مالِ حرام متعین طور پر اس کے پاس موجود ہو، اسے بلا نیت ثواب صدقہ کر دے۔ افسوس کہ حج میں بعض دفعہ فرائض و واجبات کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا، بعض حضرات فجر کی نماز چھوڑ دیتے ہیں؛ حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کفر و شرک اور ایمان کے درمیان نماز کا ترک کرنا معیار ہے: "**بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاۃ**" (**مسلم عن جابر بن عبد اللہؓ، کتاب الایمان، باب بیان الطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ، حدیث نمبر:۲۵۶**) اسی طرح بعض حضرات حرمین شریفین میں رہنے کے باوجود جماعت کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ جو لوگ مسافر نہ ہوں، ان کے حق میں جماعت واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو نذر آتش کر دوں۔(**ابو داؤد عن ابی ھریرۃؓ، حدیث نمبر:۵۴۸**) ایسی وعیدوں کا کوئی شخص حرم شریف جیسی مبارک جگہ میں مستحق

قرار پائے تو اس کی حرماں نصیبی کی بھی کوئی انتہا ہوگی؟ اس لیے حجاج مرد وخواتین کو نمازوں کا اور انہیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ حج کے منکرات میں ایک غیر محرم کے ساتھ اختلاط بھی ہے، کمروں میں مردوں اور عورتوں کا مشترک قیام رہتا ہے، اس میں ایک دوسرے کے غیر محرم بھی ہوتے ہیں، مسجدوں کو جانے اور آنے کے اوقات مختلف ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے بعض دفعہ غیر محرم کے ساتھ تنہائی کی بھی نوبت آجاتی ہے، یہ نہایت ہی قبیح بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اجنبی مرد وعورت کی تنہائی ہوتی ہے تو اس میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے، نیز مردوں اور عورتوں کا اس طرح مخلوط قیام نیک طبیعت مرد وخواتین کے لیے گرانی کا باعث بھی بنتا ہے؛ اس لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ چند افراد مل کر اس طرح نظم بنائیں کہ ایک کمرہ مردوں کے لیے مخصوص کر دیں اور ایک کمرہ عورتوں کے لیے؛ تاکہ بدنگاہی، بے پردگی اور اختلاط کے گناہ سے بھی بچیں اور دونوں کو بے تکلف ماحول میں رہنے کا بھی موقع ملے۔ حج کے سفر میں خرید وفروخت کی ممانعت نہیں ہے؛ لیکن اس سے ایسا اشتغال اور ایسی رغبت بھی نہ ہو کہ گویا سفر حج کا مقصود ہی یہی ہے، یہ عبادت کی روح کے منافی ہے، افسوس کہ بہت سے لوگ حرمین شریفین میں پہنچتے ہی خرید وفروخت کا پروگرام بنانا اور حریصانہ نظر سے بازاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں اور جن کا واپسی کا سفر حج کے بعد قریب ہوتا ہے ان میں سے بعض حضرات کو تو دیکھا گیا ہے کہ وہ منیٰ ہی سے خریداری کا نقشہ تیار کرنے لگتے ہیں کہ کس کے لیے کیا سامان خرید کر لے جانا ہے؟ یہ یقیناً قابل افسوس ہے، حج وہ جگہ ہے جہاں سے انسان کو زرق برق مادی لباس کے بجائے ''لباسِ تقویٰ'' لے کر جانا چاہیے، جہاں سے سونا چاندی کے بجائے زیورِ عمل کی سوغات اس کے ساتھ ہونی چاہیے، جہاں سے غذائے جسمانی کے بجائے غذائے روحانی کا توشہ لے کر اسے لوٹنا چاہیے؛ لیکن بہت سے حجاج مادی اسباب عشرت کی بہتات لے کر واپس ہوتے ہیں اور جہاز کا عملہ ان کے سامانوں کے ڈھیر کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے، حرمین شریفین سے اگر کوئی چیز لانے کی ہے تو وہ وہاں کے تبرکات ہیں، یعنی مکہ مکرمہ سے آبِ زمزم اور مدینہ منورہ سے کھجوریں نہ کہ متاعِ

عیش وعشرت ! بعض حجاج خرید نے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ سفر حج کو تجارتی سفر بھی بنا لیتے ہیں، ادھر ایک سلسلہ بعض افراد نے قربانی کے جانور فروخت کرنے کا شروع کر رکھا ہے، جس میں متعدد واقعات دھوکہ اور خیانت کے پکڑے گئے ہیں، اس لیے ایسی چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔ عبادت کی روح، اخلاص وللّٰہیت ہے اور اخلاص کی ایک علامت اپنے نیک اعمال کو چھپانا اور اس کی تشہیر سے بچنا ہے؛ لیکن افسوس کہ آج کل حج وعمرہ کی بھی باضابطہ تشہیر کی جاتی ہے، اخبارات میں مصور اشتہارات دیئے جاتے ہیں کہ فلاں صاحب حج کے لیے جارہے ہیں، خبریں بھی چھاپی جاتی ہیں، افسوس کہ عوام اور دنیا دار سمجھے جانے والے لوگ ہی نہیں، وہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں جو اصلاح وارشاد کی مسندوں پر متمکن ہیں، یہ نہایت قابل افسوس بات ہے، حج کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اس میں تجارت، دِکھاوا اور تشہیر سے بچایا جائے: "ویجرد سفرہ عن التجارۃ والریاء والسمعۃ والفخر" (فتح القدیر:۲/ ۴۰۷) حج کا سفر ہے ہی مشقت ومجاہدہ کا سفر؛ اس لیے اسے ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہیے اور جذبہ ایثار کے ساتھ عزم سفر کرنا چاہیے، سفرِ عشق ومحبت کھونے کا سفر ہوتا ہے، اس میں کھونا ہی پانا ہے اور اس میں لٹ جانا ہی سرفرازی ہے، سفر حج میں بہت سے مواقع باہمی کشاکش کے آتے ہیں، تکان اور مشقت اس احساس کو اور بھی سوا کر دیتی ہے؛ اس لیے اگر آدمی پہلے سے ذہن بنالے کہ ہم اپنے حصہ سے کسی قدر کم پر راضی ہو جائیں گے اور اپنے بھائی کے حق میں ایثار سے کام لیں گے تو نہ صرف آخرت میں وہ اجر کا مستحق ہوگا؛ بلکہ اپنے ساتھیوں کے درمیان بھی وہ محبوب وپسندیدہ شخص بن کر رہ سکے گا۔ حرمین شریفین کا تقدس، اس کی عظمت اور رشتہ ایمان کی وجہ سے اس سے جو محبت ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہاں کے لوگوں، وہاں کی چیزوں اور وہاں کی خوبیوں کو سراہا جائے اور خامیوں اور پریشانیوں کے ذکر سے گریز کیا جائے؛ کیوں کہ ان مبارک مقامات سے محبت دراصل ایمان کا حصہ ہے، انسان کو اپنے والدین اور اولاد سے محبت ہوتی ہے تو وہ ان کی خامیوں میں بھی خوبیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے؛ اس لیے زبان کو محتاط رکھنے کی ضرورت ہے، بہت سے لوگ یہاں پہنچ کر بھی

شکایت کا دفتر کھولے رہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے بارے میں فرمایا کہ اس کی مثال ایک بھٹی کی سی ہے، جو خراب حصے کو اچھے حصہ سے الگ کر دیتی ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۳۳۵۵) تو اگر ان مقامات کی محبت سے کسی مسلمان کا سینہ خدانخواستہ لبریز نہ ہو، یہاں کی فضائیں اور یہاں کی چیزیں دل کو نہ بھائیں تو ایمان میں کمزوری کی علامت ہے؛ اس لیے ایسی باتوں سے خوب احتیاط کرنی چاہیے؛ بلکہ وہاں کے لوگوں کی کمزوریوں سے بھی درگذر کرنا چاہیےاور اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھے۔

حجاج کرام کی بعض مشکلات

اللہ تعالیٰ نے اس سال حج کی سعادت سے بہرہ ور فرمایا، خوشی کی بات ہے کہ اس سال حج مکمل امن وامان کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا، نہ کوئی حادثہ پیش آیا نہ کوئی افراتفری پیدا ہوئی اور نہ کوئی احتجاج یا مظاہرہ ہوا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعودی حکومت حج وعمرہ کرنے والوں کو سہولت پہنچانے کی پوری کوشش کرتی اور فراخ دلی کے ساتھ حرمین شریفین کی خدمت کرتی ہے، جوں جوں تعمیری منصوبے مکمل ہورہے ہیں، آسانیاں بڑھتی جارہی ہیں، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور عالم اسلام کو جوڑ کر رکھنے، مسلم ممالک کو اختلاف سے بچانے اور مقاماتِ مقدسہ کو یہود ونصاریٰ کے شرور اور ان کے ناپاک منصوبوں سے محفوظ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ دینی حمیت اور ایمانی غیرت سے نوازے۔

ہندوستان کے لوگوں کے لیے یہ بات بے حد مسرت کی باعث ہے کہ انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد سب سے زیادہ حجاج ہندوستان سے حج کرتے ہیں، اور کسی ایک خطہ کے اعتبار سے بحیثیت تعداد برصغیر کے حجاج سب سے زیادہ ہوتے ہیں، برصغیر — ہندوپاک اور بنگلہ دیش — میں بسنے والے مسلمانوں کی غالب ترین تعداد فقہ حنفی کی متبع ہے، اسی طرح افریقی ممالک سے آنے والے حجاج زیادہ تر مالکی ہیں، مشرقی ایشیاء، انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ کے حاجی فقہ شافعی پر عمل کرتے ہیں، سعودی عرب کے مسلمان فقہ حنبلی کے متبع ہیں؛ اسی لیے حرمین شریفین میں معمول رہا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں فقہاء کی ایک سے زیادہ رائیں ہیں؛ لیکن اس کی کسی خاص صورت پر سب لوگوں کا اتفاق ہے تو اسی صورت کو اختیار کیا جائے؛ تاکہ تمام مسلمانوں کے لیے وہ عمل قابل قبول ہو، اور اِس طریقۂ کار کی تائید فقہاء کے اس اصول سے ہوتی ہے کہ اختلافی مسائل میں ایسا عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جس میں اختلاف سے بچتے ہوئے عمل مکمل ہوجائے، جیسے وضو کا ایک فرض ہاتھ کا دھونا ہے، اب بعض فقہاء کے نزدیک ہاتھ دھونے کے حکم میں کہنیاں بھی شامل ہیں اور بعض فقہاء کے نزدیک کہنیاں شامل نہیں ہیں تو اگر کہنیوں سمیت ہاتھ دھولیا جائے تو سبھوں کے نزدیک وضوء درست ہوجائے گا،

یا جیسے بعض فقہاء کے نزدیک وضو میں چند بالوں پر مسح کافی ہے، بعضوں کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح ضروری ہے اور بعض حضرات کے نزدیک پورے سر کا، اب اگر پورے سر کا مسح کرلیا جائے تو تینوں نقطۂ نظر کے مطابق سر کا مسح درست ہوجائے گا؛ اس لیے پورے سر کا مسح کرنا چاہیے، اس اصول کو ''خروج عن الخلاف'' کہتے ہیں اور اس کے بہتر ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، پس حرمین شریفین چوں کہ پوری امتِ اسلامیہ کا مرکز ہے، اس لیے اختلافی مسائل میں وہاں اسی طریقۂ کار پر عمل ہونا چاہیے۔

اس لحاظ سے اس سفر میں بعض ایسے افعال دیکھے گئے، جو بیشتر حجاج کے لیے اضطراب اور بے اطمینانی کا باعث تھے، ان میں سے تین امور کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، ان میں ایک وقت نصف النہار کا ہے، جب سورج بیچ آسمان پر ہوتا ہے، زوال کے اصل معنی سورج ڈھلنے کے ہیں، جب مکروہ وقت ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن برصغیر کے عرف میں اسی کو زوال کا وقت کہا جاتا ہے، جب یہ وقتِ مکروہ ختم ہوجاتا ہے تو ظہر یا جمعہ کا وقت شروع ہوتا ہے؛ اسی لیے احناف، مالکیہ اور شوافع کے نزدیک جمعہ کی اذان اور نماز دونوں اس وقتِ مکروہ کے ختم ہونے کے بعد ہونی چاہیے؛ ہاں حنابلہ کے نزدیک جمعہ کی اذان وقت سے پہلے ہی دی جاسکتی ہے؛ البتہ نماز وقتِ مکروہ ختم ہونے کے بعد ہی ادا کرنی ضروری ہے؛ لیکن اگر اذان بھی وقت مکروہ کے ختم ہونے کے بعد دی جائے تو حنابلہ کے یہاں اس میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ لہٰذا اگر وقت مکروہ کے گذرنے کے بعد جمعہ کی اذان دی جائے اور اس کے بعد خطبہ اور نماز ہوجائے تو تمام فقہاء کی رائے پر یہ عمل درست رہے گا، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا معمول بھی رہا ہے؛ خود دو ڈھائی سال پہلے تک حرمین شریفین میں بھی یہی معمول تھا کہ وقت مکروہ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی اذان دی جاتی اور تھوڑا سا وقت دے کر خطبہ دیا جاتا؛ لیکن شیخ سدیس کے رئیس امور حرمین بننے کے بعد معمول بدل گیا، اب جمعہ کا وقت شروع ہونے

سے تقریباً نصف گھنٹہ پہلے ہی اذان دے دی جاتی ہے، ایک تو اس سے حجاج کی بڑی تعداد غیر مطمئن ہے، دوسرے: اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عین مکروہ وقت میں نماز ادا کرتے ہیں، جس کی ممانعت ہے، تیسرے: جو لوگ مکروہ وقت سے پہلے جمعہ کی سنت ادا کرتے ہیں، ان کی سنت ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ ابھی جمعہ کا وقت داخل ہی نہیں ہوا ہے؛ اس لیے جو معمول پہلے سے تھا اسی کو برقرار رکھا جانا چاہیے، اور جب تک یہ صورت نہ ہو جائے لوگوں کو چاہیے کہ وقت مکروہ میں نماز پڑھنے سے بچیں اور چوں کہ وقت شروع ہونے کے بعد سنت کا موقع نہیں دیا جاتا تو جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد سنت پڑھیں، اس کی گنجائش ہے، اور بہ حالت موجودہ اس تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ عام مسلمان اس سلسلہ میں مجبور ہیں۔

(۲) جماعت کی نماز میں یہ بات واجب ہے کہ امام آگے ہو اور مقتدی اس کے پیچھے ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عہد میں یہی معمول رہا ہے، اگر مقتدی امام سے آگے بڑھ جائے تو مقتدی کی نماز نہیں ہوگی، یہی رائے احناف، شوافع اور حنابلہ کی ہے؛ البتہ مالکیہ کے ایک قول کے مطابق اگر مقتدی آگے بڑھ گیا، تب بھی کراہت کے ساتھ نماز ادا ہو جائے گی؛ لیکن ان کے نزدیک بھی بہتر طریقہ یہی ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے ہوں؛ چناں چہ حرمین شریفین کا یہی معمول تھا، مدینہ منورہ میں ابھی بھی سمت قبلہ میں ترکی عمارت کے دونوں جانب بورڈ لگا ہوا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس سے آگے نہ بڑھیں ورنہ نماز نہیں ہوگی، مسجد حرام مکہ مکرمہ میں بھی پہلے زمانۂ حج میں امام صاحب حجر اسود کے سامنے کھڑے ہوتے تھے اور وہاں سے نماز پڑھاتے تھے؛ تا کہ مقتدی امام سے پیچھے ہوں؛ لیکن اس بار یہ بات دیکھنے میں آئی کہ باب ملک عبدالعزیز کے پاس فرسٹ فلور پر ایک عارضی احاطہ بنا ہوا ہے، امام صاحب اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں اور ہزاروں لوگ ان کے آگے کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں، جمہور فقہاء کے نزدیک اس صورت میں آگے رہنے والے مقتدیوں کی نماز نہیں ہوگی؛ اس لیے برصغیر کے حجاج کو چاہیے کہ اس حصہ میں نماز ادا کرنے سے گریز کریں، دوسری سمتوں میں نماز ادا کریں؛ کیوں کہ مسجد حرام میں امام جس سمت میں کھڑا ہے، وہاں مقتدی کے

آگے بڑھنے کی ممانعت ہے، دوسری سمتوں میں اگر وہ آگے بڑھ جائے تو نماز ہو جاتی ہے؛ البتہ اگر ناواقفیت کی بنا پر امام سے آگے نماز ادا کر لی تو ان شاء اللہ نماز ہو جائے گی؛ کیوں کہ وہ اس سلسلہ میں معذور ہے اور ائمہ اربعہ کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

(۳) نماز جنازہ کی ترتیب یہ ہے کہ جنازہ امام کے آگے ہو اور نماز پڑھنے والے امام کے پیچھے ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا یہی عمل رہا ہے اور یہی مسلمانوں کا متوارث طریقہ ہے، مسجد نبوی میں اب بھی نماز جنازہ اسی طریقہ پر ادا کی جاتی ہے؛ لیکن مسجد حرام مکہ مکرمہ میں اب جنازہ کی جگہ عام نمازوں میں امام کے لیے مقررہ جگہ سے بھی پیچھے رکھی گئی ہے، اور امام جنازہ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھاتا ہے، اور نماز پڑھنے والوں کی بڑی تر تعداد اس طرح نماز ادا کرتی ہے کہ جنازہ بھی پیچھے اور امام بھی پیچھے، یہ طریقہ بھی جمہور فقہاء اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منقول طریقہ کے خلاف ہے؛ اس لیے جو لوگ امام کے آگے ہیں، ان کو نماز جنازہ میں شامل نہیں ہونا چاہیے، ہاں، جو لوگ امام کی سمت سے ہٹ کر کھڑے ہوں تو چاہے وہ امام کے مقابلہ میں کعبۃ اللہ سے زیادہ قریب ہوں، ان کی نماز ہو جائے گی، اس سے پہلے نماز جنازہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جنازہ کعبۃ اللہ کے قریب لایا جاتا اور امام صاحب وہیں سے نماز پڑھاتے، حرمین شریفین سے چوں کہ پوری امت اسلامیہ کا تعلق ہے؛ لہٰذا ایسے مسائل میں ایک دو افراد یا ادارہ کا اپنے طور پر فیصلہ کر لینا اور اس کو تمام مسلمانوں پر نافذ کر دینا مناسب عمل نہیں ہے۔

اسی طرح بعض اور باتیں بھی قابل توجہ ہیں، مثلاً مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ دیکھا گیا کہ جمعہ کا خطبہ چالیس پچاس منٹ کا ہوا؛ حالاں کہ کھلے صحن میں بیٹھے لوگ چلچلاتی دھوپ کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے اور نماز میں سورۃ کوثر اور سورۃ اخلاص پڑھی گئی تو حالات کے لحاظ سے نماز کو مختصر کرنا تو ایک مناسب عمل اور اسوۂ نبوی کے مطابق ہے؛ لیکن خطبہ کو اتنا طویل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، دس منٹ میں مسنون خطبہ کی تکمیل ہو سکتی

ہے، اور اس بات پر حدیث میں بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے کہ خطبہ طویل ہو اور نماز مختصر۔

اسی طرح آج کل رمضان المبارک میں نماز وتر میں اتنی طویل دعا کی جاتی ہے جو تیس سے چالیس منٹ کا احاطہ کرتی ہے؛ حالاں کہ نماز میں بہت سے ضعیف اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں، حرمین شریفین کی نماز میں خواتین اور بچے بھی ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زیادہ دیر تک اپنا وضو قائم نہیں رکھ سکتے، سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے اندر اتنی طویل دعاء شریعت کے مزاج کے مطابق ہے؟ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ سے نماز کے اندر اتنی لمبی دعا کرنا منقول نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی موقع پر نماز کے اندر قنوت نازلہ زور سے پڑھی ہے، راقم الحروف نے مختلف حدیثوں میں اس دعا کے جو فقرے منقول ہیں، ان کو اپنی کتاب ''قاموس الفقہ'' میں جمع کر دیا ہے، جس کو پڑھنے میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا تو کیا صرف اس لیے ایسی طویل دعاء کو نماز میں رواج دینا درست ہوگا کہ لوگ اسے پسند کرتے ہیں؟ یہ شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے قراءت کو بھی مختصر کر دیتے تھے اور یہاں دعاء اتنی طویل کی جاتی ہے کہ اس میں قرآن مجید کے دو پاروں کی تلاوت ہو جائے۔

حرمین شریفین میں پوری دنیا سے مسلمان کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور اس موقع پر تیس سے چالیس دن قیام ہوتا ہے، یہ ان کی تربیت کا بہترین موقع ہے، اصلاح و تربیت کے موضوعات ایسے ہیں، جن میں سلف صالحین کے درمیان کوئی اختلافِ رائے نہیں ہے، اور اس وقت اس کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، حرمین شریفین میں ماشاء اللہ بہت سے اساتذہ مقرر ہیں، جو تفسیر، حدیث، فقہ کی مختلف کتابوں کا درس دیتے ہیں؛ لیکن افسوس کہ بعض حضرات بالخصوص اردو اور بنگلہ میں درس دینے والوں نے طے کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں میں تفریق ہی کی باتیں کریں گے اور ایسے مسائل چھیڑیں گے جس میں اختلافِ رائے ہو؛ تاکہ اختلاف رکھنے والوں کے خلاف بول کر اپنے نفس کی تسکین کر سکیں، اس کا نتیجہ ہے کہ

ایسے لوگوں کے دروس بے فیض ثابت ہوتے ہیں اور لوگوں کی اصلاح تو نہیں ہوتی؛ لیکن وہ اختلاف کی کڑوی باتیں لے کر ہندوستان اور پاکستان پہنچتے ہیں اور یہاں آکر وہی انتشار پھیلاتے ہیں؛ حالاں کہ اگر ان دروس کو اعتقادی بگاڑ کو دور کرنے اور اخلاقی اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے تو اس سے بڑا فائدہ ہوسکتا ہے، بظاہر جو لوگ ایسی تفرقہ آمیز باتیں کرتے ہیں، وہ سعودی حکومت کو لاعلم رکھ کر ایسا کرتے ہیں؛ کیوں کہ سعودی حکومت بار بار مسلکی تشدد کی مخالفت کرتی رہتی ہے اور علماء کو اس سے بچنے کی تلقین کرتی ہے۔

کاش! اگر ان امور پر توجہ دی جائے تو سعودی حکومت حج کے سلسلے میں جو گراں قدر مخلصانہ خدمت انجام دے رہی ہے، اس میں چار چاند لگ جائے، **وباللہ التوفیق وهو المستعان!**

عمرہ — ایک اہم عبادت !

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ارضی کے بچھانے کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا ہے؛ اسی لیے یہ خشکی کے علاقہ کے اعتبار سے عین وسط کائنات میں واقع ہے، یہاں تک کہ بعض اہل تحقیق کا بیان ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے عین وسط میں ہونے کی وجہ سے وہاں کشش صفر ہو جاتی ہے اور قطب نما کے کانٹے میں حرکت نہیں ہوتی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسانوں سے بسایا تو اس دنیا میں پہلا گھر جو بنایا گیا، وہ ''کعبۃ اللہ'' ہے، اس طرح کعبۃ اللہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے مرجع و ماویٰ کی حیثیت رکھتا ہے، اگر انسان یہاں پہنچ کر ایک قلبی سکون اور روحانی مسرت محسوس کرے تو یہ وہی فطری احساس ہوگا، جو سفر سے اپنے گھر لوٹنے والے انسان کو ہوتی ہے؛ اسی لیے اسلام میں دو فرض عبادتیں ایسی ہیں جو کعبۃ اللہ سے جڑی ہوئی ہیں، مسلمان جہاں کہیں بھی نماز پڑھے، اس کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور حج سوائے مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات کے کہیں اور ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔

حج کے علاوہ دوسری عبادت جس میں انسان کو زیارت حرم شریف کی سعادت حاصل ہوتی ہے، عمرہ ہے؛ بلکہ عمرہ کے اصل معنی ہی زیارت و ملاقات کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ''مخصوص طریقہ پر بیت اللہ شریف کی زیارت کو کہتے ہیں'' (النہایۃ : ۳/۷) چوں کہ بیت اللہ شریف کی زیارت ایمان کو تازہ کرتی ہے؛ اس لیے عمرہ کی بڑی فضیلتیں منقول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بیت اللہ شریف کو آئے اور کوئی شہوانی کام اور گناہ نہ کرے تو وہ اس طرح لوٹتا ہے کہ جس طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے دن تھا (**مسلم، باب فی فضل الحج والعمرۃ و یوم العرفۃ**، حدیث نمبر: ۱۳۵۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی ایک اور روایت نقل کی گئی ہے، اس میں حج اور عمرہ دونوں کی صراحت موجود ہے کہ جو کسی شہوانی حرکت اور گناہ سے بچتے ہوئے حج کرے گا، وہ اپنے گھر اس طرح لوٹے گا کہ گویا وہ آج ہی پیدا ہوا ہے (سنن دار قطنی : ۱/۲۴۹، حدیث نمبر: ۲۶۸۸) ایک اور روایت میں ہے کہ جو بیت اللہ شریف کو آئے اور اس کا مقصد اسی گھر کی

زیارت ہو اور طواف کرے تو وہ اپنے گناہ سے اس طرح پاک ہو جائے گا، جیسا کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔ (القری لقاصد ام القری، ص:۲۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ کے بعد جب انسان دوسرا عمرہ کرتا ہے تو یہ دوسرا عمرہ درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے: "**العمرة الی العمرة کفارة لما بینهما**" (بخاری، **باب وجوب العمرة وفضلها**، حدیث نمبر: ۱۷۷۳)؛ البتہ اس حدیث میں گناہ سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جن باتوں سے تم کو منع کیا گیا ہے، اگر تم ان میں سے بڑی بڑی باتوں سے بچ جاؤ تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے: **اِن تَجتَنِبوا کَبَارَ مَا تنهَونَ عَنه نکَفِر عَنکم سَیّاٰتِکم** (النساء:۳۱) —— حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حج وعمرہ روحانی فائدہ کا باعث ہے، اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، وہیں یہ فقر ومحتاجی کو بھی دور کرتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج وعمرہ پے در پے کرتے رہو، یہ فقر ومحتاجی کو اس طرح دور کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے کے میل وکچیل کو دور کر دیتی ہے۔ (**مجمع الزوائد، باب المتابعة بین الحج والعمرة**، حدیث نمبر: ۵۶۵۷)

حج وعمرہ کے روحانی اور مادی فوائد میں یکسانیت کی وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف سے متعلق طواف وسعی اور تلبیہ واحرام کا جو عمل حج میں ہوتا ہے، وہ عمرہ میں بھی ہوتا ہے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کو حج اصغر قرار دیا ہے: "... **وان العمرة الحج الاصغر**" (**الدارقطنی، کتاب الحج**، حدیث نمبر: ۲۶۹۷)

یہ تو عمرہ کی عمومی فضیلت ہے؛ لیکن رمضان المبارک میں چوں کہ ہر عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے؛ اس لیے ماہ مبارک میں عمرہ کرنے کا اجر بھی زیادہ ہے، مدینہ میں ایک انصاری خاتون ام سنان رضی اللہ عنہا نام کی تھیں، وہ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک نہیں ہو سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے سبب پوچھا، انہوں نے عرض کیا کہ

میرے پاس دو ہی اونٹ ہیں، ایک اونٹ میرے شوہر اور لڑکے لے کر چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی اور دوسرا اونٹ پانی لانے اور دوسرے کاموں میں استعمال ہوتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان آئے تو عمرہ کرلینا؛ کیوں کہ رمضان کا عمرہ بھی حج کے برابر ہے: ''**فإذا جاء رمضان فاعتمر؛ فان عمرة فيه تعدل حجة**'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۵۶، **باب فضل العمرة في رمضان**) بعض روایتوں میں اس سے بھی بڑھ کر بشارت آئی ہے کہ رمضان میں عمرہ کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے کے درجہ میں ہے (دیکھئے: سنن ابی داود، حدیث نمبر: ۱۹۹۰) ـــ غالباً یہ بات آپ نے ان لوگوں کی تسلی کے لیے فرمائی، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشریف نہ لے جا سکے، حالاں کہ وہ اس کے آرزومند تھے، یہ شریک نہ ہونا مختلف اعذار کی بناء پر ہوا ہوگا، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مدینہ بالکل خالی نہ ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد رمضان المبارک میں عمرہ کا موقع نہیں ملا اور اہل مکہ سے ناخوش گوار تعلقات کی وجہ سے مدنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کا بار بار عمرہ کرنا ممکن نہیں تھا؛ لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ حدیبیہ کو لے کر چار عمرے فرمائے ہیں، پہلا ۶ھ میں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ تشریف لائے اور وہاں صلح طے پائی، یہ عمرہ نامکمل رہا؛ کیوں کہ مشرکین مکہ کی رکاوٹ کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ نہ کر پائے، دوسرا عمرہ آئندہ سال اس عمرہ کی قضاء کے طور پر، اس کو ''عمرۃ القضاء'' کہا جاتا ہے، تیسرا عمرہ فتح مکہ کے موقع سے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے حج قِران کا احرام باندھا تھا، جس میں حج وعمرہ دونوں جمع ہوتا ہے اور یہ تمام ہی عمرے ماہ ذوالقعدہ میں کیے گئے۔ (بخاری، **کتاب العمرة، باب کم اعتمر النبة** حدیث نمبر: ۱۷۷۸، صحیح مسلم، **کتاب الحج، باب بیان عدد عمر النبة وزمانهن**، حدیث نمبر: ۳۰۹۲، **سنن ابی داود، کتاب المناسک، باب العمرة**، حدیث نمبر: ۱۹۹۵)

عمرہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے بعض فقہاء نے عمرہ کو واجب قرار دیا ہے، حنفیہ اور

مالکیہ کے نزدیک اگرچہ عمرہ سنت مؤکدہ ہے (المغنی: ۹۸/۳) لیکن بعض مشائخ احناف نے عمرہ کو واجب بھی قرار دیا ہے، اور مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ (بدائع الصنائع: ۲۳۶/۲)

اس لیے جو مسلمان اصحابِ استطاعت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مالی گنجائش دی ہے، انہیں شادی بیاہ اور لہو ولعب میں پیسے ضائع کرنے کی بجائے عمرہ کی سعادت حاصل کرنی چاہیے، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ عمرہ کو عبادت کا سفر بنایا جائے، نہ کہ تفریح کا، آج کل عمرہ کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس طرح عمرہ کرتی ہے کہ گویا وہ کسی سیاحتی سفر پر جا رہے ہوں، نہ عبادت کا اہتمام، نہ خشوع وخضوع، نہ زندگی میں کوئی تبدیلی، نہ اخلاق وکردار میں کوئی انقلاب، عمرہ کے باوجود نماز کی پابندی نہیں، داڑھی رکھنے کی توفیق نہیں، زمینوں پر ناجائز قبضہ سے اجتناب نہیں، لوگوں کے ساتھ بدخلقی کے رویہ میں کوئی فرق نہیں، غرض کہ عمرہ ان کے قلب ورُوح کے لیے کوئی انقلاب انگیز عمل نہیں ہوتا؛ بلکہ ایک تفریح ہوتی ہے، جیسے آگ کی تصویر سے حرارت حاصل نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ایسے بے روح عمرہ اور بے کیف عبادت سے انسان کی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی نہیں آتی۔

شریعت کے تمام احکام حالات سے مربوط ہیں، ضرورت کے اعتبار سے عمل کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں، اگر جہاد کا موقع ہو تو روزہ رکھنے سے نہ رکھنا افضل ہے، اگر گھر میں ایک شخص مریض ہو جس کو ہر لمحہ خدمت اور تیمارداری کی ضرورت ہو تو نفل عبادتوں سے زیادہ اہم اس مریض کی دیکھ ریکھ ہے، اسی طرح اگر کسی سے رشتہ داروں کے مالی حقوق وابستہ ہوں، کسی کی یتیم بھانجی کی پیسوں کی وجہ سے شادی نہ ہو پا رہی ہو، کسی کا غریب بھتیجا پیسوں کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو، کسی کا غریب بھائی اپنے علاج کے لیے پیسہ نہ پاتا ہو، کسی کے قرب وجوار میں مسلمانوں کی غربت وپسماندگی کی وجہ سے ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا ہو تو ایسے موقع پر نفل عمرہ کرنے سے افضل ان ضرورتوں کو پورا کرنا ہے اور امید ہے کہ ان شاء اللہ اگر کوئی شخص مکرر عمرہ کرنے کی بجائے اس رقم کو ان کاموں میں صرف کرے گا تو وہ زیادہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

صدقۃ الفطر: کچھ قابل توجہ پہلو

شریعت اِسلامی کا مزاج یہ ہے کہ جب بھی کوئی خوشی اور مسرت کا موقع آئے تو صرف امیروں کے دولت کدہ ہی میں خوشی کا چراغ نہ جلے؛ بلکہ غریبوں اور ناداروں کے غربت کدہ میں بھی اس کی روشنی پہنچے؛ اِسی لیے خوشی کے موقع پر سماج کے غریب افراد کو یاد رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، بقر عید کی قربانی میں ایک تہائی غریبوں کا حق قرار دیا گیا، ولیمہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے، جس میں سماج کے امیر لوگوں کو بلایا جائے اور غریبوں کو نظر انداز کر دیا جائے، اسی طرح عید الفطر کی خوشی میں غرباء کو شریک کرنے کے لیے صدقۃ الفطر کا نظام مقرر کیا گیا۔

چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد وعورت پر صدقۃ الفطر فرض کیا ہے، جو ایک صاع کھجور یا جَو ہونا چاہیے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۵۱۱) صحابہ اہتمام سے صدقۃ الفطر ادا کیا کرتے تھے، (بخاری، عن ابی سعید خدری، حدیث نمبر: ۱۵۰۶) زکوٰۃ ہی کی طرح صدقۃ الفطر نکالنے کا حکم ہجرت کے دُوسرے سال آیا، اس کا ایک مقصد غرباء کی مدد کرنا ہے اور دُوسرا مقصد یہ ہے کہ روزوں میں جو کمی اور کوتاہی رہ گئی ہو، اِس صدقہ کے ذریعہ اس کی تلافی ہو جائے۔

رمضان المبارک شروع ہونے کے بعد کبھی بھی صدقۃ الفطر نکالا جا سکتا ہے؛ البتہ عید سے پہلے نکال دینا بہتر ہے؛ تا کہ غریب مسلمانوں کو عید کا سامان فراہم کرنے میں سہولت ہو، اگر چہ بعض اہلِ علم نے رمضان سے پہلے بھی صدقۃ الفطر نکالنے کی اِجازت دِی ہے؛ لیکن جس بات کو ترجیح ہے، وہ یہ ہے کہ رمضان شروع ہونے بعد صدقۃ الفطر مستحق کے حوالہ کیا جائے؛ کیوں کہ عید الفطر اور صدقۃ الفطر کا رمضان سے گہرا تعلق ہے: **"لكن المفتي به اشتراط دخول رمضان، فلا يجوز تقديمها عن رمضان"** (**الفقه الاسلامي وأدلته: ۳/ ۲۰۴۱، المبحث الثاني، وقت وجوب زكوٰة الفطر وحكم تعجيلها**) لیکن اگر رمضان میں ادا نہیں کیا تو عید کے دن نماز عید سے پہلے تو ادا کر ہی دینا چاہیے، حضرت

عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو سنت قرار دیا ہے کہ جب عید کی نماز کے لیے نکلے تو کچھ کھا کر نکلے اور نماز سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کر دے۔ (سنن دار قطنی، حدیث نمبر:۱۷۰۹)

صدقۃ الفطر مال داروں پر واجب ہے اور غرباء اس کا مصرف ہیں، اس میں مال دار سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کے پاس اپنی بنیادی ضروریات؛ مکان، کپڑے، گھر کے ضروری سامان، اِستعمال کی سواری وغیرہ کے علاوہ کوئی بھی چیز نصابِ زکوٰۃ کی قیمت کی موجود ہو، زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ کچھ مخصوص مالوں ہی میں واجب ہوتی ہے، یعنی: سونا، چاندی، رُوپے، مالِ تجارت، بعض جانور اور زرعی پیداوار؛ اگر کسی کے پاس ڈھیر ساری زمینیں ہوں، کئی مکانات ہوں؛ مگر بیچنے کے لیے نہیں رکھے گئے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛ لیکن صدقۃ الفطر کے لیے مخصوص اموال کا ہونا ضروری نہیں، کوئی بھی مال نصابِ زکوٰۃ کی قیمت کا موجود ہو تو صدقۃ الفطر واجب ہو جائے گا؛ (فتح القدیر:۲۹/۲) کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس دولت نہ ہو اس پر صدقہ واجب نہیں: ''لا صدقة الا عن ظهر غنى'' (نصب الرایہ:۱۱۴/۲) اور شریعت نے دولت مندی کا معیار نصابِ زکوٰۃ کے بقدر مال کو قرار دیا ہے۔

صدقۃ الفطر اپنی طرف سے اور اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے ادا کرنا واجب ہے؛ بالغ لڑکے، لڑکیاں، بیوی، اس کے زیر پرورش چھوٹے بھائی بہن اور والدین کی طرف سے صدقۃ الفطر ادا کرنا واجب نہیں ہے؛ لیکن ہندوستانی سماج میں بیوی اور شوہر کا مال ملا جلا ہوتا ہے اور بالغ لڑکے جب تک ماں باپ کی کفالت میں ہوتے ہیں، اور تعلیم وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں، تو ان کی بھی ساری ذمہ داریاں گھر کا ذمہ دار خود انجام دیتا ہے، یہی حال اُن چھوٹے بھائی، بہن اور والدین کا ہے، جن کی کفالت گھر کا کوئی مرد انجام دیتا ہو؛ اِس لیے بہتر ہے کہ ان سب کی طرف سے بھی صدقۃ الفطر ادا کر دیا جائے، جس غلام کو اپنی خدمت کے لیے رکھا جائے نہ کہ بیچنے کے اِرادہ سے اس کا صدقۃ الفطر نکالنا بھی مالک پر واجب قرار دیا گیا ہے، موجودہ دور میں بعض دفعہ کسی لڑکے یا لڑکی کو گھر کی خدمت کے لیے رکھا جاتا ہے، یہ

اگرچہ غلام نہیں ہوتے، خادم ہوتے ہیں؛ لیکن یہ اِنسان کو قریب قریب وہی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں، جو غلام پہنچایا کرتے تھے؛ اِس لیے ان کی طرف سے بھی صدقۃ الفطر ادا کردینا بہتر معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ چاہے یہ واجب نہ ہو؛ لیکن باعث اجر وثواب تو ہوگا ہی۔

صدقۃ الفطر ہر اس شخص کی طرف سے ادا کرنا واجب ہے، جو عید الفطر کی صبح میں موجود ہو، اگر اسی شب کو بچہ پیدا ہوتو اس کا بھی صدقۃ الفطر واجب ہے۔ صدقۃ الفطر کے مصارف تقریباً وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں، جن لوگوں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، ان کو صدقۃ الفطر بھی نہیں دیا جاسکتا ہے؛ البتہ زکوٰۃ تو غیر مسلم کو نہیں دی جاسکتی، صدقۃ الفطر ان کو بھی دیا جاسکتا ہے، (بدائع الصنائع: ۴۹/۲، کتاب الزکوٰۃ، فصل الذی یرجع الیٰ المؤدی لیہ) موجودہ حالات میں جب مذہبی منافرت شعلہ سے آتش فشاں بنتی جارہی ہے، مسلمانوں کو الگ تھلگ کیا جارہا ہے اور یہ تصور دیا جارہا ہے کہ مسلمان صرف اپنے لیے سوچتا ہے، دُوسروں کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ غلط ہے۔ تو اس تاثر کو ختم کرنے کے لیے اگر مسلمان غیر مسلم غریب پڑوسیوں کو بھی صدقۃ الفطر دینے کا اہتمام کریں تو یہ ایک بہتر قدم ہوگا، اوراس سے یہ پیغام جائے گا کہ مسلمان نہ صرف سماجی جذبہ سے؛ بلکہ اپنے مذہبی حکم کے تحت برادرانِ وطن کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتا ہے اور بلا اِمتیازِ مذہب تمام لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا رویہ اِختیار کرتا ہے۔

اصل میں صدقۃ الفطر سے متعلق اس وقت جو بات عرض کرنی مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۃ الفطر کے لیے چند چیزوں کو معیار بنایا ہے: کھجور، جَو، کشمش، پنیر، (نیل الاوطار، عن ابی سعید خدری: ۱۷۹/۴) ان میں سے کھجور، جو، کشمش اور کھانے کی دُوسری چیزوں کے بارے میں اِتفاق ہے کہ قدیم پیمانے کے لحاظ سے ایک صاع نکالنا واجب ہے، گیہوں کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اِختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نصف صاع گیہوں کا نکالنا کافی ہے؛ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ایک صاع کھجور یا جَو اور نصف صاع گیہوں کا تذکرہ آیا ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ، عن ابن

عباسؓ، حدیث نمبر:۱۰۳۳۴) ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیث میں بھی یہی مضمون آیا ہے، دیگر فقہاء امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک گیہوں میں بھی صدقۃ الفطر ایک صاع ہی واجب ہوتا ہے؛ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے عید الفطر سے ایک دو دنوں پہلے ہی صدقۃ الفطر ادا کرنے کی تلقین فرمائی اور اس میں ایک صاع گیہوں کا تذکرہ کیا، (نصب الرایہ:۴۰۶/۲) اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے منقول ہے کہ کوئی بھی کھانے کی چیز ہو، ہم لوگ اس میں ایک صاع صدقۃ الفطر کے طور پر نکالا کرتے تھے۔(بخاری، حدیث نمبر:۱۵۰۶)

پھر احناف کے بشمول بہت سے فقہاء نے صدقۃ الفطر میں غلہ کے بجائے اس کی قیمت نکالنے کی اجازت دی ہے؛ کیوں کہ صدقۃ الفطر کا مقصد غرباء کی ضرورت پورا کرنا ہے، اور یہ ضرورت بمقابلہ سامان کے پیسوں سے زیادہ بہتر طور پر پوری ہوسکتی ہے اور ہندوستان میں اسی طور پر صدقۃ الفطر ادا کرنے کا رواج ہے، معمولی آمدنی کے حامل لوگ ہوں یا بڑے صاحب ثروت ہوں، سبھی حضرات پونے دو کلو گیہوں بطور صدقۃ الفطر کے ادا کر دیتے ہیں، اب اس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں: اوّل یہ کہ پونے دو کلو گیہوں احناف کے نزدِیک کافی ہے، دُوسرے فقہاء کے نزدِیک کافی نہیں، ان کے یہاں ساڑھے تین کلو گیہوں سے صدقۃ الفطر ادا ہوگا، جن مسائل میں اِختلاف ہو، ان میں ایک اہم اُصول یہ ہے کہ احتیاط کے پہلو کو اِختیار کیا جائے اور ایسا عمل کیا جائے جو تمام دلیلوں اور فقہی رایوں کے مطابق دُرست ہو جائے، تو اگر ساڑھے تین کلو گیہوں کے لحاظ سے فطرہ ادا کیا جائے تو یہ زیادہ محتاط عمل ہوگا، اور تمام فقہاء کے اقوال پر صدقۃ الفطر ادا ہو جائے گا۔

دُوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے گیہوں کو صدقۃ الفطر کا معیار مقرر کیا ہے، اسی طرح جَو، کھجور، کشمش اور پنیر کو بھی صدقۃ الفطر کے لیے معیار بنایا ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۵۰۶) عہد نبوی میں ان تمام چیزوں میں سب سے قیمتی شئے گیہوں تھی؛ کیوں کہ حجاز میں گیہوں کی پیداوار نہیں ہوتی تھی، گیہوں شام یا یمن سے امپورٹ

کیا جاتا تھا؛ اِس لیے جن غذائی اشیا کو صدقۃ الفطر کا معیار بنایا گیا تھا، ان میں گیہوں ہی سب سے قیمتی چیز تھی؛ اِس لیے دُوسری چیزیں ایک صاع کی مقدار میں واجب قرار دِی گئیں اور گیہوں نصف صاع، اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کشمش کے لحاظ سے صدقۃ الفطر ادا کیا جائے تو اس وقت اوسط درجہ کی کشمش دوسو روپے ہے اور اوسط درجہ کی کھجور بھی اسی قیمت میں ہے، اِس لحاظ سے ایک شخص کا صدقۃ الفطر سات سو ہوتا ہے اور اگر ان حدیثوں اور زیادہ تر فقہاء کے اقوال کی بنیاد پر ایک صاع گیہوں صدقۃ الفطر کے طور پر نکالا جائے تو فی کس ساڑھے تین کلو گیہوں ہو جاتا ہے؛ اِس لیے اگرچہ پونے دو کلو گیہوں سے فطرہ ادا ہو جاتا ہے؛ لیکن تمام لوگوں کا اسی پر قانع ہو جانا شریعت کی رُوح کے خلاف ہے۔

اِس لیے اس حقیر کا مشورہ ہے کہ جن لوگوں پر صدقۃ الفطر واجب ہے، ان میں جو بڑے تاجر اور اصحابِ ثروت ہیں، ان کو کھجور اور کشمش کی قیمت سے صدقۃ الفطر ادا کرنا چاہیے، جو لوگ معاشی لحاظ سے ان سے کم درجے کے ہوں، ان کو پونے دو کلو کے بجائے ساڑھے تین کلو گیہوں کے لحاظ سے صدقۃ الفطر ادا کرنا چاہیے؛ تاکہ تمام حدیثوں پر عمل ہو جائے، اور جو معاشی اعتبار سے ان سے بھی کم درجہ کے ہوں، وہ پونے دو کلو گیہوں کے لحاظ سے صدقۃ الفطر ادا کریں، اس میں غرباء کا فائدہ ہے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں پر عمل ہو جائے گا اور اگر گیہوں ہی کے ذریعہ صدقہ ادا کرنا ہو تو گیہوں کی قیمت کے بجائے بہتر ہے کہ خود گیہوں مستحقین کو دے دیں؛ کیوں کہ اگر پونے دو کلو گیہوں کی قیمت بطورِ فطرہ ادا کی جائے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کیے ہوئے دُوسرے معیارات؛ کشمش اور کھجور کے اعتبار سے نامکمل ہوگا۔ **واللہ اعلم و باللہ التوفیق!**

نمازِ استسقاء — احکام ومسائل

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ بے شمار ہیں، ان میں کچھ نعمتیں روحانی ہیں اور کچھ مادی ہیں، یہ مادی نعمتیں انسانوں کی اس بستی میں جینے اور رہنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان ضرورتوں میں سب سے اہم ہوا اور ہوا کے بعد پانی ہے، ہوا اور پانی اس فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں کہ ہمیں کبھی ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہیں گذرتا، غور کیجئے کہ ایک لیٹر صاف وشفاف پانی ہم بازار سے دس تا بارہ روپے میں خرید کرتے ہیں ، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بے حساب مقدار کھیت اور باغات کی آبیاری، انسان کی سیرابی اور انسان سے متعلق چیزوں کی صفائی اور دھلائی کے لئے پیدا فرمائی ہے، اگر اس پانی کی قیمت بارہ کے بجائے پانچ یا دو ہی روپے لیٹر کے حساب سے انسان سے وصول کی جاتی تو یہ انسان کے لئے کس قدر گراں بار ہو جاتا؟ اگر آکسیجن کا ایک سلنڈر حاصل کیا جائے تو سینکڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انسان کو سانس لینے کے لئے ہر وقت آکسیجن مطلوب ہے، اگر اسے اس آکسیجن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تو کتنا دشوار ہوتا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہے، کہ کائنات کے اس چھوٹے سے محلّہ میں جسے زمینی دنیا کہا جاتا ہے، پانی اور ہوا کی نہایت ہی وافر مقدار موجود ہے، جب کہ فضاء میں اس سے بڑے سیارے موجود ہیں؛ لیکن وہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ دستیاب ہے اور نہ ہوا کا کوئی جھونکا، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت انسان کی ضیافت و مہمان نوازی اور راحت رسانی کا کس خوبی سے انتظام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ان میں ایک پانی بھی ہے؛ بلکہ فرمایا گیا کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ'' (الانبیاء: ۳۰) انسان کی زندگی کا مدار تو پانی پر ہی ہے، جتنے بھی ذی روح جانور ہیں، ان کی زندگی کا بقاء بھی پانی ہی پر منحصر ہے؛ چوں کہ مادۂ تخلیق میں بھی پانی کا ایک جزء موجود ہوتا ہے، اسی لئے قرآن نے انسانی نطفہ کو بھی ''ماء دافق'' یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے

تعبیر کیا ہے (الطارق: ۶) اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جان دار کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے۔ (النور: ۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے، کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ جو جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا نمو پذیر زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے (النحل: ۵۶)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کر لیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہو جاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں گندھک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو گھلاتی ہے اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے اور ہوائیں اسے گود لے کر اڑن کھٹولا بن فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں اور ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں، کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضاء کی سیر کرتا رہتا ہے اور جہاں چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا نظام قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چوں کہ اپنے بقاء کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سر سبز و شاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، کہ ان کا بقاء پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بادل کی نگاہ التفات بھی بڑھ جاتی ہے، غالباً اللہ تعالیٰ کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ

پودوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں ؛ چوں کہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں، وہیں پالتو اور جنگلی، چلنے والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے؛ لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم و بیش ہمیشہ رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضاء میں جگہ جگہ اپنے گھروندے بنائے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دست سوال پھیلائے رہتے ہیں؛ لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ وہی مشیت خداوندی کا کرشمہ ہے، کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دو چار ہے اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے، کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو اللہ کی اس پکڑ کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحب نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم و جور ہو جاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہل مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو

زندہ جلایا جاتا ہے، برسر عام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے، ''اِستَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (البقرة:۱۵۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نمازِ شکر، کسی مسلمان کی موت ہو جائے تو استغفار کے لئے نمازِ جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو نماز توبہ، کسی معاملہ میں خیر و شر اور نفع و نقصان سمجھ میں نہ آتا ہو، تو نمازِ استخارہ، سورج گہن ہو تو نمازِ کسوف، چاند گہن ہو تو نمازِ خسوف، کوئی ضرورت درپیش ہو تو نمازِ حاجت، اسی طرح اگر بارش رک جائے تو نمازِ استسقاء۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے اور صرف دعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ جمعہ ارشاد فرمارہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، اس نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعاء مانگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار دعاء کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایات میں: ''**اللھم اسقنا**'' کے الفاظ ہیں اور بعض میں ''اغثنا'' کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء ایسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں اور جانور غرقاب ہو رہے ہیں، آپ دعاء فرمائیے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو: ''**اللھم حوالینا**

ولا علینا'' چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گردوپیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر بارش کے لئے دعاء فرمائی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر دعاء کی؛ حالاں کہ خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک اتنا اونچے اٹھائے کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۰، ۱۰۲۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی عمل کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دعاء پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ (ردالمحتار: ۳/۱۷)

بہتر یہ ہے کہ دعاء کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز بھی خاص اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ: ''**سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور **ھل اتک حدیث الغاشیہ**'' کی سورت پڑھی جائے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۱۵)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہو کر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں۔ (ردالمحتار: ۱/۱۷، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) کیوں کہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید کی طرح نمازِ استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں اور جیسے خطبہ عیدین میں کلماتِ تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے؛ کیوں کہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطباتِ عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی

طرح استسقاء کے خطبہ اولی میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالہ سابق:۲/۱۲۴)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گذر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو، تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردے اور گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کردے؛ لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبداللہ بن زیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رداء مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر:۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں؛ بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو، تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی جائے۔ (الدر المختار مع الرد:۳/۷۲) یہ بھی مستحب ہے کہ نماز استسقاء کے موقع سے بوڑھوں اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے؛ بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (ردالمختار:۳/۷۲) کہ ان کمزوریوں کو دیکھ کر اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہو تو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نماز استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں، تو حق ادا کردینے کی کوشش کریں۔ (درمختار وردالمحتار:۲/۷۲) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں؛ لیکن امام ابوداود نے حضرت عائشہؓ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورج نکلتے وقت نمازِ استسقاء کے لئے تشریف لے گئے۔ (ابوداود، باب رفع الیدین فی الاستسقاء) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت

نمازِ استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں سماج کے دیندار لوگوں کو شامل رکھا جائے، حضرت عمرؓ نے خاص طور پر حضرت عباسؓ کو اور حضرت معاویہؓ نے یزید بن اسود ص کو نماز استسقاء میں شامل رکھا تھا اور انہیں سے دعاء کرائی تھی۔

امام خطبہ کے درمیان بارش کے لئے دعاء کرے گا اور دعاء کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف کرلے گا، جیسا کہ گذرا ہاتھ اٹھا کر دعاء کرے گا اور لوگ اس کی دعاء پر آمین کہتے جائیں گے، استسقاء کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف دعائیں منقول ہیں، غالباً سب سے مختصر دعاء وہ ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، تین بار: "**اللھم اغثنا**" کے الفاظ، یہاں ایک تفصیلی دعاء کا نقل کر دینا بھی مناسب ہوگا، جسے امام ابوداود نے نقل فرمایا ہے:

"**اللھم اسقنا غیثاً مغیثاً مرئیاً مریعاً نافعاً غیر ضار عاجلاً غیر اٰجل ، اللھم اسق عبادک وبھائمک وانشر رحمتک واحی بلدک المیت.**" (ابو داود، حدیث نمبر: ۱۱۶۹، ۱۱۷۶)

اے اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما، ایسی بارش جو ہماری فریاد کو پوری کرے، ہلکی پھواریں، غلہ اگانے والی ہوں، نفع دینے والی، نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی نہ کہ دیر لگانے والی، خداوندا! اپنے بندوں اور جانوروں کو سیراب کر، اپنی رحمت کو پھیلا اور اپنے مردہ شہروں کو زندہ کر دے۔

حلال ذبیحہ — ایک قابل توجہ مسئلہ!

غذا انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کائنات میں غذا کے وافر وسائل پیدا فرمائے ہیں، یہ وسائل نہ صرف دنیا میں انسان کے گرد پھیلے ہوئے ہیں؛ بلکہ آخرت میں بھی فراہم رہیں گے، یہ اور بات ہے کہ اہل جنت کو ہر قسم کی تکلیف و مشقت سے محفوظ غذائیں دی جائیں گی اور اہل دوزخ کو بدمزہ، بدبودار اور تکلیف دہ کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جائیں گی، دنیا میں انسان کو غذا کے طور پر جو چیزیں میسر ہیں، وہ بنیادی طور پر تین ہیں: جمادات، نباتات اور حیوانات۔

جمادات سے مراد مٹی، لوہا وغیرہ ہیں، ایسی چیزیں جن میں زندگی نہیں ہوتی اور جن میں تیز رفتار نمو کی کیفیت نہیں پائی جاتی، جمادات میں بہت کم چیزیں ہیں، جو غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، ان کا زیادہ تر استعمال دواؤں میں ہوتا ہے، لوہا، چونا، پتھر، سونا چاندی وغیرہ قدیم زمانہ سے ہی دواؤں میں استعمال کیے جاتے رہے ہیں، اور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس طریقہ پر استعمال ہوا کرتے ہیں، اسی طرح قدرتی نمک، غذا اور دوا دونوں کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔

غذا کا سب سے بڑا وسیلہ نباتات ہیں، چاول، گیہوں، دال، تیل اور ترکاریاں، یہ سب یا تو نباتات ہیں یا نباتات سے حاصل ہونے والی اشیاء ہیں، بڑی حد تک انسانی غذا کا انحصار نباتات کی پیداوار ہی پر ہے، اللہ تعالیٰ نے نباتات میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ ان کی افزائش میں کم محنت اور مدت درکار ہوتی ہے اور پیداوار کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان غذاؤں میں ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ جسم کو جو وٹامن اور اجزاء مطلوب ہوتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے ذریعہ مہیا ہو جاتے ہیں؛ اسی لیے بہت سے لوگ نباتاتی اشیاء کے ذریعہ ہی اپنی غذا کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

نباتات کے بعد انسانی خوراک کا دوسرا بڑا وسیلہ حیوانات ہیں، گذشتہ زمانہ میں جب حمل ونقل کے ذرائع محدود بھی تھے اور سست رفتار بھی، تو صحرائی علاقوں میں زیادہ تر حیوانی

غذاؤں پر لوگوں کا دار و مدار ہوتا تھا، اسی طرح جنگلات میں ''جہاں باضابطہ کھیتی نہیں ہوتی'' تھی، شکار کے جانور اور پھلوں کے ذریعہ آدمی اپنی ضرورت پوری کرتا تھا؛ لیکن لحمی غذاؤں کی اہمیت ہر علاقہ میں بسنے والے لوگوں کے لیے رہی ہے؛ کیوں کہ جسم کی بہت سی ضرورتیں لحمی غذاؤں کے ذریعہ ہی بہتر طور پر پوری ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان میں جو لذت رکھی ہے، نباتات کے ذریعہ وہ حاصل نہیں ہو پاتی ہیں؛ اسی لیے دنیا میں ہمیشہ لحمی غذاؤں سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے اور دنیا کے بیشتر مذاہب نے اس کی اجازت دی ہے، مسلمان، یہودی، عیسائی اور بدھسٹ تو اس کو درست سمجھتے ہی ہیں؛ لیکن ہندو مذہبی کتابوں میں بھی جانوروں کی قربانی اور جانوروں کے گوشت کو بطورِ غذا استعمال کرنے کا ذکر موجود ہے۔

غور کیا جائے تو قدرت کا اشارہ بھی یہی ہے، جو جانور چارہ کھاتے ہیں، ان کے اندر گوشت کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ قدرتی طور پر چارہ خور نہیں ہوتے ہیں، جو جانور قدرتی طور پر گوشت خور ہوتے ہیں، وہ گوشت ہی کو ہضم کرتے ہیں، طبعی طور پر وہ چارہ نہیں کھاتے، اسی لیے کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ بھینسیں گوشت کھانے لگی ہوں اور شیروں نے گھاس پھوس کھانا شروع کر دیا ہو؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے معدہ میں دونوں طرح کی غذاؤں کو ہضم کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، اسی طرح جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے دانت دیئے ہیں، جو کھانے والی چیزوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کے کام آتے ہیں، اس طرح ان کو ہضم کرنا آسان ہو جاتا ہے، چارہ خور جانوروں کو چپٹے دانت دیئے گئے ہیں، جو نباتاتی چیزوں کو چبانے کے کام آتے ہیں، انھیں نوک دار دانت نہیں دیئے گئے، جن کو گوشت وغیرہ کو کاٹنے میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف گوشت خور جانوروں کو نوک دار دانت دیئے گئے ہیں، جو لحمی غذاؤں کو ٹکڑے کرنے اور کاٹنے کے کام آتے ہیں، جیسے: کتے اور شیر وغیرہ، انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے دونوں طرح کے دانت دیئے ہیں، یہ سب قدرت کے اشارے ہیں؛ تاکہ انسان اپنی غذا کے دائرے کو سمجھ لے۔

جب ہم غذاؤں پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو جمادات اور نباتات کا مسئلہ آسان اور واضح نظر آتا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس نے کائنات کی تمام چیزوں کو انسان ہی کے لیے پیدا کیا ہے: ''**هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً**'' (البقرۃ: ۲۹) فقہاء نے اسی حکم ربانی کی روشنی میں یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے، جب تک کہ اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو: ''**الاصل فی الاشياء الاباحة**'' (**البحر المحيط فی اصول الفقه** :۱/۲۱۲) لیکن حیوانات کا معاملہ اس سے مختلف ہے، حیوانات اصل میں حرام ہیں، جب تک کہ اس کے حلال ہونے کی شرعی دلیل فراہم نہ ہو؛ اس لیے لحمی غذاؤں کے حلال ہونے کے لیے تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے، اَوّل یہ کہ جس جانور کا گوشت ہے، وہ خود حلال ہو، ایسے جانوروں کی تعداد محدود ہے، قرآن و حدیث میں اس سلسلہ میں اُصول بھی ذکر کر دیئے گئے ہیں اور ان کی جزوی تفصیلات بھی مذکور ہیں؛ چناں چہ تمام درندہ جانور حرام ہیں، نیز رینگنے والے جان دار کیڑے مکوڑے وغیرہ بھی حرام کیے گئے ہیں، اونٹ، بیل، بھینس، بکرے، ہرن، مرغ میں نر و مادہ نیز پالتو و جنگلی جانور حلال کیے گئے ہیں، دوسری قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ حلال جانور کے بھی بعض اجزاء حرام ہیں، جس کا ذکر خود حدیث میں ہے اور وہ یہ ہیں: ''نر و مادہ کے اعضاء تناسل، فوطے، بہتا ہوا خون، مثانہ، پتہ، جس گوشت میں گرہ پڑ گئی ہو'' (کتاب الآثار: ۱۱۶) بعض فقہاء نے اِن پر اُس کا بھی اضافہ کیا ہے، جس کو قصاب حضرات ''مغز حرام'' سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کل آٹھ ہیں، تیسری ضروری بات یہ ہے کہ وہ حلال جانور شرعی اُصولوں کے مطابق ذبح کیا گیا ہو۔

شرعی طریقہ پر ذبح کرنے کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اَوّل یہ کہ جانور کی گردن سے چار نالیاں گزرتی ہیں: ایک غذا کی، ایک سانس کی اور دو خون کی، جن کو شہ رگ کہا جاتا ہے، ذبح کے صحیح ہونے کے لیے ان میں سے تین کا اچھی طرح کٹ جانا ضروری ہے۔ (الفتاویٰ الہندیہ: ۵/۲۸۷) اس کا ایک فائدہ تو جانور کی تکلیف کو کم کرنا ہے؛ کیوں کہ اگر دماغ کی طرف جانے والی خون کی سپلائی لائن کٹ جائے تو چند سیکنڈ میں قوتِ

احساس ختم ہوجاتی ہے، دماغ کی موت ہوجاتی ہے اور تکلیف کا احساس باقی نہیں رہتا، اس طرح جانور کو تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ رگوں میں گردش کرتا ہوا خون اچھی طرح نکل جاتا ہے، اس خون کے نکل جانے سے گوشت میں مضرِ صحت اثر باقی نہیں رہتا، اگر خون اچھی طرح نہ بہہ پائے اور وہ جسم کے اندر ہی جذب ہوجائے تو خون میں صحت کو نقصان پہنچانے والے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں اور گوشت انسان کے لیے نقصان دہ ہوجاتا ہے، غالباً مردار کے گوشت کو حرام قرار دینے کی حکمت یہی ہے۔

ذبح کے عمل کے درست ہونے کے لیے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت جانور پر اللہ کا نام لیا جائے، اللہ تعالیٰ نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ وہی جانور حلال ہے، جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو اور ایسے جانور کا گوشت کھانے سے منع فرمایا گیا ہے، جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہو: ”وَلَا تَاكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ“ (الانعام: ۱۲۱) احادیث میں اس کی اور بھی وضاحت آئی ہے، یوں تو اصل مقصود جانور پر اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہے، خواہ کسی بھی طریقہ پر نام لیا جائے؛ لیکن افضل طریقہ یہ ہے کہ ”بسم اللہ اللہ اکبر“ کہا جائے، ذبیحہ پر اللہ تعالیٰ کے نام لینے کا یہ حکم ایمان وعقیدہ کے پہلو سے ہے۔

کیوں کہ دنیا کی مختلف مشرک قومیں ذبح اور قربانی کو مشرکانہ نقطۂ نظر سے انجام دیتی آئی ہیں، لوگ دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر جانوروں کو چھوڑتے تھے، تہواروں میں ان کے نام سے قربانی کیا کرتے تھے، استھانوں اور بتوں کی عبادت گاہوں پر جانوروں کے نذرانے پیش کیا کرتے تھے اور کھانے کے لیے بھی غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے، گویا ذبح و قربانی کو وہ اپنے مشرکانہ عقائد کے اظہار کا ذریعہ بناتے تھے، اس کی واضح مثال خود ہندوستان ہے، عام طور پر برادرانِ وطن گوشت خوری کو ناپسند کرتے ہیں اور زیادہ تر سبزی خور ہیں، ان کو نہ صرف گائے کی قربانی پر اعتراض ہے؛ بلکہ بڑا جانور بھی ناگوارِ خاطر ہے؛ لیکن اس کے باوجود تہواروں میں ان کے یہاں بھی جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ذہن میں عقیدۂ توحید کو راسخ کرنے اور مشرکانہ افکار سے انہیں بچانے کے

لیے یہ تدبیر فرمائی کہ جن کاموں کو وہ شرک اور غیر اللہ کی تقدیس کے طور پر کرتے تھے، ان ہی کو توحید کے سانچہ میں ڈھال دیا گیا، قربانی دینا چوں کہ ایک فطری جذبہ ہے اور گوشت انسان کی ایک فطری غذا ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے طریقہ کو باقی رکھا، شرعی ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا؛ لیکن ان کو شرک کی بجائے عقیدۂ توحید کا مظہر بنا دیا کہ قربانی کی جائے، مگر اللہ ہی کے نام پر، جانور ذبح کیا جائے؛ غیر اللہ کے نام پر نہ قربانی جائز ہے اور نہ جانوروں کو چھوڑنا اور ذبح کرنا، علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام پر جانور ذبح کرے تو اس کا کھانا حرام ہے؛ کیوں کہ خود قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے۔ (المائدۃ:۳) اس پر بھی قریب قریب اتفاق ہے کہ اگر ذبح کرتے وقت قصداً اللہ کا نام چھوڑ دے تو اس صورت میں بھی ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ (الہدایہ:۴/۳۴۷)

یہ بھی ضروری ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو۔ (المائدۃ:۴) غیر مسلم کا ذبیحہ حلال نہیں؛ البتہ ایسے یہودی اور عیسائی جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہوں، نبوت اور وحی پر ایمان رکھتے ہوں، آخرت پر ان کا ایمان ہو، وہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھتے ہوں؛ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا ایمان نہ ہو، تو اگرچہ یہ مسلمان نہیں ہیں؛ لیکن کفر میں ان کا درجہ دوسرے غیر مسلموں کے مقابلہ میں کمتر ہے؛ اس لیے عام غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان کے حکم میں نرمی برتی گئی ہے، ان کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے اور ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ (المائدۃ:۵) لیکن اس سے صرف نام کے یہودی یا عیسائی مراد نہیں ہیں، جو ملحد ہوں، یا جو رسالت وآخرت کا انکار کرتے ہوں، مگر اپنے آپ کو برائے نام یہودی یا عیسائی کہتے ہوں، ایسے نام نہاد یہودی وعیسائی کا نہ ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے؛ آج کل عام طور پر جو لوگ اپنے آپ کو یہودی یا عیسائی کہتے ہیں، ان کی صورتِ حال یہی ہے کہ وہ زیادہ تر دہریہ ہیں، خدا، نبوت اور آخرت وغیرہ کے قائل نہیں ہیں —— ہندوستان میں زیادہ تر جو غیر مسلم آباد ہیں، یعنی ہندو، سکھ، بودھ وغیرہ، ان کا ذبیحہ مطلقاً حرام ہے؛ کیوں کہ وہ بہر حال اہل کتاب میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص حقیقت

میں یہودی یا عیسائی ہو، تب بھی جب تک وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لے اور بسم اللہ نہ کہے، اس وقت تک ذبیحہ حلال نہیں ہوگا: "**لاتحل ذبيحة من تعمد ترك التسمي مسلماً كان او كتابياً.** "(ردالمحتار: ۱۹۰/۵)

آج کل ذبیحہ کے سلسلہ میں دو باتیں خاص کر قابل توجہ ہیں:

اَوّل یہ کہ اب گوشت کی تجارت میں اچھی خاصی تعداد غیر مسلموں کی داخل ہوچکی ہے اور غیر مسلم قصاب بھی جانور ذبح کیا کرتے ہیں، خاص کر چکن کی تجارت میں، مسلمانوں کو اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے گوشت خریدنا چاہیے، اگر مسلمان جانور ذبح کرے اور غیر مسلم اس کے گوشت فروخت کرتے ہوں تو ان سے گوشت لینے میں حرج نہیں؛ لیکن اگر غیر مسلم ہی جانور ذبح بھی کرتے ہوں تو پھر ان کا ذبیحہ حلال نہیں؛ اگرچہ ایسی جگہیں کم ہیں، زیادہ تر علاقوں میں خود مسلمان اس کام کو انجام دیتے ہیں؛ لیکن بڑے شہروں میں اس کو خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے، دوسرا قابل توجہ پہلو خود مسلمان قصابوں کا ہے، لوگوں کا احساس ہے کہ عام طور پر قصاب جانور ذبح کرتے چلے جاتے ہیں، بسم اللہ پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طرف جانور کے گلے پر چھری چلا رہے ہیں، دوسری طرف دوکان میں کام کرنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کررہے ہیں، یہاں تک کہ گالی بک رہے ہیں، ایسی صورت میں اگر قصداً اس نے جانور پر بسم اللہ نہیں کہا تو یہ ذبیحہ حلال نہیں ہوا، مرغیاں چوں کہ تقریبات میں بڑی تعداد میں ذبح کی جاتی ہیں؛ اس لیے اس موقع پر غفلت اور زیادہ ہوتی ہے، قصاب حضرات کو اس سلسلہ میں خصوصی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، بہتر ہے کہ جہاں وہ اور کام کرنے والوں کو رکھتے ہیں، ایک شخص کو خاص اسی مقصد کے لیے رکھیں، جو جانور پر "بسم اللہ اللہ اکبر" کہتے ہوئے اسے ذبح کرنے کا اہتمام کرے، نیز جو لوگ دعوت اور مختلف تقریبات کے لیے بڑی مقدار میں چکن خریدتے ہیں، وہ بھی اس بات کا اہتمام کریں کہ چکن ذبح کرنے میں اپنے ایک ایسے ساتھی کو مقرر کردیں، جو مستقل طور پر بسم اللہ اللہ اکبر کہتے ہوئے ذبح کا فریضہ انجام دے، اس طرح حلال وحرام جیسے اہم مسئلہ میں ایک بڑی بے احتیاطی سے بچنے کا اہتمام ہوسکتا ہے،

حرام غذا عبادت کو نامقبول بنا دیتی ہے، دعاؤں کو بے اثر کر دیتی ہے، انسان کی اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور اگر انسان کسی دوسرے کو ایسی غذا کھلائے جو حرام ہو تو یہ گناہ بالائے گناہ ہے؛ اس لیے جو مسلمان قصاب جانور کو ذبح کرتے ہیں، یا جو لوگ چکن ذبح کر کے سپلائی کرتے ہیں، یا جو گوشت خرید کر بازار میں فروخت کرتے ہیں، وہ سب اپنے آپ کو حرام سے بچانے اور حلال پر قائم رہنے کا اہتمام کریں۔

مساجد کے خطباء کو بھی چاہیے کہ وہ عام مسلمانوں اور خاص کر قصاب کے پیشہ سے وابستہ بھائیوں اور گوشت فروخت کرنے والوں کو مسئلہ کی اہمیت سمجھائیں؛ بلکہ ان کے لیے تربیتی کیمپ رکھیں، جس میں ذبح کا شرعی طریقہ سمجھایا جائے، ذبیحہ کے جو اعضاء جائز نہیں ہیں، ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جائے، اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض علاقوں میں لوگ بکرے کے فوطے بھی تل کر کھایا کرتے ہیں، جن کو "کپورے" کہا جاتا ہے، یہ حرام ہے اور یہ ان آٹھ اعضاء میں شامل ہے جن کو کھانے کی ممانعت ہے، جو تنظیمیں یا ادارے ذبیحہ کے حلال ہونے کے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، ان کی ذمہ داریاں بہت نازک ہیں، ان میں احکامِ شریعت سے واقف نمائندے ہونے چاہئیں، ذبح کے وقت نگرانی ہونی چاہیے، پیشگی اطلاع کے بغیر اچانک معائنہ ہونا چاہیے؛ تاکہ ان کی تصدیق کا غلط استعمال نہ ہو۔

مشینی طریقہ پر جانور کو ذبح کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جانور کو عام معمول کے مطابق چھرے سے ذبح کیا جائے اور مشین کے ذریعہ گوشت وغیرہ کے ٹکڑے کیے جائیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ جانور کے ذبح کرنے کا عمل ہی مشین کے ذریعہ انجام پائے، اس کی بعض صورتیں جائز اور بیشتر صورتیں ناجائز ہیں، ہندوستان میں عام طور پر ابھی مشینی ذبیحہ کا طریقہ مروّج نہیں ہے؛ لیکن اگر جانور کے ذبح کے لیے مشینوں سے کام لیا جائے تو علماء اور اَربابِ اِفتاء سے دریافت کرنا چاہیے؛ بلکہ ان سے معائنہ کرانا چاہیے؛ تاکہ وہ مشین کی نوعیت کو دیکھ کر حکم شرعی بیان کریں۔

عبادت میں تجارت (عبادتوں سے تجارتی فوائد اٹھانا)

ایک انسان کی اپنے خالق و مالک سے جو نسبت ہے، اس میں سب سے اہم نسبت عبدیت اور بندگی کی ہے، انسان عبد ہے اور اللہ تعالیٰ معبود ہیں، انسان بندہ ہے اور اللہ کی ذات بندگی کی مستحق ہے، انسان غلام ہے اور اللہ اس کے آقا ہیں، یہ غلامی کی نسبت انسان کے لیے تحقیر نہیں ہے؛ بلکہ اِس میں اس کی توقیر اور اعزاز و اکرام ہے، اسی لیے واقعہ معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اپنے بندے کے لفظ سے کیا ہے: سبحٰنَ الَّذِی اَسریٰ بِعَبدِہٖ (بنی اسرائیل:۱) جیسے بیٹے کو اس سے زیادہ اور کوئی خطاب محبوب نہیں ہوسکتا کہ اس کا باپ اس کو بیٹا کہہ کر مخاطب کرے اسی طرح کسی بندے کے لیے اس سے بڑھ کر اعزاز نہیں ہوسکتا کہ خود کائنات کا خالق و مالک ''بندہ'' کہہ کر اپنے آپ سے اس کی نسبت کو ظاہر کرے۔

انسان اپنی بندگی کا اپنے عمل کے ذریعہ اقرار کرے، اسی کو ''عبادت'' کہتے ہیں اور اللہ نے انسان و جنات کی یہ بستی اس لیے بسائی ہے کہ یہ سب خدا کی عبادت کریں: وَمَا خَلَقتُ الجِنَّ وَالاِنسَ اِلَّا لِیَعبُدُونِ (الذاریات:۵۶) — ہر نبی نے اپنی تعلیمات میں انسانیت کو اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی ہے اور اس کے طریقے بتائے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے عبدیت کو اس کے اوج کمال پر پہنچا دیا، عبادت کی مقدار بھی بڑھائی گئی اور عبادت کی کیفیت میں بھی اضافہ کیا گیا، نیز جس تفصیل سے عبادت کا طریقہ وسلیقہ اور اس کے آداب واحکام شریعت محمدی میں بتائے گئے، کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، ہر عبادت بندگی اور نیازمندی کا مظہر، جھکاؤ اور بچھاؤ کی کیفیت سے معمور، اللہ سے مانگنے اور ہاتھ پھیلانے کی کوشش اور انسانی زندگی کے لیے دروسِ عبرت سے معمور!

عبادت کے اصل معنی اللہ کے سامنے اپنی ذلت اور کمتری کے اظہار کے ساتھ بے حد جھکاؤ اور آخری درجہ تواضع اختیار کرنے کے ہیں؛ اس لیے عام طور پر عربی لغت کے ماہرین نے اس کا ترجمہ خضوع اور ذلّ سے کیا ہے (مفردات القرآن: ۳۱۸، صحاح

للجوهری :۲/ ۲۰۵،لسان العرب :۳/ ۴۰۷۲)ایک بڑے صاحب علم علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ عبادت ایسے افعال کا نام ہے کہ جس سے آخری درجہ معبود کے سامنے اپنی کمتری، عاجزی، جھکاؤ اور نیاز مندی کا اظہار ہو کہ اس عمل سے بڑھ کر کسی اور عمل سے اس جذبہ کا اظہار ممکن نہ ہو(**التوقیف علی مھمات التعریف للمناوی** :ص۲۳۴) عبادت میں جہاں اللہ کے سامنے عجز کا اظہار ضروری ہے، وہیں اللہ سے حد درجہ محبت اور دل میں اللہ کی غیر معمولی چاہت کا احساس بھی ضروری ہے؛ اسی لیے علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عبادت ایسے عمل کا نام ہے،جس میں آخری درجہ کی محبت بھی ہو اور آخری درجہ کا جھکاؤ بھی:''**العبادة تجمع اصلین: غایة الحبّ وغایة الذل والخضوع**'' (**مدارج السالکین**:۸۵-۸۶)

لہٰذا وہ اعمال عبادت میں شامل ہیں جو خالصتاً اللہ کے لیے ہی کیے جاتے ہیں،جس عمل کو کسی بندے کے لیے نہیں کیا جا سکتا، جیسے: نماز، روزہ، زکاۃ، حج،قربانی،سجدہ، تلاوت، دعاء، نذر وغیرہ، جو افعال اللہ کے لیے بھی کیے جا سکتے ہیں اور انسانوں کے لیے بھی، اگر ان کو بہتر نیت سے کیا جائے ، اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع مقصود ہو تو ان شاء اللہ وہ بھی اجر وثواب کا باعث ہوگا؛ لیکن وہ اصل میں طاعت ہے، حقیقی معنوں میں وہ عبادت نہیں ہے،عربی زبان کے ایک ماہر علامہ ابو ہلال عسکری نے لکھا ہے کہ عبادت اور طاعت کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کی جا سکتی ہے؛ لیکن طاعت اللہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔(**الفروق فی اللغة**:۱۸۲)

عبادت کا ایک بنیادی حکم یہ ہے کہ وہ اجر کے لیے کی جاتی ہے نہ کہ اجرت کے لیے، اس کا بدلہ آخرت ہی میں دیا جا سکتا ہے، دنیا کے بدلے کے لیے اس عمل کو نہیں کیا جا سکتا، انبیاء کرام اپنی خاص حیثیت کے اعتبار سے ہر کام اللہ کے لیے کرتے تھے اور اللہ کے حکم سے ہی کرتے تھے؛ اسی لیے قرآن نے مختلف انبیاء کی زبان سے کہلایا: **اِن اَجرِاَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ** (ہود:۲۹) میرا اجر صرف اللہ ہی پر ہے، جب کوئی کام دنیا میں بدلے کے لیے کیا جائے تو پھر

وہ تجارت بن جاتا ہے، اور عبادت وتجارت کے مقاصد بالکل الگ ہیں؛ اسی لیے عبادت کے لیے مخصوص جگہ پر تجارت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور اللہ کی عبادت کے لیے ہی بنائی گئی ہیں؛ چناں چہ مسجد میں خرید وفروخت اور کاروباری گفتگو سے منع کیا گیا ہے؛ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے اس کو بھی پسندنہیں فرمایا کہ کسی کی کوئی چیز گم ہوئی ہو تو وہ مسجد میں اس کا اعلان کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس طرح کا اعلان مسجد میں کرے تو کہہ دو کہ تمہاری چیز نہ ملے۔

اسی لیے فقہاء کا عمومی نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو افعال مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں، جیسے: نماز، روزہ، حج، تلاوت قرآن، جہاد، ان پر اجرت لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری وعدہ لیا، وہ یہ کہ اگر میں مؤذّن مقرر کیا جاؤں تو اذان پر اجرت نہیں لوں (ترمذی بہ تحقیق احمد محمد شاکر ۱/۴۳۱۰) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اہل صفہ میں سے کچھ لوگوں کو قرآن پڑھنا اور لکھنا سکھایا، مجھے پڑھنے والوں میں سے ایک نے ایک کمان تحفہ میں دی، میں نے سوچا کہ یہ خاص مال تو ہے نہیں، میں اسے جہاد میں استعمال کروں گا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمہیں یہ بات پسند آتی ہو کہ اللہ تمہیں آگ کی کمان پہنائے تب قبول کرلو۔ (ابو داود مع عون المعبود :۲۷۶/۳) صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن بشر انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن مجید پڑھو، مگر اس میں غلو نہ کرو اور نہ اس کو کھانے اور دولت میں اضافے کا ذریعہ بناؤ ”ولا تا کلوا بہ ولا تستکثروا بہ“ (فیض القدیر: ۴۶/۲ بہ حوالہ مسند احمد)

یہ اور بات ہے کہ عبادت سے متعلق بعض افعال ایسے ہیں، جن میں عمل کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی ضرورت ہے، جیسے نماز کہیں بھی پڑھی جاسکتی ہے، اتفاق سے اگر کسی نے کہیں نماز کی امامت کردی اور ایک جماعت نے اس کے پیچھے نماز ادا کرلی تو اس میں کچھ

زیادہ وقت کی ضرورت نہیں؛ لیکن اگر کسی کو خاص مسجد میں امام مقرر کیا جائے تو وہ اس وقت کا پابند ہو جاتا ہے؛ بلکہ بعض اوقات پانچ وقت کی امامت میں انسان کا پورا وقت گھر جاتا ہے، اسی طرح ایک صورت تو یہ ہے کہ اتفاقاً کوئی آئے اور آپ کے پاس قرآن کی کوئی آیت پڑھ لے، یا اپنے پڑوسی کو چند آیات پڑھا دیں اور قرآن کی تصحیح کر دیں تو اس میں انسان کا وقت اس طرح گھِر نہیں جاتا کہ وہ کسبِ معاش کا کوئی اور ذریعہ اختیار نہ کر سکے؛ اس لیے ایسے اعمال پر اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص مستقل طور پر ایک مدرّس کی حیثیت سے قرآن اور اسلامی علوم کی تعلیم دے، اور مقررہ وقت اس میں لگایا کرے، جس کی پابندی اس پر لازم ہو تو پھر اس کا وقت اس عمل کی وجہ سے مشغول ہو جاتا ہے، اس لیے ایسی صورت میں علماء اہل سنت میں سے امام مالکؒ و امام شافعیؒ نے اجرت لینے کی اجازت دی ہے اور جب حکومتوں کی طرف سے ائمہ اور معلّمین کا انتظام باقی نہ رہا اور صورتِ حال یہ ہوگئی کہ ہر وقت امامت کی صلاحیت کے حامل ائمہ کا ملنا دشوار ہو گیا، مسلمان بچے اور بڑے قرآن کی تعلیم سے محروم ہونے لگے تو فقہاء احناف اور حنابلہ میں سے بعد کے لوگوں نے ان کاموں پر اجرت لینے کی اجازت دے دی؛ کیوں کہ یہ کام کی اجرت نہیں ہے، وقت کی اجرت ہے، اور وقت کی اجرت لینا جائز ہے۔

اسی طرح فقہاء نے حج پر اجرت لینے یا جہاد پر اجرت لینے کو منع کیا ہے؛ کیوں کہ یہ سب عبادت ہے اور عبادت خالصتاً لوجہ اللہ ہونی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت بھی اہم عبادت تھی اور آپ نے صاف اعلان کر دیا کہ جو اللہ اور رسول کے لیے ہجرت کرے گا، اس کا یہ عمل باعث اجر بنے گا اور جو کسی اور مقصد کے لیے ترکِ وطن کرے گا، وہ ہجرت کے ثواب سے محروم رہے گا؛ کیوں کہ اس کا یہ وطن چھوڑنا اللہ اور رسول کے لیے نہیں ہے، مشہور محدث امام بخاریؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب بخاری شریف کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے، غرض کہ عبادت پر عبادت کا رنگ باقی رہنا چاہیے، خود عبادت کرنے والوں کا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے اور دوسرے مسلمانوں کا بھی۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک خاص رجحان عبادتوں سے

تجارتی فوائد اٹھانے کا بنتا جا رہا ہے، ایصالِ ثواب کا درست ہونا حدیث سے ثابت ہے اور سوائے بعض اہل علم کے علماء اہل سنت کا اتفاق ہے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے، مگر اس پر اجرت کا لینا جائز نہیں، مشہور حنفی عالم علامہ شامیؒ نے خوب لکھا ہے کہ اگر تلاوتِ قرآن اجرت کے عوض ہو تو اس عمل میں اخلاص باقی نہیں رہا اور جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ کارِ ثواب نہیں ہوسکتا، تو جب یہ عمل خود لائق ثواب نہیں رہا تو دوسروں کو اس کا ثواب پہنچایا کس طرح جاسکتا ہے؟ اس لیے ایصالِ ثواب کے لیے تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں؛ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ آج کل مسلم معاشرہ میں اس کی اجرت متعین کی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو اس کے لیے گروپ بنے ہوئے ہیں اور وہ باضابطہ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں، یہ واضح طور پر عبادت کو تجارت کی شکل دینا ہے۔

تراویح کی نماز میں قرآن مجید کا ختم کرنا واجب نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ سنت ہے، اب بحمد اللہ! حفاظ کرام کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ بڑی آسانی سے شہر سے گاؤں تک حفاظ میسر آجاتے ہیں، اگر تراویح پڑھانے والے کی طرف سے اجرت کا مطالبہ نہ ہو؛ بلکہ انکار ہو اور اس کی نیت ایسی خالص ہو کہ اگر اس کو کوئی اجرت نہیں ملے، تب بھی وہ نماز پڑھائے گا، اس کے باوجود لوگ اپنی طرف سے ایک حافظ قرآن کی خدمت کی نیت سے ہدیہ پیش کردیں تو پیش کرنے والوں کے لیے سعادت اور اس حافظ کا قبول کرنا جائز ہے؛ لیکن حافظ کی طرف سے اس کا مطالبہ کرنا اور دونوں فریقوں کا مل کر اجرتِ تراویح طے کرنا یہ یقیناً عبادت کو تجارت کے درجے میں لے آنا ہے اور قرآن مجید کے احترام کے مغائر ہے۔

رمضان المبارک میں عام طور پر فروٹ کا استعمال بڑھ جاتا ہے اور فروٹ کے تاجروں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، ان کا روزہ داروں کے ہاتھ فروٹ بیچنا اور اس پر مناسب منافع لینا جائز ہے؛ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ اس میں روزہ داروں کا استحصال کیا جاتا ہے، مثلاً ایک تربوز اگر ۲۵/ شعبان کو ۳۰/ روپئے کا ہو تو پہلی رمضان سے اس کی قیمت ۱۰۰/ روپئے کردی جاتی ہے اور عید ختم ہوتے ہی پچھلی قیمت بحال ہوجاتی ہے، یہی حال بقرعید

کا ہے، جانوروں کے مسلمان تاجر عید الاضحیٰ کے کچھ پہلے سے قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیتے ہیں، قصاب حضرات قربانی کے دنوں میں دوگنا اور تین گنا پیسہ وصول کرتے ہیں، ۱۲/ ذی الحجہ کے بعد پھر قیمت اور اجرت معمول پر آجاتی ہے، بعض حضرات نے تو اجر و ثواب کے اس موسم کو تجارت اور انویسٹمنٹ کا سنہرا موقع بنا لیا ہے دو ہفتہ کے لیے سرمایہ لگاتے ہیں اور کئی گنا نفع حاصل کرتے ہیں۔

حج کے معاملے میں مسلم ٹورس اور ٹراویلس کا رویہ سب سے زیادہ خراب ہے، انہیں اس نیت سے کام کرنا چاہیے تھا کہ حاجیوں کو راحت پہنچائیں اور تھوڑا بہت نفع ان کو مل جائے؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اَوّلاً تو حاجیوں سے ایسے وعدے کیے جاتے ہیں، جو حرمین شریفین پہنچنے کے بعد دن کا خواب معلوم ہوتا ہے، جو سہولتیں نہیں پہنچا سکتے۔ان کا اعلان کرتے ہیں، خود حجاج عبادت میں مشقت اٹھانے اور اللہ کا مہمان ہونے کے جذبہ کے بجائے ٹورس کے مہمان ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ سہولت پسندی کے جذبہ کے ساتھ پہنچتے ہیں، جب وہاں شکایتیں پیدا ہوتی ہیں تو لے جانے والوں کا رویہ نہایت تیز اور بہت کڑوا ہوتا ہے، یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے؛ تاکہ سبز باغ دکھا کر عازمین سے زیادہ سے زیادہ پیسے وصول کیے جائیں۔

افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ اب حج میں رشوت کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا ہے، سعودی حکومت حج وعمرہ کے ویزے فروخت نہیں کرتی ہے؛ لیکن نہ معلوم کہاں سے اس میں کرپشن داخل ہو گیا ہے، لوگ رشوت دے کر حج کے ویزے خریدتے ہیں، جو قطعاً ناجائز ہے، اسی طرح بعض ٹورس ان ویزوں کو فروخت کرتے ہیں، جو انہیں الاٹ ہوا ہے؛ حالاں کہ یہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔

ان سب کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں مال ومتاع کی حرص اور مادیت اس قدر پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ہر کام میں اور ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے عبادتوں کے انجام دینے اور اس کے وسائل فراہم کرنے میں اجر

وثواب کے جذبہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور ایسے مقدس کاموں کو بھی خالصتاً تجارتی مقصد کے تحت انجام دیتے ہیں، نیز لوگوں کے سامنے اپنی تصویر کچھ اس طرح کی پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ دین کے خدمت گذار اور اپنے مسلمان بھائیوں کے پکے بہی خواہ ہیں، اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے، ضرورت تو یہ تھی کہ ہم اپنی تجارت کو عبادت بنا لیتے، یعنی اس میں اللہ کی رضا کا جذبہ شامل رکھتے، کم نفع لیتے، لوگوں کو سہولت بہم پہنچاتے، کچھ اجرت حاصل کرتے اور کچھ اجر کے امیدوار رہتے، نہ یہ کہ ہم عبادت کو تجارت کا رنگ دے دیں اور حصولِ اجر وثواب کے مواقع کو کسبِ معاد کے بجائے خالص کسب معاش کا ذریعہ بنالیں۔ وباللہ التوفیق!

اسلام میں تجارت کی اہمیت

قرآن مجید میں کم سے کم ۳۲ / مقامات پر زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے اور اسی طرح ۱۶ / مواقع پر بطورِ ترغیب یا مدح کے صدقہ دینے والوں کا ذکر آیا ہے اس کے برخلاف شاید ہی کوئی آیت ہو جس میں زکوٰۃ اور صدقہ لینے کی ترغیب دی گئی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا منشا یہی ہے کہ مسلمان جائز طریقہ پر اپنے آپ کو اس لائق بنانے کی کوشش کریں کہ وہ خود زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ صدقہ دینے کے مؤقف میں ہوں نہ کہ لینے کے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر یعنی دینے والے ہاتھ کو نیچے کے ہاتھ یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر قرار دیا۔ دنیا کے مذاہب میں شاید اس کی کوئی مثال مل سکے جو معتدل اور متوازن تصور مال کے سلسلہ میں اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے مال کو ''خیر'' (البقرۃ: ۲۱۵) اور ''فضل'' (جمعہ: ۴) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی اچھی اور بھلی چیز کے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو مناسب مقدار میں مال حاصل ہو جائے، انہوں نے کہا اللہ کے رسول! میں مال کے لیے مسلمان نہیں ہوا۔ میں اپنی قلبی رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا صالح آدمی کے لیے صالح یعنی حلال مال بہت ہی بہتر شئے ہے۔ (مسند احمد: ۱۷۳۰۹)

پس اگر حلال طریقہ پر مال حاصل کیا جائے اور صحیح راستہ سے خرچ کیا جائے تو یہ اسلام میں عین مطلوب ہے، کیوں کہ بہت سے حقوق مال ہی سے متعلق ہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر و محتاجی کے بارے میں فرمایا: یہ ایسی چیز ہے جو بعض دفعہ انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جو اعتدال و توازن تھا، ایک واقعہ سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دن آپ اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھے تھے، لوگوں نے دیکھا ایک صحت مند طاقت ور نوجوان صبح دوڑ بھاگ میں لگا ہوا ہے۔ صحابہؓ کہنے لگے اس شخص پر افسوس ہے کاش اس کی جوانی اور طاقت اللہ کے راستہ میں صرف ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا نہ کہو، اگر یہ اس لیے محنت کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو دست

سوال پھیلانے سے اور لوگوں کی محتاجی سے بچائے، تو یہ اللہ ہی کے راستہ میں ہیں، اسی طرح اگر اس کی دوڑ دُھوپ کمزور والدین اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے ہو، تاکہ ان کی ضروریات پوری کرے، تب بھی وہ اللہ ہی کے راستہ میں ہے، ہاں اگر اس کی یہ جدوجہد اس لیے ہو کہ دوسروں پر فخر کرے اور اپنی دولت مندی کا مظاہرہ کرے، تب اس کی دوڑ دُھوپ شیطان کے راستہ میں ہے۔ (احیاء العلوم: ۲/۶۱)

کسب معاش کی بہت سی صورتیں ہیں اور جو بھی جائز صورت ہو، اسے اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن سب سے زیادہ بابرکت ذریعہ تجارت کا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دیانت دارانہ تجارت میں اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باوجود یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے تھوڑی سے محرومی کو بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی آپ کی موجودگی میں بصرہ کا سفر تجارت کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فراق پسند نہیں تھا، لیکن آپ نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور اکثر مہاجرین کا ذریعہ معاش تجارت ہی تھا۔ حضرت علیؓ چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشغول رہتے تھے، اس لیے انہیں اس کا موقع کم ملا تاہم گاہے بگاہے انہوں نے بھی تجارت فرمائی۔ سرخیل فقہاء امام ابوحنیفہؒ بڑے تاجروں میں تھے۔ رأس المحدثین امام بخاریؒ بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اکثر سلف صالحین کا ذریعہ معاش تجارت تھا، ان کا یہ مشغلہ اس لیے بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کے اور اہل ثروت کے احسان سے بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجر کے بارے میں فرمایا کہ: سچے اور امانت دار تاجر کا حشر قیامت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا (ترمذی) اسلام سے پہلے عرب میں لوگ تاجروں کے لیے سمسار کا لفظ استعمال کرتے تھے، جس کے معنی دلال کے ہیں، یہ ایک ناگوار تعبیر سمجھی جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک مہذب لفظ تاجر کا اختیار فرمایا اور فرمایا کہ: اے جماعت تجار! خرید وفروخت میں

لغو بات بھی آجاتی ہے اور قسم کھانے کی نوبت بھی آتی ہے، لہٰذا صدقہ کے ذریعہ اس کی تلافی کیا کرو۔ (ابوداؤد) رافع بن خدیجؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ سب سے پاکیزہ کمائی کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: اپنے ہاتھ کا کام اور صحیح طریقہ پر تجارت! (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، حالاں کہ تاجر بھی اپنا سرمایہ لگاتا ہے اور سود خور بھی، تاجر بھی اپنے سرمایہ لگانے کی مدت کے لحاظ سے نفع حاصل کرتا ہے اور سود خور بھی مہلت کی گویا اُجرت حاصل کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا اور اسے بے برکتی کا باعث بتایا اور تجارت کو حلال قرار دیا اور باعث برکت بتایا گیا۔ کیوں کہ تاجر اپنے نفع کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس سے نفع ہوگا یا نقصان؟ نفع ہوتا تو کس قدر؟ اور سود خور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنا نفع بہر صورت متعین کرانا چاہتا ہے۔

تجارت کی فضیلت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تاجر اور گاہک کا ربط بہت ہی گہرا ہوتا ہے اور خلیق و دیانت دار تاجر بہت آسانی کے ساتھ گاہک کے دل میں اپنی جگہ بنالیتے ہیں، اس میں مذہب وملت اور قبیلہ وخاندان کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ جہاں ارزاں اور سستا سودا ملے، انسان اسی دکان کی طرف متوجہ ہوتا ہے خواہ دوست کی ہو یا دشمن کی اور اپنوں کی ہو یا بیگانوں کی۔ اس لیے ایک خداترس اور فہیم تاجر اپنی تجارت کو اسلام کی دعوت و اشاعت کا بہترین وسیلہ بناسکتا ہے۔ اور دنیا کی تجارت کے ساتھ ساتھ آخرت کی تجارت کو بھی انجام دے سکتا ہے۔ بشرط یہ کہ تجارت میں راست گوئی، دیانت داری اور خدا ترسی کی راہ اختیار کی جائے اور جو تجارت جھوٹ اور دھوکہ سے آلودہ ہو، وہ تجارت کو بے برکت اور بے فیض بنادیتی ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم کھا کر سامان بیچا جاسکتا ہے لیکن اس سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔ (بخاری)

اسلامی تاریخ میں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ محض تاجروں کے ذریعہ ایک

پورے علاقہ اور وسیع خطہ میں اسلام کی تبلیغ و اِشاعت کی خدمت انجام پائی۔ خاص کر مشرقی ایشیاءاور افریقی ممالک میں زیادہ تر مسلمان اور عرب تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی۔ انڈونیشیا میں اسلام کے ابتدائی دور میں جزیرہ صوماترہ پر عرب تجار اترے اور پھر خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں عرب تاجروں نے جزائر انڈونیشیا کو اپنی دعوتی کوششوں کا خاص مرکز بنایا۔ فلپائن میں عرب تجار قیام پذیر ہوئے اور ان ہی کی نسلوں سے اسلام پھیلا، ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہلی صدی سے چوتھی صدی تک عرب تاجروں کی دعوت اسلام کی کوششیں بارآور ہوتی رہیں۔ سری لنکا میں بھی پہلی صدی ہجری میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام پہنچا۔ چھٹی صدی ہجری میں برما، عرب تجار کے ذریعہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا، اور ملیشیا کے مسلمان تاجروں کے ذریعہ پہلی سے چوتھی صدی ہجری تک برونائی میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ جو اس وقت صد فی صد مسلم ملک ہے۔ کمبوڈیا میں نویں صدی ہجری میں اور سنگاپور میں ابتدائی صدیوں میں تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام پہنچا۔ عرب تاجروں ہی کے ذریعہ پہلی صدی ہجری میں ہانگ کانگ اور تیسری صدی ہجری میں جنوبی کوریا میں اسلام کا چراغ روشن ہوا۔ اسی طرح چین کے ساحلی علاقوں میں بھی مسلمان تاجر ہی اسلام کی امانت لے کر پہنچے۔

افریقہ میں عرب سے قریبی علاقوں میں تو مجاہدین اور علماء کی کوششیں ہوئیں لیکن دور دراز علاقوں تک دعوت اسلام کے پہنچنے کا ذریعہ تاجر ہی بنے، تنزانیہ میں پہلی صدی ہجری اور نائیجریا کے شمالی علاقوں میں دوسری صدی ہجری میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی۔ موریطانیا میں بربر کے تازہ دم نومسلم تجار نے اشاعت اسلام کا فریضہ ادا کیا۔ مزنبیق میں ابتدائی صدیوں ہی میں عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام پہنچا اور بارہویں صدی ہجری کے بعد پوری قوت سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔ سوڈانی مسلمان تجار وسطی افریقہ میں بارہویں صدی ہجری میں اسلام کی امانت لے کر پہنچے، انگولا میں اس وقت پچیس فی صد مسلمان ہیں اور یہ مسلمان تاجروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بنوامیہ کے عہد میں عرب تجار اور

مراکشی مسلمان سینیگال میں خیمہ زن ہوئے اوران کے ذریعہ وہاں اسلام کی بادِ نسیم چلی۔ بحر ہند کے جزائر قمر میں چوتھی صدی ہجری میں عرب تاجر دین اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنے، اسی طرح مغربی افریقہ کے مختلف ممالک میں تاجروں ہی کے ذریعہ اسلام کی عالم تاب کرنیں ضیابار ہوئیں۔ (ملخص از انتشار الاسلامی فی العالم حصہ اول، تالیف: ڈاکٹر عبداللہ مبشر طرازی)

صرف ایشیا اور افریقہ ہی نہیں بلکہ یورپ کے بہت سے علاقوں تک بھی اسلام کی تبلیغ واشاعت تاجروں کے ذریعہ انجام پائی۔ اگر آج بھی مسلمان تجار دعوتی شعور سے ہم کنار ہوں تو وہ متاعِ دُنیا کے ساتھ ساتھ متاعِ آخرت کے تاجر بھی بن سکتے ہیں اور کفر کی تاریکیوں میں اسلام کا چراغ جلا سکتے ہیں۔

پانی کی تجارت

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں ایک پانی ہے؛ بلکہ یہ ہر جان دار کے وجود اور بقاء کا ذریعہ ہے: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْئٍ حَيٍّ'' (الانبیاء: ۳۰) اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ جو نعمت انسان کے لیے جتنی زیادہ ضروری ہوتی ہے، وہ اتنی ہی بڑی مقدار میں مہیا بھی ہوتی ہے اور اس میں امیر وغریب، حاکم ومحکوم، آجر اور مزدور یہاں تک کہ نیک و بد اور مسلمان وغیر مسلم کا بھی فرق نہیں ہوتا، جب سورج نکلتا ہے تو بلا امتیاز ہر گھر کو اپنی روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے، جب چاند اپنے رُخ روشن سے پردہ اُٹھاتا ہے تو کسی آنکھ پر پابندی نہیں ہوتی کہ اس کی ٹھنڈی روشنی سے محظوظ نہ ہو، جب ہوائیں چلتی ہیں تو ایک ایک نفس کو شاد کام کرتی ہے، یہی حال پانی کا ہے، اللہ تعالیٰ نے پانی کے ذخیرہ کے تین نہایت ہی حیرت انگیز نظام رکھے ہیں، ایک نظام ان بادلوں کا ہے جو خود شہر شہر، گاؤں گاؤں، کھیت کھیت اور باغ باغ پہنچ کر برستے ہیں اور ہر ایک کو مئے حیات کا پیمانہ بھر بھر کر دیتے ہیں، گویا اللہ کی طرف سے فضا میں پانی کے یہ بڑے بڑے ذخیرے بنا دیئے گئے ہیں، یہ ایسی ٹنکیاں ہیں، جو پورب سے پچھّم اور اُتّر سے دکھن کا سفر طے کرتی رہتی ہیں، ان میں لاکھوں لیٹر پانی خالق کائنات کی طرف سے محفوظ کر دیا گیا ہے، اگر انسان اتنا سارا پانی کسی ٹنکی میں محفوظ کر دے تو تعفن پیدا ہو جائے اور دو چار مہینے کے بعد قابل استعمال بھی نہیں رہتے اور پھر پانی کی اتنی بڑی مقدار کو ضرورت کے لحاظ سے دور دراز علاقے تک پہنچانا آسان کام نہیں؛ لیکن یہ قدرت کا نظام ہے کہ پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ فضا میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور وہ ہوا کے دوش پر اس طرح اپنا سفر طے کرتا ہے کہ گویا روئی کے ہلکے پھلکے ٹکڑے ہوں، جن کو ہوا کا معمولی سا جھونکا ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑاتا پھرتا ہے۔

دوسرا نظام ان برفیلی چٹانوں کی شکل میں ہے، جو ہمالیہ اور اس جیسے بلند و بالا پہاڑوں پر یا بعض سمندروں کی سطح پر جم گئے ہیں، یہ پانی کا ایک جامد خزانہ ہے جو ہمارے ماحولیات کے توازن کو قائم رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اور دوسری طرف سال بھر پگھل پگھل کر اور اپنا خونِ جگر نچوڑ نچوڑ کر ہم تک پہنچاتا ہے، یہی پانی ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں

ہم تک پہنچتا ہے اور اس کا بہت سارا پانی زیرزمیں جذب ہو جاتا ہے، جس سے زمین میں نمی باقی رہتی ہے، اس میں پودوں کو بارآور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اس سے زمین کے اندر موجود پانی کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی سطح اونچی ہوتی ہے۔

تیسرا قدرتی نظام زیرزمین پانی کی موجودگی کا ہے، بارش کا پانی اور پگھلتی ہوئی برف یہ سب زمین کے اندر پانی کے اس ذخیرے سے جا ملتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات میں پھیلا رکھا ہے، پہلے اس پانی کو حاصل کرنے کے لیے کنویں کھودے جاتے تھے اور اب مشین کے ذریعہ بور کیا جاتا ہے، زیرزمین پانی کی سطح کبھی اونچی ہوتی ہے اور کم فاصلہ پر پانی مل جاتا ہے اور کہیں نیچی ہوتی ہے، یہ پانی کا غیر معمولی ذخیرہ ہے جو انسان کی نگاہوں سے مخفی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری کائنات میں اس کو پھیلا رکھا ہے، عام طور پر پانی کی قلت کے وقت یہی ذخیرہ انسان کے لیے آخری سہارا ہوتا ہے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پانی کے ان تین بڑے ذخائر کو وجود بخشنے اور باقی رکھنے میں انسان کی صلاحیتوں اور محنتوں کا کوئی حصہ نہیں، بادل انسان نے نہیں بنائے ہیں، اللہ نے بنائے ہیں اور بادل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ انسانی طاقت یا انسانی کاریگری منتقل نہیں کرتی، اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ خاص سے منتقل کرتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان فضائی آلودگی پیدا کر کے اور جنگلات اور درختوں کو کاٹ کر قدرت کے قائم کیے ہوئے فطری نظام کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کی وجہ سے بارش کی قلت پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح آسمان کو چھوتی ہوئی برفیلی چٹانوں کو پیدا کرنے میں انسان کا کوئی حصہ نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان اپنے کرتوتوں کی وجہ سے گلیشیر کو نقصان پہنچا رہا ہے اور اس سے سائنس داں زبردست نقصان کا اندیشہ کر رہے ہیں، زیرزمین پانی بھی انسانوں نے ڈول بھر بھر کر جمع نہیں کیا ہے اور ایک ایسی وسیع و عریض ٹنکی اس نے نہیں بنائی ہے جس میں پانی کی لہریں چلتی رہتی ہوں اور جو پتھروں اور مٹیوں کے درمیان رہنے کے باوجود صاف و شفاف اور غیر آلودہ طریقہ سے انسان کو دستیاب ہوتی ہو، پانی کے ان ذخیروں کو انسان نے پیدا تو نہیں کیا؛ لیکن اپنے عمل سے اس کو

نقصان ضرور پہنچارہا ہے: ”ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ“ (الروم:۴۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ان غیر معمولی نعمتوں کو انسانوں کے کسی ایک گروہ کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس میں تمام انسانوں کا حق رکھا گیا ہے؛ اسی لیے فرمایا گیا کہ زمین میں جو کچھ ہے، وہ ہم نے تم سبھوں کے لیے پیدا کیا ہے: ”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً“ (البقرۃ:۲۹) اس لیے یہ مزاج نہ ہونا چاہیے کہ اگر کسی کے پاس کنواں ہو، بورنگ ہو، پانی کھینچنے کا پائپ ہو تو وہ سمجھ لے کہ یہ ہماری ملکیت ہے، اس میں اس کے پڑوسیوں کا اور محلّہ کے لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے، پانی کے یہ ذخیرے ایسے نہیں ہیں کہ اگر آج اس میں سے دوسو لیٹر کی جگہ چارسو لیٹر پانی نکال لیا جائے تو پانی نکالنے کی وجہ سے ذخیرہ ختم ہو جائے اور کل پانی نہ آئے؛ بلکہ پانی جیسے جیسے نکالا جاتا ہے، اسی طرح پانی آتا جاتا ہے؛ بلکہ بعض دفعہ تو زیادہ پانی نکالنے کی وجہ سے پانی کے نئے سوتے کُھل جاتے ہیں، مگر افسوس کہ پھر بھی انسان دوسرے انسانوں کے سلسلہ میں بخل سے کام لیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی مہیا کرنے کو بے حد قابل اجر عمل بتایا ہے، آپ نے فرمایا: پانی سے زیادہ اجر کا ذریعہ کوئی اور صدقہ نہیں ہے: ”ليس صدقة أعظم أجر من ماء“ (بيهقي في شعب الايمان، حدیث نمبر:۸۷۳۳) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ جو شخص کنواں کھودے تو اس میں سے جو بھی جان دار، جنات، انسان اور پرندہ پانی پیے، اللہ اس کو قیامت کے دن اجر عطا فرمائیں گے۔ (صحیح ابن خزیمہ، عن جابر بن عبد الله، حدیث نمبر:۲۹۲۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص جارہا تھا، اسے شدت سے پیاس محسوس ہوئی، وہ کنویں میں اُترا اور اس سے پانی پیا، باہر آنے کے بعد دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور وہ مارے پیاس کے زمین کی تری کو کھانے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے دل میں خیال آیا کہ جیسی پیاس مجھے لگی ہوئی تھی، ایسی ہی پیاس اس کتے کو لگی ہوئی ہے؛ چناں چہ وہ دوبارہ کنویں میں اُترا، موزے کو پانی سے بھرا اور اسے منھ سے پکڑ کر

چڑھتے ہوئے اوپر آیا اور کتے کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اِس عمل کو قبول فرمالیا اور اس کی مغفرت کر دی، لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیا ہمیں جانوروں کو پانی پلانے میں بھی اجر ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر زندہ چیز کو پانی پلانے میں اجر ہوگا: ''فی کل کبد رطبة اجر'' (بخاری، کتاب المساقات، حدیث نمبر:۲۲۳۴)

جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پلانے اور لوگوں کی پیاس بجھانے کی فضیلت بیان فرمائی، وہیں اپنی ضرورت سے زیادہ پانی کو روک لینے اور دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دینے کی بھی بڑی مذمت فرمائی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی وہ ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی طرف نگاہِ رحمت نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے؛ بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، ان میں ایک وہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو اور وہ اسے راستہ چلنے والوں سے روک لے۔ (بخاری، کتاب المساقات، حدیث نمبر:۲۲۳۰) بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین افراد وہ ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نہ مخاطب ہوں گے اور نہ ان کی طرف نگاہِ رحمت ڈالیں گے، ان میں ایک شخص وہ ہے جو اپنی ضرورت سے زیادہ پانی کو روک لے، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جیسے تم نے میری نعمت کو روک لیا تھا، اسی طرح آج میں تم سے اپنی نعمتوں کو روک لوں گا، جس کے ہونے میں تمہارے ہاتھوں کو دخل نہیں۔ (بخاری، کتاب المساقات، حدیث نمبر:۲۲۴۰) — غور کریں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی بڑی تنبیہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنی نعمتوں کو روک لیں تو کیا اس کے لیے نجات کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو روکنا نہیں چاہیے: پانی، (خود رَو) گھاس اور آگ، (ابن ماجه، عن ابی هريرةؓ، باب المسلمون شركاء فی ثلاث، حدیث نمبر:۲۴۷۳) — پانی جیسی ضروری چیز کا انسان ضرورت کے بقدر ذخیرہ کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن زائد از ضرورت پانی کو روک لینا اسلامی

اخلاق کے مغائر ہے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقدمہ آیا، جس میں ایک کا دوسرے پر الزام تھا کہ اس دوسرے شخص نے اس کے کھیت کا پانی روک دیا ہے، شکایت کرنے والے صاحب کا کھیت نشیب میں تھا اور جن کے خلاف شکایت کی گئی تھی، ان کا کھیت اونچائی پر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ جس کا کھیت اونچائی پر ہے، اس کا حق ہے کہ ٹخنے کے بقدر پانی روک لے؛ لیکن اس کے بعد دوسروں کے لیے پانی کا چھوڑنا واجب ہے۔(**ابن ماجہ، عن عبادہ بن صامت، باب الشرب من الاودیۃ ومقدار حبس الماء**، حدیث نمبر:۲۴۸۳)

اس زمانہ میں زیر زمین پانی نکالنے کے اس طرح کے وسائل پیدا نہیں ہوئے تھے، جو ہمارے اِس دور میں پیدا ہو گئے ہیں؛ تاہم اس حدیث سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں کو بورویل کی سہولت میسر ہو اور پانی کی ایسی قلت ہو کہ ہر شخص پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہو تو ایسے حالات میں ایک اسلامی اور انسانی فریضہ ہے کہ اپنی ضرورت کا بچا ہوا پانی دوسرے بھائیوں کو فراہم کیا جائے اور لوگوں کی ضرورت کا استحصال کرتے ہوئے ایک ایسی نعمت کی تجارت نہ کی جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے سبھوں کے لیے پیدا کیا ہے، جو کائنات کا مشترکہ اثاثہ ہے اور جو انسانی کوششوں، محنتوں اور اخراجات کے ذریعہ وجود میں نہیں آئی ہے۔

یہ بات بے حد افسوس ناک ہے کہ اس وقت ملک کے بیشتر علاقوں میں قحط کی صورتِ حال ہے کہ کسان خودکشی کر رہے ہیں، بعض بڑے شہروں سے مزدور اپنے گاؤں کو واپس جا رہے ہیں، بہت سی جگہوں میں پانی کی ایسی قلت ہے کہ لوگ پینے کے پانی کو ترس رہے ہیں، مہاراشٹر اور ملک کی جنوبی ریاستیں خاص طور پر اس صورتِ حال سے دوچار ہیں؛ لیکن دوسری طرف کچھ ایسے بے توفیق لوگ ہیں جنھوں نے اس قدرتی مصیبت کو کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے، زرعی علاقوں میں کھیت کو سیراب کرنے کا پانی بیچا جا رہا ہے اور من چاہی قیمتیں طلب کی جا رہی ہیں، شہروں میں عام ضروریات یہاں تک کہ پینے کا پانی فروخت کیا جا رہا

ہے؛ حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین چیزوں میں تمام مسلمان شریک ہیں: پانی، خودرَو گھاس اور آگ، اور پھر فرمایا: اس کی قیمت حرام ہے: "المسلمون شركاء في ثلاث في الماء والكلأ والنار، وثمنه حرام" (ابن ماجہ، عن ابن عباسؓ، کتاب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث، حدیث نمبر:۲۴۷۲)

افسوس کہ آج کی دنیا میں لوگوں کی سوچ دنیا رخی ہوگئی ہے، یعنی انسان ہر چیز کو دنیا کے نقصان اور فائدے کی ترازو میں تولتا ہے، نہ آخرت کی فکر ہے نہ انسانی اور اخلاقی اقدار کا لحاظ ہے، نہ سماج کی محبت ہے اور نہ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کا جذبہ ہے؛ حالاں کہ یہ وقت پیسے کمانے کا نہیں، اجر وثواب کے کمانے کا ہے، لوگوں کی محبت کمانے اور ان کی دعائیں حاصل کرنے کا ہے، موجودہ حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ:

(۱) جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے گنجائش دی ہے، وہ عام لوگوں کے فائدے کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں کنویں کھدوائیں اور بور کریں اور لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پانی فراہم کریں کہ اس سے بڑھ کر کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

(۲) جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ پانی مہیا ہے، وہ اس پانی کو بیچنے کے بجائے بلا تفریق مذہب وملت دوسرے بھائیوں کو فراہم کریں اور اس کی کوئی قیمت وصول کرنے کی کوشش نہ کریں، ان شاء اللہ یہ ان کے لیے بڑے اجر وثواب کا باعث ہوگا۔

(۳) جن لوگوں کو اتنی گنجائش میسر نہ ہو کہ وہ الیکٹرک کے اخراجات برداشت کرسکیں، یا گنجائش ہو؛ لیکن حوصلہ نہ ہو، وہ واقعی اخراجات پانی لینے والوں سے وصول کرلیں اور پانی فراہم کریں، تو امید ہے کہ اس کے بارے میں وہ عنداللہ جواب دہ نہ ہوں گے۔

تجارت انسانی عزت و وقار کی!

دنیا میں کتنی ہی چیزوں کی تجارت ہوا کرتی ہے، معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی ہیرے موتی سے لے کر ریت اور مٹی کے ڈھیر؛ بلکہ غلاظتوں تک کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہے، کسی زمانہ میں انسان کی بھی تجارت ہوا کرتی تھی، اب بھی سنا ہے کہ افریقہ کے بعض غریب ممالک میں انسان خریدے اور بیچے جاتے ہیں، گاہے گاہے مسلم ممالک میں بھی ایسی خبریں منظر عام پر آجاتی ہیں کہ فلاں مقام پر غریب اور فاقہ کش ماں باپ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کچھ پیسوں کے عوض فروخت کر دیا، یقیناً خونِ جگر پلا کر اپنے بچوں کی پرورِش کرنے والے ماں باپ ایسے موقعوں پر خون کے آنسو روتے اور اشکِ حسرت ان بچوں کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے رخصت کرتے ہوں گے۔

لیکن انسانی تجارت کی ایک اور صورت ہے، جو اِس وقت سماج کے مہذب لوگوں کے درمیان رائج ہے، جس میں انسان اپنے لڑکوں کو آپ فروخت کرتا ہے اور فروخت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حسرت وافسوس کے آنسو نہیں؛ بلکہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں، دل حسرت و یاس کی تپش سے ابلتا نہیں؛ بلکہ حسین آرزوؤں کے تصور سے اچھلتا اور کودتا ہے، یہ عجب منڈی ہے جہاں پڑھے لکھے، اہل دانش، اصحابِ ثروت، اعلیٰ عہدوں پر فائز خوشی خوشی اپنے لڑکوں کا سودا لے کر آتے ہیں اور اس کی تعلیم، معاشی امکانات، خاندانی پس منظر، یہاں تک کہ شکل وصورت اور آباء واجداد کی شرافت کی دہائی دے کر ڈاک لگاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت کے خواست گار ہوتے ہیں، انہیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرنے اور ان کی جوانی کی قیمت لگانے میں نہ کوئی شرم ہوتی ہے، نہ کوئی عار!

آپ سوچیں گے یہ کون سی منڈی ہے؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے لڑکوں کو بیچ بھی سکتا ہے، کہیں انسانوں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا عہد غلامی پھر واپس آ گیا ہے؟

لیکن آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، ہمارا پورا سماج انسانی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے، ہر گھر میں ایک دوکان ہے، اور ہر خاندان میں کچھ تاجر اور کچھ گاہک ہیں — کیا لڑکی

والوں سے گھوڑے، جوڑے کے نام پر رقم وصول کرنا، ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا، اپنے مدعووین کو ان کے سر تھوپ دینا اور ان سے منھ مانگا کھانا طلب کرنا، تجارت اور اپنے لڑکے کی قیمت لگانا نہیں ہے؟ قیمت روپیوں میں بھی ادا کی جاتی ہے، سامان و اسباب کے ذریعہ بھی اور ہوٹلوں میں شکم پروری کے ذریعہ بھی، یہ سب قیمت کے مختلف عنوان اور الگ الگ انداز ہیں، لڑکا اور اس کے والدین ان تمام طریقوں سے لڑکے کی قیمت وصول کرتے ہیں اور اس کی جوانی کا منھ مانگا دام پاتے ہیں، اس کے تجارت ہونے میں کیا شبہ ہے؟!

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی ماں باپ سے مرد و عورت دونوں کو پیدا کیا ہے، جیسے مردوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی عورتوں کے؛ بلکہ قرآن نے کہا ہے کہ اصولی طور پر مرد و عورت دونوں حقوق میں برابر ہیں: ”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ“ (البقرۃ:۲۲۸) — البتہ صلاحیتوں کے تفاوت کے اعتبار سے تقسیم کار ہے، اور بعض ذمہ داریوں میں مرد و عورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، مرد کو سربراہِ خاندان قرار دیا گیا: ”اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ“ (النساء: ۳۴) — اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فوقیت دی گئی؛ لیکن یہ فوقیت محض مرد ہونے کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ مردانہ فرائض اور بحیثیت سربراہِ خاندان خرچ کرنے کی وجہ سے ہے: ”وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ“ (البقرۃ:۲۲۸)

غرض مرد کو جو فضیلت و برتری دی گئی ہے وہ اس وجہ سے کہ وہی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے؛ اسی لیے کسبِ معاش کی ذمہ داری مرد سے متعلق کی گئی: ”وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ“ (الجمعۃ:۱۰) اور اُمورِ خانہ داری کو عورتوں سے متعلق کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ گھر میں رہا کریں: ”وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ“ (الاحزاب:۳۳) کہ ان کی عزت شمع خانہ بن کر رہنے میں ہے نہ کہ شمع محفل بننے میں، اسی لیے ساری مالی ذمہ داریاں مردوں ہی سے متعلق رکھی گئی ہیں، مہر اسے ادا کرنا ہے، دعوتِ ولیمہ اس کی ذمہ داری ہے، پھر نکاح کے بابت لڑکی کی تمام ضروریات اس سے متعلق ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی ان مالی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور الٹے لڑکی اور

اس کے اولیاء سے اپنی قیمت وصول کرتا ہے، تو یہ نہایت ہی شرم ناک بات ہے، جوانی کی قیمت تو جانوروں کی لگائی جاتی ہے اور اعلیٰ نسل کے جانور حاصل کیے جاتے ہیں، کیا شادی کے موقع سے لڑکے والوں کی جانب سے مطالبہ اس حیوانی کردار کی پیروی نہیں ہے؟ اور جو لوگ پیسے لے کر شادی کرتے ہیں، کیا وہ مردانہ تعظیم و وقار اور بحیثیت شوہر تکریم و توقیر کے مستحق ہیں؟ جب کہ قرآن نے مردوں کو بلند رتبہ اس بنیاد پر دیا تھا کہ وہ خرچ کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اونچا (یعنی دینے والا ہاتھ نچلے) یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے: ''الید العلیا خیر من الید السفلی'' (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۲۷، عن ابی ھریرۃؓ) تو جو شوہر اپنا ہاتھ نیچے رکھتا ہو اور اپنی بیوی اور اس کے اولیاء کو اپنا ہاتھ اونچا رکھنے پر مجبور کرتا ہو، وہ کیسے اپنی بیوی سے بلند رتبہ ہوسکتا ہے؟ اگر دولت مند خود فقیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے اور بادشاہ درویش کے سامنے اپنی کشکول رکھ دے، تو وہ فقیر و درویش بلند مرتبہ ہوگا، یا بادشاہ وغنی؟

یہ ایک چبھتا ہوا ناگوارِ خاطر؛ لیکن برحقیقت سوال ہے اور جن لوگوں نے اپنی اور اپنے بچوں کی قیمت لگا رکھی ہے، انہیں کبھی تنہائی میں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے، حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں؛ لیکن دانا وہی ہوتا ہے جو حقیقت کے تلخ گھونٹ کو اپنے حلق سے اُتار لے!

افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض لوگ لڑکیوں کی شادی کے وقت تو شریعت کی دہائی دیتے ہیں؛ لیکن لڑکوں کی شادی کے وقت شریعت کو بھول جاتے ہیں؛ بلکہ شریعت کا ذکر بھی گراں خاطر ہوتا ہے، گویا شریعت پر عمل کرنا مقصود نہیں ہے، اصل مقصود نفس کے عفریت کا پیٹ بھرنا ہے، اس لیے کبھی پیسے بٹورنے کے غرض سے شریعت کے نام سے گریز کیا جاتا ہے، اور کبھی پیسہ بچانے کے لیے شریعت کا نام استعمال کیا جاتا ہے، مقصود دونوں صورتوں میں اپنے مالی مفادات کو حاصل کرنا ہے، ابھی چند دنوں پہلے ہمارے ہاں ایک تنظیم نے ایک پروگرام رکھا تھا، جس میں شریعت اور سنت کے مطابق نکاح کرنے والے لڑکے، لڑکیوں کے اولیاء کو جو

رشتہ کے خواہش مند ہوں، دعوت دی گئی تھی تا کہ ایسے لوگ اس عزم کے ساتھ باہم رشتہ طے کریں کہ وہ مسنون طریقہ پر بغیر لین دین کے تقریب نکاح کو انجام دیں گے، اس کیمپ کے افتتاح کی ذمہ داری اس حقیر پر رکھی گئی تھی، میں جب پہنچا تو اس وقت تک دوسو سے کچھ اوپر رشتہ کے خواہش مند حضرات اپنے نام رجسٹرڈ کرا چکے تھے؛ لیکن ان میں بیس رشتے لڑکے والوں کی طرف سے تھے اور باقی سب لڑکی والوں کی طرف سے، گویا نوے فی صد رشتوں کی پیش کش لڑکی والوں کی طرف سے تھی اور دس فی صد لڑکے والوں کی طرف سے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سماج کے مزاج میں کتنا بگاڑ آچکا ہے، اور شریعت اور دین کو کس قدر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کے موقع پر مہر کے علاوہ جو مطالبات کیے جاتے ہیں، وہ رشوت کے حکم میں ہیں، رشوت کا لینا تو حرام ہے ہی، شدید ضرورت کے بغیر رشوت کا دینا بھی حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۳۷، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۵۸۰، عن عبد اللہ بن عمروؓ) آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں جہنمی ہیں، (مسند البزار، حدیث نمبر: ۱۰۳۷، عن عبد الرحمنؓ، معجم طبرانی، حدیث نمبر: ۱۰۹۰۲، عن عبد اللہ بن عمروؓ) اس طرح نکاح کے موقع سے مطالبہ کرنے والے تو اپنے لیے جہنم خرید تے ہی ہیں، اور اللہ کی لعنت کا طوق اپنے گلے میں لٹکاتے ہی ہیں، جو لوگ دینے پر مجبور نہ ہوں وہ بھی اپنے لیے جہنم اور خدا کی لعنت خرید رہے ہیں، مجھے تو سب سے زیادہ افسوس لڑکے کے بوڑھے والدین اور دوسرے اعزہ کی کم بختی پر ہوتا ہے کہ زیادہ تر وہی مطالبات کی فہرست بتاتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں؛ حالاں کہ جب یہ سامان گھر میں آتا ہے، یا رقم لڑکوں کے ہاتھوں ملتی ہے، تو خود ان کو بہت کم اس سے استفادہ کا موقع بہم پہنچتا ہے، زیادہ تر گھر میں آنے والی بہو اور اُس کا شوہر ہی نفع اندوز ہوتا ہے؛ لیکن ناحق قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے والدین اپنے عمر کے آخری لمحات میں جس کو توبہ و استغفار کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا، دوزخ

اور لعنت خداوندی بصد مسرت اور بہ ہزارِ شوق خریدتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کم نصیبی ؛ بلکہ بد نصیبی ہوسکتی ہے؟

اگر کسی شخص نے رشوت لے لی ہو تو اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ وہ اسے واپس کردے، اس لیے جن لوگوں نے مطالبہ کے ذریعہ کوئی رقم یا سامان حاصل کیا ہے، تو اس کا یا اس کی قیمت کا واپس کردینا شرعاً واجب ہے، مانگنا چاہے صراحتاً ہو یا اشارتاً، براہِ راست ہو یا بالواسطہ سب کا ایک ہی حکم ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالبہ تو نہیں کیا اور سامان کی فہرست تو پیش نہیں کی ؛ لیکن کسی دولت مند گھرانہ میں یہ سمجھ کر رشتہ طے کیا کہ اگر دو نہیں تو ایک لاکھ تو کہیں نہیں جائیں گے، اتنا تو وہ بغیر مانگے ہی دے دے گا، یہ بھی رشوت کے ہی حکم میں ہے ؛ کیوں کہ فقہاء نے ایک اُصول مقرر کیا ہے کہ جو چیز بطورِ شرط کے طے نہ کی جائے ؛ لیکن عرف ورواج کے تحت لی جائے، تو وہ بھی شرط لگانے کے ہی درجہ میں ہوگا "**المعروف عرفا کالمشروط شرعًا**"، ہاں ! اگر انکار و نفی کے باوجود لڑکی والے اپنی طرف سے دے دیں تو یہ یقیناً اس دائرہ میں نہیں آئے گا۔

اگر نکاح کی تقریب مسجدوں، دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں رکھی جائے، علماء اور اہل دین سے نکاح کے خطبات پڑھوائے جائیں، مجلس نکاح میں ایمان افروز اور رُوح پرور بیان رکھے جائیں ؛ لیکن اندرونی طور پر سودہ بازی بھی کی جائے اور چھپے ہاتھوں لین دین کا معاملہ بھی طے کیا جائے، تو یہ تو نفاق اور گناہ پر ظاہری نیکی کا دبیز غلاف چڑھانا اور دین کے پردہ میں بے دینی کو چھپانا ہے، جو یقیناً کھلی ہوئی بے دینی سے بھی زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔

لین دین کا ایک نفسیاتی اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کوئی لڑکی مسنون طریقۂ عقد کے ذریعہ نکاح میں لائی جائے، تو لڑکی اور اُس کے والدین کے اندر احسان مندی اور احسان شناسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنے سسرال کو اپنا محسن تصور کرتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک ماں باپ سے جدا ہو کر دوسرے ماں باپ کے گھر پہنچی ہے، اس میں اپنے شوہر، ساس، سسر اور

سسرال کے بزرگوں کے تئیں محبت اور خدمت کے جذبات ہوتے ہیں اور جب لڑکے اور اس کے والدین لڑکی والوں کا خونِ جگر اور آخری قطرۂ لہو نچوڑ کر اسے اپنے گھر لاتے ہیں، اس بہو میں احسان مندی اور جاں نثاری کے بجائے نفرت اور خود غرضی کے جذبات پنہاں ہوتے ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے، اگر کوئی شخص آپ کو پانچ روپیہ ہی کی کوئی چیز تحفتاً پیش کرے، تو آپ یقیناً اس کے شکر گذار ہوں گے، اور آپ کے دل میں قدر دانی کا جذبہ پیدا ہوگا اور اگر آپ کسی سے پانچ روپئے میں کوئی چیز خریدیں تو آپ اسے محسن تصور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو محسن سمجھیں گے، اس لیے کہ تاجر خریدار کا احسان مند ہوتا ہے نہ کہ خریدار تاجر کا، اس لیے جس لڑکی اور اس کے سرپرست نے دُولہا کی قیمت ادا کی ہے، آخر وہ اس مرد یا مرد کے اہل خانہ کے احسان مند کیوں کر ہوں، جس کی قیمت ان لوگوں نے اپنا خونِ جگر بیچ کر ادا کی ہو؟! اسی لیے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ جب بہو گھر میں آتی ہے وہ خدمت واطاعت کے جذبہ سے خالی وعاری ہوتی ہے اور گھر سے متعلق فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہ!

اراضی پر ناجائز قبضہ

غور کیجیے تو کائنات میں انسان کا تمام اشیاء سے بڑھ کر زمین سے تعلق ہے، وہ خود زمین سے پیدا کیا گیا ہے۔ (الانعام:۲) یہی زمین میں اس کے لیے بستر استراحت ہے، ”جَعَلَ لَکُمُ الارضَ فِرَاشاً“ (البقرۃ:۲۲) اسی زمین میں موت تک اس کا قیام ہے، ”وَلَکُمْ فِی الاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلیٰ حِیْنٍ“ (البقرۃ:۶۳) خدا نے اس متواضع اور بچھی ہوئی زمین کو بلند و بالا اور سر پر سایہ فگن آسمان سے بھی پہلے پیدا فرمایا ہے۔ (البقرۃ:۲۹) قرآن مجید میں زمین کی قسم کھائی گئی ہے۔ (طارق:۱۲) زمین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مختلف عنوان سے ۶۴۱ بار زمین کا ذکر کیا ہے، شاید ہی مخلوقاتِ عالم میں کسی کا اس تکرار اور کثرت کے ساتھ ذکر ہو، پھر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تمام ضرورتوں کو زمین ہی سے متعلق رکھا ہے، اسی زمین سے درخت اگتے ہیں، پودے پنپتے ہیں، پھل پھول اور نوع بنوع غذائیں پیدا ہوتی ہیں، دلوں کو لبھانے اور آنکھوں کو بھانے والے خوب صورت گل بوٹے اور مشام جان کو عطر بیز کرنے والے خوش بودار بہار بردوش پھول اور پتے وجود میں آتے ہیں۔

اسی زمین نے اپنے سینہ میں دودھ سے بھی زیادہ قیمتی پانی چھپا رکھا ہے، جو ہماری تشنہ کامی کا مداوا ہے، سونا، چاندی، لوہا، تانبا، رنگ برنگ پتھر، بہتا ہوا پیٹرول اور توانائی سے بھرپور گیس اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہیں جس کو زمین نے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ اپنے اندر چھپا رکھا ہے، دولت مند ہے لیکن نشہ دولت سے خالی، وسیع و عریض ہے لیکن کبر و ترفع سے عاری، ہر وقت انسان کے قدموں میں بچھی ہوئی اور ہمہ دم اس کی خدمت کے لے تیار و مستعد، پھر آخر انسان کو واپس بھی اسی مٹی میں جانا ہے اور قیامت تک اسی کی آغوش میں وقت کاٹنا ہے، پھر اسی کے آغوش سے باہر نکل کر عالم آخرت تک پہنچنا ہے، پیدائش سے موت اور موت سے پھر دوسری زندگی تک یہی مٹی غم جاناں اور غم دوراں میں ساتھ دیتی ہے۔

غرض زمین اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ایک شاہکار ہے، اسی لیے زمین کی محبت اور حرص بھی

انسان کے اندر نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے، کبھی یہ محبت حب الوطنی سے بڑھ کر وطن پرستی تک جا پہنچتی ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا ہے: ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!

اور اسی وطن پرستی نے عالم اسلام کو پارہ پارہ اور بے اثر کر کے رکھ دیا ہے، کبھی سماج میں زمین کی یہ محبت حرص وہوس کی طرف لے جاتی ہے اور زمین پر ناجائز قبضہ اور ناجائز خرید و فروخت تک منتج ہوتی ہے، چناں چہ آج کل اخبارات میں آئے دن قتل وخون کی جو خبریں آتی ہیں، وہ زیادہ تر زمین ہی کے مسئلہ سے جڑی ہوتی ہیں، ہندوستان و پاکستان میں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تمام بڑے شہروں میں زمین کی ناجائز خرید وفروخت کا بازار گرم ہے، بعض بھولے بھالے خریدار تو اپنی زمین کا منھ بھی نہیں دیکھ پاتے ہیں، بعض لوگ زمین خرید کر پلاٹ چھوڑ دیتے ہیں اور جب سال دو سال کے بعد آتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ ان کی زمین پر مکان بنا ہوا ہے، مگر یہ مکان کسی مخلص وہمدرد کی طرف سے ان کے لیے ''تحفۂ غیر مترقبہ'' نہیں ہوتا، بلکہ اس شخص کا مکان ہوتا ہے جس کے ہاتھوں دوبارہ زمین فروخت کی جاتی ہے، پہلے اور دوسرے خریدار کے درمیان نزاع چھڑ جاتی ہے اور اصل فروخت کرنے ولا منظر سے غائب ہو جاتا ہے، بعض جگہ تو تعمیر شدہ مکان پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا ہے، زمین بھی گئی، پیسے بھی اور محنت بھی!

یہ صورتِ حال ہر شریف انسان کے لیے تکلیف دہ ہے اور یہ رجحان بغیر محنت کے بیٹھ کر کھانے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کمانے کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے، آخر یہ سینہ زوری کبھی قتل وقتال کا باعث بن جاتی ہے اور بجائے اس کے کہ زمین پر قبضہ ہو، زمین خود اس کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ ظلم وزیادتی کے اس کاروبار میں مذہب وملت اور عقیدہ ومسلک کا بھی کوئی فرق نہیں ہے، اور یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ غنڈوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ اس پیشہ میں گھسے ہوئے خدا ناترس افراد پر پوری طرح صاق آتی ہے۔

غصب اور ظلماً کسی کی چیز پر قبضہ کر لینے کی قرآن وحدیث میں جو مذمت آئی ہے، وہ محتاجِ اِظہار نہیں، جو شخص حرام کھاتا ہے، بارگاہِ ربانی میں اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی، نہ اس کی دعاء مقبول ہوتی ہے، لیکن زمین کے غصب کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر مذمت فرمائی ہے، حضرت سعید بن زیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**من ظلم من الارض شیئا طوّقه من سبع ارضین.**" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۵۲)

جس نے زمین کا کوئی حصہ ظلماً لے لیا، ساتوں زمینیں اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈالی جائیں گے۔

حضرت ابوسلمہؓ کی روایت میں ہے کہ اگر ایک بالشت زمین بھی ظلماً حاصل کی تو زمین کی سات تہیں اس کے گلے کا طوق بنادی جائیں گی۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۶۱۲) اس مضمون کی روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں منقول ہے۔ (دیکھیے: ترمذی، حدیث نمبر: ۱۴۱۸، دارمی، حدیث نمبر: ۲۶۰۹)

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے ایک بالشت زمین بھی کسی کی ہڑپ کر لی اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن مکلّف کریں گے کہ وہ اس زمین کو حاضر کرے، یہاں تک کہ اس کی سات تہیں قیامت کے دن اس کے گلے کا طوق بنادی جائیں گی، تا آں کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۵۳۹)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**من اخذ من الارض شیئا بغیر حقه خسف به یوم القیامة الی سبع ارضین.**" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۵۴)

جس نے کچھ بھی زمین ناحق لے لی، وہ قیامت کے دن سات تہوں تک اس میں دھنسایا جائے گا۔

ان احادیث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین پر ناجائز قبضہ کتنا شدید گناہ ہے اور

کسی بھی طرح ایک مسلمان بلکہ شریف انسان کے شایانِ شان نہیں، یہ رویہ نہ مسلمانوں کے ساتھ درست ہے اور نہ غیر مسلموں کے ساتھ، افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ ظاہری دین داری کے ساتھ اس طرح کا تکلیف دہ رویہ اختیار کرتے ہیں، شکل وصورت، وضع قطع اور بات چیت سے پکے دین دار ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور لوگ اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، چاہے وہ لوگوں کو دھوکہ دے دیں، لیکن یقیناً خدا کو اور اپنے ضمیر کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

ہندوستان میں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے، زمینیں ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہیں، زیورِ تعلیم سے وہ خالی وعاری ہیں، تجارت کے لیے ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے، اس فاقہ مستی کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست عناصر کا پھیلایا ہوا زہراب معصوم دیہاتیوں کے ذہن کو بھی متأثر کر رہا ہے اور کوئی حساس موقع ہو تو جان اور عزت وآبرو کو بھی خطرہ دامن گیر ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض دیہاتوں میں ایسا بھی ہوا کہ مسلمانوں کو غیر مسلم عبادت گاہوں میں جانے اور پوجا کرنے پر مجبور کیا گیا، ان دشواریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے دیہات کے غریب، افسردہ حال مسلمان اس بات پر مجبور ہیں کہ شہر کا رخ کریں اور شہر کے مضافات میں فروکش ہوں۔

عام طور پر یہ شہر کے کنارے ایسی جگہ کا انتخاب کرتے ہیں جو بلدی سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں، تنگ اور کچے راستے، نہ برقی نہ ڈرینج اور کہیں کہیں پانی بھی نہیں، گاڑھا پسینہ بہا کر اور تھوڑے تھوڑے کر کے کتنی قسطوں میں قیمت ادا ہو پاتی ہے، لیکن افسوس کہ بہت سے خدا ناترس لوگ ایسے غریب بھائیوں کی بھی جاں بخشنے کو تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ آخری قطرۂ خون بھی ان سے نچوڑ لیں، گویا انھوں نے زمین کے ساتھ ساتھ اپنا ضمیر بھی فروخت کر دیا ہو، کاش! ہمارے یہ بھائی انصارِ مدینہ کے اسوہ کو سامنے رکھتے، جنھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے خود اپنی زمین کے دو حصے کر دیئے تھے، آدھا خود رکھا تھا اور آدھا مہاجر بھائی کو دے دیا تھا، اگر ہم ایسی قربانی پیش نہیں کر سکتے تو کم سے کم ان کے ساتھ ظلم وزیادتی اور لوٹ و

غارت گری کا رویہ تو اختیار نہیں کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس تجارت میں سارے لوگ ایسے نہیں ہیں اور ایمان دار اور دیانت دار لوگوں سے یہ پیشہ خالی نہیں ہوا ہے، اگر ایمان داری اور دیانت کے ساتھ غریبوں کو راحت پہنچانے اور بے گھروں کو سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنے کی نیت سے پلاٹنگ کی جائے اور مناسب قیمت پر دیانت داری کے ساتھ فروخت کیا جائے، تو ان شاء اللہ یہی تجارت آخرت کے لیے بھی نفع خیز تجارت ہو جائے گی اور اپنے غریب مسلمان بھائیوں کو بسانے اور مفلوک الحال انسانوں کے کام آنے کا اجر بھی ان کے حصہ میں آئے گا۔

کسی سماج میں برائی کو اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا جب تک برائی پر ٹوکنے والی زبانیں، اس کو روکنے والے ہاتھ اور اس کو برا سمجھنے واے دل موجود نہ ہوں، جیسے ایک چور (جس کی چوری کا راز کھل گیا ہو) شرمندگی کا احساس کرتا ہے اور سماج کے دامن کو اپنے لیے تنگ محسوس کرنے لگتا ہے، اسی طرح زمین کے ناجائز قابضین کو روکنے والے ہاتھ ہوں، انہیں ٹوکنے والی زبان ہو، انہیں لوگ برا سمجھتے ہوں، اور وہ محسوس کرتا ہو کہ اس حرکت سے میں سماج کی تحقیر و ناپسندیدگی کا خریدار بن جاؤں گا، تو یہ خوف اسے گناہ سے باز رکھ سکتا ہے، ورنہ اس کے جرم میں بالواسطہ پورا سماج شریک ہے، ضرورت ہے کہ مسجد کے منبروں سے، جلسوں کے شہ نشینوں سے، جماعتوں اور تحریکوں کے اجتماعات سے اور اخبارات و جرائد کے صفحات سے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھے اور اسے روکنے کی کوشش کی جائے اور اس تجارت کو صحیح طریقہ پر اور جائز حدود میں کرنے کی ترغیب دی جائے، تو یقیناً یہ قوم کی ایک اہم خدمت ہوگی۔

موجودہ حالات میں علماء سے مطلوب کردارِ عزیمت

اگر ہم گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد ایک دور ایسا گذرا، جب عیسائی دنیا پستی اور تنزلی کے دلدل میں پھنسی رہی، پھر جب اس وقت کی ترقی یافتہ قوم امت مسلمہ سے علم کی روشنی اسپین کے راستہ یورپ تک پہنچی تو مغرب نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی بیداری صنعتی ترقی کے اس عظیم واقعہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، جس کا تسلسل اب تک جاری ہے، مغرب کی مادی اور علمی ترقی نئی نئی منزلیں فتح کر رہی ہے اور مسلسل آگے کی طرف جا رہی ہے اور مسلمانوں کے ادبی اور علمی زوال کی داستان بھی دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی ہے، اس ترقی کا سہارا لے کر ایک نئی صلیبی جنگ استعماریت کی شکل میں شروع ہوئی، جس نے ایشیاء وافریقہ اور خاص کر عالم اسلام کے بڑے حصے کو فتح کرتے ہوئے اسے اپنی نو آبادی بنالیا، یہ استعماریت آخر اس وقت تک جاری رہی، جب تک خلافت عثمانیہ کا سقوط نہ ہوگیا اور عالم اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوگئی۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلم ممالک کو آزادی نصیب ہوئی؛ لیکن اکثر و بیشتر یہ نام نہاد آزادی تھی، ان کے گلے میں غلامی کا ایسا طوق پہنایا گیا، جو آنکھوں کو نظر نہ آئے؛ لیکن وہ صرف جسم ہی کی غلامی نہ ہو؛ بلکہ دل و دماغ کی بھی غلامی ہو، جس میں ایک قوم خود اپنے بارے میں فیصلہ کرتی ہوئی نظر آئے؛ لیکن اس کی حیثیت اس جہاز کی ہو جسے ریموٹ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، اسی دور میں کارل مارکس نے کمیونزم کا صور پھونکا اور دنیا کے دو بڑے ممالک — روس، چین — اس نئے فلسفہ حیات اور نظام معیشت پر ایمان لے آئے، کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا، اب دنیا میں فکری اعتبار سے تین فریق بن گئے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، مشرق کا اشتراکی نظام اور اسلام، اگرچہ ان دونوں نظام ہائے حیات کو اسلام سے بغض تھا؛ لیکن چوں کہ عالم اسلام اپنی پستی اور کمزوری کی وجہ سے کمزور دشمن شمار کیا جاتا تھا؛ اس لیے اصل سرد جنگ مغربی قوتوں اور اشتراکیت کے حامل مشرقی ملکوں کے

درمیان قائم رہی، اس سے ایک توازن قائم تھا، بغض وعناد رکھنے کے باوجود یہ دونوں بڑی طاقتیں مسلم ملکوں کو اپنا ہم نوا رکھنا چاہتی تھیں، اور چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک مذہب کی بالکل نفی نہیں کرتے تھے؛ اس لیے کمیونسٹ ملکوں کے مقابلہ میں عالم اسلام اور مسلمان مغربی قوتوں سے زیادہ قریب رہے، مغربی اقوام نے بھی یہ رویہ رکھا کہ وہ علی الاعلان کمیونزم کے خلاف تو بولتے تھے اور اپنے ذرائع ابلاغ کو بھی ان کے خلاف خوب خوب استعمال کرتے تھے؛ لیکن اسلام اور مسلمانوں کو براہِ راست نشانہ بنانے میں کسی قدر رعایت سے کام لیتے تھے۔

کمیونزم کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی، جو پوری طرح فطرت سے متصادم تھے: اس لیے صرف ستر سال کے اندر ہی اس کی جائے پیدائش ہی اس کا مدفن بن گیا، اس نظام کا سب سے بڑا نمائندہ ملک اور دوسری سپر طاقت ''روس'' خود اپنی وحدت کو بچا نہیں سکا اور اس کے ٹکڑے ہوگئے، اب دنیا میں دو ہی تصورات باقی رہ گئے، ایک اسلام، دوسرے مغربی تہذیب اور مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، دشمن کا مقابلہ کرنے اور کسی فکر کے تحفظ میں دو طرح کے لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے، ایک: حکومتوں کا، جن کے پاس فوجی طاقت ہوتی ہے، جن کے پاس مادی وسائل ہوتے ہے، جو زروزمین کی مالک ہوتی ہیں، جو ٹیکنالوجی کی حامل ہوتی ہیں، اس کو وجود میں لانے اور ترقی دینے کا کام انجام دیتی ہے اور اس کے لیے وسائل فراہم کرتی ہیں، دوسرے: وہ لوگ جو اس فکر کے ترجمان اور اس کے شارح ہوتے ہیں، جو فکری اعتبار سے اس کا دفاع کرتے ہیں، جو اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ عوام کو اس سے وابستہ رکھتے ہیں، کسی بھی فکر کے بقا اور کسی بھی نظام کے دوام و استحکام کے لیے ان دونوں طبقوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، ایک کے پاس فولاد کی طاقت ہوتی ہے، دوسرے کے پاس علم کا ہتھیار ہوتا ہے، ایک نوکِ شمشیر سے میدان سر کرتا ہے، دوسرا زبان وقلم سے، ایک زمین کو فتح کرتا ہے اور دوسرا دل ودماغ کو۔

چناں چہ اب مشرق ومغرب کی پوری طاقت اسلام، مسلمان اور عالم اسلام کی طرف

متوجہ ہے، مسلم حکومتوں کو زیر کرنے میں انہیں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد پورے عالم اسلام میں کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی، جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے، ان کو مزید کمزور کرنے کے لیے دو خصوصی تدبیریں اختیار کی گئیں، ایک یہ کہ ان کے زیارہ سے زیادہ ٹکڑے کر دیے گئے، اتنے چھوٹے چھوٹے مما لک بنا دیے گئے کہ بعض شہر بھی ان میں سے بعض ملکوں سے بڑے ہوں گے، اس طرح ان کی طاقت ٹوٹ گئی، قدرتی وسائل بٹ گئے، افرادی وسائل کم ہو گئے اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان ملکوں کو پروانۂ آزادی دیتے ہوئے سرحدوں کا اختلاف باقی رکھا جائے، اس اختلاف کے ذریعہ ان کے درمیان نفرت کی بیج بوئی گئی اور اسے مسلسل پروان چڑھایا گیا، آج اکثر مسلم مما لک کی یہی صورتِ حال ہے، سعودی عرب اور کویت اور سعودی عرب اور یمن کے درمیان سرحد کا اختلاف موجود ہے، قطر اور بحرین کے درمیان جھگڑا ہے، کویت کو عراق سے اور متحدہ عرب امارات کی ایران سے لڑائی ہے، مصر اور سوڈان کے درمیان اختلاف ہے، خود سوڈان میں عرب اور غیر عرب قبائل کے درمیان نزاع ہے، فلسطین کی چھوٹی سی نامکمل حکومت کے دو حصے بنے ہوئے ہیں، شام اور ترکی کو ایک دوسرے سے بغض ہے، کرد، عراق، ترکی اور شام سے نبرد آزما ہیں، پاکستان اور افغانستان کے درمیان کدورتیں ہیں، بنگلہ دیش میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہے، غرض شرق بعید کے دو تین مسلم ملکوں کو چھوڑ کر تمام ہی مسلم مما لک اپنے مسلمان پڑوسی ملکوں سے یا ملک کے اندر دو طبقے ایک دوسرے سے برسر جنگ ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلم مما لک کو حقیقی جمہوریت سے دور رکھا گیا؛ تا کہ وہاں ایسے لوگ نہ آجائیں، جو اسلام پسند ہوں اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں شریعت اسلامی کو نافذ کرنا چاہتے ہوں؛ اسی لیے انگلی پر گنے جانے والے تین چار مسلم مما لک کو چھوڑ کر تمام ملکوں میں دو طرح کے حکمراں تختِ اقتدار پر مسلط ہیں، ایک وہ جو خاندانی بادشاہت کے نمائندہ ہیں، وہاں ایک خاندان کو ملک کے عوام اور اس کے وسائل کا مالک سمجھا جاتا ہے، وہ

پیدائشی طور پر حکمراں ہوتا ہے، اس کی زبان قانون ہوتی ہے، عوام کی نہ حکومت میں شرکت ہوتی ہے اور نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے، ہاں، اگر اس حکمراں کے اندر ذاتی طور پر اللہ کا خوف، دین کی عظمت اور اپنے عوام کی محبت ہے تو اس کا رویہ بہتر ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ کسی نظام کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک شخص کے انفرادی اخلاق و اوصاف کا اثر ہے؛ اس لیے اس میں دوام و استمرار باقی نہیں رہتا۔

دوسرے قسم کے ممالک وہ ہیں، جہاں کسی فوجی جنرل نے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر وہ ڈکٹیٹر بن گیا اور اس کے بعد یہ ڈکٹیٹر شپ اس کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہی، عوام کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جمہوری طور پر ان سے نجات پاسکیں، ان کے لیے نجات کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کوئی فوجی یا ظلم و ستم سے عاجز شخص تشدد کے ذریعہ اس کا خاتمہ کر دے، یا اللہ تعالیٰ اس کو اُٹھالیں، ان ملکوں کا حال بھی پہلی قسم کے ملکوں سے مختلف نہیں؛ بلکہ زیادہ بُرا ہے، ان دونوں طرح کی حکومتوں میں مغربی طاقتوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ یہ اصحابِ اقتدار ان کا کھلونا بن کر رہیں، وہ نام کے مسلمان ہوں؛ لیکن پوری طرح مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ حیات کے نمائندہ ہوں، ان کی زبان حق بولنے سے خاموش رہے، اس کو ٹیکنالوجی سے محروم رکھ کر بنا بنایا سامان فراہم کیا جائے، ان کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور پھر قرض دے کر ان پر احسان جتایا جائے، ان کے ذریعہ عوام پر ظلم و ستم کیے جائیں، جو لوگ اسلامی اور شریعت اسلام کا نام لیتے ہیں، انہیں دبایا جائے اور شرم ناک سزائیں دی جائیں، وہ اپنی عوام کے مالک و مختار ہوں اور مغربی آقاؤں کے غلام، آج کم و بیش پورا عالم اسلام اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔

اس طویل عرصے میں مغرب کی مسلسل سازشوں اور ستم انگیزیوں کے باوجود مسلم ممالک میں بھی اور مسلم اقلیتی ممالک میں بھی جن لوگوں نے ملت اسلامیہ کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی آگ کو بجھنے سے بچایا ہے، وہ وہی طبقہ ہے جو زبان و قلم کے ذریعہ اسلامی افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور

اخلاق ومحبت کی تلوار سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتا ہے، یہ طبقہ علماء اور دینی تحریکات کا ہے، مغرب کے استعماری دور میں ہی مسلمانوں میں اسلامی تحریکات وجود میں آنے لگیں اور انہیں فروغ حاصل ہوتا رہا، ان تحریکات کو فکر کا سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ علماء کا ہے، خلافت کے خاتمہ کے بعد کسی سرکاری اعانت کے بغیر اس طبقہ نے مسلمانوں کا دین سے رشتہ استوار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ نقش لازوال ہے، ورنہ نہ معلوم کتنے مسلمان ارتداد کا شکار ہو چکے ہوتے، دہریت اور الحاد پورے پورے ملک کو اپنے قبضہ میں لے لیتی، اسلامی شعائر کے بارے میں مسلمانوں کی دینی غیرت ختم ہو چکی ہوتی اور شریعت اسلامی سے ان کا رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہوتا، جیسے عیسائی معاشرہ میں کچھ لوگ اتوار کو چرچ چلے جاتے ہیں اور جیسے ہندو سماج میں کچھ افراد مندروں میں پہنچ کر نذر و نیاز پیش کر دیتے ہیں اور کچھ خاص خاص تہواروں کو دھوم دھام سے انجام دے لیتے ہیں، یہی حال مسلمانوں کا ہو گیا ہوتا؛ کہ ان میں جو لوگ مذہبی ہوتے وہ جمعہ اور عیدین میں شرکت کر لیتے اور کبھی کبھار مسجد چلے جاتے، ان کی عائلی زندگی، ان کی معیشت اور زندگی کے دوسرے مسائل میں شریعت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

علماء نے ہمیشہ اپنی بساط بھر امت مسلمہ کو دین سے جوڑے رکھنے اور اسلام کو اللہ کی زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کی؛ چوں کہ ان کی یہ کوشش حکمراں طبقہ کے عیش وعشرت کے منصوبوں میں خلل انداز ہوتی تھی؛ اس لیے زیادہ تر وہ اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کے معتوب ہی بنے رہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو قرنِ اول میں نذرانۂ شہادت پیش کر دیا تھا، امام ابوحنیفہؒ کو بنوامیہ اور بنوعباس دونوں زمانوں میں حکمراں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، دونوں حکومتوں میں انہیں کوڑوں سے مارا گیا، قید کی سزا سے بھی دوچار ہوئے، یہاں تک کہ زہر کا پیالہ پلا کر انہیں شہید کیا گیا، امام مالکؒ کو عباسی حکمراں منصور کے زمانے میں ستر (۷۰) کوڑے لگائے گئے اور اس طرح ان کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے، امام احمد بن حنبلؒ عباسی حکمراں مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانہ میں ایسی شدید آزمائش سے گذرے کہ تاریخ عزیمت میں شاید اس کی مثال مل سکے، جس شخص نے امام احمدؒ پر کوڑے

برسائے خود اس کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ پر اس سختی کے ساتھ اَسّی (۸۰) کوڑے برسائے کہ اگر اس طاقت کے ساتھ میں ہاتھی پر کوڑوں کی بارش کرتا تو وہ بھی چیخ اٹھتا اور یہ بارش مدتوں امام احمد بن حنبلؒ پر ہوتی رہی؛ لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، امام بخاریؒ کا آخری زمانہ اس حال میں گذرا کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، سعید بن جبیرؒ کو اس طرح ذبح کر دیا گیا جیسے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے؛ لیکن حجاج بن یوسف کا جبر وظلم ان کو ذرا بھی خوفزدہ نہ کر سکا، ابن السکیت کی حق گوئی پر عباسی خلیفہ متوکل نے ان کی زبان کھینچوالی اور زبان کے ساتھ ساتھ ان کی روح بھی پرواز کر گئی، خود ہندوستان میں راہِ عزیمت میں علماء کی استقامت کی ایک وسیع تاریخ رہی ہے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کی دین بے زاری کے خلاف علم اصلاح بلند کیا اور پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ گوالیار میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، مغل حکمرانوں کے دور میں مختلف علماء ومشائخ حق گوئی کے جرم میں شہید کر دیئے گئے، کسی کو قتل کر دیا گیا، کسی کو ہاتھی کے قدموں تلے روند دیا گیا، کسی کو دیوار میں چن دیا گیا اور کوئی جلا وطن کر دیا گیا، ہندوستان کی جنگ آزادی ــــ جس میں علماء نے اسلام کی حفاظت کے لیے حصہ لیا ــــ میں بے شمار علماء شہید کر دیئے گئے، دلی کے مضافات میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سر راہ درختوں پر پھانسی دے دے کر عبرت کے لیے علماء و اہل دین کی لاشیں لٹکا کر رکھی گئیں، سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں شامل کتنے ہی علماء صادق پور نے جام شہادت نوش کیا اور ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، شاملی میں بڑے بڑے علماء نے سر بہ کف ہو کر برطانوی فوج کا مقابلہ کیا؛ لیکن کوئی چیز ان کی ثابت قدمی کو متأثر نہیں کر سکی۔

آزمائش کا ایک دوسرا رنگ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے مال ومتاع کی لالچ دے کر کسی کو اس کی فکر سے ہٹا دینا اور اس کو اس کے مشن سے روک دینا، امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں منقول ہے کہ عباسی حکمراں متوکل نے جب پچھلے مظالم کی تلافی کے لیے امام احمدؒ کے پاس ۲۰ ہزار سکے بھیجے اور ایک دوسرے موقع پر ایک لاکھ درہم بھیجے تو امام احمدؒ نے معذرت کر دی اور

فرمایا کہ یہ آزمائش اُس آزمائش سے بڑھ کر ہے: ''**ھذا امر اصعب علیّ من ذلک، ذلک فتنۃ الدین وھذا فتنۃ الدنیا**'' محدثین وفقہاء ہوں یا اکابر صوفیاء جیسے خواجہ حسن بصریؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مشائخ ہند میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ شرف الدین یحیٰ منیری۔ رحمہم اللہ ۔وغیرہ ان سب کے حالات دیکھیے، یہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے اوران کی طرف سے ملنے والے مناصب اورنذرانوں سے اس طرح بھاگتے تھے، جیسے انسان آگ سے بھاگتا ہے۔

موجودہ حالات میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی طوراس طبقہ کی لگام کسی جائے، انہیں حق گوئی سے باز رکھا جائے، غلط تاویل اور جھوٹی توجیہ کے ذریعہ مغربی افکاراور لادینی تہذیب پران سے مہرلگوائی جائے اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، ہلاکوخان نے جب بغداد کو پوری طرح قابو میں کرلیا تو اس نے اس زمانہ کے بعض نام نہاد ضمیر فروش علماء سے یہ فتویٰ صادر کرانے میں کامیابی حاصل کرلی کہ ''عادل کافر بادشاہ'' ظالم مسلمان بادشاہ سے بہتر ہے اوراس غلط فتویٰ کواس نے اپنے لیے مہر تصدیق بنایا، مغرب نے اپنی اس سوچ کو روبہ عمل لانے کے لیے دوطریقۂ کار اختیار کیے، ایک طریقہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان حکمراں ہیں یا جہاں آمرانہ نظام ہے، وہاں ظلم اور دباؤ کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہےاور حسب ضرورت کچھ ترغیب وتحریص کا، اِس وقت اس کی زندہ مثال عرب ممالک ہیں، خاص کر مصر، جہاں شیخ الازہراور مفتی اعظم سے مغرب کے منشا کے مطابق بیانات دلوائے جاتے ہیں، جہاں مساجد سے ان ائمہ کومعزول کردیا گیا ہے، جوحقیقت میں اسلامی فکر کے ترجمان ہیں اور ایسے لوگوں کو اس اہم ذمہ داری پر فائز کیا گیا ہے، جن کواس عہد کا ''منافق'' کہا جاسکتا ہے، ان سے کس طرح کا کام لیا جارہا ہےاور لیا جانے والا ہےاس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ائمہ مساجد کے لیے جوتربیتی ورکشاپ رکھے جارہے ہیں، ان میں انہیں ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ عوام کو بتائیں کہ اسرائیل ہمارا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور چاہےاس کا سلوک اچھا ہو یا بُرا؛ اس لیے اسرائیل جوبھی کرے؛ لیکن

ہمیں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں حد درجہ افسوس ناک صورتِ حال وہ ہے جو ابھی چند عرب ملکوں کی طرف سے ایک مسلم عرب ملک قطر کے بائیکاٹ پر مصر اور سعودی عرب کے بعض علماء و مشائخ اور اصحابِ افتاء کی طرف سے سامنے آئی ہے، مصر کے ایک مفتی نے تو خوشامد کی آخری حدوں کو پار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اس سال قطری باشندوں کا روزہ مقبول نہیں ہوگا؛ کیوں کہ انہوں نے سعودی عرب کی مخالفت کی ہے، گویا روزہ کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، سعودی حکومت کی طرف ہوگی، سعودی عرب کے مفتی اعظم اور رئیس اُمور حرمین بجائے اس کے کہ ایک مذہبی قائد ہونے کی حیثیت سے مسلم ملکوں کے باہمی اختلاف کو کم کرنے اور صلح کرانے کی کوشش کرتے، انہوں نے سعودی حکومت کے فیصلے پر آمین کہنے پر اکتفا کیا، ظاہر ہے کہ جب امام خود مقتدی بن جائے تو اُمت کے مسائل کیوں کر حل ہوسکیں گے؟

جو جمہوری ممالک ہیں، جہاں دستوری طور پر کسی کو اپنے ضمیر کے خلاف مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہاں مال و متاع اور عہدہ و منصب کی لالچ دے کر زبان و قلم پر مہر لگانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور یقیناً جمہوریت ایک نعمت ہے، نیز مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے، اور اس ملک کی خصوصیت علماء و مشائخ، دینی جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں، نیز دینی تعلیمی اداروں کی کثرت ہے؛ اس لیے یہاں ایک طرف دباؤ کی پالیسی اختیار کی جارہی ہے، مدارس، ان کے طلبہ و فضلاء، دینی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں اور مذہبی شخصیتوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزامات لگائے جارہے ہیں۔

عالم اسلام کی صورتِ حال اس سے بھی بہت خراب ہے، جہاں ہزاروں علماء کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے، انھیں یہود و نصاریٰ اور اسرائیل سے خطرہ نہیں ہے؛ لیکن علمائے ربانیین اور اسلام کے پرستاروں سے خطرہ ہے، دوسری طرف ان کے سامنے متاعِ مال و زر کی پیش

کش بھی کی جارہی ہے، خود ہمارے ملک میں کبھی کہا جاتا ہے کہ حکومت ائمہ مساجد کو معقول تنخواہیں دے گی، مساجد حکومت کے یہاں اپنا رجسٹریشن کرالیں، کبھی مدارس کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ کے قائم کیے ہوئے بورڈ میں شامل ہوجائیں، اس طرح اساتذہ کو اونچی تنخواہیں فراہم کی جائیں گی، کبھی حکومت کے غیراہم مناصب دے کر تالیف قلب کی جاتی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان تمام کوششوں کا بنیادی مقصد اس طبقہ کو پست حوصلہ کرنا، ان کی زبان کو بند کرنا اوران کی جد و جہد کو محدود کرنا ہے، جن کا بنیادی مشن اسلام کی اشاعت وحفاظت ہے اور یہ سب کچھ صرف حکومت ہند کا منصوبہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عالمی منصوبہ ہے جس کے تانے بانے امریکہ اور اسرائیل میں بنے گئے ہیں۔

یہ حالات عالمی سطح پر علماء ومشائخ کے لیے لمحہ فکر یہ ہیں کہ کیا ان کا مقصد زندگی صرف روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنا ہے جس طور پر بھی حاصل ہوجائیں؟ یا وہ اس سے اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے کام کررہے ہیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں، جو اجرت کے لیے نہیں، اجر کے لیے کام کرتے تھے یا حکومتِ وقت کے ہر فیصلہ کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا، وہ اس کائنات میں خدائی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں یا مادیت کے پرستار، ان کا کام حکمت ومصلحت کے ساتھ حکومتِ وقت پر نکیر کرنا ہے یا ان کی ڈیوٹی حکمرانوں کے اعدائے اسلام کی سازشوں کا حصہ بننے کے باوجود ان کی تائید وتقویت ہے، یہ وقت ہے کہ علماء سر جوڑ کر بیٹھیں، اس مسئلہ پر غور کریں، اپنے سلف کے راستہ پر خود کو ثابت قدم رکھیں، دین کے فروغ کو اپنی متاعِ حیات بنانے کا عہد کریں اور اس بات کا عزم مصمم کریں کہ نہ فولاد و آہن کی طاقت اظہار حق کے معاملہ میں انہیں خوف زدہ کرسکے گی اور نہ سیم وزر کی لالچ انہیں اپنا اسیر بناسکے گی کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے: **اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ!**

علماء کی دانش مندی کا امتحان

اسلام اور مسلمانوں سے عداوت رکھنے والی طاقتیں شروع سے اس بات کے لیے کوشاں رہی ہیں کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کیا جائے؛ تاکہ ان کی طاقت بکھر جائے، افسوس کہ خود مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد ان کے آلہ کار بن جاتے ہیں، جو کچھ متاع حقیر کے بدلے اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو بعض کاموں کو نیک کام سمجھ کر بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ انجام دیتے ہیں؛ حالاں کہ یہ ملت کے لیے نقصان کا سودا ہوتا ہے اور اس سے بالواسطہ طور پر اعداء اسلام کو تقویت پہنچتی ہے۔

اس طرح کی سازشوں کا شکار زیادہ تر مذہبی لوگ ہوتے ہیں، ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے، پھر اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر اہم یا کم اہم باتوں کے سلسلہ میں ان کو باور کرایا جاتا ہے کہ اِس وقت کا سب سے اہم کام یہی ہے، اور یہ مسائل عموماً ایسے ہوتے ہیں، جن میں امت کے درمیان اختلافِ رائے رہا ہے، اِن مسائل میں کچھ اس طرح اکسایا جاتا ہے کہ وہ اشتعال انگیز تقریریں کرنے لگتے ہیں، جذباتی مضامین لکھتے ہیں، مباحث و مناظرے کرتے ہیں، فریق مخالف پر تیز وتند تبصرے کرتے ہیں اور ان کا استہزاء کر کے اپنے نفس کی تسکین کرتے ہیں، اس سے دو بڑے نقصانات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ حقیقی مسائل کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے، دوسرے امت میں اختلاف بڑھتا ہے اور بعض اوقات زبان و قلم کی جنگ سے بڑھ کر نوبت مار پیٹ اور قتل وقتال تک آجاتی ہے، اس وقت دنیا کے مختلف خطوں میں خود اسلام کے نام پر دہشت گردی کے جو واقعات پیش آرہے ہیں، ان کا پس منظر یہی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ایسی تحریکوں کی قیادت ہے، وہ تو دانستہ طور پر یہود و نصاریٰ کے آلہ کار ہیں؛ لیکن جو لوگ ان کے تحت کام کر رہے ہیں، وہ اسی طرح کی اکساہٹ کا شکار ہیں اور اپنی غیر اسلامی حرکتوں کو اسلام کی بیش قیمت خدمت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی کوشش کی جارہی ہے کہ اسی طرح کی صورتِ حال پیدا کی

جائے اور مسلمانوں کے مسلکی اختلافات کو ابھارا جائے، ان حالات میں بریلوی مکتبِ فکر کے نمائندہ جناب مولانا توقیر رضا خان صاحب کا دیو بند تشریف لے جانا ایک غیر معمولی اور خوش آئند واقعہ ہے، اور یہ یقیناً ان کی دانش مندی اور زمانہ آگہی کا ثبوت ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہتر اجر عطا فرمائے، تاہم ایسی پہل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور شاید اس کوشش میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے؛ تاکہ مسلمانوں کے مسلکی اختلافات کو نمایاں کیا جائے، اس کی ایک مثال اس وقت تین طلاقوں کا مسئلہ ہے، ہمارے ملک کی برسراقتدار فرقہ پرست پارٹی کے منشور میں یہ بات شامل ہے کہ مسلم پرسنل لا کو ختم کر دیا جائے اور ملک میں بسنے والے تمام لوگوں کے لیے ’’کامن سول کوڈ‘‘ بنایا جائے، اس لیے تعدد ازواج اور طلاق وغیرہ کے مسئلہ پر پہلے سے اعتراض ہوتا رہا ہے، لیکن اس بار میڈیا نے خاص طور پر تین طلاقوں کے مسئلہ کو اپنا موضوع بنایا ہے، اس کو عورتوں سے ہمدردی کا تقاضہ قرار دیتے ہوئے بعض نام نہاد آوارہ خیال مسلم خواتین کو مسلم پرسنل لا کے خلاف کھڑا کیا جا رہا ہے، گویا مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے، بیف کی تہمت لگا کر برسرعام ایک مسلمان کو قتل کر دیا گیا، مسلمان نوجوانوں کو گائے کا گوبر کھانے اور پیشاب پینے پر مجبور کیا گیا اور سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والی تنظیموں کے کارکنوں نے برسرعام ان حرکتوں کو جائز ٹھہرایا، فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، نہ جانے کتنے بے قصور مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا مگر ایسے مواقع پر میڈیا میں سرسری طور پر ان کا ذکر ہوتا ہے اور جلد ہی اس کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے، لیکن تین طلاقوں کا مسئلہ جو کہیں اکا دکا پیش آتا ہے، اس پر اِس طرح آہ وواویلا کی جارہی ہے گویا یہی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی، اسلام کو بدنام کرنے کی دانستہ کوشش اور منظّم سازش ہے، اور تین طلاقوں کے مسئلہ کو خاص طور پر اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، علماء کو اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ایسے مسائل میں ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ اَوّل تو ہم اعراض اور پہلو تہی کا راستہ اختیار کریں کہ اگر کوئی اختلافی سوال اٹھایا جائے تو اس کا جواب دینے سے گریز کیا جائے اور

سوال کا رخ بدل دیا جائے، مثلاً اگر میڈیا میں یہ دریافت کیا جائے کہ تین طلاق مسلم خواتین کے لیے ایک بہت گمبھیر مسئلہ ہے، اس سے عورتیں بے سہارا ہو جاتی ہیں تو جواب دیا جائے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں سینکڑوں مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، صرف گجرات کے فسادات میں دو ہزار مسلمان شہید کیے گئے، ان کی عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے اور وہ آج تک بے سہارگی کی زندگی گزار رہے ہیں، آسام میں کتنے سارے مسلمان شہید کیے گئے اور ان کے گھر اُجاڑ دیے گئے، مسلمانوں کا اور مسلم خواتین کا اصل مسئلہ یہ ہے، ایسے واقعات کے سد باب کے سلسلہ میں قانون سازی ہونی چاہیے، اسی طرح ہزاروں مسلم نوجوانوں کو جیل کی کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا ہے، دس دس سال گزر گئے اور کوئی چارج شیٹ داخل نہیں کی گئی، ان کی بیویاں نیم بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں، ان کے بچوں کا حال ایسے یتیموں کا سا ہے جو باپ کی شفقت سے بھی محروم ہیں اور انہیں یتیم بھی نہیں سمجھا جاتا، مسلم معاشرہ کے اصل مسائل یہ ہیں، حکومت اور عدلیہ کو اس جانب توجہ دینی چاہیے، اور جو لوگ مسلم خواتین کی ہمدردی کا نعرہ لگا رہے ہیں، اُن کو اِن بیچارہ و بے کس خواتین کے مسائل حل کرنے چاہییں، اعراض کے اس اسلوب سے مسلم خواتین کے اصل مسائل لوگوں کے سامنے آئیں گے اور مصنوعی طور پر جس بات کو مسئلہ بنایا جا رہا ہے، اس کی طرف سے لوگوں کے توجہ ہٹے گی، اگر آدمی ہر سوال کا جواب دینے لگے تو وہ مخالفین کی سازش کا شکار ہو جاتا ہے، قرآن مجید میں اس کی بڑی خوب مثال ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو فرعون تو مسلمان نہیں ہوا؛ البتہ جن جادوگروں کو اس نے بلایا تھا، ان پر سچائی ظاہر ہو گئی اور وہ ایمان لے آئے تو آخری حربہ کے طور پر فرعون نے کہا کہ تمہارے بقول ان کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور یہ اللہ کے عذاب سے بچ گئے؛ لیکن ان کے آباء و اجداد کا کیا ہوگا؟ وہ تو ایمان لائے نہیں، تمہارے بقول کفر کی حالت میں دنیا سے چلے گئے، اس کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ ان کا بھی وہی حال ہوگا، جو دوسرے ایمان سے محروم لوگوں کا ہوگا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعراض کا پہلو اختیار کرتے ہوئے فرمایا: ''علمها عند

ربی فی کتاب لا یضل ربی ولا ینسیٰ'' (طٰہٰ:۲۵) ''میرے پروردگار کو اس کا علم ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، میرے پروردگار نہ غلطی کرتے ہیں اور نہ بھولتے ہیں۔''

غور فرمایئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس خوب صورتی کے ساتھ اس کی سازش کو ناکام کر دیا اور ایسا جواب دیا جو غلط بھی نہیں تھا، اور فرعون جو چاہتا تھا کہ جادوگروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دور کر دے، اس میں کامیاب بھی نہیں ہو سکا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسے کسی اختلافی مسائل میں اِظہارِ رائے کی نوبت آ ہی جائے تو مخالف نقطۂ نظر کے حامی لوگوں کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے اور ان کے نقطۂ نظر کے درست ہونے کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بات پیش کی جائے، اس سے اختلاف بڑھتا نہیں ہے، بحث کا دروازہ نہیں کھلتا اور ایک دوسرے کے خلاف تیز و تند ریمارکس کرنے کی نوبت نہیں آتی؛ حالاں کہ مخالفین کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہ آپ کی زبان سے ایسی باتیں کہلائیں جو باہمی اختلافات کو بڑھانے کا باعث بنیں، قرآن مجید نے ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین مکہ سے مکالمہ کا اُسلوب بتایا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیلیں پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آپ یوں کہیے: ''وانا او ایاکم لعلیٰ ھدی او فی ضلٰل مبین'' (سبا:۲۴) ''ہم یا تم یا تو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔''

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق و ہدایت پر ہونا بالکل واضح تھا، دُوپہر کی دھوپ سے بھی زیادہ واضح اور مشرکین کا غلطی پر ہونا بھی اسی درجہ واضح تھا، تو بظاہر جواب یہ ہونا چاہیے کہ ہم واضح ہدایت پر ہیں اور تم کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو، لیکن قرآن نے ایک ایسا جواب دینا سکھایا، جس میں ایک درجہ میں فریق مخالف کی رعایت ہے، اور جس جواب سے توقع کی جاسکتی ہے کہ باہمی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہے گا اور گفتگو کا دروازہ بند نہیں ہوگا؛ کیوں کہ دعوتِ دِین کے لیے یہ بات ضروری ہے، تو جب کھلے ہوئے گمراہوں کو یہ بات کہی جاسکتی ہے تو کیا ایسے اختلافی مسائل میں جن میں دونوں فریق کے پاس قرآن و حدیث کی دلیلیں اور صحابہ وسلف صالحین کے فتاویٰ موجود ہیں، کیا اس طرح جواب نہیں دیا

جا سکتا کہ اگر چہ اس مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے؛ لیکن دوسرے حضرات جو رائے رکھتے ہیں، وہ بھی بے بنیاد نہیں ہے، ان کے پاس بھی دلیلیں ہیں، اور اس مسئلہ کو ہمارے یہاں کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں ہے، یہ کہہ کر ہم اختلاف کی شدت کو کم کر سکتے ہیں اور اپنے مخالفین کی سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم احتیاط، دوسرے فریق کے احترام اور ان کے نقطۂ نظر کے پیچھے دلائل کا اعتراف کرتے ہوئے متفق علیہ نقطہ کو پیش کریں، اور لوگوں سے کہیں کہ اصل قابلِ توجہ مسئلہ یہ ہے، جس پر سبھوں کا اتفاق ہے، مثلاً: تین طلاق کے مسئلہ پر ہماری گفتگو کا اسلوب یہ ہو کہ اس مسئلہ میں دو رائیں پائی جاتی ہیں، جمہور کی رائے یہ ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تینوں طلاقیں بھی واقع ہو جاتی ہیں، یہی نقطۂ نظر امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام بخاری اور بیشتر محدثین وفقہاء رحمہم اللہ کا ہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں، یہ رائے اُمت کے بعض بڑے جلیل القدر علماء علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم کی ہے اور دونوں کے پاس اپنے نقطۂ نظر کے دلائل موجود ہیں، لیکن اصل قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ بلا وجہ تین طلاقوں کا دینا ہی غلط ہے، خواہ ایک ساتھ دی جائے یا الگ الگ، چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت عبادہ بن صامتؓ کا معاملہ آیا، جنہوں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا انہیں اللہ کا خوف نہیں؟ پھر آپ نے طلاق دینے کے اس انداز کو ظلم و عدوان قرار دیا۔ (مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، حدیث: ۱۱۳۳۹)

ایک اور واقعہ کا ذکر آیا ہے کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاق دے دی ہے تو آپ غصہ سے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: ''کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ ابھی میں تم لوگوں کے درمیان موجود ہوں''، آپ کا غصہ اس قدر بڑھا ہوا اور خلافِ معمول تھا کہ ایک صاحب کھڑے ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول! کیا میں اسے قتل ہی نہ کر دوں؟ (سنن نسائی، کتاب الطلاق،

حدیث:۱۰۴۳۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے انہیں رجوع کرنے کا حکم دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے عرض کیا کہ یہ تو میں نے ایک طلاق دی تھی، اگر میں نے تین طلاق دی ہوتی تو کیا ہوتا؟ آپ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں تم اپنے رب کی نافرمانی کرنے والے ہوتے اور تمہاری بیوی تم سے علیحدہ ہوجاتی۔(سنن دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والا یلاء:۳۲/۴)

حضرت عمرؓ کی خدمت میں اگر ایسا کوئی شخص لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہو تو سر پر کوڑے لگواتے اور خوب پٹائی کرتے۔(مصنف عبدالرزاق، باب المطلّق ثلاثاً، حدیث:۱۱۳۴۵)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاق دے دی ہے،تو فرمایا کہ تین طلاق سے تمہاری بیوی بائنہ ہوگئی اور یہ تمام ہی طلاقیں اللہ کی نافرمانی ہیں:"وسائرهن معصية" (مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الطلاق، حدیث: ۱۷۸۰۰)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے،تو فرمایا کہ تمہارے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی ہے۔(مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الطلاق، حدیث:۱۸۰۸۸)

اسی لیے فقہاء بھی اس بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا ناپسندیدہ طریقہ ہے،امام کرخی سے منقول ہے کہ اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا مکروہ ہے۔(المبسوط، کتاب الطلاق:۶/۶)

مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے جو حرام کے قریب ہوتا ہے،امام مالکؒ کے شاگرد عبدالرحمٰن بن قاسم سے پوچھا گیا کہ کیا امام مالک اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے دے؟ عبدالرحمٰن نے جواب دیا کہ امام مالکؒ اس

سے شدید کراہت کرتے تھے:''کان یکرھہ اشد الکراھیة'' (المدونہ، کتاب طلاق السنة:۳/۲)اور فقہاء مالکیہ کی اصطلاح میں امام مالکؒ جب کسی چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں تو مکروہ سے ناجائز ہونا مراد ہوتا ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کا بیان ہے کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا اکثر صحابہ، تابعین اور بعد کے فقہاء امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک حرام ہے، اور ایک قول امام احمد کا بھی یہی ہے جس کو ان کے اکثر متبعین نے اختیار کیا ہے۔(مجموع الفتاویٰ،ھل یقع طلاق البدعة ام لا:۳۳/۶۷)

غرض کہ اگرچہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین یا ایک ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن اس طریقے کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اس لیے ہماری کوششوں کا محور یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں شعور پیدا کیا جائے کہ بلاضرورت طلاق نہ دی جائے، اور اگر طلاق دینے کی نوبت آہی جائے تو ایک طلاق پر اکتفاء کیا جائے، ہمیں اِس کی مہم چلانی چاہیے؛ کیوں کہ اگر تین طلاق کی شناعت اور برائی لوگوں کے سامنے نہیں رکھی گئی اور مزاج نہیں بدلا گیا تو ایک دفعہ طلاق دینے کے بجائے لوگ تین الگ الگ مجلسوں میں طلاق دیں گے، گھوم پھر کر تین بار طلاق کے الفاظ کہیں گے، اس لیے مزاج کو بدلنے کی ضرورت ہے کہ بلاضرورت طلاق دینا گناہ ہے اور تین طلاق دینا گناہ بالائے گناہ ہے، چاہے ایک ساتھ دی جائے یا الگ الگ۔

غرض کہ اس طرح کے اختلافی مسائل اسلام دشمن عناصر مسلمانوں کے اختلاف کو بڑھانے کے لیے، مسلکی اختلاف کو ہوا دینے اور مسلم سماج کو رسوا کرنے کے لیے اٹھا رہے ہیں، ہمیں ان کی نیت کو سمجھنا چاہیے اور ایسی دانش مندی کے ساتھ ایسے سوالات کا سامنا کرنا چاہیے کہ مخالفین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں، درحقیقت یہ علماء کی فراست ایمانی، معاملہ فہمی اور دانش مندی کا امتحان ہے، کاش، مذہبی قائدین اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں!

علماء اور دینی خدمت گذاروں کے لیے لمحہ فکر

اگر ہم گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد ایک دور ایسا گذرا، جب عیسائی دنیا پستی اور تنزلی کے دلدل میں پھنسی رہی، پھر جب اس وقت کی ترقی یافتہ قوم امت مسلمہ سے علم کی روشنی اسپین کے راستہ یورپ تک پہنچی تو مغرب نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی بیداری صنعتی ترقی کے اس عظیم واقعہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، جس کا تسلسل اب تک جاری ہے، مغرب کی مادی اور علمی ترقی نئی نئی منزلیں فتح کر رہی ہے اور مسلسل آگے کی طرف جاری ہے اور مسلمانوں کے ادبی اور علمی زوال کی داستان بھی دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس ترقی کا سہارا لے کر ایک نئی صلیبی جنگ استعماریت کی شکل میں شروع ہوئی، جس نے ایشیا و افریقہ اور خاص کر عالم اسلام کے بڑے حصے کو فتح کرتے ہوئے اسے اپنی نوآبادی بنالیا، یہ استعماریت آخر اس وقت تک جاری رہی، جب تک خلافت عثمانیہ کا سقوط نہ ہوگیا اور عالم اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوگئی۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلم ممالک کو آزادی نصیب ہوئی؛ لیکن اکثر و بیشتر یہ نام نہاد آزادی تھی، ان کے گلے میں غلامی کا ایسا طوق پہنایا گیا، جو آنکھوں کو نظر نہ آئے؛ لیکن وہ صرف جسم ہی کی غلامی نہ ہو؛ بلکہ دل و دماغ کی بھی غلامی ہو، جس میں ایک قوم خود اپنے بارے میں فیصلہ کرتی ہوئی نظر آئے؛ لیکن اس کی حیثیت اس جہاز کی ہو جسے ریموٹ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، اسی دور میں کارل مارکس نے کمیونزم کا صور پھونکا اور دنیا کے دو بڑے ممالک — روس، چین — اس نئے فلسفہ حیات اور نظام معیشت پر ایمان لے آئے، کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، اب دنیا میں فکری اعتبار سے تین فریق بن گئے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، مشرق کا اشتراکی نظام اور اسلام، اگر چہ ان دونوں نظام ہائے حیات کو اسلام سے بغض تھا؛ لیکن چوں کہ عالم اسلام اپنی پستی اور کمزوری کی وجہ سے کمزور دشمن شمار کیا جاتا تھا؛ اس لیے اصل سرد جنگ مغربی قوتوں اور اشتراکیت کے حامل مشرقی ملکوں کے

درمیان قائم رہی، اس سے ایک توازن قائم تھا، بغض وعناد رکھنے کے باوجود یہ دونوں بڑی طاقتیں مسلم ملکوں کو اپنا ہم نوا رکھنا چاہتی تھیں، اور چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک مذہب کی بالکل نفی نہیں کرتے تھے؛ اس لیے کمیونسٹ ملکوں کے مقابلہ میں عالم اسلام اور مسلمان مغربی قوتوں سے زیادہ قریب رہے، مغربی اقوام نے بھی یہ رویہ رکھا کہ وہ علی الاعلان کمیونزم کے خلاف تو بولتے تھے اور اپنے ذرائع ابلاغ کو بھی ان کے خلاف خوب خوب استعمال کرتے تھے؛ لیکن اسلام اور مسلمانوں کو براہِ راست نشانہ بنانے میں کسی قدر رعایت سے کام لیتے تھے۔

کمیونزم کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی، جو پوری طرح فطرت سے متصادم تھے: اس لیے صرف ستر سال کے اندر ہی اس کی جائے پیدائش ہی اس کا مدفن بن گیا، اس نظام کا سب سے بڑا نمائندہ ملک اور دوسری سپر طاقت ''روس'' خود اپنی وحدت کو بچا نہیں سکا اور اس کے ٹکڑے ہوگئے، اب دنیا میں دو ہی تصورات باقی رہ گئے، ایک اسلام، دوسرے مغربی تہذیب اور مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام۔

دشمن کا مقابلہ کرنے اور کسی فکر کے تحفظ میں دو طرح کے لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے، ایک: حکومتوں کا، جن کے پاس فوجی طاقت ہوتی ہے، جن کے پاس مادی وسائل ہوتے ہیں، جو زر وزمین کی مالک ہوتی ہیں، جو ٹیکنالوجی کی حامل ہوتی ہیں، اس کو وجود میں لانے اور ترقی دینے کا کام انجام دیتی ہیں اور اس کے لیے وسائل فراہم کرتی ہیں، دوسرے: وہ لوگ جو اس فکر کے ترجمان اور اس کے شارح ہوتے ہیں، جو فکری اعتبار سے اس کا دفاع کرتے ہیں، جو اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ عوام کو اس سے وابستہ رکھتے ہیں، کسی بھی فکر کے بقا اور کسی بھی نظام کے دوام واستحکام کے لیے ان دونوں طبقوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، ایک کے پاس فولاد کی طاقت ہوتی ہے، دوسرے کے پاس علم کا ہتھیار ہوتا ہے، ایک نوکِ شمشیر سے میدان سر کرتا ہے، دوسرا زبان وقلم سے، ایک زمین کو فتح کرتا ہے اور دوسرا دل ودماغ کو!

چناں چہ اب مشرق ومغرب کی پوری طاقت اسلام، مسلمان اور عالم اسلام کی طرف

متوجہ ہے، مسلم حکومتوں کو زیر کرنے میں انہیں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد پورے عالم اسلام میں کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی، جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے، ان کو مزید کمزور کرنے کے لیے دو خصوصی تدبیریں اختیار کی گئیں، ایک یہ کہ ان کے زیادہ سے زیادہ ٹکڑے کر دیے گئے، اتنے چھوٹے چھوٹے ممالک بنا دیے گئے کہ بعض شہر بھی ان میں سے بعض ملکوں سے بڑے ہوں گے، اس طرح ان کی طاقت ٹوٹ گئی، قدرتی وسائل بٹ گئے، افرادی وسائل کم ہو گئے اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان ملکوں کو پروانۂ آزادی دیتے ہوئے سرحدوں کا اختلاف باقی رکھا جائے، اس اختلاف کے ذریعہ ان کے درمیان نفرت کی بیج بوئی گئی اور اسے مسلسل پروان چڑھایا گیا، آج اکثر مسلم ممالک کی یہی صورتِ حال ہے، سعودی عرب اور کویت اور سعودی عرب اور یمن کے درمیان سرحد کا اختلاف موجود ہے، قطر اور بحرین کے درمیان جھگڑا ہے، کویت کو عراق سے اور متحدہ عرب امارات کی ایران سے لڑائی ہے، مصر اور سوڈان کے درمیان اختلاف ہے، خود سوڈان میں عرب اور غیر عرب قبائل کے درمیان نزاع ہے، فلسطین کی چھوٹی سی نامکمل حکومت کے دو حصے بنے ہوئے ہیں، شام اور ترکی کو ایک دوسرے سے بغض ہے، کرد، عراق، ترکی اور شام سے نبرد آزما ہیں، پاکستان اور افغانستان کے درمیان کدورتیں ہیں، بنگلہ دیش میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہے، غرض شرقِ بعید کے دو تین مسلم ملکوں کو چھوڑ کر تمام ہی مسلم ممالک اپنے مسلمان پڑوسی ملکوں سے یا ملک کے اندر دو طبقے ایک دوسرے سے برسر جنگ ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلم ممالک کو حقیقی جمہوریت سے دور رکھا گیا؛ تاکہ وہاں ایسے لوگ نہ آ جائیں، جو اسلام پسند ہوں اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں شریعت اسلامی کو نافذ کرنا چاہتے ہوں؛ اسی لیے اُنگلی پر گنے جانے والے تین چار مسلم ممالک کو چھوڑ کر تمام ملکوں میں دو طرح کے حکمراں تخت اقتدار پر مسلط ہیں، ایک وہ جو خاندانی بادشاہت کے نمائندہ ہیں، وہاں ایک خاندان کو ملک کے عوام اور اس کے وسائل کا مالک سمجھا جاتا ہے، وہ

پیدائشی طور پر حکمراں ہوتا ہے، اس کی زبان قانون ہوتی ہے، عوام کی نہ حکومت میں شرکت ہوتی ہے اور نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے، ہاں! اگر اس حکمراں کے اندر ذاتی طور پر اللہ کا خوف، دین کی عظمت اور اپنے عوام کی محبت ہے تو اس کا رویہ بہتر ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ کسی نظام کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک شخص کے انفرادی اخلاق واوصاف کا اثر ہے؛ اس لیے اس میں دوام واستمرار باقی نہیں رہتا — دوسرے قسم کے ممالک وہ ہیں، جہاں کسی فوجی جنرل نے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر وہ ڈکٹیٹر بن گیا اور اس کے بعد یہ ڈکٹیٹرشپ اس کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہی، عوام کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جمہوری طور پر ان سے نجات پا سکیں، ان کے لیے نجات کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کوئی فوجی یا ظلم وستم سے عاجز شخص تشدد کے ذریعہ اس کا خاتمہ کر دے، یا اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لے، ان ملکوں کا حال بھی پہلی قسم کے ملکوں سے مختلف نہیں؛ بلکہ زیادہ برا ہے، ان دونوں کی طرح کی حکومتوں میں مغربی طاقتوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ یہ اصحابِ اقتدار ان کا کھلونا بن کر رہیں، وہ نام کے مسلمان ہوں؛ لیکن پوری طرح مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ حیات کے نمائندہ ہوں، ان کی زبان حق بولنے سے خاموش رہے، اس کو ٹیکنالوجی سے محروم رکھ کر بنا بنایا سامان فراہم کیا جائے، ان کے وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور پھر قرض دے کر ان پر احسان جتایا جائے، ان کے ذریعہ عوام پر ظلم وستم کیے جائیں، جو لوگ اسلام اور شریعت اسلام کا نام لیتے ہیں، انہیں دبایا جائے اور شرم ناک سزائیں دی جائیں، وہ اپنی عوام کے مالک و مختار ہوں اور مغربی آقاؤں کے غلام، آج کم وبیش پورا عالم اسلام اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔

اس طویل عرصے میں مغرب کی مسلسل سازشوں اور ستم انگیزیوں کے باوجود مسلم ممالک میں بھی اور مسلم اقلیتی ممالک میں بھی جن لوگوں نے ملت اسلامیہ کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی آگ کو بجھنے سے بچایا ہے، وہ وہی طبقہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ اسلامی افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور

اخلاق ومحبت کی تلوار سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتا ہے، یہ طبقہ علماء اور دینی تحریکات کا ہے، مغرب کے استعماری دور میں ہی مسلمانوں میں اسلامی تحریکات وجود میں آنے لگیں اور انہیں فروغ حاصل ہوتا رہا، ان تحریکات کو فکر کا سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ علماء کا ہے، خلافت کے خاتمہ کے بعد کسی سرکاری اعانت کے بغیر اس طبقہ نے مسلمانوں کا دین سے رشتہ استوار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ نقش لازوال ہے، ورنہ نہ معلوم کتنے مسلمان ارتداد کا شکار ہو چکے ہوتے، دہریت اور الحاد پورے پورے ملک کو اپنے قبضہ میں لے لیتی، اسلامی شعائر کے بارے میں مسلمانوں کی دینی غیرت ختم ہو چکی ہوتی اور شریعت اسلامی سے ان کا رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہوتا، جیسے عیسائی معاشرہ میں کچھ لوگ اتوار کو چرچ چلے جاتے ہیں اور جیسے ہندو سماج میں کچھ افراد مندروں میں پہنچ کر نذر و نیاز پیش کر دیتے ہیں اور کچھ خاص خاص تہواروں کو دھوم دھام سے انجام دے لیتے ہیں، یہی حال مسلمانوں کا ہو گیا ہوتا؛ کہ ان میں جو لوگ مذہبی ہوتے وہ جمعہ اور عیدین میں شرکت کر لیتے اور کبھی کبھار مسجد چلے جاتے، ان کی عائلی زندگی، ان کی معیشت اور زندگی کے دوسرے مسائل میں شریعت کا کوئی حصہ نہ ہوتا۔

علمائے حق نے ہمیشہ اپنی بساط بھر امت مسلمہ کو دین سے جوڑے رکھنے اور اسلام کو اللہ کی زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کی؛ چوں کہ ان کی یہ کوشش حکمراں طبقہ کے عیش وعشرت کے منصوبوں میں خلل انداز ہوتی تھی؛ اس لیے زیادہ تر وہ اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کے معتوب ہی بنے رہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو قرنِ اوّل ہی میں نذرانۂ شہادت پیش کر دیا تھا، امام ابوحنیفہؒ کو بنوامیہ اور بنوعباس دونوں زمانوں میں حکمراں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، دونوں حکومتوں میں انہیں کوڑوں سے مارا گیا، قید کی سزا سے بھی دوچار ہوئے، یہاں تک کہ زہر کا پیالہ پلا کر انہیں شہید کیا گیا، امام مالکؒ کو عباسی حکمراں منصور کے زمانے میں ستر (۷۰) کوڑے لگائے گئے اور اس طرح ان کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے، امام احمد بن حنبلؒ عباسی حکمراں مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانہ میں ایسی شدید آزمائش سے گذرے کہ تاریخ عزیمت میں شاید اس کی مثال مل سکے، جس شخص نے امام احمدؒ پر کوڑے

برسائے خود اس کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ پر اس سختی کے ساتھ اَسّی (۸۰) کوڑے برسائے کہ اگر اس طاقت کے ساتھ میں ہاتھی پر کوڑوں کی بارش کرتا تو وہ بھی چیخ چیخ اُٹھتا اور یہ بارش مدتوں امام احمد بن حنبلؒ پر ہوتی رہی؛ لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، امام بخاریؒ کا آخری زمانہ اس حال میں گذرا کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، سعید بن جبیرؒ کو اس طرح ذبح کر دیا گیا جیسے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے؛ لیکن حجاج بن یوسف کا جبر و ظلم ان کو ذرا بھی خوف زدہ نہ کر سکا، ابن السکیت کی حق گوئی پر عباسی خلیفہ متوکل نے ان کی زبان کھنچوالی اور زبان کے ساتھ ساتھ ان کی روح بھی پرواز کر گئی، خود ہندوستان میں راہِ عزیمت میں علماء کی استقامت کی ایک وسیع تاریخ رہی ہے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کی دین بے زاری کے خلاف علم اصلاح بلند کیا اور پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ گوالیار میں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، مغل حکمرانوں کے دور میں مختلف علماء و مشائخ حق گوئی کے جرم میں شہید کر دیئے گئے، کسی کو قتل کر دیا گیا، کسی کو ہاتھی کے قدموں تلے روند دیا گیا، کسی کو دیوار میں چن دیا گیا اور کوئی جلا وطن کر دیا گیا، ہندوستان کی جنگِ آزادی — جس میں علماء نے اسلام کی حفاظت کے لیے حصہ لیا — میں بے شمار علماء شہید کر دیئے گئے، دلی کے مضافات میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سرراہ درختوں پر پھانسی دے دے کر عبرت کے لیے علماء و اہل دین کی لاشیں لٹکا کر رکھی گئیں، سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں شامل کتنے ہی علمائے صادق پور نے جامِ شہادت نوش کیا اور ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، شاملی میں بڑے بڑے علماء نے سر بہ کف ہو کر برطانوی فوج کا مقابلہ کیا؛ لیکن کوئی چیز ان کی ثابت قدمی کو متاثر نہیں کر سکی۔

آزمائش کا ایک دوسرا رنگ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے مال و متاع کی لالچ دے کر کسی کو اس کی فکر سے ہٹا دینا اور اس کو اس کے مشن سے روک دینا، امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں منقول ہے کہ عباسی حکمراں متوکل نے جب پچھلے مظالم کی تلافی کے لیے امام احمدؒ کے پاس ۲۰ ہزار سکے بھیجے اور ایک دوسرے موقع پر ایک لاکھ درہم بھیجے تو امام احمدؒ نے معذرت کر دی اور

فرمایا کہ یہ آزمائش اس آزمائش سے بڑھ کر ہے: ”**ھذا امر اصعب علیّ من ذلک، ذلک فتنة الدین وھذا فتنة الدنیا**“ محدثین وفقہاء ہوں یا اکابر صوفیاء جیسے خواجہ حسن بصری، شیخ عبدالقادر جیلانی، مشائخ ہند میں خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری۔ رحمہم اللہ ۔ وغیرہ ان سب کے حالات دیکھیے، یہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے اور ان کی طرف سے ملنے والے مناصب اور نذرانوں سے اس طرح بھاگتے تھے، جیسے انسان آگ سے بھاگتا ہے۔

موجودہ حالات میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی طور اس طبقہ کی لگام کسی جائے، انھیں حق گوئی سے باز رکھا جائے، غلط تاویل اور جھوٹی توجیہ کے ذریعہ مغربی افکار اور لادینی تہذیب پر ان سے مہر لگوائی جائے، اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، ہلاکو خان نے جب بغداد کو پوری طرح قابو میں کر لیا تو اس نے اس زمانے کے بعض نام نہاد ضمیر فروش علماء سے یہ فتویٰ صادر کرانے میں کامیابی حاصل کر لی کہ ”عادل کافر بادشاہ“ ظالم مسلمان بادشاہ سے بہتر ہے اور اس غلط فتویٰ کو اس نے اپنے لیے مہر تصدیق بنایا، مغرب نے اپنی اس سوچ کو روبہ عمل لانے کے لیے دو طریقۂ کار اختیار کیے، ایک طریقہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان حکمراں ہیں یا جہاں آمرانہ نظام ہے، وہاں ظلم اور دباؤ کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت کچھ ترغیب وتحریص کا، اِس وقت اس کی زندہ مثال عرب ممالک ہیں، خاص کر مصر، جہاں شیخ الازہر اور مفتی اعظم سے مغرب کے منشا کے مطابق بیانات دلوائے جاتے ہیں، جہاں مساجد سے ان ائمہ کو معزول کر دیا گیا ہے، جو حقیقت میں اسلامی فکر کے ترجمان ہیں اور ایسے لوگوں کو اس اہم ذمہ داری پر فائز کیا گیا ہے، جن کو اس عہد کا ”منافق“ کہا جا سکتا ہے، ان سے کس طرح کا کام لیا جا رہا ہے اور لیا جانے والا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہاں ائمہ مساجد کے لیے جو تربیتی ورکشاپ رکھے جا رہے ہیں، ان میں انھیں ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ عوام کو بتائیں کہ اسرائیل ہمارا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور چاہے اس کا سلوک اچھا ہو یا برا؛ اس لیے اسرائیل جو بھی کرے؛

لیکن ہمیں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے۔

جو جمہوری ممالک ہیں، جہاں دستوری طور پر کسی کو اپنے ضمیر کے خلاف مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہاں مال ومتاع اور عہدہ ومنصب کی لالچ دے کر زبان وقلم پر مہر لگانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور یقیناً جمہوریت ایک نعمت ہے، نیز مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے، اور اس ملک کی خصوصیت علماء و مشائخ، دینی جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں، نیز دینی تعلیمی اداروں کی کثرت ہے؛ اس لیے یہاں ایک طرف دباؤ کی پالیسی اختیار کی جارہی ہے، مدارس، ان کے طلبہ وفضلاء، دینی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں اور مذہبی شخصیتوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزامات لگائے جارہے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے متاعِ مال وزر کی پیش کش بھی کی جاری ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ حکومت ائمہ مساجد کو معقول تنخواہیں دے گی، مساجد حکومت کے یہاں اپنا رجسٹریشن کرالیں، کبھی مدارس کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ کے قائم کیے ہوئے بورڈ میں شامل ہوجائیں، اس طرح اساتذہ کو اونچی تنخواہیں فراہم کی جائیں گی، کبھی حکومت کے غیر اہم مناصب دے کر تالیف قلب کی جاتی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان تمام کوششوں کا بنیادی مقصد اس طبقہ کی زبان کو بند کرنا اور ان کی جدو جہد کو محدود کرنا ہے، جن کا بنیادی مشن اسلام کی اشاعت وحفاظت ہے اور یہ سب کچھ صرف حکومتِ ہند کا منصوبہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عالمی منصوبہ ہے جس کے تانے بانے امریکہ اور اسرائیل میں بنے گئے ہیں۔

یہ حالات علماء و مشائخ، دینی مدارس و جامعات اور دینی جماعتوں سے وابستہ حضرات کے لیے لمحہ فکریہ ہیں کہ کیا ان کا مقصد زندگی صرف روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنا ہے، جس طور پر بھی حاصل ہوجائیں، یا وہ اس سے اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے کام کررہے ہیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں، جو اجرت کے لیے نہیں، اجر کے لیے کام کرتے تھے، وہ اس کائنات میں خدائی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں یا مادیت کے پرستار، یہ وقت ہے کہ علماء سر جوڑ کر بیٹھیں، اس مسئلہ پر غور کریں، اپنے سلف کے راستہ پر خود کو ثابت قدم رکھیں، دین

کے فروغ کو اپنی متاعِ حیات بنانے کا عہد کریں اور اس بات کا عزم مصمم کریں کہ نہ فولاد و آہن کی طاقت اِظہارِ حق کے معاملہ میں انہیں خوف زدہ کر سکے گی اور نہ سیم وزر کی لالچ انہیں اپنا اسیر بنا سکے گی کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جینا اور مرنا سب اللہ کے لیے ہے: اِنَّ صَلَاتِی وَنسکی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبّ العٰلَمِیْنَ!

اساتذہ — مقام اور ذمہ داریاں

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس نہایت ہی مقدس اور معزز پیشہ ہے، ہر مذہب اور ہر سماج میں اساتذہ کو بڑا احترام حاصل رہا ہے؛ کیوں کہ سماج میں جو کچھ بھلائیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہیں اور خدمت خلق کا جو سرو سامان موجود ہے، وہ سب دراصل تعلیم ہی کا کرشمہ ہے اور درس گاہیں ان کا اصل سرچشمہ، اسلام کی نگاہ میں انسانیت کا سب سے مقدس طبقہ پیغمبروں کا ہے، پیغمبر کی حیثیت اپنے اُمتی کی نسبت سے کیا ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ اس کا ذکر فرمایا ہے اور وہ یہی کہ نبی انسانیت کا مربی اور معلم ہوتا ہے، وہ تعلیم بھی دیتا ہے اور انسانیت کو اس علم کے سانچہ میں ڈھالنے کی بھی کوشش کرتا ہے: ''یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' (آل عمران: ۱۶۴)

اسی لیے اساتذہ کا احترام اسی قدر ضروری ہے جتنا اپنے والدین کا، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فقہاءِ صحابہ میں ہیں، حدیث کی نقل و روایت اور فہم و درایت میں بھی بڑے اعلیٰ درجہ کے مالک ہیں اور تفسیر و فہم قرآن کا کیا پوچھنا کہ اُمت میں سب سے بڑے مفسر مانے گئے ہیں؛ لیکن اس مقام و مرتبہ کے باوجود صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں اہل علم کے ساتھ اسی سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ (مستدرک حاکم: ۳/۴۲۳)

خلف احمر مشہور امام لغت گزرے ہیں، امام احمدؒ ان کے تلامذہ میں ہیں؛ لیکن علومِ اسلامی میں مہارت اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے امام صاحب کو اپنے استاذ سے بھی زیادہ عزت ملی، اس کے باوجود امام احمدؒ کبھی ان کے برابر بیٹھنے کو تیار نہیں ہوتے اور کہتے کہ آپ کے سامنے بیٹھوں گا؛ کیوں کہ ہمیں اپنے اساتذہ کے ساتھ تواضع اختیار کرنے کا حکم ہے۔ (تذکرۃ السامع والمتکلم، ص: ۸۷)

امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگردوں میں ہیں، کہتے ہیں کہ جب میں امام مالکؒ کے سامنے ورق پلٹتا تو بہت نرمی سے کہ کہیں آپ کو بارِ خاطر نہ ہو۔ (حوالہ سابق، ص: ۸۸)

خود قرآن مجید نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقامِ نبوت پر فائز تھے؛ لیکن انھوں نے نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ حضرت خضر کی باتوں کو برداشت کیا اور بار بار معذرت خواہی فرمائی، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف پاؤں کرنے میں بھی لحاظ ہوتا تھا، امام صاحبؒ نے خود اپنے صاحب زادہ کا نام اپنے استاذ کے نام پر رکھا، قاضی ابویوسفؒ کو اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ سے ایسا تعلق تھا کہ جس روز بیٹے کا انتقال ہوا اس روز بھی اپنے استاذ کی مجلس میں حاضری سے محرومی کو گوارا نہیں فرمایا۔

بدقسمتی سے اب اساتذہ اور طلبہ (بالخصوص نئے فضلاء) کے درمیان محبت واحترام کا یہ جذبہ مفقود ہے، طلبہ اپنے اساتذہ کو ایسی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ ان کے حریف اور فریق ہیں، نقل وحرکت اور نشست و برخاست میں ادب واحترام تو بہت دور کی چیز ہے، رودررو فقرے چست کرنے اور جملے کسنے میں بھی کوئی حجاب نہیں، ظاہر ہے اس بے احترامی اور بے اکرامی کے ساتھ کیوں کر کسی شخص سے فیض یاب ہوا جاسکتا ہے؟

جو شخص جتنے بلند مقام ومرتبہ کا حامل ہو، اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، استاذ باپ کا درجہ رکھتا ہے: لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو وہی محبت اور پیار بھی دے، جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے طلبہ کی نسبت سے فرماتے تھے کہ اگر ان پر ایک مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ (تذکرۃ السامع، ص:۹۴)

سلف صالحین کو اپنے شاگردوں سے ایسی محبت ہوتی کہ ان کی نجی دشواریوں کو بھی حل کرتے، امام شافعیؒ بڑے اعلیٰ درجہ کے فقیہ ومحدث ہیں، یہ حصولِ علم کے لیے مدینہ پہنچے، غریب آدمی تھے، امام مالکؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو خود اپنا مہمان بنایا اور جب تک مدینہ میں رہے، ان کی کفالت کرتے رہے، پھر جب امام شافعیؒ نے مزید کسبِ علم کے لیے کوفہ کا سفر کرنا چاہا تو سواری کا نظم بھی کیا اور اخراجاتِ سفر کا بھی اور شہر سے باہر آکر نہایت محبت

سے آپ کو رخصت کیا، امام شافعیؒ کوفہ آئے اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام محمدؒ کی درس گاہ میں بحیثیت طالب علم شریک ہوگئے، یہاں بھی امام محمدؒ نے ذاتی طور پر امام شافعیؒ کی کفالت فرمائی؛ بلکہ بھرپور تعاون فرمایا، امام شافعیؒ اس حال میں کوفہ پہنچے کہ نہایت ہی معمولی کپڑا آپ کے جسم پر تھا، امام محمدؒ نے اسی وقت ایک قیمتی جوڑے کا انتظام فرمایا، جو ایک ہزار درہم قیمت کا تھا، پھر جب امام شافعیؒ کو رُخصت کیا تو اپنی پوری نقدی جمع کر کے تین ہزار درہم انہیں حوالہ کیے۔ (**جامع بیان العلم لابن عبد البر**، ص:۸۶۲)

امام ابو یوسفؒ کے والد دھوبی کا کام کرتے تھے اور بڑی عسرت کے ساتھ گزر اوقات ہوتی تھی؛ بلکہ اس افلاس و مجبوری کی وجہ سے ان کے والدین کو امام ابو یوسفؒ کا پڑھنا پسند نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ آپ کسبِ معاش میں مصروف ہوں اور گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹائیں، امام ابوحنیفہؒ ان کی ذہانت اور طلب علم کے شوق سے بہت متأثر تھے، اس لیے آپ نے بنفس نفیس ان کے اخراجات برداشت کیے۔

آج کل عصری تعلیمی اداروں کی صورتِ حال یہ ہے کہ تدریس محض درس گاہ کی ملازمت نہیں کہ آدمی تکمیل ضرورت کے لیے کچھ تنخواہ لے لے اور بے غرضی کے ساتھ اپنے شاگردوں کو پڑھائے؛ بلکہ تدریس ایک ایسی تجارت بن گئی ہے کہ جس کے لیے کسی سرمایہ اور دوکان کی ضرورت نہیں، اساتذہ تاجر ہیں اور طلبہ گاہک! اساتذہ اسکولوں اور کالجوں میں قصداً غیر معیاری اسباق دیتے ہیں اور اسباق کو تشنہ رکھتے ہیں؛ تاکہ طلبہ ان سے ٹیوشن پڑھیں اور کم وقت کی زیادہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دانش گاہوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی ''شایانِ شان نذرانہ'' پیش کرنا ہوتا ہے!

یہ ایسی شرم ناک بات ہے کہ شریف النفس لوگوں کے لیے اس کا تذکرہ بھی گراں خاطر ہے، ایک ایسا مقدس رشتہ جو مکمل طور پر بے غرضی پر مبنی ہے، جو ایک دوسرے سے بے لوث محبت اور بے پناہ شفقت کا متقاضی ہے اور جو تعلیم گاہیں اِنسانیت، محبت اور فرض شناسی کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہیں، وہیں سے ایسی بداخلاقی اور حرص و طمع کا سبق ملے تو پھر کون

سی جگہ ہوگی جہاں انسان کو انسانیت کا سبق مل سکے گا؟

حماد بن سلمہ ایک مشہور محدث گزرے ہیں، ان کے ایک شاگرد نے چین کا تجارتی سفر کیا اور کچھ قیمتی تحائف اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیے، استاذ نے فرمایا کہ اگر یہ تحفے قبول کروں گا تو آئندہ پڑھاؤں گا نہیں اور پڑھاؤں گا تو یہ تحفے قبول نہیں کرسکتا۔ (**الکفایة للخطیب، ص:۳۵۱**)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانیِ دارالعلوم دیوبند) کا حال یہ تھا کہ صرف تیس روپے ماہانہ پر خدمت فرماتے تھے، اس درمیان بعض رئیسوں کی طرف سے تین سو اور پانچ سو روپے ماہانہ پر کام کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے معذرت کردی اور فرمایا کہ اللہ کے یہاں ان ہی پیسوں کا حساب دینا مشکل ہے، اگر اور زیادہ پیسے لیے جائیں تو ان کا حساب تو اور بھی دشوار ہوگا۔

مسئلہ صرف پیسوں ہی کے لین دین کا نہیں؛ بلکہ ہر طرح کی نصح و ہمدردی کا ہے، ابن جماعہ نے خوب لکھا ہے کہ استاذ کا فرض ہے کہ وہ اپنے لیے جو پسند کرتا ہے وہی اپنے شاگردوں کے لیے پسند کرے اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہے اسے اپنے شاگردوں کے لیے بھی ناپسند سمجھے۔ (**تذکرة السامع، ص:۹۴**)

استاذ کو اپنے شاگرد سے بے حد محبت ہونی چاہیے اور اسے ہر وقت اس کا خیر خواہ ہونا چاہیے، جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کی ترقی پر خوش ہوتا ہے اور اس کی ناکامی پر کبیدہ خاطر، یہی تعلق ایک استاذ کو اپنے شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہیے، یہ تعلق بے غرض اور بے لوث ہو اور پاکیزگی پر مبنی ہو، اگر اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ طلبہ میں ان کے تئیں وہی احترام نہ پیدا ہو جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تدریس کے لیے کسی شخص کا انتخاب اہلیت اور لیاقت کی بناء پر ہونا چاہیے نہ کہ تعلقات اور دوسری بنیادوں پر؛ اس لیے کہ تدریس نہایت ہی اہم اور نازک کام ہے، مشہور بزرگ ابوبکر شبلی سے منقول ہے کہ جو شخص قبل از وقت کسی منصب پر فائز

ہو جائے وہ دراصل اپنی رسوائی کے درپے ہے: ''**من تصدر قبل اوانه فقد تصدر لهوانه**'' (**تذكرة السامع و المتكلم: ۵۴**)

اہلیت کا مطلب یہ ہے کہ جس مضمون کی تدریس اس کے حوالہ کی جارہی ہے، وہ واقعی اس مضمون میں عبور رکھتا ہو اور اپنے اخلاق وعادات کے اعتبار سے بھی انگشت نمائی سے محفوظ ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون پر مناسب محنت کرتا ہو اور اس کے مطالعہ و تحقیق میں ارتقاء اور تسلسل ہو کہ اس کے بغیر وہ اپنے طلبہ کو کما حقہ فیض یاب نہیں کرسکتا، وہ اوقاتِ درس کا پابند ہو اور اپنے وقت کو طلبہ کی امانت تصور کرتا ہو، قرآن مجید نے کم ناپنے تولنے کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور اہل علم نے لکھا ہے کہ ناپ تول کی کمی میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ وہ ملازمت کے اوقات میں سے کوئی حصہ اپنی ضرورت میں اور مفوضہ کام کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرے، یہ بھی ایک طرح کی چوری ہے اور ان اوقات کی اجرت اس کے لیے حلال نہیں۔

اساتذہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی نفسیات کا شعور رکھتے ہوں اور عملی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، طالب علم کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کرنا اور اس کی تذلیل کے درپے ہونا نہایت اوچھی بات ہے اور کسی بھی طرح استاذ کے شایان شان نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک تھا کہ اگر کسی کی غلطی پر ٹوکنا ہوتا تو تنہائی میں توجہ دلاتے اور اگر متعدد افراد کو اس غلطی میں مبتلا دیکھتے تو مجمع عام میں کسی کا نام لیے بغیر مبہم انداز میں توجہ دلاتے؛ چوں کہ مقصود اصلاح ہے نہ کہ انتقام، ایسا بھی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بعض لوگوں نے مسجد میں پیشاب کردیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پانی بہانے کا حکم دیا اور کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر محبت کے ساتھ سمجھانے پر اکتفا فرمایا، بعض طلبہ بظاہر شر پسند ہوتے ہیں؛ لیکن اگر تنہائی میں بلا کر ان کی تفہیم کی جائے اور ان کی ذہانت کو تخریبی کاموں کے بجائے تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیا جائے تو بآسانی ان کی اصلاح

ہو جاتی ہے اور وہ قوم کے لیے ایک مخلص عنصر ثابت ہو سکتے ہیں۔

اساتذہ کے لیے علمی لیاقت کے ساتھ اخلاقی اقدار بھی نہایت ضروری وصف ہے، استاذ کو اتنا باوقار ہونا چاہیے کہ اس کی ایک نگاہِ درشت سے طلبہ سہم جائیں، اگر اساتذہ خود اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں، طلبہ سے سطحی گفتگو کرتے ہوں، ان کے سامنے فحش ہنسی مذاق کیا کرتے ہوں، ان کے کردار کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور ان کی زبان وبیان سے وقتاً فوقتاً سوقیانہ پن اور پھوہڑ پن کا اظہار ہوتا ہو، تو بجا طور پر طلبہ ان کو اپنا بے تکلف دوست سمجھتے ہیں اور استاذ کا درجہ نہیں دیتے؛ کیوں کہ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان خود کتنا بھی برا ہو، وہ اپنے بزرگوں کو اس سے ماوراء دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج اور قوم کی تعمیر میں اساتذہ کا بڑا رول ہے، وہ نہ صرف طلبہ بلکہ سماج کے لیے بھی قابل احترام ہیں؛ لیکن اسی قدر ضروری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور جیسے وہ اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتتے، اسی طرح؛ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے فرائض وواجبات پر بھی نگاہ رکھیں اور خود احتسابی سے بھی غافل نہ ہوں۔

دینی تعلیم؛ سبھوں کے لیے!

کسی بھی مذہب اور فکر وعقیدہ کے لیے تعلیم کی حیثیت شہ رگ کی ہے، اگر کسی قوم کو اس کے دین سے محروم کرنا ہو تو اس کے دینی تصورات سے اس قوم کا علمی رشتہ کاٹ دیجیے، یہ چیز خود بخود اس قوم کو اپنے مذہب سے بے گانہ بنا دے گی، اس کے لیے پنجہ آزمائی کی ضرورت پڑے گی اور نہ معرکہ آرائی کی، یہ کسی قوم کو فکری اور مذہبی اعتبار سے قتل کرنے کا ایسا کامیاب اور بے ضرر نسخہ ہے کہ بقول شاعر:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو!

اکثر مسلم ممالک میں اس وقت مسلمانوں کے ساتھ یہی طرزِ عمل اختیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، انگریز جب ہندوستان میں آئے، تو انہوں نے بھی یہ نا کام کوشش کی؛ چناں چہ لارڈ میکالے جب فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کے بعد برطانیہ واپس گئے، تو انہوں نے برطانوی دارالعوام میں اپنے اس منصوبہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا: ''میں ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈال کر آیا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہیں گے؛ لیکن اپنی فکر اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے انگریز بن جائیں گے'' چناں چہ اس ملک کے دردمند علماء نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا اور انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس اور مکاتب قائم کر کے اس بات کا انتظام فرمایا کہ اس ملک میں بسنے والے مسلمان گو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں؛ لیکن وہ دل و نگاہ کے اعتبار سے ''حجازی'' بنے رہیں اور پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ کا دامن نبوت ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ جب ملک آزاد ہوا تو مسلمانوں نے اس جذبہ کے ساتھ جنگ آزادی میں شرکت کی کہ وہ اس ملک کے مالکوں میں ہوں گے، اس ملک میں ان کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی زبان محفوظ رہے گی؛ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے اس ملک میں فرقہ پرستی کا بیج بویا اور اس شجر خبیث کو اتنا تناور کر دیا کہ آزادی کے بعد بھی اس کی جڑیں پھیلتی رہیں اور

آج تو فرقہ پرست طاقتیں بامِ اقتدار پر پہنچ چکی ہیں، جہاں مسلمانوں کو اس ملک میں معاشی طور پر پس ماندہ، سیاسی اعتبار سے مفلوج و بے اثر اور جان و مال کے اعتبار سے غیر محفوظ و غیر مامون کرنے کی کوششیں کی گئیں، وہیں مسلمانوں کی تہذیب پر بھی یلغار کی گئی اور کوشش کی گئی کہ تہذیبی اعتبار سے ان کا ہندوکرن کر دیا جائے اور اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور عقیدہ سے دور کر دیا جائے؛ تاکہ ایک دو نسل کے بعد وہ مذہبی شعور سے پوری طرح محروم ہو جائیں۔ مسلمانوں پر یہ سب سے بڑا حملہ اور ضربِ کاری ہے اور اس سے معمولی سا تغافل بھی ان کے ملّی وجود اور بقا کے لیے زبردست خطرہ ہے — فرقہ پرست طاقتیں اس مقصد کے لیے دو طرفہ حملہ کر رہی ہیں، ایک طرف سرکاری درس گاہوں کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں جو ایک سیکولر ملک کے بجائے خالص ہندو تصورات پر مبنی ملک کی نمائندگی کرتی ہوں، ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے حالات، ہندو فکر و عقیدہ کی وکالت اور ہندو تاریخ کی عظمت اور تفوق کا اظہار، مسلم حکمرانوں کے مفروضہ ظلم و جور کا بیان، یہاں تک کہ بعض اوقات خود پیغمبر اسلام کی حیاتِ طیبہ پر حرف گیری اس ''بھگوا نصابِ تعلیم'' کی فکری بنیادیں ہیں ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' اقلیتوں کو مشرکانہ تصورات سے مانوس کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔ دوسری طرف دینی مدارس کے نظام میں دخیل ہونے اور ان اداروں کو بدنام کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں، بہار میں مدتوں پہلے گورنمنٹ نے دینی مدارس کو نصابِ تعلیم میں معمولی ترمیم کی شرط پر اعانت دینے کی پیش کش کی تھی اور اس کے لیے ''بہار مدارس اگزامنیشن بورڈ'' کی بنیاد رکھی تھی، ریاست کے وہ مخلص بزرگ علماء جو حالات کی نبض پہ انگلی رکھتے تھے، نے مدارس کو اس سرکاری بورڈ میں شریک ہونے سے روکنے کی بڑی کوششیں کیں؛ لیکن سرکاری اعانتوں کی پیش کش نے اکثر اربابِ مدارس کے قدم ڈگمگا دیئے اور انھوں نے اس کو ایک ''نعمتِ غیر مترقبہ'' سمجھ کر بے تحاشہ الحاق کرانا شروع کیا، گورنمنٹ نے بتدریج ان مدارس کے نصاب اور نظام میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ اب ان کو دینی درس گاہ کہنا ایک تہمت سے کم نہیں اور افسوس کہ ان کو ایک معیاری عصری

درس گاہ بھی نہیں کہا جا سکتا، اسی قسم کی کوشش مشرقی اتر پردیش میں بھی شروع ہوئی اور کسی قدر تاخیر سے سہی؛ لیکن اب وہاں بھی اس کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے—— جو دینی مدارس حکومت کے زیر اثر نہیں ہیں اور اس کے عمل و دخل سے آزاد ہیں، ان کو بدنام کرنے اور ان کی تصویر مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، کبھی اس کو انتہا پسندی کا مرکز قرار دیا جاتا ہے، کبھی ان مدارس کی طرف دہشت گردی کو منسوب کیا جاتا ہے، کبھی ان کے مالی وسائل کے بارے میں شکوک و شبہات ظاہر کیے جاتے ہیں، تاکہ خاص طور پر غیر مسلم ہم وطنوں کا ذہن ان اداروں کے بارے میں مسموم ہو جائے۔ ان حالات میں دینی تعلیم کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، دینی تعلیم حاصل کرنے کے دو درجے ہیں: ایک تو اتنی تعلیم جو ہر شخص کے لیے ضروری ہے، یہ دین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہے، توحید اور شرک کی حقیقت، نبوت و وحی کا اسلامی تصور، انبیاء اور بالخصوص پیغمبر اسلام ا کے ضروری حالات، پاکی و ناپاکی، نماز، روزہ، حج و زکوۃ اور قربانی کے بنیادی احکام، نکاح و طلاق، خرید و فروخت، ملازمت اور نوکری، کسبِ معاش کے حلال و حرام طریقے، شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں وغیرہ سے متعلق ضروری مسائل، صحابہ اور صحابیات کی مبارک زندگیوں سے متعلق بنیادی معلومات، والدین، اولاد، میاں بیوی اور اعزہ واقرباء سے متعلق حقوق، شب و روز کیے جانے والے افعال کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور مسنون و ماثور اوراد و اذکار، یہ وہ امور ہیں کہ جن کے بارے میں جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے، مرد ہوں یا عورت اور جوان ہوں یا بوڑھے، اس مقصد کے لیے جگہ جگہ دینی مکاتب اور بالغوں کے لیے دینی تعلیم کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے، کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی محلّہ اور کوئی مسجد ایسے مکاتب اور مراکز سے خالی نہ ہو؛ بلکہ بچوں اور بچیوں کے اسکول کے اوقات کے لحاظ سے صباحی اور مسائی دونوں طرح کے مکاتب ہوں اور کوشش کی جائے کہ محلّہ کا کوئی بچہ اور دین سے ناواقف کوئی نوجوان ایسا نہ رہے جو اس نظام سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ لیکن دوسری ضرورت ایسی درس گاہوں کی ہے، جہاں قرآن و حدیث، کلام و عقیدہ اور سیرتِ نبوی سے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اور اسلام کو اصل مأخذ سے سمجھنے اور سمجھانے کی

غرض سے عربی زبان وادب میں بصیرت کا سامان فراہم کیا جاتا ہو، بحمد اللہ! ہندوستان کے چپہ چپہ میں ایسے مدارس موجود ہیں، یہ اسلام کی فکری سرحدوں کے محافظ ہیں، ان ہی درس گاہوں سے نکلنے والے فضلاء نے ہر عہد میں اسلام کے خلاف اُٹھنے والی فکری شورشوں کا مقابلہ کیا ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسیحی پادریوں اور مبلغوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا، دیہات دیہات یہ مبلغین پہنچتے، بھولے بھالے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، یہ حضرات علماء ہی ہیں جنہوں نے ان سے پنجہ آزمائی کی اور اسی دور میں ایک ہندوستانی عالم مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عیسائیت کے رَدّ میں ''اظہار الحق'' کے نام سے ایک ایسی کتاب تالیف کی کہ اس موضوع پر کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور ہندوستان سے مصر وترکی تک مشہور عیسائی مناظر پادری فنڈر کا تعاقب کر کے اس کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا، پھر جب آریہ سماجی تحریک اُٹھی اور اس نے شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوششیں شروع کیں، تو یہ علماء ہی تھے جو اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فتنہ کا ایسا علمی اور تبلیغی تعاقب کیا کہ ان کی ناپاک کوششیں ذرا بھی بار آور نہ ہو پائیں۔ اسی طرح جب انگریزوں کی شہ پر پنجاب کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر حملہ کیا اور جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچایا، تو یہی علماء تھے جنہوں نے اُمت کو اس عظیم فتنہ سے بچانے کی سعی کی اور پورے برصغیر میں اپنی مجاہدانہ کوششوں سے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت فرمائی، اسی طرح انکارِ حدیث کا فتنہ اُٹھا، مستشرقین نے اسلام کے بارے میں تشکیکی مہم چلائی، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کے قلوب میں ان کے مذہب کے تئیں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھو دیئے جائیں، ان ہی مدارس کے فضلاء نے ان سازشوں کے مقابلہ کے لیے لوح وقلم کی امانت سنبھالی اور وقت کے اُسلوب میں ان کا رَدّ فرمایا، پھر جب ماضی قریب میں شریعت اسلامی کو فکری اور عقلی حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی کوشش کی گئی، تو پورے ملک میں ان مدارس کے تعلیم یافتہ اور پرداختہ فضلاء نے ایک تحریک کی شکل میں ''مسلم پرسنل لاء'' کے تحفظ کا بیڑہ اُٹھایا اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر شعور

پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حفاظت و صیانت میں دینی مدارس کا اتنا نمایاں اور اہم کردار ہے کہ کسی حقیقت پسند کے لیے اس سے انکار ممکن نہیں؛ اسی لیے اُمت میں ایک ایسے طبقہ کا وجود ضروری ہے، جو اسلام کا تحقیقی اور کتاب وسنت کا تفصیلی علم رکھتا ہو، اپنے عہد کے فکری اور فقہی مسائل کو حل کرنے کا اہل ہو، نیز اسلام کے خلاف اُٹھنے والے علمی و فکری فتنوں کا مقابلہ کرسکتا ہو اور ہر دور میں اس دور کی زبان اور طریقۂ استدلال کی رعایت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کی صلاحیت رکھتا ہو، ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر خاندان میں ایسا ایک عالم موجود ہو؛ لیکن جب مدینہ میں ۸۰/اشخاص نے اسلام قبول کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تربیت کے لیے حضرت معصب بن عمیرؓ کو بھیجا، اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم ہراسّی مسلمان پر ایک عالم ہونا چاہیے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کی تعداد ایک فی صد بھی نہیں، بیس کروڑ کی مسلمان آبادی میں اگر ایک فی صد بھی عالم ہو، تو ان کی تعداد بیس لاکھ ہونی چاہیے؛ لیکن پورے ملک میں علماء کی تعداد شاید دو لاکھ بھی نہ ہو، گویا مسلم آبادی میں ان کا تناسب ایک فی ہزار بھی نہیں! ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ ان لوگوں میں تھے، جن کو مشرق دیدہ اور مغرب رسیدہ کہا جاسکتا ہے، حکیم احمد شجاع نے اپنی کتاب ''خون بہا'' (۴۳۹/۱) میں اقبالؒ سے اپنی ایک دلچسپ گفتگو نقل کی ہے، جو ان لوگوں کے لیے یقیناً چشم کشا ہے، جو اِن دینی مدارس کے نظام کو فرسودہ اور (Out of date) تصور کرتے ہیں، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ لاہور میں آکر میں نے پاک پٹن شریف کے مسلمانوں کی نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبال کو سنائی، وہ پہلے تو حسبِ عادت میری بات غور سے سنتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے، پھر آنکھیں بند کرکے سوچنے لگے، جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو فرمایا: ''جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ سوچتا تھا جو تم چاہتے ہو، انقلاب ایک ایسا انقلاب ہو جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب ومتمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے'' پھر علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو،

غریب مسلمان کے بچوں کو انہیں مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے، تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرؤوں اور اسلامی تہذیب کے اثر کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔‘‘

مسلم مینجمنٹ کے تعلیمی ادارے

اللہ کا شکر ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں میں مسلمانوں نے درس گاہوں کے قیام پر خصوصی توجہ دی ہے اور ملک کے اکثر علاقوں میں مسلمانوں نے اپنی درس گاہیں قائم کی ہیں، پرائمری اور مڈل اسکول سے لے کر کالجز اور اعلیٰ فنی تعلیم کے بہت سے ادارے ہیں، جو اس وقت مسلم انتظامیہ کے تحت کام کر رہے ہیں، ہندوستان کے جن شہروں میں اس اہم کام کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے، ان میں ایک ہمارا شہر ''حیدرآباد'' بھی ہے، یہ نہایت ہی مبارک اور مسعود قدم ہے اور ان شاء اللہ مستقبل میں اس کے بڑے مفید نتائج ظاہر ہوں گے، عام طور پر لوگ اعلیٰ فنی تعلیم کے اداروں ہی کو اہم سمجھتے ہیں اور اہمیت دیتے ہیں؛ لیکن شاید ایسا سمجھنا درست نہیں، اگر ہم اپنے بچوں کو پرائمری سطح سے ہائی اسکول کی سطح تک بہتر تعلیم نہ دلا سکیں اور معیاری تعلیم کا اہتمام نہ کر پائیں، تو میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کا قیام چنداں مفید نہ ہوگا؛ کیوں کہ ہمارے بچے مقابلاتی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت آپ کریں گے، پیسے آپ لگائیں گے؛ لیکن خود آپ کے بچے ان درس گاہوں میں پڑھنے سے محروم رہیں گے؛ اس لیے یہ اوّلین ضرورت ہے کہ ہائی اسکول سطح تک تعلیم پر ہم بھرپور توجہ دیں، یہی زمانہ ہے جس میں ذہن وفکر کی تعمیر ہوتی ہے اور تعلیم کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں، اگر اس مرحلہ پر توجہ نہ دی گئی، تو وہ طالب علم ہمیشہ کمزور اور پست ہمتی کا شکار ہی رہے گا کہ:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان انتظامیہ کے تحت مستقل درس گاہوں کے قیام کا مقصد سرکاری یا غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے نجی درس گاہوں کی طرح مجرد تعلیم ہے، یا کوئی اور بڑا مقصد بھی ہے؟ اس مقصد کے لیے تو پہلے ہی بڑی تعداد میں اسکولز اور کالجز موجود ہیں، اصل مقصود مسلمانوں کے زیر انتظام درس گاہوں کا یہ ہے کہ ان کو جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی ماحول میسر ہو، ان کے دِلوں میں اسلامی اقدار کی عظمت بیٹھے، وہ مسلمان ہونے کی حیثیت

سے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں، وہ سب کچھ ہوں؛ لیکن پہلے مسلمان ہوں، بہ قول اکبر الہ آبادی:

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پر اُڑو چرخ پر جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اس کے لیے چند باتیں نہایت ہی ضروری ہیں اور مسلمان انتظامیہ کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ ان پر توجہ دے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اسکول کے ماحول میں اسلامی معاشرہ کو فروغ دیا جائے اور بچوں کا رہن سہن اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کا نمائندہ ہو، افسوس کہ مسلمانوں کے زیر انتظام بعض اسکولوں میں بھی طلبہ اور طالبات کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت ''گڈ مارننگ'' Good Morning گڈ آفٹرنون Good Afternoon گڈ ایوینگ Good evening، کہا کریں، ظاہر ہے کہ یہ ملاقات کا غیر اسلامی طور وطریق ہے، اسلام سے پہلے عربوں میں سلام وملاقات کے لیے اس قسم کے فقرے تھے: ''انعم اللہ بک عینا'' (اللہ تمہاری آنکھ کو ٹھنڈی رکھے) اور ''انعم صباحا'' (تمہاری صبح بخیر ہو) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے بجائے ملاقات کے وقت کہا جائے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ یعنی تم کو اللہ تعالیٰ دین ودنیا کے تمام نقصانات سے محفوظ رکھے اور تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں یہ نہایت جامع دعاء ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس سے بہتر اور کوئی دعاء نہیں دے سکتا، ہماری درس گاہوں میں بچوں کو اس طرزِ ملاقات کا عادی بنایا جائے کہ اس سے ہماری شناخت اور پہچان بھی متعلق ہے۔

اسی طرح یونیفارم کا مسئلہ ہے، یونیفارم ایسا ہونا چاہیے، جو شریعت کے دائرہ میں ہو، آج کل بہت سے مسلمان اسکولوں میں بھی لڑکیوں کو ''اسکارف'' کے استعمال سے منع کیا

جاتا ہے، ایسی قمیص پہننے کو کہا جاتا ہے جس میں بازو کھلے ہوئے ہوں، بعض اسکولوں میں پائجامہ کے بجائے لڑکیاں ''اسکرٹ'' پہنتی ہیں، قریب البلوغ اور بالغ لڑکیاں ہیں؛ لیکن ان کے بال کھلے ہوئے، بازو کھلے ہوئے، ٹانگیں کھلی ہوئیں، کپڑا چست، ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف اسلام بلکہ شرافتِ انسانی کے بھی مغائر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت سراپا پردہ ہے: ''المرأة عورة'' ایسے کپڑے جس سے جسم کی رنگت چھلکتی ہو، جن سے اعضا کا نشیب وفراز نظر آتا ہو اور جسم کی ساخت نمایاں ہوتی ہو، قطعاً جائز نہیں ہے، اور نفسیاتی اعتبار سے بھی ایسے یونیفارم مقرر کرنا نقصان دہ ہی ہے، جس ماحول میں اس طرح بے حجاب لڑکیاں چلتی اور رہتی ہوں، آنکھوں سے آنکھیں ٹکراتی ہوں، کھلے ہوئے بازو اور ٹانگوں پر نگاہ پڑتی ہو، تو ضرور ہے کہ یہ چیز لڑکوں کی ذہنی یکسوئی میں خلل انداز ہوگی، دل میں وساوس پیدا ہوں گے اور ذہن میں ہیجان کی لہریں اُٹھیں گی، ایسا طالب علم کیوں کر اپنے سبق اور استاذ کے لکچر کی طرف متوجہ رہ سکتا ہے؟ اور جب توجہ اور یکسوئی باقی نہ رہے، تو کیسے وہ کتاب کے مضامین کو حل کر سکے گا؟ لڑکیوں کو اس کی وجہ سے دو چیزوں میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک تو یہی نفسیاتی اُلجھن لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہوگی، دوسرے ایسے لباس کی وجہ سے ان کو اوباش اور آوارہ لڑکوں کی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، فقرہ بازی، چھیڑ چھاڑ، مسلسل نظر بازی کے نتیجہ میں لڑکیاں ذھنی تناؤ سے دوچار رہتی ہیں اور درس گاہ میں آتے جاتے اور اُٹھتے بیٹھتے یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کچھ اوباش نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی ہیں، ظاہر ہے ایسے خوف اور ذہنی تناؤ کے ماحول میں کیسے ان کو ذہنی یکسوئی حاصل ہوسکتی ہے؟

اس لیے یونیفارم میں اسلامی اور اخلاقی قدروں کا لحاظ ہونا چاہیے، شرٹ، پتلون اسکارف اور بالغ لڑکیوں کے لیے نقاب تاکہ جسم ڈھکا چھپا رہے، لڑکوں کے لیے بھی دِیدہ زیب؛ لیکن اسلامی وضع قطع کا نمائندہ لباس ہو، بعض پڑوسی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ پٹھانی سوٹ اسکول کا یونیفارم متعین کیا گیا ہے، یہ خوب صورت بھی ہے، ڈھیلا ڈھالا ہونے کی بنا پر طبّی نقطۂ نظر سے صحت کے لیے مفید بھی اور پوری طرح ساتر بھی، اگر مسلمان انتظامیہ اسکولوں

میں ایسے یونیفارم مقرر کرے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا جسم کی نمائش اور غیر ساتر لباس سے طالب علم کی ذہنی وفکری قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے؟ کیا انسان کی قوت حفظ اور ذکاوت میں بھی اس کو کچھ دخل ہے؟ اور علم وفن کی تاریخ میں جو ممتاز شخصیتیں گذری ہیں، وہ اس قسم کے یونیفارم پہن کر ہی علمی اور قلمی کام کیا کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، یہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں احساسِ کمتری اور فکری ہزیمت کا آئینہ دار ہے!

اسی سے متعلق دوسری اہم چیز لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ تعلیمی نظام کا ہے، بدقسمتی سے اس وقت مخلوط تعلیم ''کو ایجوکیشن'' کا فیشن سا ہو گیا ہے، فخر یہ تشہیر کی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں ''کو ایجوکیشن'' (Co_Education) ہے، یہ سراسر نادانی ہے اور نہ صرف اسلام سے دوری؛ بلکہ تعلیمی نفسیات سے ناواقفیت اور ناآگہی بھی ہے، تعلیم وتعلّم کے وقت استاد اور طالب علم کا ذہن پوری طرح ان مضامین پر مرتکز ہونا چاہیے، جو اس وقت ان کے سمجھنے اور سمجھانے کا موضوع ہے، درس گاہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہیے جو توجہ کو بانٹنے والی ہو کہ یہ تعلیم کے لیے سم قاتل ہے، سبق کی حیثیت ایک زنجیر مسلسل کی ہے، اگر بیچ سے ایک کڑی بھی غائب ہوگئی، تو پورا سبق ضائع ہو جائے گا۔

اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ہی ماحول میں لڑکوں اور لڑکیوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے کشش کا باعث ہے، ایک ہی جگہ ان دونوں کا موجود رہنا اور نگاہوں کا ٹکرانا یقیناً ذہن کو متأثر کرے گا، توجہ کو بانٹے گا اور مدرّس کی طرف تسلسل کے ساتھ توجہ برقرار رکھنی دشوار ہو جائے گی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے نمازیوں کے سامنے سے گزرنے کو منع فرمایا اور اس کو ''قاطع صلاۃ'' قرار دیا، یعنی یہ نمازیوں کی توجہ کو بانٹنے والی چیز ہے، سماج میں بڑھتے ہوئے موجودہ اخلاقی بحران؛ بلکہ اخلاقی انارکی کے پس منظر میں جداگانہ نظام تعلیم ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور اگر مسلمان بھی اس جانب توجہ نہ کریں، جو شرم وحیا اور عفت وعصمت کے علم بردار ہیں، تو کن سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے؟

مسلمانوں کے زیرِ انتظام عصری مدارس کی ایک بڑی ضرورت نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین کو شامل کرنا ہے، جو مسلمان طلبہ اور طالبات کو اسلام کے بارے میں واقفیت بھی فراہم کریں اور ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائیں، محض چند دُعاؤں کا یاد دِلا دینا کافی نہیں؛ بلکہ توحید، شرک، رسالت، عبادات، معاشرتی زندگی اور معاملات کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں، سیرتِ نبوی اور اسلامی تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کے متعلق وہ حقائق سے آگاہ ہوں، ہندوستان کی حقیقی تاریخ کہ مسلمانوں نے اس ملک کو کیا کچھ دیا؟ پڑھائی جائے، بابر، غزنوی وغوری اور حضرت اورنگ زیب عالم گیرؒ وغیرہ مسلم حکمرانوں کے بارے میں جو پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں، ان کی حقیقت سمجھائی جائے؛ تاکہ آج ازسرنو تاریخ لکھنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس کے زہر سے مسلم نوجوانوں کے ذہن کو محفوظ رکھا جاسکے، ان موضوعات پر بہت سی تحریریں موجود ہیں اور اگر ضرورت پڑے، تو اس نقطۂ نظر سے کچھ کتابیں مدوّن کی جائیں، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے جن جماعتوں میں بورڈ کا امتحان دینا ہوتا ہے، ان جماعتوں کو چھوڑ کر اگر دوسری کلاسز میں ایسی کتابیں رکھی جائیں، تو شاید اس میں کوئی دقت نہ ہو۔

ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ تعلیم جو خدمت خلق کا ذریعہ تھی، آج وہ سب سے بڑی تجارت ہے، عیسائی مشنریز تو اس تجارت سے لوگوں کا مذہب خریدتی ہیں اور اپنے دین کی تبلیغ کرتی ہیں؛ لیکن مسلمان انتظامیہ اس تجارت کو زیادہ تر اپنے شخصی مفاد اور زیادہ سے زیادہ حصولِ دولت کے لیے استعمال کرتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات تو غریب مسلمانوں کو اس حوصلہ افزا مشورہ سے بھی سرفراز فرمایا جاتا ہے کہ ”پڑھانا ہی کیا ضروری ہے، رکشہ چلوالو“ اگر ہماری درس گاہوں کا مقصد صرف مرفہ الحال مسلمانوں سے پیسے وصول کرنا اور ان کے بچوں کو پڑھانا ہے، تو یقیناً یہ ادارے بے فیض ہیں، اور یہ مقصد تو غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی درس گاہوں سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ معقول داخلہ فیس اور تعلیمی فیس لینے کے باوجود ان اسکولوں میں

عام طور پر اساتذہ کی تنخواہیں بہت قلیل ہوتی ہیں اور قلیل تنخواہ ہی کی نسبت سے ان اساتذہ کی صلاحیت اور استعداد بھی ہوتی ہے، تنخواہ کی کمی اساتذہ کے لیے بے اطمینانی کا باعث ہوتی ہے؛ اس لیے وہ بھی دوسری جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ شاید یہ ان کی تنخواہ میں کسی قدر اضافہ کا باعث ہو سکے، اس بے اطمینانی کی وجہ سے بار بار اساتذہ تبدیل ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ بار بار اساتذہ کی تبدیلی تعلیم کے لیے نہایت نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ تعلیم کے لیے طالب علم اور مدرّس کے درمیان ذہنی مناسبت اور مناسبت سے بڑھ کر موانست ضروری ہے، ہر شخص کی تفہیم کا انداز الگ الگ ہوتا ہے، زبان اور لب ولہجہ میں بھی فرق ہوتا ہے، ہفتہ عشرہ تو طالب علم کو اساتذہ سے مناسبت پیدا ہونے میں لگ جاتا ہے اور اساتذہ کے لیے طلبہ کی انفرادی صلاحیت اور مزاج کو پہچاننے میں تو اس سے بھی زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، اس کے بعد ہی حقیقی طور پر استاذ اور طالب علم کا تعلیمی رشتہ استوار ہوتا ہے، اگر مدرّس بار بار تبدیل ہو یا خود مضامین ایک مدرّس سے دوسرے مدرّس کی طرف منتقل ہوتے رہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھا خاصا وقت ایک دوسرے سے ارتباط ہی میں چلا جائے گا۔

مسلمان انتظامیہ کا انسانی، اسلامی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ تعلیمی اخراجات کو ایسا مناسب اور متوازن رکھیں کہ غریب مسلمان خاندان کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کر سکیں اور ''نہ نفع نہ نقصان'' یا ''اقل ترین نفع'' کی بنیاد پر ادارے چلائے جائیں، جبھی ہم غریب اور پس ماندہ مسلمانوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکیں گے یا کم سے کم اتنا کیا جائے کہ ہر طالب علم کی فیس میں کچھ حصہ (Poorfund) مان کر چلیں، مثلاً اگر ہم ایک ہزار داخلہ فیس لیتے ہیں، تو نو سو داخلہ فیس اور ایک سو ''غرباء کا فنڈ'' تصور کریں اور ہر دس طالب علم پر ایک غریب طالب علم کا مفت داخلہ لیں، اس طرح کم سے کم دس فی صد داخلے غریب بچوں کے بھی ہو سکیں گے۔

موجودہ حالات میں ایک اہم مسئلہ اردو زبان کی تعلیم کا بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اردو واحد زبان ہے جس کو مسلمانوں نے وجود بخشا ہے، اس زبان میں تقریباً ۷۵ فی صد الفاظ عربی اور فارسی ہیں، خود قرآن مجید کے الفاظ بہ کثرت اس زبان میں داخل ہیں، اسلامی

اصطلاحات اور محاورات جس قدر اردو زبان میں پائے جاتے ہیں، عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جو اسلامی تعبیرات سے اس قدر مالا مال ہو، ایک غیر مسلم بھی جب اردو زبان میں لکھتا اور بولتا ہے، تو ''ماشاء اللہ، الحمدللہ'' اور ''سبحان اللہ'' وغیرہ الفاظ اسے بھی بولنے اور لکھنے پڑتے ہیں۔

پھر اردو زبان میں اسلامی علوم کا سرمایہ اتنی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے کہ سوائے عربی زبان کے کوئی زبان نہیں جو اتنی مال دار اور صاحبِ ثروت ہو، تفسیر، قرآن وحدیث کے ترجمے، مسنون حدیث کی شرحیں، فقہ اور فقہی کتابوں کے ترجمے، سیرت، اسلامی تاریخ، غرض تمام ہی اسلامی علوم پر اردو زبان میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو چکا ہے، ایک زمانہ میں عربی کے بعد سب سے زیادہ اسلامی لٹریچر فارسی زبان میں تھا؛ لیکن اب اردو نے فارسی پر سبقت حاصل کرلی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے، جو آج ایشیاء سے لے کر امریکہ تک اپنا مقام بنا چکی ہے، برصغیر آبادی کے اعتبار سے دنیا کا نہایت ہی گنجان علاقہ ہے، برصغیر کے اکثر علاقوں میں اردو زبان سمجھی جاتی ہے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ساٹھ کروڑ مسلمان بستے ہیں، ان میں پچاس کروڑ لوگ وہ ہیں جو اردو سمجھتے ہیں اور کم سے کم چالیس کروڑ وہ ہیں، جو اردو بولتے اور پڑھتے ہیں، یہ ایک بہت وسیع حلقہ ہے، اگر پوری دنیا میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد پچاس کروڑ ہی مان لی جائے، تو اردو بولنے والے کا تناسب بین الاقوامی زبانوں میں نہایت نمایاں ہے۔

اگر ہمارے بچے (جو عربی اور فارسی زبان سے بھی واقف نہیں) اردو زبان سے بھی نابلد رہ جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی عظیم اسلامی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے، اسلامی لٹریچر سے ان کا رابطہ کٹ کر رہ جائے گا اور اپنے سلفِ صالحین اور بزرگوں سے ان کا رشتہ منقطع ہو جائے گا، اسلام کے بارے میں یا تو ان کو کوئی واقفیت اور آگہی نہیں رہے گی، یا وہ اپنی معلومات کے لیے ان لوگوں کی تحریروں اور کتابوں پر انحصار کریں گے جو حقیقت

میں اسلام کے معاند ہیں اور جن سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے اوراس سے چشم پوشی برتنا آنے والی نسلوں سے محرومی کو گوارا کرنے کے مترادف ہے، یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جو لوگ اردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں، دین دار ہیں، دینی علوم سے وابستہ ہیں، اردو زبان کی روٹی کھاتے ہیں، اردو میں وعظ وتقریر اور شعروسخن ان کا امتیاز ہے، خود ان کے بچے اردو کو ''اچھوت'' سمجھتے ہیں، اس لیے ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ معیاری اسکول قائم کیے جائیں؛ لیکن اگر اپنے اندر اتنی جرأت نہ پاتے ہوں، تو خواہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو، ثانوی زبان ہی کی حیثیت سے کم سے کم اردو کو داخل نصاب کریں، اس کے لیے اچھے تربیت یافتہ اساتذہ رکھیں اور اس کو پوری اہمیت دیتے ہوئے پڑھائیں، یہ موجودہ حالات میں آئندہ نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور مسلمان بچوں کا اسلام سے رشتہ استوار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

عصری درس گاہوں کے طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی میں دینی مدارس بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، اگر دینی مدارس ابتدائی مرحلہ میں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک سرکاری نصاب کے ساتھ اسلامیات اور قرآن مجید پڑھ لیں، دو پارے حفظ کر لیں، سیرت اور دینیات کی کچھ کتابیں پڑھ لیں، نیز اسلامی عقائد اور تاریخ پر بھی کوئی کتاب ان کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھا دی جائے اور تربیت کا اسلامی ماحول ان کو دیا جائے، تو یہ نہایت ہی مبارک اور نافع قدم ہوگا، اس طرح بہت سے وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں اور اس ذہنی ارتداد سے نالاں ہیں جو اس وقت مشنری اسکولوں کی عام بیماری ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے، بچوں کا اگر ابتدائی مرحلہ میں اسلامی ذہن بنا دیا جائے اور ان کی صحیح تربیت ہو جائے، تو پھر جو بھی پڑھیں اور بنیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے بنیں گے اور ان شاء اللہ ان کو کوئی طاقت ''سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور طارق فتح'' بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور خود ان دینی مدارس کے لیے بھی یہ نہایت مفید اور نتیجہ

خیز قدم ہوگا، ان مدارس کے فضلاء کے بارے میں جو شکایت ہے کہ یہ عصری معلومات سے بے خبر ہیں اور اپنے ماحول کے بارے میں بھی کوئی آگہی نہیں رکھتے، یہ شکایت بھی ان شاء اللہ دور ہو جائے گی اور مدرسہ کی چہار دیواری سے نکلنے کے بعد اپنے آپ کو ماحول میں اجنبی اور نو وارد محسوس نہیں کریں گے۔

عصری تعلیم؛ اسلامی نقطۂ نظر

آج کل ہم مسلمانوں میں بھی تعلیم کی نسبت سے دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کی اصطلاح قائم ہوگئی ہے، قرآن وحدیث کی تعلیم کو دینی تعلیم تصور کیا جاتا ہے اور عصری علوم کے سیکھنے سکھانے کو دنیوی تعلیم کہا جاتا ہے؛ حالاں کہ اسلام نے علم کی ایسی کوئی تقسیم نہیں کی ہے؛ بلکہ علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں ''علم نافع'' اور ''علم غیر نافع'' جو علم انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہو وہ ''علم نافع'' ہے اور جو علم انسانیت کے لیے نافع ہونے کے بجائے نقصان رساں ہو اور تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہو وہ ''علم غیر نافع'' ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعا مانگی ہے اور علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے۔

میڈیکل تعلیم ہو، انجینئرنگ کا فن ہو یا تکنیکی تعلیم کے دوسرے شعبے ہوں، یہ جب انسانی خدمت اور انسانیت کی فلاح وبہود کے ذرائع ہیں اور یقیناً یہ علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، ان کا حاصل کرنا قابل تعریف ہے نہ کہ لائق مذمت، اسی لیے امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں، ایک علم فقہ تاکہ آدمی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھے، دوسرے فن طبابت تاکہ جسم انسانی کی بابت معلومات حاصل ہوسکے: ''**العلم علمان: علم الفقه للاديان، وعلم الطب للابدان**'' (مفتاح السعادۃ، ص:۲۰۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ریاضی اور بعض اور فنون کا بھی ذکر کیا ہے۔ (حوالہ سابق)

اسلام نہ کسی علم کا مخالف ہے اور نہ کسی زبان کا، قرآن مجید نے کتنے ہی ایسے حقائق پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق فلکیات، طبعیات، نباتات اور حیوانات کے علوم سے ہے، خود انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات، اس کی مرحلہ وار پیدائش اور اس کی نفسیات کا بھی بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، گزشتہ اقوام کے قصص و واقعات ذکر کیے گئے ہیں، ان کی آبادی اور ان پر ہونے والے عذابِ خداوندی کے محل وقوع کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور پھر ان تمام چیزوں میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تدبر ان علوم کی تحصیل کے بغیر کیوں کر ممکن ہوگا اور ان کو حاصل کیے بغیر کیسے ان میں تفکر کا حق ادا کیا جاسکتا ہے؟

پس ان علوم کو حاصل کرنا جن سے کائنات کے اسرار و رموز کو جانا جاسکے، قرآن مجید کا عین مطلوب ہے، چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں دوسری اقوام سے جو جدید تکنیک حاصل ہوسکتی تھی، اس میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور اس کو کبھی تقاضۂ دین کے منافی تصور نہیں فرمایا۔ مدینہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے اور اسلام سے پہلے کھجور کے نر اور مادہ درخت میں اختلاط کی ایک خاص صورت اختیار کرتے تھے، جس کو ''تابیر'' کہا جاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اسے بے فائدہ اور فضول عمل تصور کرتے ہوئے اس سے منع فرما دیا؛ لیکن جب اس سال پیداوار کم ہوئی اور لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور آئندہ ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ تم اپنے دنیا کے اُمور کے بارے میں زیادہ واقف ہو''انتم اعلم بامور دنیاکم۔'' (مسند احمد: ۱۲۳۶)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض غزوات میں ''منجنیق'' کا استعمال فرمایا، یہ گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس کے ذریعہ پتھر کی چٹانیں دور سے دشمن کے قلعوں اور فصیلوں پر پھینکی جاسکتی تھیں، فتح مکہ کے بعد جب بنوثقیف پر فوج کشی کی تو بنوثقیف کی ماہرانہ تیراندازی نے مجاہدین کو بڑی دشواری میں ڈال دیا، اس موقعہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گاڑیاں بنوائیں، جس پر اوپر چمڑے کا غلاف ڈالا گیا؛ تاکہ دشمن کے تیر چمڑے میں پھنس کر رہ جائیں اور مجاہدین قلعہ کی فصیل تک پہنچ سکیں، غزوۂ خندق کا واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ کی پشت پر پہاڑیوں کو رکھتے ہوئے آگے کی سمت طویل و عریض خندق کھدوائی، یہ عربوں کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا اور اس حسن تدبیر کے نتیجہ میں اعدائے اسلام کی متحدہ قوت (جو تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل تھی) خاسرو ناکام واپس ہوئی اور اسلام کا ایسا رعب قائم ہوا کہ پھر کبھی اہل مکہ کو مدینہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسی لیے اسلامی عہد میں قدیم سائنسی علوم کو نہ صرف قبول کیا گیا؛ بلکہ ان علوم کا

ترجمہ اور ان پر مزید ریسرچ اور تحقیق کو جاری رکھنے کے لیے دارالخلافہ بغداد میں ''بیت الحکمت'' کا قیام عمل میں آیا اور مسلمان سائنس دانوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ علم و فن کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نا تمام رہے گی، چناں چہ خود منصف مزاج اور حقیقت پسند مغربی مصنفین نے بھی مسلمانوں کے اس علمی اور تحقیقی کارنامہ کا اعتراف کیا ہے اور اسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

یہی حال لغت اور زبان کا ہے، زبان کوئی بھی اچھی اور بری نہیں ہوتی، زبان تو محض ذریعہ اظہار ہے، اگر اس کا استعمال خیر اور نیکی کی تبلیغ واشاعت کے لیے ہو تو قابل تعریف اور لائق ستائش ہے اور زبان خواہ کوئی بھی ہو، اگر اس کو برائی کی دعوت واشاعت کا وسیلہ بنالیا گیا تو اس سے زیادہ نامبارک بات کوئی نہیں ہوسکتی، عربی زبان، قرآن وحدیث کی زبان ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی اہل جنت کی زبان ہوگی، لیکن اسی زبان میں بعض ایسی اسلام دشمن اور اخلاق دشمن تحریریں وجود میں آئیں کہ جن سے شاید شیطان کو بھی شرم آتی ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں انہیں کی زبان میں اپنا کلام نازل فرمایا ہے، تو نہ معلوم کتنی زبانیں ہیں جن کو اللہ کے کلام کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے کسی مسلمان کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی زبان کو بحیثیت زبان برا تصور کرے اور ان کے سیکھے سکھانے کو بددینی اور گمراہی سمجھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ذہین رفیق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو باضابطہ عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تھی، جسے بہت کم عرصہ میں انہوں نے سیکھا اور اس زبان کے سمجھنے اور سمجھانے کے لائق ہوئے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ چھ زبانوں سے واقف تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارسی زبان سے واقف تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر فارسی میں بھی گفتگو کر لیتے تھے۔

نہ جانے کہاں یہ یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ علماء جدید علوم اور انگریزی زبان کے حاصل کرنے کو منع کرتے ہیں یا یہ کہ کسی زمانہ میں انہوں نے اس سے منع کیا تھا، یہ محض غلط فہمی؛ بلکہ بہت بڑا مغالطہ ہے، علماء نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جب دیو بند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی تو سنسکرت زبان کو بھی داخل نصاب فرمایا، سنسکرت زبان میں مشرکانہ محاورات وتعبیرات زیادہ ہیں، یہ بات کیوں کر سوچی جاسکتی ہے کہ مولانا نانوتویؒ سنسکرت زبان کے مخالف نہ ہوں اور انگریزی زبان کے مخالف ہوں، دیو بند کے نصاب میں شروع ہی سے انگریزی جیومیٹری اور فلسفہ داخل نصاب رہا۔

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری عصری درس گاہ جامعہ ملیہ ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ نے اس کی بنیاد رکھی اس کے افتتاح میں نہایت بلیغ خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اور اس یونی ورسٹی کے قیام کی ستائش کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اسی نقطۂ نظر کے تحت پڑی کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کا بھی ایک متوازن حصہ شریک نصاب رکھا جائے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو انگریزی زبان کے حصول کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، مولانا نانوتویؒ کی جب ایک انگریز سے اسلام کے بارے میں ترجمان کے واسطے سے گفتگو ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو آپ کو اس پر بڑا افسوس ہوا اور اس وقت آپ نے اس ضرورت کا احساس فرمایا کہ فی زمانہ علماء اور مبلغین اسلام کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان اور عصری علوم کی مخالفت نہیں کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں بعض ایسی شخصیتیں عصری تعلیم کا جھنڈا لے کر اٹھیں جو اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے تئیں مخلص تھیں؛ لیکن جیسا کہ عام طور پر مفتوح قومیں فاتحین کے سامنے نہ صرف مادی اور فوجی اعتبار سے؛ بلکہ فکری اور ثقافتی اعتبار سے بھی سپر انداز جاتی ہیں اور احساسِ مرعوبیت میں مبتلا ہو کر فاتحین کے افکار اور ان کی تہذیب وثقافت کو رشک وتحسین

کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہیں، اسی طرح انہوں نے بھی مغرب سے آنے والی ہر چیز پر لبیک کہنا شروع کیا، علماء کو اس اندازِ فکر سے اختلاف تھا، نہ کہ عصری تعلیم اور اس درس گاہ سے، جہاں تک ان مدارس کی بات ہے جہاں خالص اسلامی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں تو وہاں پوری طرح عصری علوم کو شامل نصاب کرنا طلبہ کو بیک وقت دونوں علوم سے محروم کردینے کے مترادف ہوگا، اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اسلامی علوم وفنون کی کم از کم تعداد چودہ پندرہ تو ہے ہی، پھر ان میں سے ہر فن کی مختلف اور متعدد شاخیں ہیں، ان سب کا حق ادا کرتے ہوئے عصری علوم کو بھی بہ کمال وتمام شامل نصاب رکھنا عملاً ایک ناممکن امر ہے، اسی لیے ان مدارس کے نصاب میں عصری علوم کا حصہ کم رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علماء اور دینی جامعات عصری تعلیم کی مخالف ہیں۔

اس وقت اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلمان اعلیٰ فنی تعلیم کی طرف توجہ دیں اور کوشش کریں کہ ہمارے سماج میں کوئی بچہ تعلیم سے محروم رہنے نہ پائے، تعلیمی سروے سے یہ بات ظاہر ہے کہ پرائمری سے ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مسلمان بچوں کی بڑی تعداد تعلیم چھوڑ دیتی ہے، کالج تک جو تعداد پہنچ پاتی ہے ان کا تناسب اور بھی کم ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امتحان تک ان کا تناسب ناقابل شمار حد تک کم ہوجاتا ہے، یقیناً ان میں سے بہت سے بچے ذہین وذکی ہوتے ہوں گے اور محض اقتصادی حالات کی وجہ سے انہیں ترکِ تعلیم کرنا پڑتا ہوگا، آپ ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر میں چلے جائیں اور ہوٹلوں میں معمولی درجہ کا کام کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھیں، ان میں اکثریت مسلمان بچوں کی ہوگی، ان کی آنکھوں میں ذہانت جھانکتی ہوگی اور ان کی پیشانیوں پر فراست کی چمک ہوگی؛ لیکن معاشی حالات نے ان کے پاؤں تھام لیے ہیں اور وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ برتن دھوکر اور جھاڑو دے کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھریں۔

بدقسمتی سے جو ادارے اقلیتوں کی طرف منسوب ہیں اور ان کو مسلم ادارہ سمجھا جاتا ہے وہ عام طور پر تعلیم کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسی ''تجارت'' کا تصور رکھتے

ہیں جو کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد نفع حاصل کرنے کے اصول پر مبنی ہے، غریبوں پر ان اداروں کا دروازہ بند ہے اور انہیں لوگوں کے لیے یہاں حصولِ تعلیم کی گنجائش ہے جو خطیر اور کثیر رقم خرچ کر کے غیر اقلیتی اداروں میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، کاش! قوم کا ہر فرد پوری امت کو ایک خاندان اور ایک کنبہ تصور کرنے کو تیار ہو، قوم کے بچوں کی جہالت اور تعلیم سے محرومی ان کو اسی طرح بے چین کر دے، جیسے خود اپنے بچوں کی جہالت اور آج کے ''تاجرانِ علم'' اس بات کا احساس کریں کہ تعلیم ایک عبادت نہ کہ تجارت!

نصابِ تعلیم میں اخلاقیات کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن اوصاف وامتیازات سے نوازا ہے، ان میں دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک: علم، دوسرے: اخلاق، علم کا تعلق دماغ سے ہے اور اخلاق کا تعلق دل سے، علم کے معنی جاننے کے ہیں، یہ جاننا کبھی اپنے آپ ہوتا ہے، اس کے لیے نہ واسطے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ محنت کی، جیسے ایک شخص کے سر میں درد ہو، اسے اپنے آپ اس تکلیف کا ادراک ہو جاتا ہے، کبھی علم کسی واسطہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے؛ لیکن اس میں انسان کو محنت کرنی نہیں پڑتی، جیسے صبح کا سورج طلوع ہوا، سنہری دھوپ کائنات کے نشیب وفراز پر چھا گئی، اور ہر دیکھنے والے نے جان لیا کہ یہ دن کا وقت ہے، کسی جانے پہچانے شخص کو دیکھا اور فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ فلاں شخص ہے، یہ بھی علم کے حاصل ہونے ہی کی صورتیں ہیں؛ لیکن ان میں کوئی محنت ہے نہ مشقت اور نہ فکری تگ ودو کی ضرورت ہے، اس لیے یہ علم اور واقفیت تو ہے؛ لیکن اسے تعلیم نہیں کہا جاتا۔

علم کی ایک اور صورت یہ ہے کہ انسان کو کسی واسطہ سے بات معلوم ہو، اور اس بات تک رسائی کے لیے محنت بھی کرنی پڑے، اس کو ''تعلیم وتعلّم'' کہتے ہیں، یہ صرف جاننا نہیں ہے؛ بلکہ جانکاری حاصل کرنا ہے، جو باتیں معلوم ہیں، ان کے ذریعہ نامعلوم باتوں تک اور جانی ہوئی حقیقتوں کے ذریعہ انجانی حقیقتوں تک پہنچنا علم کا وہ اعلیٰ مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے؛ اسی لیے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو ان کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا اور خود حق تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا'' (البقرۃ: ۳۱) تعلیم ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ دور رس انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ انسان کے اندر فکری انقلاب لانے کے لیے اسی ہتھیار کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

عربی زبان میں ''خلق'' کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو جہاں وہ ایک ظاہری شکل وصورت لے کر آتا ہے، وہیں کچھ باطنی صفات بھی اس کے اندر

موجود ہوتی ہیں، ظاہری شکل وصورت بالکل واضح ہوتی ہے، اس کا رنگ وروپ، ناک نقشہ، چہرہ مہرہ اور ہاتھ پاؤں، وغیرہ، جنہیں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے اور اگر ان میں کوئی کمی محسوس کی جائے تو ڈاکٹروں کے ذریعہ علاج بھی ہوتا ہے، اس کو ''خَلق'' یعنی جسمانی ہئیت وشکل کہتے ہیں، انسان کی باطنی اور اندرونی صفات آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہیں، تواضع یا کبر، غصہ یا بردباری، محبت یا نفرت، ایثار یا خودغرضی وغیرہ، ان کو ''خُلق'' یعنی اخلاق کہتے ہیں، جیسے جسم کی ظاہری بیماریوں کا علاج ہوا کرتا ہے، اسی طرح اخلاقی بیماریاں بھی لاعلاج مرض نہیں ہیں، یہ بھی قابلِ علاج ہیں، اللہ کے پیغمبروں اور رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اخلاقی امراض اور روحانی بیماریوں کا علاج ہوسکے۔

اخلاق کو سنوارنے اور قلب وروح کو بیماریوں سے شفایاب کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ''تعلیم'' بھی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تزکیۂ اخلاق، آیاتِ قرآنی کی تلاوت اور کتاب وحکمت کی تعلیم کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے ذکر فرمایا ہے **یَتلُوا عَلَیھِم اٰیٰتِہ وَیُزَکِّیھِم وَیُعَلِّمُھُم الکِتٰبَ وَالحِکمَۃَ** (آل عمران:۱۶۴) — انسان کے اندر خیر اور شر دونوں کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، بھلائی کا جذبہ بھی اس کے اندر پنہاں ہے اور برائی کی خواہش بھی اس کے اندر کروٹ لیتی رہتی ہے، انسان کی پوری زندگی اسی کش مکش میں گذرتی ہے اور وہ اس امتحان میں جس درجہ کامیابی حاصل کرتا ہے، یا ناکامی سے دوچار ہوتا ہے، اسی لحاظ سے وہ آخرت میں جزا یا سزا کا مستحق ہوگا۔

تعلیم انسان کو نیکی اور بدی کی اس کش مکش میں نیکی پر راغب اور بدی پر فتح یاب کرتی ہے، پھر جب انسان کے اندر اچھے اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے علم کو بہتر طور پر استعمال کرتا ہے، پس علم کے ساتھ اخلاق ضروری ہے، اچھی تعلیم انسان کو اچھے اخلاق کی طرف لے جاتی ہے اور اخلاق کی وجہ سے انسان کا علم حقیقی معنوں میں نافع بنتا ہے، جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے ''**اللھم اسئلک علما نافعا**'' (ابن ماجہ: **کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب ما یقال بعد التسلیم**، حدیث نمبر: ۹۲۵) اگر علم کے ساتھ اخلاق نہ ہو تو

اکثر اوقات اچھا سے اچھا علم انسان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے انسانیت کے لیے نقصان اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، اس کی واضح مثال جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ وجود میں آنے والی چیزیں ہیں، انسان نے ایٹم کو دریافت کیا اور ایٹمی طاقت تک رسائی حاصل کی، اگر انسان اپنی صلاحیت کا استعمال اچھے مقاصد کے لیے کرتا تو آج پوری دنیا میں شہر سے لے کر دیہات تک کوئی گھر روشنی سے محروم نہیں ہوتا، ہر گھر میں بجلی کی وافر سہولت مہیا ہوتی؛ لیکن ہوا یہ کہ انسان نے اپنی صلاحیت کو ہلاکت خیز اور انسانیت سوز ہتھیاروں کے لیے استعمال کیا اور دنیا میں ناگاساکی اور ہیروشیما جیسے حادثات پیش آئے کہ انسان اس پر جس قدر آنسو بہائے کم ہے، ذرائعِ ابلاغ میں غیر معمولی ترقی ہوئی، ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل نے انسان کے لیے یہ ممکن بنادیا کہ وہ لمحوں میں اپنی بات ہزاروں میل دور تک پہنچا دے، وہاں کے حالات کو سر کی آنکھوں سے دیکھے، ان ذرائع کو بہترین دینی اور دنیوی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، سماج تک اخلاق و محبت کا پیغام پہنچایا جاسکتا ہے، تعلیم کو عام کیا جاسکتا ہے، دور دراز علاقوں سے معلومات کا تبادلہ ہوسکتا ہے، تجارت اور کاروبار کو فروغ دیا جاسکتا ہے، مظلوموں تک اپنی مدد پہنچائی جاسکتی ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان مقاصد کے لیے بھی ان وسائل کا استعمال کیا جارہا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معاشرہ میں بے حیائی اور عریانیت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے، جرائم کی جو کثرت ہوئی ہے، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کی جو کوشش ہوئی ہے، ان میں بھی ان ذرائعِ ابلاغ کا بہت بڑا رول ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جیسے جیسے تعلیم کی روشنی پہنچتی، ویسے ویسے جرائم کم ہوتے اور برائیاں مٹتی چلی جاتیں؛ لیکن عملی صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے، حقیقت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ مجرمین کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے، ۱۶/دسمبر ۲۰۱۲ء کو دہلی میں زنا بالجبر کا جو تکلیف دہ واقعہ پیش آیا، اس میں جرم کا ارتکاب کرنے والے کالج کے طلبہ ہی تھے، اس کے بعد سے آئے دن اس طرح کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں، زیادہ تر واقعات میں ان نوجوانوں کا نام آتا ہے، جو اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں، امریکہ دنیا کا سپر پاور ہے اور نہ صرف

دفاعی قوت اور معاشی بالادستی میں پوری دنیا کے لیے نمونۂ تقلید بنا ہوا ہے؛ بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد میں بھی اسی کی برتری تسلیم شدہ ہے، تعلیمی اعتبار سے بھی امریکہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے؛ یہاں تک کہ بہت سے مسلم ممالک میں جس نئے نظامِ تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے، اسی میں بھی امریکہ کے نقوشِ قدم کو سامنے رکھا گیا ہے۔

لیکن امریکہ میں طلبہ وطالبات کے اندر جرائم کی شرح میں جو روز افزوں اضافہ ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نیشنل کرائم سروے ۲۰۱۲ء کی رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال میں جنسی تشدد اور ہراسانی کے واقعات چھ لاکھ باون ہزار آٹھ سو، چوری کے واقعات تین لاکھ اکہتر ہزار تین سو، تشدد کے واقعات ایک لاکھ سینتیس ہزار تین سو ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنسی تشدد اور ہراسانی کے واقعات میں دو لاکھ بہتر ہزار تین سو معاملات لڑکیوں کی طرف سے پیش آئے ہیں اور یہ اعداد وشمار ان طلبہ وطالبات کے ہیں، جو بارہ سے اٹھارہ سال کے درمیان ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں جرائم کی شرح کس رفتار سے بڑھ رہی ہے، ہندوستان میں غالباً اسکولوں اور یونی ورسٹیوں میں جرائم کی سروے رپورٹ موجود نہیں ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جرائم کی رفتار اس سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے، جو رفتار شرحِ تعلیم میں اضافہ کی ہے، مثلاً ۱۹۵۲ میں قتل کے نو ہزار آٹھ سو دو اور اغواء کے پانچ ہزار دو سو اکسٹھ واقعات پیش آئے اور ۲۰۰۶ء میں قتل کے بتیس ہزار چار سو اکیاسی اور اغواء کے تیس ہزار نو سو اکیانوے واقعات پیش آئے، کم وبیش یہی حال دوسرے جرائم کا ہے، یعنی ملک میں تعلیم کے بڑھنے کی وجہ سے جرائم کم ہونے چاہئیں؛ لیکن جرائم میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے؛ بلکہ بعض برائیاں تو ایسی ہیں جو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی میں پائی جاتی ہیں، جیسے کرپشن، کرپشن کے نوے فی صد واقعات اعلیٰ سیاسی قائدین، اونچے درجہ کے سرکاری و پرائیویٹ عہدیداران اور صنعت کاروں میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے، شاید انگریز بھی اس ملک سے اتنی دولت سمیٹ کر نہیں لے گئے تھے جتنی رشوت خور سرکاری عہدیداروں نے لوٹ لوٹ کر اپنی تجوریوں اور سوئز

بنکوں میں محفوظ کر رکھی ہے۔

یہ بیماری اس قدر روز افزوں ہے کہ جن شعبوں کو خدمت خلق کا شعبہ سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی اب یہ بیماری سرایت کر چکی ہے، اساتذہ امتحان میں پیسہ لے کر نمبر دیتے ہیں، تعلیمی ماہرین رشوت لے کر اساتذہ کی تقرری کراتے ہیں، ڈاکٹر مریض سے فیس لینے کے علاوہ فارمیسی سے، پیتھالوجسٹ سے اور ہسپتالوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں، بلا وجہ ٹیسٹ لکھتے ہیں، بلا سبب دوائیں تجویز کرتے ہیں اور بلا ضرورت آپریشن کا کیس بناتے ہیں، انجینئرز تعمیری میٹریل کے بارے میں غلط رپورٹ دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں پلوں اور عمارتوں کے گرنے کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں، یہ سب جاہل و ناخواندہ لوگوں کی طرف سے نہیں؛ بلکہ پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے پیش آتا ہے، پس یہ حقیقت ہے کہ کتنا بھی مفید علم ہو، اگر اخلاق سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے تو وہ نافع کے بجائے مضر اور مفید کے بجائے نقصان دہ بن جاتا ہے۔

اسی لیے اسلام کا تصور یہ ہے کہ صرف تعلیم کافی نہیں ہے؛ بلکہ تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو اس میں فرمایا گیا: ''اِقْرَا بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ'' (العلق:۱) یعنی اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے، گویا پڑھنا کافی نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ پڑھائی اللہ کے نام سے جڑی ہوئی ہو؛ کیوں کہ جب پڑھنے والا اپنی تعلیم کو اللہ کے نام سے جوڑے رکھے گا تو خشیت پیدا ہوگی اور وہ اخلاق سے آراستہ ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی دعاء اس طرح فرمائی ہے:

''**اللھم اغننی بالعلم، وزینی بالحلم، واکرمنی بالتقوی، وجملنی بالعافیة**'' (کنز العمال:۱۸۵/۲، حدیث نمبر:۳٦٢٦)

اے اللہ! مجھے علم کی دولت عطا فرمائیے، حلم وبردباری سے آراستہ فرمائیے، تقویٰ کے ذریعہ عزت عطا کیجیے اور عافیت کے ذریعہ میرے حالات کو بہتر رکھیے۔

اس دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی دعاء کے ساتھ ساتھ حلم وبردباری کا

ذکر فرمایا ہے، جو بہتر اخلاق کی بنیاد اور اساس ہے، آپ نے لڑکیوں کو تعلیم دینے کے بارے میں فرمایا کہ باپ اپنی بیٹی کو تعلیم دے اور بہتر تعلیم دے اور ادب و اخلاق سکھائے اور بہتر ادب واخلاق سکھائے: ''**علّمھا فاحسن تعلیمھا و ادّبھا فاحسن تادیبھا**'' (بخاری: کتاب النکاح، باب اتخاذ السراری، حدیث نمبر: ۳۸۰۵) غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصولِ علم کو کافی نہیں سمجھا؛ بلکہ اس کے ساتھ اخلاق کو بھی ضروری قرار دیا؛ کیوں کہ جب علم کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹ جاتا ہے، تو علم جیسی قیمتی شئے کا استعمال صلاح کے بجائے فساد اور بناؤ کے بجائے بگاڑ کے لیے ہونے لگتا ہے۔

یہ بات یقیناً باعث مسرت ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے، قانونی طور پر بھی تعلیم کو ہر بچہ کا بنیادی حق تسلیم کرلیا گیا ہے؛ تعلیمی ترقی کی وجہ سے ہمارے ملک کے ہنرمندوں کو پوری دنیا خراجِ تحسین پیش کرتی ہے؛ لیکن یہ بات اسی قدر افسوس ناک ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم اخلاقی اقدار سے خالی ہوتی جارہی ہے، اس پر حکومت کو بھی توجہ کرنے کی ضروت ہے، پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو بھی اور خاص کر مسلمانوں کے زیرِ انتظام اداروں کو؛ کہ وہ تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے اداروں میں اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کی طرف توجہ دیں، بقولِ شاعر حقیقت شناس اکبر الہ آبادی:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں جھولو
ممکن ہے فضاؤں میں اُڑو، عرش کو چھوو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

طلبہ وطالبات کے لیے ہاسٹل کا انتظام

تعلیم اور تربیت کے درمیان اگرچہ گہرا رشتہ ہے؛ لیکن بہر حال نتیجہ اور اصل کے اعتبار سے ان دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے، تعلیمات کے معنی معلومات فراہم کرنے کے ہیں اور تربیت سے مراد ان کو عملی زندگی میں لانا ہے، تعلیم کے ذریعہ انسان جانتا ہے اور تربیت کے ذریعہ انسان کے اندر ماننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم ذمہ داریوں کا ذکر فرماتے ہوئے تین باتوں کا ذکر کیا ہے: تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ۔ (البقرۃ:۱۲۹) تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت سے تعلیم کے مختلف شعبوں کی طرف اشارہ ہے اور تزکیہ سے تربیت کی طرف اشارہ ہے، یہ دونوں ہی باتیں ضروری ہیں، تعلیم سے محرومی ایمان سے محروم ہونے کے بعد سب سے بڑا نقصان ہے، جو شخص شکل وصورت اور اخلاق وعادات کے اعتبار سے بہتر ہو؛ لیکن علم سے محروم ہو، اس کی مثال اس شخص کی ہے، جو یوں تو خوب صورت اور صحت مند ہو؛ لیکن آنکھوں سے محروم ہو، اور جو شخص تعلیم یافتہ ہو؛ لیکن اس کی تربیت نہیں ہوئی ہو، اس کی مثال اس بینا شخص کی سی ہے، جو ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتا ہو اور ایک خنجر آب دار اس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہو، پہلا شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا اور دوسرا شخص سماج اور معاشرہ کو؛ چناں چہ دن ورات اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ تعلیم سے محروم افراد پسماندگی اور محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور کردار واخلاق سے محروم تعلیم یافتہ شخص پوری قوم کے لیے دردِ سر بن جاتا ہے، اس کا تکبر، اس کی زبان درازی، دوسروں کی حق تلفی اور رشوت کی گرم بازاری پورے سماج کو بے سکون بنا دیتی ہے۔

اسی لیے اسلام نے تعلیم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے، اسلام نے جہاں تعلیم حاصل کرنے اور اپنے نونہالوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے، وہیں خاندان اور سماج کے ذمہ دار لوگوں کو اپنے چھوٹوں کی تربیت کی بھی نہایت تاکید کے ساتھ تلقین کی ہے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنے زیر پرورش لوگوں کو بھی: ’’قوا انفسکم وَاھلِیکم نَاراً‘‘ (التحریم: ٦) صرف نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ فرمایا گیا کہ اپنے اہل وعیال کو بھی نماز کی تاکید کرو: ’’وَأمر اَھلَکَ بِالصّلوٰۃِ‘‘ (طٰہٰ: ۱۳۲) بچوں کی

تربیت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا زیادہ لحاظ تھا کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں اور نماز ترک کریں تو ان کی سرزنش کرو، نیز اس عمر کو پہنچنے کے بعد ان کے بستر الگ الگ کردو۔(**سنن ابوداؤد، باب متی یومر الغلام بالصلاۃ**، حدیث نمبر:۴۹۵) والد کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے خاص طور پر تربیتی پہلو کو ذکر فرمایا اور والد پر اولاد کا یہ حق قرار دیا کہ وہ اپنی اولاد کا اچھا نام رکھے اور اس کو ادب سکھائے:" **فلیحسن اسمه و ادبه.**"(مسند بزار، حدیث نمبر:۴۵۸)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ کسی باپ نے اپنی اولاد کو بہتر تربیت سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دیا:"**ما نحل والد ادباً فضل من ادب حسن**" (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۵۲) اور حضرت جابر بن سمرہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بچے کی تربیت کرے اور اسے ادب سکھائے، یہ ہر دن مسکینوں پر آدھا صاع یعنی صدقۃ الفطر کے مقدار گیہوں صدقہ کرنے سے افضل ہے۔(مسند بزار، حدیث نمبر:۴۲۷۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کی ہر پہلو سے تربیت کرتے تھے، یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی، آپ کے ربیب (سوتیلے بیٹے) عمر بن ابی سلمہ کھانا کھاتے ہوئے اِدھر اُدھر ہاتھ ڈال رہے تھے تو آپ نے فرمایا: **بسم اللہ** پڑھو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔(بخاری، **باب التسمیة علی الطعام الخ**، حدیث نمبر:۵۳۷۶)

اسی طرح آپ بچوں کو اچھی اچھی نصیحتیں فرماتے تھے، ایسی نصیحتیں جو زندگی کے ہر مرحلہ میں کام آئیں اور بچوں اور نوجوانوں کی زندگی کے رخ کو صحیح رکھیں، ایک بار حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں: اللہ کو یاد رکھو تو اللہ تمہیں یاد رکھے گا، اللہ کو یاد کرو گے تو اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے، کوئی چیز مانگنی ہو تو اللہ ہی سے مانگو، مدد چاہیے تو اللہ ہی سے چاہو، تمام لوگ مل کر تم کو فائدہ پہنچانا چاہیں، تب بھی جو فائدہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے وہی پہنچے گا، لوگ کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے، اگر سب مل کر نقصان پہنچانا چاہیں تو جو نقصان اللہ نے مقدر کیا ہے، وہ اس کے سوا کوئی اور نقصان نہیں پہنچا سکتے، سہولت کے وقت اللہ کو یاد رکھو تو دشواری کے وقت اللہ تم کو یاد رکھے گا، جان لو کہ اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہے اور مصیبت کے ساتھ کشادگی اور تنگی

کے ساتھ سہولت ہے۔(ترمذی، عن عبداللہ بن عباسؓ، حدیث نمبر:۲۵۱۶)

چھوٹے بچوں کی تربیت کافی نہیں ہے؛ بلکہ جب بچے بڑے ہو جائیں، تب بھی ان کی تربیت کا خیال کرنا والدین کی ذمہ داری ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح کر دو، اگر والد نے اس سے غفلت برتی اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کے گناہ کا بوجھ اس کے والدین پر بھی ہوگا: "**فان بلغ ولم یزوجه فاصاب اثماً فانما اثمه علی ابیه**" (**شعب الایمان للبیهقی**، حدیث نمبر:۸۲۹۹) اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بچوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ رہتی تھی، آپ نے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے جو شادی کے بعد کی ضروریات پوری کرنے پر قادر ہو تو اس کو شادی کر لینی چاہیے کہ یہ چیز نگاہ کو پست رکھتی ہے اور عزت وآبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنتی ہے، اور جو نکاح کرنے کی گنجائش نہیں رکھتا ہو تو اسے روزے رکھنا چاہیے کہ روزہ اس کے لیے گناہ سے ڈھال بن جائے گا: "**فنه له وجاء**" (**بخاری، کتاب النکاح**، حدیث نمبر:۴۷۷۹)

ایک موقع پر آپ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو! بوڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، تنگ دستی سے پہلے خوش حالی کو، مشغولیت بڑھ جانے سے پہلے فراغت وقت کو۔(مستدرک حاکم، حدیث نمبر:۷۸۴۶) یہ تمام نصیحتیں ہر انسان بالخصوص نوجوانوں کے لیے بڑی اہم ہیں؛ کیوں کہ نوجوان عام طور پر صحت مند بھی ہوتا ہے، کمانے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے خوش حال بھی اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جس طور پر ذمہ داریاں بڑھتی ہیں، اس لحاظ سے اس کو فراغت وقت بھی حاصل ہوتی ہے اور اگر واقعی وہ اس عمر کو سنبھال کر رکھے تو اس جیسا خوش بخت اور سعادت مند کوئی اور نہیں۔

تربیت میں عام طور پر تین عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں: اساتذہ، والدین اور دوست و احباب، استاذ سے اس کے شاگرد صرف ان مضامین ہی کو نہیں پڑھتے جو نصاب کا حصہ ہوتا ہے؛ بلکہ وہ اپنے اساتذہ سے بول چال، اندازِ ملاقات، طریقۂ تخاطب، لباس و پوشاک، یہاں تک کہ ہنسی مذاق سب کچھ سیکھتے ہیں اور پڑھنے والوں پر ان کی گہری چھاپ پڑتی چلی جاتی ہے، مگر افسوس کہ آج

کل اساتذہ پیشہ ورانہ حیثیت میں کام کرتے ہیں، طلبہ ان سے خوبیوں کو حاصل کرنے کے بجائے کمزوریوں کو اخذ کرتے ہیں، کام چوری، ناشائستہ گفتگو، نامناسب رویہ اور فرض ناشناسی کا سبق اکثر وہ اپنے اساتذہ ہی سے سیکھتے ہیں اور اپنی آئندہ زندگی میں اس کو دہراتے ہیں۔

والدین پر اولاد کی تربیت کی خصوصی ذمہ داری ہے؛ کیوں کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ خود کیسا بھی ہو؟ اس کے بچے اچھے ہوں، شراب پینے والوں کو بھی یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ اس کے بچے شراب پئیں؛ لیکن تین باتیں تربیت میں رکاوٹ بنتی ہیں، ایک تو ماں باپ کی جہالت، مسلم معاشرہ میں آج بڑی تعداد ایسے والدین کی ہے، جو اپنی اولاد کی تربیت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، دوسرے: معاشی تگ ودو کے لیے بڑھی ہوئی مشغولیت اور تفریحی وسائل کے سامنے وقت گذارنے کا مزاج، شہروں میں بڑی تعداد ایسے ہی سرپرستوں کی ہے، انھیں وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی وقت لگا سکیں، ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے: کمانا، کمانا اور کمانا، تیسرے: وہ لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ بھی ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کا خیال بھی ہے؛ لیکن ان کے نزدیک تربیت کا مطلب صرف بچوں کو دنیوی زندگی کی آسائشوں کے لیے تیار کرنا ہے، اخلاقی تربیت کی ان کے یہاں کوئی قدر وقیمت نہیں، ہاں جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہیں اور اپنی اولاد کی غفلت وبے توجہی انہیں خون کے آنسو رلاتی ہے، اس وقت انہیں اپنی اس غفلت کا احساس ہوتا ہے۔

تربیت کا تیسرا ذریعہ انسان کے دوست واحباب ہیں، انسان پر اس کے ہم نشینوں کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے؛ بلکہ بعض اوقات انسان اساتذہ اور والدین سے بھی بڑھ کر اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کا اثر قبول کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں ہم نشینوں کے رول کو بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے، آپ نے فرمایا: اچھے ہم نشیں کی مثال عطر والے کی ہے کہ یا تو وہ تم کو عطر عطا کرے گا، یا تم اس سے عطر خریدو گے، یا کم سے کم اس سے خوش بو تو پا ہی لوگے، اور خراب ہم نشیں کی مثال بھٹی پھونکنے والے کی ہے کہ اگر کپڑا نہ جلے تو دھویں سے تو نہ بچ سکو گے۔ (**بخاری، عن ابی موسیٰ اشعری، باب المسک**، حدیث نمبر: ۴۱۲۵) موجودہ دور میں سماجی بگاڑ کی وجہ سے عام طور پر تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کو جو صحبت ملتی ہے وہ ان کو فائدہ بہت کم اور نقصان بہت زیادہ پہنچاتی ہے؛ اس لیے تربیت کا عنصر بالکل ختم ہوتا جا رہا ہے؛ اسی لیے

معاشرہ میں جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جاتی ہے، اخلاقی اقدار تباہ ہوتی جارہی ہیں، پڑھ لکھ کر طالب علم ایک اچھی آمدنی حاصل کرنے والا شخص تو بن جاتا ہے؛ لیکن وہ ایک اچھا انسان نہیں بن پاتا۔

یہ صورتِ حال اس وقت اور بھی زیادہ پریشان کن ہوتی ہے، جب نوجوان ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوسرے شہروں کو جاتے ہیں اور وہاں ان کو ایسے اساتذہ نہیں ملتے جو شفقت ومحبت کے ساتھ ان کی تربیت کا فریضہ انجام دیں، نہ وہاں کسی درجہ میں بھی والدین کی نگرانی ہوتی ہے اور نہ اچھے دوستوں کا ساتھ حاصل ہوتا ہے، یہ چیز ان کو بہت تیزی سے بگاڑ کی طرف لے جاتی ہے، آج کل بہت سے طلبہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے دیہات سے شہر اور چھوٹے شہروں سے بڑے اور مرکزی شہر کا رخ کرتے ہیں اور تربیت اور نگہداشت کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح کے ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں، وہ شب وروز اخبارات میں دیکھے جاسکتے ہیں؛ اس لیے یہ بہت قابل فکر مسئلہ ہے کہ نوجوانوں کی تربیت کس طرح کی جائے اور بالخصوص وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جو تعلیمی مقاصد کے تحت اپنے وطن سے دور ہیں، انہیں کس طرح سنبھالا جائے؟

اس سلسلہ میں ایک قدیم تجویز معروف محقق اور صاحب نظر مصنف مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی ہے، جس کا انہوں نے اپنی نوعیت کی منفرد فاضلانہ کتاب ''اسلام کا نظامِ تعلیم وتربیت'' (دوجلدیں) میں ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہروں میں مسلمان طلبہ کے لیے ہاسٹل قائم کیا جائے، موجودہ حالات میں یہ تجویز مزید اہمیت اختیار کرگئی ہے کہ طلبہ کے لیے بھی اور طالبات کے لیے بھی دینی ماحول کے ساتھ مسلمانوں کے اپنے ہاسٹل ہوں، جن میں انھیں بنیادی دینی تعلیم دی جائے، اسلامی ماحول فراہم کیا جائے، جس طرح دینی درس گاہوں میں تربیت کی جاتی ہے، اسی انداز پر اس کی تربیت کی جائے، عقیدہ، اعمال اور اخلاق کی سہ رخی تربیت پر زور دیا جائے، لڑکیوں کے ہاسٹل میں پردہ کا خصوصی اہتمام کرایا جائے، اس بات پر بھی نظر رکھی جائے کہ الیکٹرانک ذرائع کا غلط استعمال نہ ہو، مخرب اخلاق سائٹیں بند کردی جائیں اور ایسے جیمر نصب کیے جائیں، جن کو صرف ضروری اوقات میں کھولا جائے، اگرچہ یہ تجویز پہلے بھی اہم تھی؛ لیکن اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ لوگوں نے پرائیویٹ طور پر جو ہاسٹل قائم کر رکھے ہیں، ان کا مقصد صرف کرایہ حاصل کرنا ہے،

ان میں دینی تربیت کا کوئی خانہ نہیں، چند طلبہ مل کر اگر شخصی طور پر کوئی کمرہ حاصل کرتے ہیں تو وہاں اخلاقی بگاڑ کے مواقع اور بڑھ جاتے ہیں، حکومت کی طرف سے جو ہاسٹل بنے ہوئے ہیں، وہاں کماحقہ نگرانی نہیں ہوتی اور موجودہ حالات میں وہاں مشرکانہ شعائر کو بھی فروغ دیا جاتا ہے، برادرانِ وطن کے تیوہار کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور مورتیاں بھی آویزاں کی جاتی ہیں؛ اس لیے ضرورت ہے کہ ادارے دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے آنے والے طلبہ و طالبات کے لیے مناسب اور کم اجرت پر قیام کا انتظام کیا جائے، اگر دینی مدارس اپنے احاطہ میں طلبہ کے لیے اور لڑکیوں کے مدارس طالبات کے لیے ہاسٹل قائم کریں تو یہ بہت ہی مفید صورت ہوگی، اس طرح ہم قوم کے بہت سے بچوں اور بچیوں کو گمراہ ہونے سے بچا سکیں گے اور جو لوگ عصری تعلیم سے آراستہ ہو کر آئندہ گورنمنٹ ملازمتیں حاصل کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ حکومتوں کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں، وہ اسلامی ذہن کے ساتھ اپنے اپنے کاموں کو انجام دیا کریں گے۔

تعلیم کے بعض شعبے اور مسلمان

اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو جن امتیازی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ اس کے اندر علم کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود اپنی صفت علم کا کم سے کم دوسو بارہ مواقع پر ذکر فرمایا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو جو اس دنیا کی خلافت عطا کی گئی ہے، وہ اسی لیے کہ ان کے اندر معلومات کو اخذ کرنے کی صلاحیت تھی؛ چناں چہ حق تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ساتھ ان کا امتحان لیا گیا اور بارگاہِ الٰہی میں ہونے والے اس امتحان میں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کامیابی سے ہمکنار ہوئے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے کن کن چیزوں کا علم عطا فرمایا گیا تھا؟ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں مختصر لیکن جامع بات کہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء (ناموں) کے علم سے نوازا گیا تھا ”وَعَلَّمَ اٰدَمَ الاَسمَاءَ کُلَّهَا“ (بقرۃ:۱۳) اسم کے معنی تو صرف نام کے ہیں جو کسی شئ کی نشان دہی کرتی ہے؛ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد صرف نام نہیں ہے؛ بلکہ کائنات کی وہ تمام چیزیں ہیں، جن کے نام رکھے جاسکتے ہیں، گویا علم کا جو مخفی خزانہ جہالت کے پردے سے نکل نکل کر باہر آرہا ہے اور جو قیامت تک آتا رہے گا، جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انسان مختلف ناموں سے موسوم کرتا ہے، ان ساری چیزوں کا علم حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، جن کا ہر دور کی ضرورت کے اعتبار سے ظہور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اسلام کی نظر میں بنیادی طور پر علم کی دو قسمیں ہیں، ایک: وہ علم جو انسان کے لیے نفع بخش ہو، خواہ دنیا کے لیے ہو یا آخرت کے لیے اور دوسرے: وہ علم جو بے فائدہ ہو، پہلا علم مطلوب ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور دوسری قسم کا علم مذموم اور ناپسندیدہ ہے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دعا کیا کرو اور بے فائدہ علم سے اللہ کی پناہ چاہو: ”سلوا علماً نافعاً، وتعوذوا باللہ من علم لا ینفع“ (سنن ابن ماجہ، عن عبداللہ بن جابرؓ، حدیث نمبر:۳۸۴۳) — آج کل انسان کی

ہلاکت و بربادی اور دنیا کو تباہ وتاراج کرنے کے جو ہتھیار تیار کیے جارہے ہیں، یہ یقیناً بے فائدہ علم میں شامل ہیں اور سوائے اس کے کہ کوئی ملک دفاع کے لیے اس پر مجبور ہو جائے، اس کو اپنے وسائل تعمیری مقاصد کے بجائے ایسے تخریبی کاموں میں خرچ نہیں کرنا چاہیے، مغربی طاقتیں جس طرح اپنی بہترین صلاحیتیں مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں خرچ کررہی ہیں، یقیناً ان کو بدبختی کہا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے علم کی خصوصیت یہ رکھی ہے کہ جیسے ایمان انسان کے لیے بلندی کا ذریعہ ہے، اسی طرح علم بھی افراد اور قوموں کی سربلندی وسرخروئی کی کلید ہے: **يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ** (مجادلہ:۱۱) جولوگ علم سے آراستہ ہوں یا جو قوم علم ودانش کی دولت سے مالا مال ہو، وہ اور جو افراد اور قومیں علم سے محروم ہوں، دونوں برابر نہیں ہو سکتے: **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ** (الزمر:۹) علم کی ضرورت جہاں آخرت کی کامیابی کے لیے ہے، وہیں دنیا میں باعزت زندگی گزارنے اور بہتر مرتبہ ومقام حاصل کرنے کے لیے بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت اور حکمرانی کے سلیقہ سے بھی نوازا تھا اور مخلوقات سے متعلق بعض ایسے علوم دیئے گئے تھے، جہاں تک عام انسانوں کی رسائی نہیں ہوتی، حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ علم کی اس دولت سے نواز کر اللہ نے ہمیں بہت سارے مسلمان بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے:

وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النمل:۱۵)

دنیا میں اقتدار میں شرکت، کاروبارِ حکومت میں شمولیت اور نظم ونسق کی انجام دہی میں بھی علمی بصیرت اور معلومات کا مہیا ہونا ضروری ہے، اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب مصر کے حکمراں سے پیش کش کی کہ جو اقتصادی بحران مستقبل میں آنے والا ہے اور جو بظاہر پورے ملک کو دانہ دانہ کا محتاج بنادے گا، اس سے نبرد آزما ہونے کے سلسلہ میں، میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں اور آپ کے خزانہ کی ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں، تو اس پیش کش کے ساتھ آپ نے یہ دلیل دی کہ

میرے اندر سرکاری خزانہ کی حفاظت ونگہداشت کی صلاحیت بھی ہے اور میں علم کی دولت سے بہرہ ور بھی ہوں: اجعَلنِی عَلٰی خَزَائِنِ الاَرضِ اِنّی حَفِیظ عَلِیم (یوسف:۵۵)

حکومت واقتدار کی اہمیت ہر ملک میں ہے؛ لیکن جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں، وہاں اقتدار میں ساجھے داری اور سرکاری نظم ونسق میں شمولیت مسلمانوں کے ملی بقاء کے لیے بے حد ضروری ہے؛ کیوں کہ عام طور پر اکثریت چاہتی ہے کہ وہ اقلیت کو ہضم کرجائے، اس کے تشخص کو مٹادے، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے اس کو پنپنے کا موقع نہیں دے، ہندوستان میں مسلمان اس وقت اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، ان کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی ضرب المثل بن چکی ہے، جس قوم نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی، وہ آج ایک بے توقیر گروہ کی حیثیت سے زندگی کا سفر طے کررہی ہے، اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے جہاں دین سے گہری وابستگی اور باہمی اتحاد ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ یہ امت علم وتحقیق کے میدان میں آگے بڑھے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لائق بن جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ مسلمان مختلف حادثات سے سبق حاصل کرتے رہے ہیں اور جب بھی کوئی مصیبت اس پر آئی ہے، غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نئے حوصلہ کے ساتھ قدم بڑھایا ہے، تقسیم ہند کے بعد سے جب فرقہ وارانہ حملہ شروع ہوا، پولیس اور فسادیوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا سلسلہ شروع کیا، تو ۱۹۷۱ء تک مسلمانوں کی یہ کیفیت رہی کہ لوگ فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرتے اور بہت سی دفعہ ان کی منزل موجودہ بنگلہ دیش کی سرزمین ہوتی، وہ اس کو اپنے لیے ایک گوشہ عافیت تصور کرتے؛ لیکن جب پاکستان کی ناعاقبت اندیشی کے نتیجہ میں بنگلہ دیش بن گیا تو انھوں نے محسوس کرلیا کہ بہرحال ان کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے؛ اس لیے انھوں نے حوصلہ وہمت کو جمع کیا اور اس کی وجہ سے فسادات کے نتائج اور آبادی کے ارتکاز میں ایک مثبت تبدیلی ظاہر ہونے لگی، پھر ۱۹۷۲ء میں جب حکومت ہند نے متبنیٰ سے متعلق ایک ایسا قانون لانے کی کوشش کی جو شریعت اسلامی سے متصادم تھا اور مسلمانوں نے محسوس کیا کہ حکومت جان

و مال کے بعد اب مسلمانوں کے دین و شریعت پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے، تو انہوں نے اپنے باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ساتھ بیٹھنے اور مشترکہ مسائل کے لیے متحدہ جدو جہد کرنے کا سبق سیکھا اور اس طرح ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' جیسا متحدہ پلیٹ فارم وجود میں آیا۔

۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کا وہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، جس نے پوری ملت ِ اسلامیہ کو ہلا کر رکھ دیا، ان حادثات کے بعد مسلمانوں نے ایک نئی کروٹ لی، انہوں نے محسوس کیا کہ ان کو قصداً انصاف سے محروم رکھا جاتا ہے اور وہ خود اپنی جدو جہد کے ذریعہ ہی اس ملک میں ایک باوقار امت کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں؛ چناں چہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیمی اور معاشی جدو جہد شروع ہوئی، مسلمانوں نے سرکاری ملازمت پر تکیہ کرنے کے بجائے تجارت، چھوٹی صنعت اور بیرون ملک ملازمت پر توجہ دی، غیر سودی قرض کے ادارے قائم کیے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو روزگار کے اعتبار سے خود مکتفی بنانے کی کوششیں کی گئیں، بحمداللہ ان کوششوں کے بہتر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

تعلیم کی طرف بھی مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، انہوں نے پرائمری سے لے کر ڈگری اور پی جی کی سطح کے ہزاروں ادارے قائم کیے ہیں، ملک کے مختلف حصوں میں اور خاص کر جنوبی ہند میں پیشہ ورانہ تعلیم کے بہت سے ادارے قائم کیے، اب ہزاروں کی تعداد میں مسلمان طلبہ میڈیکل، انجینئرنگ، ایم بی اے، ایم سی اے اور آئی ٹی وغیرہ کی سندیں لے کر نکل رہے ہیں، اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے بیشتر ادارے ملک کے جنوبی علاقہ میں قائم ہیں؛ لیکن ان کا فائدہ پورے ملک کے نوجوان مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے، یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں اس کے بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن غور کرنے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ عصری تعلیم کے جن شعبوں کی طرف مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، عام طور پر اس کا فائدہ ان کی ذات یا ان کے خاندان کو پہنچ سکے گا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں خاندان کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے، بیوی بچوں کے

سوا بمشکل والدین کو اس میں شامل کیا جاتا ہے، بھائی بہن کا تو ذکر ہی کیا ہے، تعلیم کے ان شعبوں سے فارغ ہونے والے نوجوان اپنے آپ کو سکہ ڈھالنے کی مشین سمجھتے ہیں، قومی وملّی مسائل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تعلیم ملت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا رہی ہے؛ بلکہ جو لوگ ایسے نوجوانوں پر بطور تعاون اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں، وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کا جو سرمایہ ان پر خرچ کیا جارہا ہے، ملت کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اور ایک ایسا گروہ تیار ہو رہا ہے جس کی اکثریت خودغرضی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہے، کاش کہ جو تنظیمیں تعلیم کے ان شعبوں میں نوجوانوں کو امداد فراہم کرتی ہیں، وہ ان کی اخلاقی اور فطری تربیت کی طرف بھی توجہ دیں۔

لیکن اس وقت ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ان شعبوں میں لایا جائے، جو فکر سازی، ملت کے مسائل کی ترجمانی، انصاف کے حصول اور ان کے نظم ونسق میں شمولیت کو آسان بنا سکیں، اس سلسلہ میں خصوصی طور پر بعض شعبوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، جیسے قانون کا شعبہ ہے، سپریم کورٹ میں اچھے مسلم وکلاء ''جن کا عدالت میں وزن محسوس کیا جائے'' نہ کے برابر ہیں، ہائی کورٹوں کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے؛ اسی لیے عدالتوں میں مسلمان ججز کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، بعض لوگوں کا احساس ہے کہ ملک کا یہ سب سے معزز ترین ادارہ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہوتا جارہا ہے اور بعض دفعہ انصاف کو شرم سار ہونا پڑتا ہے، اگر قانون کے شعبہ میں ہماری مؤثر نمائندگی نہیں رہے گی تو ہمارے لیے انصاف کی جنگ جیتنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ، بالخصوص انگریزی اور مقامی زبان کے میڈیا کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر پروپیگنڈہ کی جنگ میں عزت وآبرو کا بچانا مشکل ہے، ایسے انگریزی دانوں کی بھی ضرورت ہے، جن کو انگریزی کے معتبر ادیب اور مصنف کا درجہ حاصل ہو اور قومی سطح پر ان کو پذیرائی حاصل ہو، ڈاکٹر جسم کا علاج کرسکتا ہے، انجینئر بلڈنگیں اور مشینیں بنا سکتا ہے؛ لیکن فکر سازی کا کام اچھے جرنلسٹ اور باصلاحیت مصنف اور ماہر تاریخ

داں کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا ہے؛ لیکن ان شعبوں سے مسلمان طلبہ کٹے ہوئے ہیں اور اسی لیے مسلمانوں میں عصری علوم کے حامل ایسے ماہرین نہیں رہے، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو دلیل، زبان و بیان کی قوت، منطقیت و معقولیت اور خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کر سکیں، ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے تئیں ایسا کردار ادا کرتے ہیں کہ گویا وہ مسلمانوں کے بالمقابل اپوزیشن ہوں، تاریخ ایسی مرتب کی جارہی ہے جس میں مسلمانوں سے متعلق نفرت کے جذبات ابھارے جارہے ہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری اور مقبول کتابیں اس انداز کی آرہی ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہیں۔

خاص طور پر سول سروسیز کا ذکر کروں گا، جس میں مسلمانوں کا تناسب نہایت حقیر ہے اور یہ تعداد کی کمی اس لیے نہیں ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد شریک ہوتی ہو اور نسبتاً کم تعداد کامیاب ہوتی ہو؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امتحان میں شریک ہونے والے مسلمان امیدواروں ہی کی تعداد کم ہوتی ہے اور شرکت کے اعتبار سے کامیابی کا تناسب عام طور پر وہی ہوتا ہے، جو اکثریت کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ ’’کم صلاحیت‘‘ ہونے کا نہیں ہے؛ بلکہ کم ہمتی، پست حوصلگی اور جدوجہد میں کمی کا ہے، نیز مزاج یہ بن گیا ہے کہ اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنے کے بجائے اسی مرحلہ پر اکتفا کر لیا جائے، جس سے کمائی ہونے لگے اور مرفہ الحالی حاصل ہو جائے؛ حالاں کہ جو لوگ اس مقام تک پہنچتے ہیں، وہ ملت کو انصاف دلانے میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور سیاسی نمائندوں سے بھی بڑھ کر وہ قوم و ملت کے لیے اپنی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

اس لیے ضرورت ہے کہ اب تعلیم کے ان شعبوں کی طرف توجہ دی جائے، نوجوانوں کی اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی کی جائے اور انہیں اس لائق بنایا جائے کہ ان کی صلاحیت کا فائدہ صرف ان کی ذات یا ان کے خاندان تک محدود نہ رہے؛ بلکہ پوری ملت کو ان کا نفع پہنچے، وہ صرف نوٹ چھاپنے والی مشین بن کر نہ رہ جائیں؛ بلکہ وہ ملت کی سرفرازی و سرخ رُوئی کا ذریعہ بنیں۔

اپنی اولاد کو آگ سے بچایئے!

انسان پر جیسے دوسروں کے حقوق ہیں، اسی طرح اس پر خود اپنی ذات کا، اپنے بال بچوں اور اپنے عزیزوں کا بھی حق ہے؛ بلکہ یہ حق نسبتاً زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے اور آخرت میں اس کے بارے میں جواب دہی بھی زیادہ ہے، انسان پر اس کی ذات کے اور اس کے اہل وعیال کے کیا حقوق ہیں اور اپنے زیر پرورش لوگوں کے تئیں اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ قرآن وحدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے، یہ حقوق انسان کی مادی ضروریات سے متعلق بھی ہیں اور اس کی دینی اور اخروی حاجات سے متعلق بھی اور یقیناً اس کی دینی حاجات سے متعلق حقوق زیادہ اہم ہیں؛ کیوں کہ مادی ضرورتوں کا تعلق تو ایسے مستقبل سے ہے جو چند سالہ ہے اور جس کی انتہاء قبر کی منزل پر ہو جاتی ہے؛ لیکن دینی اور اُخروی ضرورتیں ایسے مستقبل سے متعلق ہیں، جن کی کوئی نہایت نہیں، اس لیے ایک صاحبِ ایمان جو آخرت میں جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اور جو اس دنیا پر یقین کرتا ہو، یقیناً اس وسیع اور نہ ختم ہونے والے مستقبل سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید نے انسان کو اسی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ: ''قوا انفسکم واھلیکم نارًا'' (التحریم: ٦) یہ آگ سے بچانا کیوں کر ہوگا؟ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ، ایمان کیا ہے؟ قرآن و حدیث میں جن جن باتوں کا ذکر آیا ہے، ان سب کو ماننا اور بے کم و کاست ان کا یقین کرنا، ایمان صرف کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں، اگر ایک شخص اپنی زبان سے توحید کا اقرار کرتا ہو اور قرآن کے کسی حکم کا انکار بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو؛ لیکن آپ کی کسی سنت کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہ کرتا ہو، آپ کو نبی مانتا ہو؛ لیکن آپ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہو، تو بظاہر وہ صاحب ایمان محسوس ہوتا ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ کفر کی راہ پر ہے، ایمان کا مسئلہ بہت نازک ہے، بعض اوقات انسان ہنسی مذاق میں، غیظ وغضب اور ضد و

عناد میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو اسے دولتِ ایمان سے محروم کر دیتی ہیں اور اسے خبر تک نہیں ہوتی، ظاہر ہے اس نادانستہ خسران ومحرومی سے بچنے کے لیے ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے علم کے زیور سے آراستہ اور احکام دین سے واقف ہونا، بے علمی اور ناآگہی و جہالت و نادانی انسان کو راہِ حق سے دور لے جاتی ہے اور گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

آگ سے بچنے کے لیے دوسری ضروری چیز عمل صالح ہے، عمل صالح کے معنی اچھے کام کے ہیں، کوئی کام اس وقت اسلام کی نگاہ میں عمل صالح بنتا ہے، جب اس میں تین باتیں پائی جائیں، اوّل: وہ حکم خداوندی کے مطابق ہو، دوسرے: اس عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر انجام دیا جائے، تیسرے: اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور رضا کا حاصل کرنا ہو، شہرت و ناموری، عہدہ و جاہ اور دنیا طلبی مقصود نہ ہو، اگر یہ تینوں باتیں جمع ہوں تو وہ عمل صالح ہے اور ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ پائی جائے، تو وہ عمل صالح نہیں، ظاہر ہے کہ عمل صالح کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کے لیے قدم قدم پر علم کی ضرورت ہے، ایک وضو اور نماز ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس سے متعلق کتنے مسائل واحکام ہیں؟ انسان بوڑھا ہو جائے اور اپنی پوری عمر طے کر لے، پھر بھی ان مسائل کا احاطہ نہیں کر پاتا، ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، اہل علم سے استفسار کرنا پڑتا ہے؛ بلکہ خود اصحابِ علم بھی ایک دوسرے سے رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، فقہ کا ایک سمندر بیکراں ہے، جو ان ہی اعمالِ صالحہ کی تشریح وتوضیح سے عبارت ہے۔

غرض انسان کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو آخرت کی آگ سے بچانے اور جہنم کی بھٹی سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ ایمان اور عمل صالح ہے اور ایمان ہو یا عمل صالح، جب تک دین کا علم نہ ہو، احکامِ شریعت سے آگہی نہ ہو، کتاب وسنت سے واقفیت اور دین کا فہم نہ ہو، حاصل نہیں ہوسکتا اور ایمان وعمل کا حق جہل وناآگہی کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

اس لیے ہر مسلمان کے لیے اپنی ضروریات کے مطابق علم دین کا حصول فرائض میں سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ وضاحت ارشاد فرمایا کہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** شاید ہی دنیا کے کسی مذہب میں علم کی یہ

اہمیت ظاہر کی گئی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اور کوئی علم داخل ہو یا نہ ہو، علم دین تو ضرور ہی داخل ہے؛ کیوں کہ یہ ایسا فریضہ ہے کہ جس کے بغیر دین کا کوئی فرض ادا ہو ہی نہیں سکتا، وضو اس لیے فرض ہے کہ اس سے نماز ادا کی جائے، حرمین شریفین کا سفر اس لیے فرض ہے کہ حج کی ادائیگی ہو سکے، تو علم سے تو تمام ہی فرائض متعلق ہیں، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، نکاح و طلاق، حلال و حرام، خلوت و جلوت اور رزم و بزم، کون سی جگہ ہے اور کون سا موقع ہے، جہاں انسان علم کا محتاج نہ ہو، اس لیے علم دین اہم ترین فریضہ ہے، ایسا فریضہ کہ جس پر تمام فرائض کی ادائیگی منحصر ہے۔

اس لیے یقیناً قرآن مجید نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانے کا حکم دے کر بالواسطہ علم کی طرف متوجہ کیا ہے، موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، ہمارے سرکاری نظامِ تعلیم میں آزادی کے بعد ہی سے مغربی تہذیب کی چھاپ ڈالنے کی کوشش رہی ہے؛ لیکن اب یہ کوشش بے لباس اور تیز رفتار ہے، مسلمان بچوں کو مشرکانہ فکر سے مانوس کیا جا رہا ہے، غیروں کا تقدس ان کے ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے، مغرب کی عظمت ان کے قلوب میں راسخ کی جاتی ہے، مسلمانوں کی تاریخ کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے؛ تاکہ مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ اور اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے؛ تاکہ پیغمبر اسلام اور آپ کے رفقاء کی عظمت نئی نسل کے دل سے نکل جائے، اس صورتِ حال میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے دینی تعلیم کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔

دینی تعلیم کا ایک درجہ تو ضروریاتِ دین کی تعلیم کا ہے، یہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، ہمارے جو بچے عصری درس گاہوں میں زیر تعلیم ہیں، ان کے لیے بھی قرآن مجید کا با تجوید ناظرہ، کچھ سورتوں کا حفظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ضروری فقہی مسائل اور شب و روز کے مختلف احوال سے متعلق جو ادعیہ واذکار منقول ہیں، ان کا یاد کرانا تو ہر مسلمان بچے کے

لیے ضروری ہے، اب اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہوگئی ہے کہ ان کو اسلام کی اور مسلمانوں کی تاریخ بھی پڑھائی جائے؛ تاکہ وہ احساسِ کمتری سے بچ سکیں اور اسلام پر مغربی مصنفین اور ان سے متأثر ہوکر مشرق کے اہل علم جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کے جواب میں بھی رہنمائی کی جائے؛ تاکہ غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے دامِ ہم رنگِ زمین سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

علم دین حاصل کرنے کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ امت میں کچھ لوگ قرآن وحدیث کا تفصیلی علم حاصل کریں، کتاب وسنت پر ان کی گہری نگاہ ہو، فقہ اسلامی پر ان کی وسیع نظر ہو۔

ایمانیات اور عقائد کی گہرائیوں تک ان کی رسائی ہو، ہر عہد میں اسلام کے خلاف جو فتنے کھڑے ہوں، وہ ان کے مقابلہ کی صلاحیت کے اہل ہوں، وہ اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں اور اپنے عہد کے پیدا ہونے والے مسائل کو فراستِ ایمانی کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں حل کریں، یہ امت پر فرضِ کفایہ ہے، جیسے کسی ملک کی سرحد پر فوج کا دستہ کھڑا رہتا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس پر مفت میں کثیر اخراجات ہورہے ہیں؛ لیکن حقیقت میں وہ ملک کے سب سے بڑے محسن اور اس کی سلامتی کے ضامن ہیں، یہی مقام فکری اعتبار سے کسی بھی سماج میں علماءِ دین کا ہے، یہ ہمارے معنوی وجود، ہمارے فکری تشخص اور ہمارے تہذیبی امتیازات کے محافظ ہیں، کسی سماج میں اگر کوئی عالم نہ ہوتو کافرانہ طاقتیں علانیہ یا نادانستہ ان کو اُچک سکتی ہیں، عالم ممکن ہے عمل کے اعتبار سے کوتاہ ہو؛ لیکن ان شاء اللہ وہ کسی گمراہی کے بارے میں غلط فہمی میں نہیں پڑسکتا اور پروپیگنڈہ سے متأثر نہیں ہو سکتا؛ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی خاندان ایسا نہ ہو جو عالم دین سے خالی ہو، یہ ان شاء اللہ اس پورے خاندان کے لیے حفاظتِ دین کی ضمانت ہے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے ایسا سوچ لیا ہے کہ یہ عظیم الشان علم صرف غریب اور پسماندہ مسلمانوں کے لیے ہے، مسلمانوں میں مرفہ الحال اور اصحابِ ثروت کا طبقہ علم دین کی طرف سے بالکل ہی بے توجہ ہے؛ بلکہ وہ اسے حقارت اور کمتری کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ

نہایت ہی افسوس ناک بات ہے، یہ سمجھنا تو درست نہیں کہ یہ غریب طلبہ، کند ذہن اور فکری اعتبار سے مفلس ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ذہانت کا دولت و غربت سے کوئی تعلق نہیں ؛ بلکہ تجربہ یہ ہے کہ غریب ماحول کے بچے علم کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں؛ چناں چہ اس وقت آئی اے ایس اور اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں زیادہ تر اسی طبقہ سے طلبہ کامیابی حاصل کر رہے ہیں؛ لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جو طالبِ علم معاشی اعتبار سے پست ماحول سے اٹھتا ہے، وہ بہر حال نفسیاتی اعتبار سے احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے اور سماج میں جو مرفہ الحال طبقہ ہے، اس سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتا، اس سے سماج میں کچھ لوگ دینی رہنمائی اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح سے محروم رہتے ہیں، اگر سماج کے معزز سمجھے جانے والے لوگ علم دین حاصل کریں تو وہ اپنے طبقہ کے لوگوں سے آنکھیں ملا کر باتیں کر سکیں گے اور بے جھجک اسلامی تعلیمات کو ان کے سامنے پیش کریں گے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے معزز اور مرفہ الحال لوگ علم دین کی طرف متوجہ ہوں اور اس علم کو حاصل کرنے میں آگے آئیں۔

قابل فکر امر یہ ہے کہ آخر علم دین کی طرف سماج کے اونچے طبقے کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ حالاں کہ ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں تہذیب و شائستگی اور بڑوں کی توقیر، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، اپنے پرائے کے ساتھ حسنِ سلوک، نگاہ اور زبان کی حفاظت اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہی کے احساس کا عنصر زیادہ ہوتا ہے؛ لیکن کیا بات ہے کہ اس کے باوجود علم کا یہ شعبہ لوگوں کے التفات سے محروم ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ دین اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کم ہیں، ان کو کم تنخواہوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہی ایک بات ہے جس نے مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن کے حاملین کو علم دین کی طرف آنے سے روکا ہوا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کیا کھائیں گے؟ اور کیوں کر زندگی گذاریں گے؟

اس سلسلہ میں مسلمان سماج کے لیے دو باتیں قابل توجہ ہیں: اَوّل یہ کہ کیا مسلمانوں

کا معاشرہ اپنے دینی تحفظ کے لیے ایک ایسے طبقہ کی صحیح طریقہ پر کفالت نہیں کرسکتا جن کی تعداد بہ مشکل ایک فی ہزار ہوگی؟ اگر مسلمان اپنی دوسری ضروریات کی طرح دینی خدمت گذاروں کو بھی اپنے لیے ایک ضرورت باور کریں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کے تعاون کے لیے ہاتھ بڑھائیں اور خادمین دین کو کم سے کم معاشی اعتبار سے اس لائق بنائیں کہ وہ متوسط طریقہ پر سماج میں اپنی زندگی بسر کرسکیں، تو یقیناً اس علم سے بے اعتنائی اور بے رغبتی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی اور یہ کچھ مشکل نہیں ہے، بعض وہ قومیں جو باطل فکر ونظر کی حامل ہیں، اپنے مذہب اور مذہبی شخصیتوں کے لیے کل آمدنی کا دس فی صد وقف کی ہوئی ہیں، مسلمان اتنی بڑی قوم ہے کہ اگر وہ آمدنی میں دین کے خدمت گذاروں کے لیے ایک فی صد بلکہ نصف فی صد بھی حصہ مقرر کرلیں تو ان کے ائمہ، مؤذّنین، علماء اور دینی کام کرنے والے بہتر حالات میں اپنی زندگی گذار سکتے ہیں اور بعض اوقات غربت واحتیاج کی وجہ سے اس طبقہ میں جو دناءت اور پستی کی بعض باتیں پیش آتی ہیں، ان کی نوبت بھی نہ آئے گی، کاش! مسلمان اس پہلو سے غور کریں کہ خادمین دین کے وقار کو بلند کرنا دراصل خود دین کے وقار کو بلند کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں معیشت کا علم سے کچھ زیادہ ربط نہیں ہے، ہمارے اسی شہر میں کتنے لوگ ہیں جو نشانِ ابہام سے کام چلاتے ہیں؛ لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کے ملازم ہیں اور دولت ان کے قدموں میں نثار ہے، کتنے انجینئر بے کار ہیں اور کتنے ڈاکٹر بے روزگار ہیں اور کتنے قانون داں مؤکل کی تلاش میں خاک چھانتے نظر آتے ہیں، اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر ایک شخص علم دین حاصل کرے گا تو بھوکا مرے گا اور دوسرے علوم حاصل کرے گا تو اس کے گھر میں ''ہن'' برسنے لگیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزّاق اور روزی رساں ہیں، چاہیں تو پڑھے لکھے لوگوں کو محروم رکھیں اور چاہیں تو جاہلوں کو سرفراز فرمادیں، پھر یہ ایک نظریہ نہیں؛ بلکہ تجربہ اور آزمودہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کے کام میں مشغول ہیں، اللہ ان کو ضائع نہیں کرتا اور غیب سے ان کی کفالت کا سروسامان کرتا

ہے، آخر اسی معاشرہ میں وہ دینی تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہیں جو خوش پوش بھی ہیں، باعزت طریقہ پر اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے پر مجبور نہیں ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے امت کے دل میں ان کی محبت اس طرح ڈال دی ہے کہ مشکل مواقع پر بلا کہے سنے اور بلا طمع و اشراف وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اس لیے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے، اگر ایک مسلمان میں اللہ کی رزّاقیت کا یقین بھی نہ پیدا ہو، تو یہ کیسا کھوکھلا اور بے روح ایمان ہے؟

پس موجودہ قومی حالات میں اور عالمی حالات کے پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کی اہمیت کی طرف متوجہ ہوں، آج ہمارے یہاں مدارسِ اسلامیہ کے خلاف آوازیں اُٹھائی جا رہی ہیں، عالمی سطح پر بھی ان کو بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا مرکز قرار دیا جا رہا ہے، یہ سب ان لوگوں کی زبان ہے کہ اسلام سے جن کی عداوت ظاہر و باہر ہے، اعداء اسلام کا یہ رویہ سرمایۂ عبرت ہے، جو لوگ حق و راستی کے دشمن ہوں، وہ تو مدارس کی اہمیت کو سمجھ لیں کہ جو لوگ صاحبِ ایمان اور اسلام کے نام لیوا ہیں، وہی اسلام کی حفاظت اور اس کی بقا میں مدارس کی کردار کی اہمیت کو نہیں سمجھیں، اس سے زیادہ قابل افسوس اور کیا بات ہوگی؟

سری لنکا کے دو سبق

ابھی ہفتہ عشرہ پہلے راقم الحروف کو پہلی بار سری لنکا کا سفر کرنے کا موقع ملا، اس سفر کی دعوت اگرچہ دو سال پہلے ہی ملی تھی؛ لیکن تکنیکی غلطی کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ایئر پورٹ سے واپس آنا پڑا، پھر رمضان المبارک سے دو ماہ پہلے سری لنکا کے علماء اور تجار کا ایک وفد آیا اور مؤرّخہ ۸/جولائی ۲۰۱۷ء کی تاریخ سفر کے لیے طے ہوگئی؛ لیکن رمضان المبارک سے کچھ پہلے وہاں بودھ انتہا پسندوں کی طرف سے مسجدوں اور مسلمانوں کی اَملاک پر حملہ کا کچھ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ڈر ہونے لگا کہ خدانخواستہ یہاں بھی برما کی سی صورت حال نہ پیدا ہو جائے؛ اس لیے فی الحال سفر کی اُمید جاتی رہی؛ مگر رمضان المبارک کے اخیر ایام میں وہاں کے احباب کے اس قدر فون آنے لگے کہ انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی، بہر حال حیدرآباد سے براہ چنئی ۸/جولائی ۲۰۱۷ء کو کولمبو پہنچا، خیال تھا کہ وہاں مسلمان اچھی حالت میں نہیں ہوں گے، خوف و ہراس ہوگا، گھبراہٹ اور بے اطمینانی ہوگی، مسلم آبادیوں پر غربت اور پسماندگی کا سایہ ہوگا، مسلمانوں کے گھر لُٹے پِٹے ہوں گے، اسی اندیشہ کے ساتھ میں نے اس نسبتاً چھوٹے سے ملک میں قدم رکھا، جو جنوبی ہند سے لگا ہوا ہندوستان کا قریب ترین پڑوسی ہے، جس کو سِیلون بھی کہا جاتا ہے اور جس کو عرب ''جزیرۂ سرندیپ'' کہتے تھے اور اسے ہندوستان ہی کا ایک حصہ مانتے تھے۔

تقریباً ایک ہفتہ مجھے اس ہرے بھرے، سرسبز و شاداب، خوب صورت، آلودگی سے پاک اور بہار بداماں جزیرہ میں رہنے کا موقع ملا اور سوائے جافنا کے علاقہ کے — جو تمل ٹائیگرس کا مرکز تھا — اکثر علاقوں میں جانے کی نوبت آئی، اس پورے سفر میں ایک طرف مسلمانوں کے دینی مراکز کو دیکھ کر قلب و روح کو سکون حاصل ہوا، دوسری طرف وہاں کے قدرتی مناظر نے نگاہوں کو شادکام کیا، اس سفر میں دو ایسی باتیں میرے سامنے آئیں، جو کسی بھی ملک میں بسنے والی مسلمان اقلیتوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک: مکاتب کا نظام، جو جمعیۃ علماء سری لنکا کے تحت ہے، یہ جمعیۃ اس ملک میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے انداز کا

پلیٹ فارم ہے، جس میں تمام مکاتب فکر اور تنظیمیں جمع ہیں، انھوں نے یہاں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے منظّم اور منصوبہ بند نظامِ مکاتب کا قائم کیا ہے، جس کا کورس دس سال کے عرصہ پر مشتمل ہے، اس نصاب میں دین کی تمام بنیادی باتیں آ گئی ہیں اور کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اختلافی باتوں سے محفوظ رہے؛ اسی لیے شوافع (جو وہاں کی غالب آبادی ہے) کے ساتھ ساتھ اہل حدیث اور دیو بندی حضرات کے ساتھ ساتھ بریلوی مسلک کے حاملین سب اسی نصاب کو پڑھتے ہیں، اس نصاب میں ہندوستان کے ادارۂ دینیات ممبئی کے نصاب کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اس کے علاوہ جنوبی افریقہ اور بعض دوسرے ملکوں کے نصاب سے بھی فائدہ اُٹھایا گیا ہے، جمعیۃ کے ذمہ داروں نے طے کیا تھا کہ وہ دس سال میں سری لنکا کی تمام مسلمان آبادیوں تک مکتب کا یہ نظام پہنچادیں گے؛ تاکہ کوئی مسلمان بچہ دین کی بنیادی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے، اس منصوبہ کو تقریباً چھ سال کا عرصہ گذرا ہے اور وہ اپنے ہدف کے قریب ہے؛ بلکہ اُمید ہے کہ اپنے مقررہ وقت سے ایک دو سال پہلے ہی پورے سری لنکا کا احاطہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اقلیت کے لیے مکاتب کا نظام صرف تعلیم کا ذریعہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی ایک مؤثر تدبیر ہے، سری لنکا کی آبادی دو کروڑ ہے اور وہاں مسلم آبادی بیس لاکھ ہے، اس طرح دس سال کی منصوبہ بندی کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک لاکھ آبادی مکتب کے نظام سے جڑ جائے، اندازہ ایک لاکھ افراد میں سے مکتب میں پڑھنے والوں بچوں اور بچیوں کی تعداد بیس، پچیس ہزار ہوگی، یہ ایک بڑا کام ہے، ہندوستان میں بھی اس وقت شدید ضرورت ہے کہ ملک کے چپہ چپہ پر مکاتب کا جال بچھا دیا جائے، محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کم و بیش بیس کروڑ ہے، اس میں اگر مکتب کے بچوں کی تعداد پچیس فی صد مانی جائے، تب بھی یہ تعداد پانچ کروڑ ہو جاتی ہے، اس لیے بظاہر ان سب کو مکتب سے جوڑنا مشکل معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ ہندوستان میں بہت سے علاقوں میں مکاتب کا نظام پہلے سے قائم ہے، گاؤں گاؤں مسجدیں موجود ہیں اور مساجد میں ایسے ائمہ و مؤذّنین مقرر ہیں، جو بنیادی

دینی تعلیم انجام دینے کے لائق ہوتے ہیں، نیز علاقہ میں ایسے مدارس بھی موجود ہیں جو اپنے مضافات میں مکاتب کے نظام کی نگرانی کرسکیں، یہاں اگر اس کی منظّم کوشش کی جائے، خاص کر مدارس مقامی مسلمانوں کی مدد سے حسبِ ضرورت مکاتب قائم کریں تو یہاں بھی دس سال میں مکاتب کے اس نظام کو پورے ملک میں پہنچایا جاسکتا ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسا نظام تعلیم لانے کی کوشش کی جارہی ہے جو بچوں کو مشرکانہ افکار سے قریب کرسکے، ہندو دیو مالائی کہانیوں پر ان کا یقین قائم ہوجائے، اسلام اور مسلمان کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس صورتِ حال کا علاج اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا کہ نظامِ مکاتب کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ ہر مسلمان بچہ بنیادی دینی تعلیم حاصل کرلے، مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا مسئلہ نہ سیاسی کوششوں سے حل ہوگا نہ مسلمانوں کی معاشی ترقی سے، اس کا حل ایسی بھرپور جدوجہد میں ہے کہ کوئی مسلمان بنیادی دینی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ سری لنکا میں حالیہ رمضان المبارک کے شروع میں نہایت ہی تباہ کن سیلاب آیا، یہ ایسا سیلاب تھا جس نے پوری پوری بستی کو اُجاڑ دیا، اس موقع پر مسلمانوں نے دل کھول کر متأثرین کی مدد کی، اپنے اپنے گھروں کے ساتھ ساتھ مدرسے اور مسجدیں بھی برادرانِ وطن کے لیے کھول دیئے، لوگوں پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا، ہندوستان میں جیسے: آر، ایس، ایس نفرت کے پودے لگانے کا کام کرتی ہے، اسی طرز پر وہاں بودھ انتہا پسندوں کی تنظیم بی، بی، ایس قائم ہے، جس نے پورے ملک میں نفرت کی آگ سلگا رکھی تھی، اس ہنگامی صورتِ حال میں مسلمانوں کی خدمت سے متأثر ہوکر عوام نے اِن نفرت کے سوداگروں کو بُرا بھلا کہنا شروع کردیا اور فضا یکسر تبدیل ہوگئی، ملک کے وزیر اعظم نے اپنے خطاب میں کہا کہ تم لوگ مسلمانوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے تھے؛ لیکن اِس مشکل وقت میں انہوں نے تمہاری ایسی مدد کی ہے کہ تم نے خود بھی اپنے لوگوں کی ایسی مدد نہیں کی، اس تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہاں کی مسلم تنظیموں نے طے کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں مزید

کوشش کریں گے، خدمت اور اخلاق کے ذریعہ — ان شاء اللہ — نفرت انگیز فضا کو تبدیل کریں گے، یقیناً مسلمان اقلیتوں کے لیے ہر جگہ یہی عمل نسخہ کیمیا کا درجہ رکھتا ہے، اسلام نے اخلاق کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرنے کی دعوت دی ہے، مسلمانوں کو اسی وصف نے بہت کم عرصہ میں دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا اور پھر وہ جہاں بھی پہنچے، لوگوں کے محبوب بن کر رہے، نہ کہ مبغوض اور سماج میں ہر دل عزیز شمار کیے گئے نہ کہ ناپسندیدہ!

اسلام نے تصور دیا ہے کہ تمام انسان انسانی رشتہ سے بھائی بھائی ہیں؛ کیوں کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں (النساء:۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سب کا خدا بھی ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں۔ (رواہ بیہقی فی شعب الایمان، حدیث نمبر: ۵۱۳۷) حضرت زید بن ارقمؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ کے تمام بندے بھائی بھائی ہیں (ابوداود، حدیث نمبر: ۱۵۱۰) ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا: جو انسان پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا: ''من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ'' (مسلم حدیث نمبر: ۲۳۱۹) غرض کہ اسلام میں انسانی اخوت کا رشتہ بلا امتیاز مذہب تمام لوگوں کو ایک ڈوری میں باندھتا ہے، کفر وشرک اگرچہ اسلام کی نظر میں قطعاً ناقابل قبول عمل ہے؛ لیکن اس پر گناہ اور پکڑ کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ دنیا سے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ فرقہ پرست طاقتیں نفرت کی آگ سلگا رہی ہیں، مسلمانوں کے لیے اس کا علاج یہی ہے کہ ہم اخلاق اور محبت کے ذریعہ اس پروپیگنڈہ کو بے اثر کر دیں اور غیر مسلموں کے ساتھ اپنے سماجی تعلقات بہتر بنانے کی تیز تر کوشش کریں، نیز اپنے مذہبی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت کرتے ہوئے برادرانِ وطن کے ساتھ تعلق اُستوار کریں، بحمد اللہ! مسلم تنظیمیں اس کی طرف متوجہ ہوئی ہیں؛ لیکن ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے طور پر بھی اس کام کو انجام دے؛ تا کہ سماج میں نچلی سطح سے خوش گوار تعلقات قائم ہوں اور پورا ملک امن وآشتی کا گہوارہ بن جائے۔

فتاویٰ پر زمانہ وحالات کی تبدیلی کا اثر

دنیا کے بیشتر مذاہب کا حال یہ ہے کہ ان کے ماننے والوں کا رشتہ اپنے مذہب سے کٹ چکا ہے، ان کے یہاں صرف دو چیزوں میں مذہب کی حکمرانی قائم ہے، ایک: عبادت اور پوجا پاٹ، دوسرے: تہوار اور قدیم زمانہ سے مروج مذہبی تقریبات، اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے مذہب کو نکال باہر کر دیا گیا ہے، ان کے یہاں زندگی کے عام مسائل میں حلال وحرام کا تصور باقی نہیں رہا؛ اسی لیے ان کے یہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں پایا جاتا، جو مذہبی نقطۂ نظر سے رہنمائی کرے کہ کن کاموں کو کرنا چاہیے اور کن کو نہیں کرنا چاہیے؟ ان کے یہاں مذہبی پیشواؤں کا رول صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ وقت اور مقام کے بارے میں مبارک اور منحوس کی نشان دہی کریں، شادی بیاہ کی اور موت کی رسوم انجام دیں اور بس اور یہ بھی اس لیے کہ اِن کاموں سے مذہبی پیشواؤں کی آمدنی متعلق ہوتی ہے۔

اس سے صرف مسلمانوں کا استثناء ہے، ہر مسلمان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ ہم پر صرف عبادات یعنی نماز وروزہ اور حج وزکوٰۃ ہی میں احکام شریعت کی پابندی ضروری نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں اس کی دنیا وآخرت کی بھلائی احکام شریعت کی پیروی سے جڑی ہوئی ہے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، تجارت وکاروبار، خاندانی زندگی، لوگوں کے حقوق، جرم وسزا، سیاسی مسائل، مختلف قوموں کے ساتھ ارتباط غرض کہ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے آزاد ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا عبد ہے، یعنی ۲۴ گھنٹے کا غلام، ایسا غلام جو ہر چھوٹا بڑا کام اپنے آقا کے چشم واَبرو کے اشارہ پر کرتا ہو، جس کی نظر میں اپنے مالک کی خوش نودی کے لیے کھونا ہی پانا اور مرنا ہی جینا ہو اور جو اپنے خدا کے لیے لٹ جانے ہی کو سب سے بڑی سرفرازی اور کامیابی تصور کرتا ہو۔

زندگی میں ایسی ہمہ گیر اطاعت وفرماں برداری کے لیے ایک ایسے ادارہ کی ضرورت تھی، جو حلال وحرام اور جائز وناجائز کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کی رہنمائی کرے، اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مسلم معاشرہ میں فتاویٰ کا نظام قائم ہے، قرآن وحدیث میں

شریعت کے جو احکام آئے ہیں، ان میں بعض ایسی صراحت و وضاحت کے ساتھ منقول ہیں کہ ان میں کوئی ابہام نہیں ہے اور بعض وہ ہیں جو قابل تحقیق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت کس حد تک درست ہے؟ یا قرآن وحدیث میں کوئی حکم ایسے الفاظ میں دیا گیا ہے، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، ایسی ہدایات کے بارے میں اہل علم تحقیق وجستجو کے ذریعہ ان کی مراد متعین کرتے ہیں، اسی کو اسلامی قانون کی اصطلاح میں ''اجتہاد'' کہا جاتا ہے اور شریعت کی واضح تعلیمات اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کا نام ''فتویٰ'' ہے، مسلم سماج میں عہد نبوی اور عہد صحابہ سے ہمیشہ ایسے لوگ رہا کیے ہیں، جو فتویٰ دینے کی ذمہ داری انجام دیا کرتے تھے، مسلم حکومتوں میں بھی مفتی کا منصب ہوا کرتا تھا اور آج بھی بہت سے مسلم ملکوں میں مفتی کا منصب موجود ہے، جب کہ غیر مسلم ممالک میں دینی درس گاہیں اس فریضہ کو انجام دیتی ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر برصغیر کی ایک روشن تاریخ رہی ہے؛ چناں چہ فتاویٰ کے کتنے ہی مجموعے ہیں، جو نہ صرف عربی زبان بلکہ مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

قرآن وحدیث کے احکام میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور وہ ہمیشہ اسی تفصیل کے ساتھ باقی رہیں گے؛ لیکن اجتہادی احکام کی بنیاد بعض اوقات وقتی حالات، رواجات اور موجودہ آلات ووسائل پر ہوتی ہے، ایسے فتاویٰ پر بدلتے ہوئے حالات کا اثر پڑتا ہے، اسلامی قانون میں بعض حصوں کا ہمیشہ اپنی حالت پر قائم رہنا جہاں اس کو استحکام اور عدل وانصاف قائم کرنے کی صلاحیت فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف فقہ وفتاویٰ میں اپنے عہد کی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت اس کو ہر عہد میں قابل عمل بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسی پس منظر میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں قائم ''شیخ محمد ابراہیم للفتویٰ چیئر'' کے تحت ''فتاویٰ میں تبدیلی اور زمانہ وحالات کے اثرات'' کے زیر عنوان ایک بین الاقوامی سیمینار بتاریخ ۱۸-۱۹؍نومبر ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوا، جس میں اس بات پر بحث کی گئی کہ فتاویٰ پر زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کا کیا اثر پڑتا ہے اور خود فتاویٰ سماج پر کس طرح اثر انداز

ہوتے ہیں؟ اس سیمینار میں لوگوں کو براہِ راست مقالہ پڑھنے یا شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی؛ بلکہ دنیا بھر سے فقہاء، اصحابِ افتاء، فقہ اور اُصولِ فقہ پر کام کرنے والے مصنفین سے مقالہ لکھنے کی درخواست کی گئی، جن کی طرف سے پانچ سو مقالات وصول ہوئے، ان میں سے ڈیڑھ سو پہلے ہی مرحلہ میں چھانٹ دیئے گئے، بقیہ ساڑھے تین سو مقالات جائزہ کمیٹی (مجلس التحکیم) کو سپرد کیے گئے، کمیٹی نے ان مقالات کا جائزہ لے کر ٦٨ کا انتخاب کیا، ان ہی حضرات کو سیمینار میں مدعو کیا گیا؛ چوں کہ یہ مقالات کافی پہلے طلب کر لیے گئے تھے، اس لیے سیمینار کے موقع سے ہی چھ جلدوں میں ان کی طباعت بھی عمل میں آ گئی، پہلے سے ہر مقالہ نگار کو لکھ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مقالہ کا خلاصہ ایک تا ڈیڑھ صفحہ میں لکھیں اور اسی کو سیمینار میں پیش کریں؛ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ وقت کی کمی کی وجہ سے اس خلاصہ کو بھی پیش کرنے کی گنجائش نہیں رہی اور ہر مقالہ نگار کو پانچ منٹ کا وقت دیا گیا کہ وہ اس میں مقالہ کی بنیادی فکر کو پیش کرے، کسی لمبی بات کو مختصر کرنا اور پھر اچانک اس کو مختصر تر کرنا آسان نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

٦ ر صفر ۱۴۳۷ھ کو صبح نو بجے مدینہ یونی ورسٹی کے ’’ملک سعود آڈیٹوریم‘‘ میں پروگرام کا آغاز ہوا، جامعہ کے کلیۃ القرآن کے ایک استاذ نے بڑی نفیس آواز میں تلاوت کی، شیخ محمد ابراہیم چیئر کے استاذ ڈاکٹر سلیمان رحیلی نے استقبالیہ کلمات کہے، پھر جامعہ ازہر کے ایک بزرگ استاذ اور مالدیپ کے صدر نے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کیا، یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ابراہیم بن علی عبید کا کلیدی خطاب ہوا، پھر مملکت کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ نے اپنے خطاب کے ذریعہ سیمینار کا باضابطہ طور پر افتتاح فرمایا، شیخ عام طور پر مختصر خطاب پر اکتفا کرتے ہیں؛ لیکن آج انھوں نے نسبتاً تفصیل سے فتویٰ کی اہمیت اور اس کی نزاکت پر روشنی ڈالی، تمام ہی مقررین کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ فتویٰ دینا ایک نازک کام ہے، اس کے لیے گہری بصیرت اور ورع و دیانت ضروری ہے، اور آج کل اس سلسلہ میں جس بے احتیاطی سے کام لیا جا رہا ہے، اس سے اُمت کے لیے نئی مشکلات جنم لے رہی ہیں۔

اس کے بعد کل سات نشستیں منعقد ہوئیں، جن میں سے چھ نشستیں متوازی طور پر ہوتی رہیں، ایک: ملک سعود آڈیٹوریم میں، دوسری: کلیۃ الدعوۃ واصول الدین کے سیمینار ہال میں، ساتویں نشست ملک سعود آڈیٹوریم میں مشترک طور پر ہوئی، تمام نشستوں کی صدارت سعودی عرب کے بڑے علماء ومشائخ نے فرمائی، جن میں شیخ عبدالرحمٰن سدیس خطیب حرم مکی و صدر اُمورِ حرمین شریفین، شیخ حسین بن عبدالعزیز آل شیخ امام وخطیب مسجد نبوی اور شیخ صالح بن حمید امام وخطیب حرم مکی ومشیر دیوان مکی شامل ہیں، یہ نشستیں ۷؍صفر ۱۴۳۲ھ جمعرات کو بارہ بجے دن تک مکمل ہوگئیں اور اختتامی نشست ساڑھے بارہ سے ڈیڑھ بجے تک منعقد ہوئی، جس میں اعلامیہ اور تجاویز کی خواندگی ہوئی، یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے اس آخری نشست کی صدارت کی۔

اس سیمینار میں نہایت اہم موضوعات پر مقالے پیش کیے گئے، جیسے جدید مسائل پر فتویٰ دینے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ اقتصادی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کا فتویٰ پر کیا اثر پڑتا ہے، ٹیکنالوجی کی ترقی، سماجی تعلقات اور میڈیکل دنیا میں پیدا ہونے والے جدید وسائل کے سلسلہ میں مفتی کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟ مسلمان اقلیتیں جن حالات سے دوچار ہیں، مختلف ملکوں میں ان مسائل کو کیسے حل کیا جائے، عرف ورواج اور زمان ومکان کی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے فقہاء نے کیا راہ دکھائی ہے، موجودہ دور میں فتاویٰ کے سلسلہ میں بے جا شدت یا بے جا نرمی یا کسی مناسب سبب کے بغیر مسلمانوں کی تکفیر جیسے مسائل سے عالم اسلام کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے؟ یہاں تک کہ دنیا کے بہت سے خطوں میں اس کی بنیاد پر برادر کشی کی نوبت آگئی ہے اور فکری اختلاف نے نوبت قتل وقتال تک پہنچادی ہے، ان تمام پہلوؤں پر بڑے اہم مقالات پیش کیے گئے۔

اس حقیر کا مقالہ پہلی نشست میں رکھا گیا تھا، جس کا عنوان تھا ''فتاویٰ میں تبدیلی — مثالیں، قواعد اور احکام'' (تغیر الفتویٰ نظائر وضوابط و احکام) شیخ سدیس اس نشست کی صدارت کررہے تھے، انھوں نے شروع میں فتاویٰ کے موضوع پر مختصر؛ لیکن جامع

اور مفید گفتگو کی، اس کی وجہ سے وقت اور مختصر ہو گیا، اس حقیر نے صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اپنے مقالہ کے خلاصہ کو سات نکات پر تقسیم کر دیا تھا، جن میں ہر نکتہ صرف دو تین فقروں پر مشتمل تھا، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ بغیر روک ٹوک کے بات پوری ہوگئی، شیخ سدیس ہر مقالہ پر دو چار جملوں میں جچا تلا تبصرہ کرتے جاتے تھے، میری اس تحریر پر انھوں نے کہا کہ جب مضمون وسیع الجہات ہو اور وقت کم ہو تو اپنی بات پیش کرنے کے لیے یہ منہج بہت بہتر ہے جو فاضل مقالہ نگار نے اختیار کیا ہے کہ اپنی بات نمبروار ذکر کر دی جائے؛ تاکہ اصل مقصد سامنے آجائے اور بات لمبی بھی نہ ہو۔

راقم الحروف نے جو کچھ عرض کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) حکم شرعی اور فتویٰ دونوں بالکل ہم معنی نہیں ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک دقیق فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ حکم شرعی تو بندوں کے افعال سے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جس کی حیثیت اصل اور بنیاد کی ہے اور جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہے، جب کہ فتویٰ اللہ تعالیٰ کے احکام کو موجودہ حالات و واقعات پر منطبق کرنے سے عبارت ہے اور اس میں انسان سے غلطی واقع ہو سکتی ہے۔

(۲) فتاویٰ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ انسان کے کسی عمل کا جو حکم بیان کیا جاتا تھا، اب اس پر اس کے بجائے دوسرا حکم لگایا جائے، جیسے کسی چیز کو گذشتہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے حرام قرار دیا تھا، بعد کے فقہاء نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اسے مباح قرار دیا ہو، یا جس کو گذشتہ اہل علم نے جائز قرار دیا تھا، فتنہ کے اندیشہ یا حالات میں تبدیلی کی وجہ سے بعد کے اربابِ افتاء نے اس کو ناجائز قرار دیا ہو، قرنِ اوّل ہی سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔

(۳) جن فتاویٰ کی بنیاد قرآن مجید، معتبر حدیث یا اجماع پر ہو، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، ان میں تبدیلی کا مطالبہ گمراہی اور دین سے انحراف ہے، جیسا کہ آج کل بعض مغرب زدہ دانش وروں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

(۴) جن فتاویٰ کی بنیاد قیاس واجتہاد، عرف ورواج یا کسی خاص زمانہ کی مصلحت پر

ہو، ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے؛ بلکہ بعض حالات میں واجب ہوجاتی ہے، سلف صالحین کا ہمیشہ سے اس پر عمل رہا ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ، علامہ ابواسحاق شاطبیؒ، علامہ قرافیؒ اور علامہ ابن قیمؒ جیسے عبقری علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔

(۵) جن مسائل میں احادیث یا صحابہؓ کے فتاویٰ بظاہر متعارض ہوں یا کسی حدیث کے معتبر ہونے اور نہ ہونے میں معتبر فقہاء اور محدثین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو اور مختلف علماء نے اپنے ذوق کے مطابق ترجیح سے کام لیا ہو تو زمانہ کی تبدیلیوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے ترجیحات میں تبدیلی ہوسکتی ہے، یہ جو مذاہب اربعہ کے فقہاء نے بوقت ضرورت دوسرے مکتب فکر سے استفادہ کی اجازت دی ہے، وہ اسی قبیل سے ہے۔

(۶) فتاویٰ میں تبدیلی کی ضرورت پیش آنے کے بنیادی اسباب ''عرف و عادت میں تبدیلی، اخلاقی قدروں کا انحطاط، جدید آلات و وسائل کی پیدائش، مقام، جیسے مسلم اور غیر مسلم ممالک کا فرق، اقتصادی اور سیاسی نظام میں تبدیلی، وغیرہ'' ہیں، جن کی وجہ سے فتاویٰ میں تبدیلی کی نوبت آتی ہے۔

(۷) فتاویٰ میں تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجماع اور قطعی دلیل کے خلاف نہ ہو، شریعت کے بنیادی مقاصد سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو، اس کی مصلحتوں سے اس کے مفاسد بڑھ نہ جائیں اور ایسے فقہاء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے جو فقہی بصیرت بھی رکھتی ہو، اپنے زمانہ کے احکام پر بھی اس کی نظر ہو اور ورع و تقویٰ کی بھی حامل ہو۔

اس اجلاس میں زیادہ تر عالم اسلام بلکہ عالم عرب کے نمائندے شریک تھے، برصغیر سے صرف یہ حقیر ہی شریک تھا، معلوم ہوا کہ پڑوسی ملک سے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب تشریف لانے والے تھے؛ لیکن وہ نہیں پہنچ سکے، سبھوں کا ایک مشترک احساس یہ تھا کہ موجودہ دور میں فتاویٰ میں غیر معمولی افراط و تفریط پائی جاتی ہے، ایک طرف مغربی ملکوں میں مقیم بعض وہ اہل علم ہیں جو منصوص مسائل میں بھی تغیر کی بات کرتے ہیں، دوسری طرف قرآن و حدیث پر عمل کے دعوے دار وہ لوگ ہیں جو اپنے سوا تمام مسلمانوں کے عمل کو غلط ٹھہراتے ہیں، یہاں تک کہ

بعض غالی حضرات اس کی وجہ سے دوسروں کی تکفیر کرنے سے بھی نہیں چوکتے، تیسری طرف وہ متشددین ہیں جنھوں نے اپنے مخالف نقطۂ نظر کو نہ صرف کافر قرار دے دیا ہے؛ بلکہ ان کے قتل کو بھی جائز ٹھہرا دیا ہے اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف تلوار لے کر میدان میں کود پڑے ہیں، یہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے اعدائے اسلام کے مقاصد کو پورا کررہے ہیں، مساجد میں خودکش حملے، مسلکی بنیاد پر لوگوں کا قتل، پرتشدد طریقوں کا استعمال اور مخالفین کے ساتھ ایسی بے دردی اور سفاکی اختیار کرنا، جو اسلام اور انسانیت کے سراسر خلاف ہے، میں فتاویٰ دینے میں بے احتیاطی کا بھی دخل ہے۔

اسی طرح آج کل مختلف ٹیلی ویژن پر ایسے لوگوں کو مفتی مقرر کیا جارہا ہے، جنھیں نہ کتاب وسنت میں بصیرت حاصل ہے اور نہ فقہ سے کوئی مناسبت ہے، یہی حال انٹرنیٹ پر چلنے والی فتاویٰ کی بہت سے سائٹوں کا ہے، ان سے نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں، ان میں کہیں انتہا پسندی، غلو، اور کہیں اباحیت پیدا ہوتی ہے؛ اس لیے مسلم سماج کی تربیت ہونی چاہیے کہ فتویٰ دینے کی ذمہ داری ایسے لوگوں کو دی جائے جو واقعی اس کے اہل ہوں اور ایسے ہی لوگوں کے فتاویٰ قبول کیے جائیں۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اس کانفرنس کا اصل پیغام یہی ہے کہ مختلف نقطۂ نظر کے حاملین فتاویٰ میں ایسے غلو کا راستہ اختیار نہ کریں کہ اختلاف، اختلافِ رائے سے بڑھ کر جدال اور جدال سے بڑھ کر قتل وقتال تک پہنچ جائے، ایک دوسرے کی تکفیر کی جائے اور اختلافِ رائے کو ایسے نفرت انگیز طریقہ پر پیش کیا جائے کہ اسلامی اُخوت کی بنیادیں ریزہ ریزہ ہو جائیں اور انسانیت کو بھی شرم سار ہونا پڑے، جیسا کہ اس وقت بعض مسلم ممالک کی حالت ہے۔

سعودی عرب کے کسی علمی پروگرام میں شرکت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، اس سفر میں پانچ دنوں مدینہ منورہ میں قیام کا موقع ملا، چوں کہ حجاج جاچکے تھے اور عمرہ ویزا شروع نہیں ہوا تھا؛ اس لیے اژدہام نہیں تھا،

ہم لوگوں کا ہوٹل بھی مسجد نبوی کے صحن سے متصل اور روضۂ نبوی کے قریب تھا اور عصر سے فجر تک کا وقت خالی ہوتا تھا؛ اس لیے بار بار روضۂ شریف پر حاضر ہونے اور دیر تک اپنی گناہ گار زبان سے صلاۃ وسلام پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی، ایک غلام بے دام کے لیے اس سے بڑھ کر شرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کو اپنے آقا کے مبارک قدموں میں کھڑے ہونے کا موقع مل جائے، اسی طرح ریاض الجنۃ میں بھی آسانی کے ساتھ اور دیر تک نماز پڑھنے کا موقع ملا، غالباً اس سے پہلے اتنی سہولت سے اور اتنی دیر تک یہ مواقع میسر نہیں آئے تھے، مکہ مکرمہ بھی میں بھی طواف میں بڑی سہولت رہی اور مختصر لیکن بہتر طور پر وقت گذارنے کا موقع ملا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس گناہ گار بندے کو بار بار اپنی چوکھٹ پر حاضری دینے اور اپنے ایمان کو تازہ کرنے کا موقع عطا فرمائے۔

دارالقضاء اور محاکم شرعیہ، بعض قابل توجہ امور

اسلام صرف چند اعتقادات یا عبادات کا نام نہیں ہے؛ بلکہ یہ ہماری پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے، اس کا ایک اہم شعبہ معاشرہ اور سماجی زندگی ہے، جس میں نکاح، طلاق، والدین اور اولاد کے حقوق، زوجین کے باہمی تعلقات وغیرہ مسائل آتے ہیں، شریعت نے اگرچہ رشتہ نکاح کے توڑنے کو بہت ہی ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے؛ لیکن بعض دفعہ مزاج کی ناموافقت، باہم ظلم وزیادتی یا قدرتی اسباب کے تحت ایک دوسرے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو جانے کے سبب رشتہ کو ختم کر دینا ایک ضرورت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے؛ اسی لیے قرآن مجید نے رشتہ نکاح کے قطع کرنے کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے۔

رشتہ نکاح کے ختم ہونے کی بنیادی طور پر تین صورتیں ہوتی ہیں: طلاق، خلع اور فسخ۔

طلاق کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے؛ لیکن اس کو اس حق کا بے جا استعمال کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے، طلاق کے واقع ہونے میں بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہوتی —— خلع بھی طلاق ہی کی ایک صورت ہے؛ البتہ یہ صورت شوہر اور بیوی کی باہمی رضامندی سے انجام پاتی ہے، ان کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے کہ بیوی اپنے کسی حق سے دستبردار ہو جائے گی یا شوہر کو کچھ ادا کرے گی اور اس کے عوض شوہر طلاق دے گا، خلع کے لیے کسی خاص سبب کا پایا جانا ضروری نہیں، اگر بیوی کی طرف سے کسی زیادتی کے بغیر خلع کی نوبت آئی ہو تو شوہر کے لیے بیوی سے کوئی معاوضہ لینا یا اس سے اس کا کوئی حق معاف کرانا مکروہ ہے، اور عورت کی طرف سے زیادتی ہو تب بھی اس سے زیادہ وصول کرنا جو اس نے مہر کے طور پر دیا ہے، کراہت سے خالی نہیں ہے۔

لیکن بہر حال خلع، طلاق ہی کی ایک صورت ہے؛ اس لیے بنیادی طور پر خلع کے لیے شوہر کی اجازت ضروری ہے، اس کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ (البقرۃ: ۲۲۹) بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ جیسے مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو خلع دینے کا؛ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اگر اختلاف اور نفرت اتنی شدت اختیار کر گئی ہو کہ عورت

کسی بھی قیمت پر اس مرد کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہو تو قاضی کے لیے گنجائش ہے کہ وہ ان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دو ورنہ کم سے کم ایک حکم مقرر کر دے، اگر یہ دونوں کے خاندان سے ہوں تو بہتر ہے؛ ورنہ وہ اپنی طرف سے کسی شخص کو حَکَم کی ذمہ داری سونپ سکتا ہے، یہ حکم دونوں میں مفاہمت کی کوشش کرے گا اور اگر مفاہمت نہ ہو سکے اور اس کا احساس ہو کہ اگر چہ مرد یا عورت کی طرف سے کوئی ایسی زیادتی نہیں ہوئی ہے، جس کی وجہ سے نکاح فسخ کیا جاتا ہے؛ لیکن باہمی نفرت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اس رشتہ کو باقی رکھنے میں نکاح کے اصل مقاصد فوت ہو جائیں گے تو ایسی صورت میں قاضی حکم کی رائے پر اپنی طرف سے خلع کا فیصلہ کر سکتا ہے، یہ ایک استثنائی صورت ہے اور ہندوستان میں بھی دارالقضاء احتیاط کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں۔

رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی تیسری صورت ''فسخ و تفریق'' ہے، بعض صورتوں میں تو نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جاتا ہے اور اکثر صورتوں میں قاضی کے ذریعہ اسبابِ فسخ کے ثابت ہونے پر نکاح فسخ کیا جاتا ہے، قاضی سے مراد نکاح پڑھانے والے حضرات نہیں ہیں، ان کو تو برطانوی عہد میں قاضی کا نام دے دیا گیا اور پھر یہی نام مختلف علاقوں میں مروّج ہو گیا، فقہاء کی اصطلاح کے اعتبار سے قاضی وہ ہے جسے مسلمانوں کے باہمی نزاعات کو حل کرنے کے لیے فیصلہ کرنے پر مامور کیا گیا ہو، بنیادی طور پر اس کی دو ذمہ داریاں ہیں، ایک یہ کہ جو نزاعی معاملہ اس کے سامنے پیش کیا گیا ہو، وہ اس کی تحقیق کرے، دوسرے: اس پر شریعت کے احکام جاری کرے، مفتی اور قاضی میں یہی فرق ہے کہ مفتی کا کام واقعہ کی تحقیق نہیں ہے؛ بلکہ اس کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ اس سے جو سوال کیا جائے اس کا جواب دے دے؛ اسی لیے فقہاء کی اصطلاح میں اس کی ذمہ داری حکم شرعی کے بارے میں ''اخبار'' یعنی خبر دینا ہے، جب کہ قاضی کی ذمہ داری واقعہ کی تحقیق اور اس پر حکم شرعی کی تطبیق کے ذریعہ فریقین پر اس کو لازم قرار دینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کسی شخص کو منصب قضاء سونپنے کا اختیار کس کو ہے؟ تو اس سلسلہ میں دو

حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ مسلم ملک ہواور زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں قاضی مقرر کرنے کا حق سربراہ ملک کو ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہوں اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ ہوتو یہاں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے معاشرتی زندگی سے متعلق مقدمات کے فیصلہ کے لیے کسی امیر کا مطالبہ کریں، جو ان کے لیے قاضی مقرر کرے، اگر حکومت امیر مقرر کرنے کو تیار نہ ہوتو مسلمان قاضی کے تقرر کا مطالبہ کریں، اگر حکومت ایسا کر دے تو وہی قاضی ایسے معاملات کا فیصلہ کرے گا اور وہ شرعاً نافذ ہوگا؛ اسی لیے ہندوستان میں جب انفساخ نکاح مسلم قانون ۱۹۳۹ء میں بنا تو اس میں علماء کی طرف سے یہ دفعہ بھی تجویز کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے اس طرح کے مقدمات کے فیصلے کے لیے کوئی مسلمان قاضی یا جج مقرر کیے جائیں؛ لیکن افسوس کہ بعض آوارہ خیال نام نہاد مسلمان دانش وروں کی مخالفت کی وجہ سے یہ دفعہ شامل نہیں ہوسکی، ورنہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا ہوتا۔

اگر حکومت کی طرف سے یہ سہولت فراہم نہ کی جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی کو اپنا امیر منتخب کرلیں، وہ قاضی کا تقرر کرے اور وہ قاضی ان معاملات کا فیصلہ کرے، مسلمان غیر مسلم ملکوں میں بھی جن پر عمل کرنے کے پابند ہیں؛ البتہ امیر سے تنظیموں اور جماعتوں کے سربراہان مراد نہیں ہیں؛ کیوں کہ وہ تو صرف اپنی جماعت کے یا تنظیم کے سربراہ ہیں، امیر سے مراد وہ شخص ہے جس کو بحیثیت مجموعی امت کے تمام گروہوں نے مل کر منتخب کیا ہو، فقہاء احناف کی کتابوں میں امارت اور قضاء کے اس نظام کی صراحت و وضاحت موجود ہے اور علماء ہند میں خاص کر حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی کتاب ''مسئلہ امارت'' اس سلسلہ میں ایک بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے، ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں امارتِ شرعی کا نظام اسی اصول پر قائم ہوا ہے اور اس کے تحت قاضی مقرر ہیں، خاص کر بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور شمال مشرق کی سات ریاستوں میں دارالقضاء کا جال بچھا دیا گیا ہے اور مسلمان بکثرت اس سے رجوع کرتے ہیں۔

ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں امارت کا ایسا نظام قائم نہ ہوسکا، جس میں مسلمانوں کے تمام حلقے شامل ہوں؛ لیکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ایک ایسا ادارہ ہے جس میں مسلمانوں کا سوادِ اعظم اکٹھا ہے اور جو صرف کسی ایک تنظیم کی نمائندگی نہیں کرتا؛ بلکہ پوری ملت اسلامیہ کی نمائندگی کرتا ہے؛ اس لیے یہ بات طے کی گئی کہ بورڈ کا صدران صوبوں میں قاضی کا تقرر کرے، جہاں اس نوعیت کی امارت نہیں پائی جاتی ہے؛ اس لیے جن صوبوں میں نظام امارت قائم نہیں ہے، وہاں بورڈ کے تحت قاضی کا تقرر درست ہے۔

فقہاء مالکیہ کے نزدیک جہاں قاضی موجود نہ ہو، وہاں ''مجلس المسلمین''، یعنی چند اہل علم کی مجلس اس کام کو انجام دے سکتی ہے؛ لیکن ان کے نزدیک بھی جہاں قاضی موجود ہو، وہاں ایسی کسی مجلس کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے، ہمارے بعض بزرگوں نے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان میں قاضی کو اپنے فیصلے نافذ کرنے کی طاقت نہیں ہے، ہندوستان جیسے ملک میں مجلس المسلمین کے ذریعہ فیصلہ کرنے کو بہتر سمجھا؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قوت تنفیذ حاصل نہ ہونے کی دشواری اگر دارالقضاء کے ساتھ ہے تو یہی دشواری مجلس المسلمین کو بھی درپیش ہے، پھر یہ کہ مالکیہ کے یہاں مجلس المسلمین کی حیثیت کسی مستقل ادارہ کی نہیں ہے؛ بلکہ ایک وقتی اور عارضی مجلس کی ہے، جو بنے اور معاملہ طے ہونے کے بعد ختم ہوجائے، وقتی طور پر بننے والی ایسی مجلسیں سماج میں پیش آنے والے متواتر مسائل کو حل کرسکیں، یہ دشوار ہے؛ اسی لیے بعض مؤقر ملیّ تنظیموں نے شرعی پنچایت یا محکمہ شرعیہ کے نام سے مجلس المسلمین کے تصور کو اختیار کیا؛ لیکن عملاً اس کی شکل دارالقضاء کی ہی مماثل ہوگئی ہے اور وہ ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے، فرق صرف یہ ہوا کہ قاضی تنہا فیصلہ کرتا ہے؛ البتہ حسبِ ضرورت دوسرے اہل علم سے بھی مشورہ لے سکتا ہے، جیسا کہ عہد نبوی یا عہد صحابہ اور بعد کے ادوار میں ہوتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں فقہاء کی صراحتیں موجود ہیں، اور مجلس المسلمین میں ایک کمیٹی فیصلہ کرتی ہے؛ بہر حال اگر معاملات کے فیصلوں کے لیے چند افراد کی کمیٹی ہو اور وہ ذمہ دارانہ طریقہ پر فیصلہ کرے اور کسی ذمہ دار تنظیم یا مسلمانوں کے درمیان معتبر کسی ادارہ یا درس گاہ کے تحت ہو تو یہ بھی

دار القضاء کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس کے متبادل کے طور پر قابل قبول ہوسکتی ہے، اسی بنیاد پر ہندوستان کی ایک قدیم دینی تنظیم جمعیت علماء ہند کی طرف سے محاکم شرعیہ قائم ہیں۔

لیکن دار القضاء ہو یا محکمہ شرعیہ، احتیاط اور شرعی اصولوں کی تکمیل ضروری ہے اور اس سلسلہ میں بعض نہایت ہی افسوس ناک بے احتیاطیاں اور غلط فہمیاں سامنے آرہی ہیں، اس سلسلہ میں چار امور کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

اوّل یہ کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات آگئی ہے کہ جس طرح مردوں کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، ٹھیک اسی طرح عورتوں کو شریعت نے خلع دینے کا حق دیا ہے، اس طرح کا خیال ناپختہ علم دانش وروں ہی میں نہیں؛ بلکہ بعض مسلمان قانون دانوں میں بھی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اخبارات میں اشتہار دیا جاتا ہے کہ ''میری مؤکلہ فلاں نے اپنے شوہر فلاں ولد فلاں کو خلع دے دیا ہے'' یہ بالکل قانونِ شریعت سے ناواقفیت ہے، خلع کے لیے شوہر کی آمادگی ضروری ہے؛ البتہ مالکیہ کے نزدیک اس سے ایک صورت مستثنیٰ ہے، جس میں قاضی حکم کی رائے پر اپنی طرف سے خلع کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ قاضی کا منصب ایسا نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ قاضی ہوجائے، نکاح خواں ہونے کے لیے تو شرعاً کسی کی طرف سے تقرر ضروری نہیں ہے، عاقدین کی رضامندی سے کوئی بھی شخص ایجاب وقبول کراسکتا ہے؛ لیکن فسخ نکاح کے لیے کوئی شخص اپنے آپ قاضی نہیں ہوسکتا، یا مسلمانوں کی کوئی کمیٹی یا کوئی مسجد، مدرسہ اپنے طور پر کسی کو قاضی مقرر نہیں کرسکتے، نہ ان صورتوں میں شرعاً وہ شخص قاضی ہوگا اور نہ اس کا فیصلہ نافذ ہوگا — یہ بات بے حد افسوس ناک ہے کہ ملک کے مختلف شہروں میں بعض انجمنیں اپنے طور پر قاضی مقرر کررہی ہیں اور بعض حضرات تو اتنے ''خود مکتفی'' ہیں کہ وہ خود ہی اپنے کمرے پر قاضی کا بورڈ لگا دیتے ہیں، گویا دار القضاء نہ ہوا، ترکاری کی دکان ہوگئی، جس کا جی چاہا، کھول کر بیٹھ گیا، ہندوستان کے ایک ساحلی شہر میں اس طرح کے قاضیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ

اندیشہ ہے کہ مستقبل میں شاید مدعی اور مدعا علیہ کی تعداد کم ہو جائے اور قاضیوں کی بڑھ جائے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص چیف قاضی ہے، یہ نہایت جسارت انگیز حرکت ہے، ایسے لوگوں کا نکاح کے فسخ ہونے کا فیصلہ کرنا سخت گناہ ہے اور اگر وہ کسی عورت کے نکاح فسخ ہونے کا فیصلہ کر بھی دیں، تب بھی نکاح فسخ نہیں ہوگا اور عورت کے لیے شرعاً دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہوگی، سوچیے! یہ کس قدر گناہ، اللہ تعالیٰ سے بے خوفی اور آخرت کی جواب دہی سے لاپرواہی کی بات ہے! مسلم سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ قاضی بن جانے والے ایسے دھوکہ بازوں کو روکے اور مسلمانوں کے لیے قطعاً جائز نہیں کہ ایسے لوگوں کے پاس اپنا معاملہ لے جائیں، یہ تو شریعت کے ساتھ ایک مذاق ہے اور اس طرزِ عمل سے اسلام کا نظامِ عدل بے وقعت ہو کر رہ جائے گا۔

تیسرے: شرعی پنچایت یا محاکم شرعیہ کے نظام میں بھی باضابطگی ضروری ہے، باضابطگی سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی معتبر دینی تنظیم یا علاقہ کی بڑی دینی درس گاہ کے زیر انتظام کام کرتی ہو اور بطور خود کچھ لوگوں نے فیصلہ کرنا نہ شروع کر دیا ہو؛ بلکہ دیانت وتقویٰ، صلاحیت اور معاملہ فہمی کی بنیاد پر کسی ذمہ دار ادارہ نے تقرر کیا ہو اور اگر اس کے فیصلہ پر اطمینان نہ ہو تو مرافعہ کی گنجائش ہو، کسی منضبط نظام کے بغیر اپنے طور پر جو لوگ محکمہ شرعیہ قائم کر رہے ہیں، ان کا حال بھی خود ساختہ قاضیوں سے بہت مختلف نہیں ہے، مثلاً اسی طرح کی ایک مجلس جو ایک اور نام سے قائم ہے، اس کا ایک فیصلہ اس حقیر کے سامنے آیا، جس میں بیوی نے اپنے شوہر کے خلاف خلافِ فطرت فعل کا دعویٰ کیا تھا، اگر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو فسخ نکاح کی گنجائش موجود ہے؛ لیکن اس ادارہ نے شوہر کے نام نوٹس جاری کیا کہ آپ فلاں تاریخ کو حاضر ہو کر لعان کریں اور چوں کہ شوہر لعان کے لیے حاضر نہیں ہوا یا اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا؛ اس لیے اس کا نکاح فسخ کر دیا گیا، اس کی صراحت خود فیصلہ میں موجود ہے، لعان ایک شرعی اصطلاح ہے، یہ اس صورت میں ہے جب کہ شوہر بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور بیوی کو اس سے انکار ہو، نیز وہاں اسلامی حکومت قائم ہو اور شرعی حدود جاری ہوتی ہوں تو اس خاص

صورت میں تہمت اور زنا کی شرعی سزا کی جگہ دونوں سے لعان کرایا جائے گا، اب اس جہالت پر غور کیجیے کہ ایک تو یہ وہ معاملہ ہے ہی نہیں، جس میں شرعاً لعان کرایا جاتا ہے، دوسرے: ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، جہاں لعان کا حکم جاری ہوتا ہے، اسی طرح کئی ایسے فیصلے سامنے آئے ہیں، جن میں صرف بیوی کی ناپسندیدگی کی وجہ سے فسخ نکاح کا فیصلہ کردیا گیا — اسی طرح ایک شہر کا یہ معاملہ سامنے آیا کہ فریقین ایک دوسری ریاست کے رہنے والے ہیں، جب مدعیہ کو اپنی ریاست میں دارالقضاء سے فسخ نکاح کی ضمانت حاصل نہیں ہوئی تو اس نے ایک دوسری ریاست میں قائم اسی طرح کے محکمہ شرعیہ میں مقدمہ دائر کیا اور وہاں اس کو فسخ نکاح کی ڈگری دے دی گئی، ظاہر ہے کہ یہ بات شرعی اصولوں کے خلاف ہے اور کام کرنے والوں کی دیانت کو مشکوک کرتی ہے، نیز اس سے افراتفری اور فساد کا دروازہ کھل سکتا ہے، قاضی کا منصب تو ایک متفق علیہ شرعی منصب ہے، پھر بھی وہ اسی علاقہ کے مقدمات کو لے سکتا ہے، جس کی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے تو محکمہ شرعیہ کے لیے اس بات کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ ہو تو کسی اور جگہ اور مقدمہ کسی دوسری جگہ کا لے لے؟ یہ بددیانتی یا تکمیل شوق کا عمل تو ہوسکتا ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

چوتھی قابل توجہ بات عام مسلمانوں کے لیے ہے کہ انہیں اپنے مقدمات فیصلہ کے لیے شرعی معتبر اداروں میں لے جانے چاہئیں، جن میں فقہ وفتاویٰ سے واقف لوگ قضا کا کام کرتے ہوں، واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیق کی جاتی ہو اور شرعی اصولوں کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہوں، سرکاری عدالتوں میں جانے سے بچنا چاہیے؛ کیوں کہ ان عدالتوں پر مقدمات کی بڑی تعداد کا بوجھ ہے، اس کی وجہ سے فیصلہ میں بے حد تاخیر ہوجاتی ہے، فریقین کا بڑا سرمایہ خرچ ہوتا ہے، جو محض مال کا ضیاع ہے، اکثر و بیشتر اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے لوگ حلف اٹھا کر جھوٹ بولتے ہیں، گویا دنیا کا بھی ضیاع ہے اور دین کا بھی، مال بھی خرچ ہوتا ہے، عزت و وقار کی بھی نیلامی ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ فسخ نکاح کے مقدمات میں شرعی اعتبار سے فیصلہ کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان قاضی ہی نے فیصلہ کیا

ہو؛ کیوں کہ یہ فیصلے اس حیثیت سے کیے جاتے ہیں کہ قاضی کو عام مسلمانوں پر ولایت حاصل ہے اور شرعاً مسلمانوں پر مسلمان ہی کی ولایت حاصل ہوسکتی ہے۔

غرض کہ خود ساختہ قاضی اور خود ساختہ مجلس فیصلہ شرعی اعتبار سے قطعاً درست نہیں ہے، نہ ایسے لوگوں کا فیصلہ کرنا درست ہے نہ ان کے پاس معاملات کو لے جانا جائز ہے اور نہ ان کے فیصلوں کا کوئی اعتبار ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ نظام قضاء کو ملک کے کونے کونے تک پہنچا دیا جائے، مسلمانوں میں مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے معاملات کو دارالقضاء میں پیش کریں اور اس کے فیصلہ پر عمل کریں، خواہ ان کی خواہش اور مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، نیز دارالقضاء یا محاکم شرعیہ کے نظام کو زیادہ سے زیادہ پختہ اور منضبط بنایا جائے اور خود ساختہ قاضیوں اور فیصلہ کمیٹیوں سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔

یکساں سول کوڈ — حقیقت کے آئینہ میں!

ہندوستان میں جس وقت انگریزوں کے خلاف جہد و جہد جاری تھی اور ہندوستان کے تمام شہری اس بدیشی دشمن کے خلاف سیسہ کی دیوار بنے ہوئے تھے، اس وقت فکر و نظر، تہذیب، قومی مفادات، زبان، نسل اور جغرافیائی تعلق میں تفاوت کے باوجود جو چیز ان سب کو سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار بنائے ہوئی تھی، وہ یہی تصور تھا کہ آزادی کے بعد یہ ملک سیکولرزم کی راہ پر چلے گا، ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر جماعت سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی انفرادی زندگی میں آزادی حاصل ہوگی، مسلمان جو مذہبی اعتبار سے زیادہ باحمیت واقع ہوئے ہیں، ممکن نہ تھا کہ وہ اس تیقن کے بغیر اس لڑائی میں شریک ہوتے، آزادی سے پہلے ہمیشہ 'قومی لیڈران' مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور اس میں عدم مداخلت کا یقین دلاتے رہے، مہاتما گاندھی جی نے خود بھی گول میز کانفرنس لندن ۱۹۳۱ء میں پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ کہا تھا: ''مسلم پرسنل لا کو کسی بھی قانون کے ذریعہ چھیڑا نہیں جائے گا'' — جنگ آزادی کے سالار مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا: نہ تو کانگریس ہی کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی اس مقصد سے قیامت تک متفق ہوسکتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصائص ختم ہوجائیں اور وہ ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہوکر جرمن یا انگریز قوم کی طرح ہندوستانی قوم کے سوا کچھ نہ رہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ہری پور میں کانگریس نے اعلان کیا: ''اکثریت کی طرف سے مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی'' پھر ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' پاس ہوا، جس نے زیادہ صراحت کے ساتھ مسلم پرسنل لا کو آئین کا حصہ بنا دیا۔ پھر آزادی حاصل ہونے کے بعد جب ہندوستان کا دستور بنا، تو قانون کے سب سے اہم حصہ 'بنیادی حقوق' کی فہرست میں ایسی دفعات بھی رکھی گئیں، جن سے ''مسلم پرسنل لا'' کی حفاظت ہوتی ہے، دستور ہند کی آرٹیکل ۲۵ میں مذہبی قوانین کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے؛ چنانچہ دفعہ ۲۵ کا ترجمہ حسب ذیل ہے: ۲۵ (۱): پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ نیز باب: ۳ میں دی ہوئی دیگر دفعات کے تابع ہر شہری کو مذہبی عقائد پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور

اس کی تبلیغ کی اجازت ہوگی۔ دفعہ ۲۵ میں دی گئی مذہبی اُمور کی اس ضمانت سے مذہبی رسوم اور ہندوؤں میں اچھوتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کو مستثنیٰ کرنے کی غرض سے دو اور تشریحی دفعات بڑھادی گئیں، جو حسب ذیل ہیں: ۲۵ (۲) (الف) کسی اقتصادی، مالی، سیاسی یا دیگر سیکولر مسئلہ میں جس کا تعلق مذہبی رسم سے ہو، پابندی عائد کرنا یا اسے ریگولیٹ کرنا۔ ۲۵ (۲) (ب) سوشیل ریفارم کی خاطر پبلک ہندو اداروں کے دروازے تمام ہندوؤں کے لئے کھولنے کے سلسلہ میں اقدام کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'مذہبی اُمور' میں حکومت بالکل دخل انداز نہ ہوگی، ہاں اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کوئی چیز اصلاً مذہبی ہونے کے بجائے کسی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان ایک رسم کے طور پر مروج ہو، مثلاً: جہیز، تلک وغیرہ، اس میں حکومت مداخلت کر کے ظلم کی روک تھام کر سکے گی، دوسرے: ''اچھوتوں'' کے سلسلے میں جو امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس کا سدباب کرے گی اور وہ مذہبی حق متصور نہ ہوگا۔ پھر ان ''بنیادی حقوق'' کو ناقابل تنسیخ بنانے کے لئے دستور کی آرٹیکل ۱۳ (۲) میں یہ بات صاف کردی گئی کہ حکومت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جو باب: ۳ میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کے خلاف ہو، یا اس میں کمی کرے — اس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ (جس کا تعلق مسلمانوں کے رسوم ورواج سے نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اعتقادات اور اسلامی تعلیمات کی بنیادوں — قرآن وحدیث — سے ہے) نہ صرف مسلمانوں کا بنیادی حق قرار پایا؛ بلکہ ناقابل تنسیخ ٹھہرا۔ اس بنیادی حق کے ساتھ ملک کے لئے جو 'رہنما اصول' وضع کئے گئے، اس کی دفعہ (۴۴) یوں رکھی گئی: ''(۴۴) ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو'' ظاہر ہے یہ دفعہ، دفعہ (۲۵) سے متصادم ہے، دفعہ ۲۵ کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے ان کے مذہب کے مطابق قوانین ہوں، جب کہ یہ دفعہ سب کے لئے یکساں قانون وضع کرنے کی متقاضی ہے اور اس کا صاف مطلب ہے کہ حکومت کبھی بھی مسلم پرسنل لا یا کسی دوسرے ''مذہبی پرسنل لا'' پر دست درازی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ پر مختلف مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ جناب محمد اسماعیل صاحب، جناب بی، پوکر

صاحب، جناب نظیر الدین الدین احمد صاحب اور جناب محبوب علی بیگ صاحب نے تنقید کی اور اس سے مسلم پرسنل لا کو مستثنیٰ رکھنے کا مطالبہ کیا، جناب نظیر الدین صاحب نے کہا: انگریز ۱۷۵ برس میں جو نہ کر سکے، یا جس کے کرنے سے گھبراتے رہے، اسی طرح مسلمانوں نے ۵۰۰ سالہ دورِ حکومت میں جو کچھ کرنے کی ہمت نہیں کی، ہمیں ریاستوں کو اتنا اختیار نہ دینا چاہیئے کہ وہ سب کچھ بیک وقت کر گزریں۔ مگر ڈاکٹر امبیڈکر (چیرمین دستور ساز اسمبلی) نے ایک نہ سنی؛ البتہ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے کہا: کوئی حکومت اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال کر کے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ نہیں کر سکتی، میرے خیال میں اگر کسی نے ایسا کیا تو ایسی حکومت پاگل ہی ہوگی، مگر یہ معاملہ اختیارات کے استعمال کا ہے نہ کہ بذات خود اختیارات کا۔ رہنما اصول کی یہی دفعہ ہے جس کے بطن سے ''یکساں سیول کوڈ'' کا فتنہ پھوٹا ہے اور جس کی صدائے بازگشت سننے میں آتی رہتی ہے۔ دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ دفعہ (۴۴) کا تعلق مذہبی قوانین سے جوڑا جا رہا ہے؛ حالاں کہ اس کا تعلق دراصل دفعہ (۲۵) کی اس استثنائی دفعہ سے تھا، جس میں کہا گیا ہے کہ 'مذہبی رسوم' جن کی مذہب میں کوئی اصل نہ ہو، حکومت کی مداخلت سے ماورا نہیں ہوں گے، گویا غیر مذہبی اُمور میں ریاستوں کو دفعہ ۴۴ کے ذریعہ ''یکساں قانون سازی'' کا اختیار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ممبئی ہائی کوٹ کے بینچ نے — جو جناب عبدالکریم چھاگلا اور جناب گجندر گدکر پر مشتمل تھا — مقدمہ بنام تارا سوا ما پالی میں دفعہ (۴۴) کے حدود پر مفصل رولنگ دی تھی، اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

مذہبی رسوم، پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ، نیز سماجی بہبود کے خلاف ہو تو ایسے رسوم کو مفاد عامہ کے پیش نظر پس پشت ڈالا جا سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفاد عامہ (جس میں یکساں سول کوڈ کو داخل کیا جا رہا ہے) کو جس چیز پر ترجیح حاصل ہے، وہ مذہبی رسوم ہیں، نہ کہ مذہبی اعتقاد اور مذہبی اعتقاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والے قوانین۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ''رہنما اصول'' کی دفعہ (۴۴) کا

تعلق مذہبی قوانین سے بھی ہے اوراس کے ذریعہ ریاستوں کو مذہبی معاملات میں بھی یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا اختیار دیا گیا ہے تو بھی ''مسلم پرسنل لا'' کا قانونی موقف کافی مضبوط رہتا ہے، اس لئے کہ بنیادی حقوق کی حیثیت دستور کی روح اور بنیاد کی ہے، جب کہ ''رہنما اصول'' کی حیثیت محض ایک اخلاقی ہدایت کی ہے، بنیادی حقوق کی اس اولیت اوراہمیت کو اکثر ماہرین قانون کے علاوہ ملک کے قائدین نے بھی تسلیم کیا ہے؛ چنانچہ آنجہانی جناب جواہر لال نہرو، سابق وزیر اعظم ہند نے ''بنیادی حقوق'' کی رپورٹ پر بیان دیتے ہوئے کہا: بنیادی حق کو کسی وقتی دشواری کے تحت نہ دیکھنا چاہئے؛ بلکہ اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ آپ اسے دستور میں مستقل مقام دے رہے ہیں، بنیادی حقوق کے علاوہ دوسرے امور کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ عارضی ہیں۔اس لئے اگر ان دونوں دفعات کے درمیان تعارض تسلیم کرلیا جائے تو بھی مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا تعلق چوں کہ ''بنیادی حقوق'' سے ہے، اس لئے وہ مقدم ہے اور قابل ترجیح ہے۔افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہماری معزز عدالتیں اپنے افکار، اپنے جذبات اور سماجی زندگی سے متعلق اپنے تصورات کو قانون پر فوقیت دینے لگی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عدالتیں کبھی ازخود طلاق اور تعدد ازواج کے مسئلہ کو اُٹھاتی ہے، کبھی نفقہ مطلقہ کے مسئلہ کو اور بار بار حکومت کو یکساں سول کوڈ کے سلسلہ میں یاد دلاتی ہیں، کبھی عدالت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مسلم خواتین کی بے آبروئی کے قضیہ کو اٹھائے اور حکومت کو اس کی ذمہ داری یاد دلائے، مطلقہ سے زیادہ دشوار صورت حال بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی ہوتی ہے، عدلیہ کو خیال نہیں ہوا کہ وہ فسادات میں بیوہ اور یتیم ہوجانے والے سینکڑوں؛ بلکہ ہزاروں عورتوں اور بچوں کے سلسلہ میں حکومت کو ان کی ذمہ داری یاد دلائے اور مجرموں کے خلاف قدم اٹھائے، مسلم عورت کی پسماندگی کا اصل سبب طلاق نہیں ہے؛ بلکہ مسلمانوں کی بے روزگاری ہے، عدلیہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اس مظلوم طبقہ کو روزگار کے مواقع دیئے جائیں، عورتوں کے لئے سب سے تکلیف دہ صورت حال ان کے شوہروں اور گھر کے مردوں کی نشہ خواری سے پیدا ہوتی ہے اور رہنما اصول میں یہ بات بھی موجود ہے کہ ملک میں مکمل نشہ بندی

ہونی چاہئے؛ لیکن اس کے بارے میں نہ حکومت سوچتی ہے، نہ عدلیہ ہدایت دیتی ہے، نہ دانش وروں میں کوئی فکر پیدا ہوتی ہے؛ حالاں کہ طلاق کے واقعات کا پیش آنا بہت ہی بری بات ہے؛ لیکن مسلم معاشرہ میں اس کا تناسب ہندوؤں سے کم ہے اور بہت سی طلاقیں بیوی کے مطالبہ یا اس کی رضامندی سے ہوتی ہیں اور زیادہ تر حالات میں عورت طلاق کے بعد بے سہارا نہیں ہوتی، اس کے والد، بیٹے، بیٹیاں اور بھائی، بہن اس کی کفالت کرتے ہیں؛ لیکن عدالت کی ساری توجہ اسی ایک مسئلہ پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 'یونیفارم سول کوڈ' مختلف وجوہ سے ہمارے ملک کے لئے مناسب نہیں ہے، ایک تو اس سے اقلیتوں کے مذہبی حقوق متاثر ہوں گے، جو دستور کی بنیادی روح کے خلاف ہے، دوسرے: یکساں قانون ایسے ملک کے لئے تو مناسب ہوسکتا ہے، جس میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے اور ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہوں، ہندوستان ایک تکثیری سماج کا حامل ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، کثرت میں وحدت ہی اس کا اصل حسن اور اس کی پہچان ہے، ایسے ملک کے لئے یکساں عائلی قوانین قابل عمل نہیں ہیں، تیسرے: مذہب سے انسان کی وابستگی بہت گہری ہوتی ہے، کوئی بھی سچا مذہبی شخص اپنا نقصان تو برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن مذہب پر آنچ کو برداشت نہیں کرسکتا؛ اس لئے اگر کسی طبقہ کے مذہبی قوانین پر خط نسخ پھیرنے اور اس پر خود ساختہ قانون مسلط کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مایوسی کے احساسات اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ ملک کی سالمیت کے لئے نقصان دہ ہے، ہمارے سامنے ناگاؤں اور میزوؤں کی واضح مثال موجود ہے کہ انھوں نے اس کے بغیر علَم بغاوت کو نہیں جھکایا کہ ان کو کچھ خصوصی رعایتیں دی جائیں، جن میں ان کے لئے اپنے قبائلی قانون پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ مختلف گروہوں کو اپنے اپنے قوانین پر عمل کی اجازت دینا ملک کے مفاد میں ہے، اس سے قومی یکجہتی پروان چڑھے گی، نہ یہ کہ اس کو نقصان پہنچے گا۔

مسلمانوں کو تو یونیفارم سول کوڈ پر اعتراض ہے ہی؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو عملی طور پر خود اکثریتی فرقہ بھی اس کو قبول نہیں کرے گا، ہندوؤں کی مختلف ذاتیں ہیں اور نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے الگ الگ طریقے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ملک کے سارے ہندوؤں کا ایک ہی طریقہ ہو، حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے بنیادی عقائد اور عبادات کی باتوں میں بھی یکساں نہیں ہیں، کوئی مورتی پوجا کا قائل نہیں ہے، کوئی قائل ہے، کوئی راون کو برا بھلا کہتا اور رام کو پوجتا ہے، کوئی رام کو برا بھلا کہتا ہے اور راون کی پرستش کرتا ہے، خود نکاح کے سلسلہ میں دیکھیں کہ شمالی ہند میں ماموں اور بھانجی کے درمیان نکاح کا تصور نہیں؛ لیکن جنوبی ہند میں بہن کا اپنے بھائی پر حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی سے نکاح کرلے، قبائلوں کے یہاں خاندانی رسم و رواج بالکل مختلف ہیں، آج بھی بعض قبائل میں ایک مرد ایک درجن سے زائد عورت سے نکاح کرسکتا ہے، یہاں تک کہ ابھی بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں کہ ایک عورت ایک سے زیادہ مرد کے نکاح میں ہوتی ہے، جس ملک میں مذاہب اور تہذیبوں کا اس قدر تنوع پایا جاتا ہو، وہاں ایک ہی قانون تمام گروہوں کے لئے کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟

جو لوگ یکساں سول کوڈ کے وکیل ہیں، وہ بنیادی طور پر دو باتیں کہتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی، دوسرے: جب یورپ میں تمام قوموں کے لئے یکساں قانون ہوسکتا ہے تو ہندوستان میں کیوں نہیں ہوسکتا؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں، قانون سے قومی یکجہتی پیدا نہیں ہوتی، قومی یکجہتی، رواداری، تحمل اور ایک دوسرے کے معاملہ میں عدم مداخلت سے پیدا ہوتی ہے، دنیا کی دونوں جنگ عظیم بنیادی طور پر ایسی دو قوموں کے درمیان ہوئی ہے، جن کا مذہب ایک تھا، جن کی تہذیب ایک تھی، جن کا قانون اور طرز زندگی ایک تھا، یہ ساری وحدتیں جنگ کو روکنے اور قومی وحدت پیدا کرنے میں ناکام رہیں، خود مسلم ممالک میں دیکھئے کہ عراق و ایران، شام و افغانستان کے مختلف گروہوں کے درمیان اس کے باوجود جنگیں ہورہی ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہی مذہب اور ایک ہی قانون کی حامل ہیں، ہندوستان ہی کو دیکھئے کہ یہاں مختلف راجاؤں کے درمیان جنگوں کی ایک

طویل تاریخ ہے، یہ سب ایک ہی طریقہ زندگی پر چلنے والے لوگ تھے؛ لیکن یہ وحدت ان کو جوڑ نہیں پائی اور آج بھی فرقہ وارانہ فسادات اس لئے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کا معاشرتی قانون الگ ہے اور ہندوؤں کے خاندانی رسوم ورواجات الگ ہیں؛ بلکہ اس کے برعکس مذہبی قانون سے ہٹ کر جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دام محبت میں گرفتار ہو کر بین مذہبی شادی رچاتے ہیں تو اس سے فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہوتا ہے اور قومی یکجہتی پارہ پارہ ہو جاتی ہے؛ اس لئے یہ سوچنا قطعاً غلط ہے کہ قانون کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی، ویسے بھی عائلی زندگی کے علاوہ تمام قوانین میں پہلے سے یکسانیت موجود ہے؛ لیکن کیا یہ یکسانیت قومی اتحاد کو برقرار رکھنے میں کافی ثابت ہو رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قومی یکجہتی اس بات سے پیدا ہوگی کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنی تہذیب کو پروان چڑھانے کا موقع دیا جائے، اس سے ہر گروہ میں اطمینان ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہ اس ملک میں برابر کے شہری ہیں، اس سے حب الوطنی میں اضافہ ہوگا، احساس محرومی ختم ہوگا، بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہوگا اور یہی قومی یکجہتی ہے، ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہر چیز میں یکسانیت اور وحدت پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، اگر آپ قانون ایک کر بھی دیں تو ملک میں جو مختلف تہذیبی اور ثقافتی گروہ ہیں، جن کے لباس و پوشاک، رہن سہن، خوشی وغم کے اظہار کے طریقے، زندگی گزارنے کے انداز، سماجی رسوم ورواجات الگ الگ ہیں اور اس کی جڑیں ان کے مذہب، موسم، جغرافیائی محل وقوع، خاندانی روایات اور نسلی خصوصیات میں پیوست ہیں، کیا ان کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ بات قابل غور ہے کہ مذہب، تہذیب اور زبان کا یہ تنوع کوئی عیب ہے یا یہ اس ملک کا حسن ہے؟ گلاب کا ایک پھول بھلا لگتا ہے یا مختلف پھولوں کا گلدستہ؟ پھول کا ایک پودا خوبصورت نظر آتا ہے، یا طرح طرح کے پودوں پر مشتمل پھلواری؟ ظاہر ہے کہ جو خوبصورتی اس تنوع میں ہے، وہ خوبصورتی اس وحدت میں پیدا نہیں ہو سکتی، جس کے پیچھے جبر اور دباؤ کا دخل ہو، ہندوستان کو اس کے معماروں نے گلدستہ بنایا ہے نہ کہ ایک پھول، اس ملک کے سینچنے والوں نے اس کو نوع

بہ نوع درختوں کا ایک باغ سدا بہار بنایا ہے نہ کہ صرف ایک ہی طرح کے درختوں کا باغیچہ، اس کے بنانے والوں کے ذہن میں تھا کہ یہ ملک ایک چراغ ہمہ رنگ ہو، یہی ہمہ رنگی اس کا حسن اور یہی تنوع اس کی پہچان ہے۔

یورپ کی جو مثال ہندوستان کے لئے پیش کی جاتی ہے، وہ بالکل بے محل ہے، ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ پورا یورپ اس کے ایک حصہ میں سما جائے، اور ہندوستان کی آبادی اتنی کثیر ہے کہ شاید پورا یورپ مل کر بھی اس کی ہمسری نہ کر سکے؛ اس لئے ہندوستان جیسے ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس میں تنوع کو برقرار رکھا جائے اور ایسی وحدت پر زور نہ دیا جائے، جو اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے — مشرقی ملکوں اور مغربی ملکوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مغرب میں لوگوں کا مذہب سے سنجیدہ اور جذباتی تعلق نہیں ہے؛ ان کے یہاں ایک دو تیوہاروں کے سوا مذہب سے زندگی کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، مردم شماری کے ریکارڈ میں صرف خاندانی روایت کے طور پر کسی مذہب کا نام لکھا دیا جاتا ہے؛ اس لئے مذہبی قوانین کے ختم کئے جانے پر ان کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا اور یہ دراصل چرچوں کے ظالمانہ رویہ کے خلاف عوام کی بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے قید آزادی کا نتیجہ ہے، جس کی ایک کڑوی تاریخ ہے، ہندوستان کی یہ صورت حال نہیں ہے، ہندوستان میں بسنے والے لوگ مذہب سے جذباتی تعلق رکھتے ہیں؛ اسی لئے جب ۱۹۵۶ء میں ہندوؤں کے لئے باضابطہ قانون بنا تو خود صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس سے دل برداشتہ تھے، اور اسی لئے ہندوؤں سے متعلق قوانین میں ہر جگہ اس بات کو شامل کرنا پڑا کہ اگر کہیں مقامی رسم ورواج اس کے خلاف ہو تو اس کو ترجیح ہوگی۔

یکساں سول کوڈ کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور سیکولر ملک میں مذہبی قوانین کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے — یہ بھی محض غلط فہمی ہے، سیکولرازم کا کوئی ایک مفہوم متعین نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں میں وہاں کے حالات اور مصالح کے لحاظ سے اس کا مفہوم متعین کیا گیا ہے، سیکولرازم کا ایک مفہوم وہ ہے، جو فرانس نے

اختیار کیا ہے، جس کی بنیاد مذہب کی مخالفت پر ہے، جو چاہتا ہے کہ کوئی مذہبی شناخت باقی نہ رہے تو بہتر ہے، جو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں مذہبی ہدایات پر عمل کرے، سیکولرازم کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہ ہو، سرکاری طور پر کسی خاص مذہب کی پشت پناہی نہ ہو؛ لیکن ملک کے ہر شہری کو اپنی نجی زندگی میں مذہب پر عمل کرنے کی گنجائش ہو، بیشتر مغربی ممالک میں اسی مفہوم کے اعتبار سے سیکولرازم کو اختیار کیا گیا ہے اور ہندوستان میں بھی اسی کو برتا گیا ہے، نیز اسی کے مطابق دستور کی تدوین عمل میں آئی ہے؛ اس لئے یہ بات بالکل بے محل ہے کہ چوں کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے: اس لئے یہاں عائلی زندگی سے متعلق مذہبی قوانین کی گنجائش نہیں۔

یہ بات بھی بہت عجیب لگتی ہے کہ بی ، جے ، پی نے یونیفارم سیول کوڈ کو اپنے ایجنڈے میں رکھا ہے، یہ فرقہ پرست پارٹی بنیادی طور پر برہمنی فکر کی نمائندہ ہے اور آر، ایس، ایس، کا سیاسی بازو ہے، جو ہندوستان میں ’ منوواد‘ کو واپس لانا چاہتی ہے، یہ اپنے آپ کو ہندوؤں کے حقوق کا محافظ قرار دیتی ہے، اگر اس نے ایسے مسائل کو اپنی فہرست میں رکھا ہے، جن میں ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یا جن کا مقصد ہندوؤں کی بالا دستی قائم رکھنا ہو تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کا آپسی مسئلہ ہے، اگر اس پر مسلمان عمل کریں تو اس سے ہندوؤں کو نہ فائدہ ہے نہ نقصان ؛ بلکہ ایک طرح سے فائدہ ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تحت مسلمان اور ہندو کے درمیان رشتہ نکاح قائم نہیں ہوسکتا، اس طرح وہ بات پیش نہیں آئے گی، جس سے یہ حضرات خوفزدہ ہیں اور جس کو غلط طریقہ سے انھوں نے ’’لو جہاد‘‘ کا نام دے رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے نفرت اور اقلیتوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے سوا اس کا کوئی اور محرک نہیں ہوسکتا۔

اور صرف بی، جے، پی کا رونا کیوں کر رویا جائے؟ افسوس تو انگلی پر گنے جانے والے ان چند نام نہاد مسلمانوں پر ہے، جو فرقہ پرست اور اسلام دشمن عناصر کا آلہ کار بن کر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، میں ان کی مجبوری سے اچھی طرح واقف ہوں، وہ دراصل

اپنی بے روزگاری کا حل نکالنا چاہتے ہیں؛ کیوں کہ جو لوگ صلاحیت کی بنا پر نہیں؛ بلکہ خوشامد کی بنا پر سرکاری مناصب حاصل کرتے ہیں، وہ چاہے عمر کے کسی مرحلہ میں ہوں، اس سے محروم ہوکر بے قرار ہو جاتے ہیں، کیا کہا جائے کہ اس وقت ہر چیز کی قیمت بڑھتی جارہی ہے، انسان اپنی ضروریاتِ زندگی خریدنے سے عاجز ہوتا جارہا ہے؛ لیکن ایک چیز ہے جو سستی ہوتی جارہی ہے، سستی سے سستی اور ارزاں سے ارزاں تر، اور وہ ہے کچھ لوگوں کا ضمیر، یہ ضمیر کے سوداگر ہیں اور کوڑیوں میں اپنا مال بیچتے ہیں، ان کے لئے ہدایت ہی کی دُعا کی جاسکتی ہے۔ **وباللہ التوفیق وھو المستعان!**

مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی بھیانک نتائج کا پیش خیمہ ہوگی

اسلام ایک ایسا جامع نظام حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لیے راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے جس طرح ہمیں عبادات کا طریقہ بتایا اسی طرح معاشرت اور خاندانی زندگی کے بارے میں بھی ہماری مکمل راہنمائی کی۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ نظام زندگی کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا کر خدا کی بندگی کا عملی اظہار کریں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ انسان قرآن وحدیث کے بنائے ہوئے اصولوں میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کا حق نہیں رکھتا۔ آج میں سیدھے سیدھے لفظوں میں کہنا چاہوں گا کہ مسلم پرسنل لاء خاندانی زندگی سے متعلق ان اسلامی قوانین کا نام ہے جن میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کو جگہ نہیں دی جاسکتی تبدیلی نا قابل قبول ہے اور حکومت کی طرف سے اگر اس سمت میں کوئی کوشش ہوئی تو ملکی سطح پر اس کے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے۔ اس وقت معاملہ صرف نکاح وطلاق کے نظام میں تبدیلی کا ہی نہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کے وجود کو مٹانے کی منظّم سازش رچی جارہی ہے۔ حکومت اس وقت ملک پر جو مذہبی نظریہ تھوپنے کی کوشش کررہی ہے اگر اس کو روکا نہیں گیا اور اس کے خلاف ہماری مذہبی بیداری سامنے نہیں آئی تو ہماری آئندہ کی نسلیں دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ اور ان کا مذہبی تشخص پامال ہوکر رہ جائے گا۔ جو لوگ خدائی قانون پر یقین نہیں رکھتے ان کے یہاں رسم ورواج کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اس لیے ہمیں عملی طور پر خدائی قانون کی عظمت کو تسلیم کرنا ہوگا کیوں کہ ہم کسی بھی ایسے نظام کو قبول نہیں کر سکتے جس کا اللہ کے قانون کے ساتھ ٹکراؤ ہو۔ شریعت ایپلیکیشن ایکٹ 1937 ہمارے آئین کا حصہ ہے اور دستور کے دفعہ 25 میں جس وضاحت کے ساتھ مذہبی آزادی کا ذکر ہے اس کے خلاف کسی عملی اقدام کو قبول کر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آئین میں دی گئی مذہبی آزادی کو چھین کر حکومت کا چور دروازے سے کامن سول کوڈ لانے کی کوشش کرنا خود ملک کے دستور کے ساتھ بے وفائی اور کھلا ہوا مذاق ہے۔ طلاق بے شک ایک ناپسندیدہ عمل ہے لیکن بعض حالات میں ہماری ضرورت بن جاتا ہے، جیسے آپریشن

ایک ناگوار عمل ہے لیکن جب علاج کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے تو ہر عقل مند آدمی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب زوجین کے درمیان نااتفاقی بڑھ جائے اور شادی کا بنیادی مقصد مفقود ہونے لگے تو طلاق ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن مذاہب میں طلاق کا تصور نہیں تھا انہیں بھی اس عمل کی اہمیت کو قبول کرنا پڑا۔ ہندوستان جیسے وسیع وعریض کثیر مذہب والے ملک میں کامن سول کوڈ کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت اور نہ ہی اس سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی۔ بلکہ اس کے برخلاف لوگوں میں احساسِ محرومی پیدا ہوگا اور حب الوطنی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گا۔ اس لیے حکومت کو اس معاملے میں ایمان دارانہ سوچ کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اسلامی اصولوں کو اپنا کر ہی معاشرہ کو امن وعافیت کی راہ پر لایا جا سکتا ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے سماج میں برائی کی جڑیں کمزور ہوں گی۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو جسمانی اور روحانی تسلی دی، بیماری میں انسان حق بات کو قبول کرنے کے لیے زیادہ تیار ہوتا ہے، آج پوری دنیا میں نظریاتی وتہذیبی کش مکش بہت گرم ہوگئی ہے اور ہر نظریے کے علمبردار اپنے نظریے کی تبلیغ کر رہے ہیں اور اس کے لیے بڑی بھاری رقم خرچ کرتے ہیں۔ جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ دین اسلام ایک عالم گیر دین ہے جو تمام انسانوں کو اپنا پیغام دینا چاہتا ہے۔ یہ اللہ عزوجل کا پسندیدہ دین ہے۔ یہی وہ کامل دین ہے جو تمام سفینۂ زندگی کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے، یہ ایک عالمی پیغام ہے جس سے کوئی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہی انسانیت کی تمام مشکلات کا واحد حل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ دعوت دین کا کام امت مسلمہ کے لیے شرف وفضیلت کی بات ہے، کیوں کہ انسانیت کو صحیح عقیدے کی دعوت دے کر آدمی اپنا شمار اس عظیم مقصد رسالت میں کراتا ہے جس کے لیے انبیاء ورسل کی بعثت عمل میں آئی۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی سے مسلمان ایک بڑے مقصد کی تکمیل کرتا ہے جس سے خیر امت کے مقام کو وابستہ کیا گیا ہے، لہٰذا امت مسلمہ کا ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت انفرادی

طور پر اس کی ذمہ داری ہے کہ دین اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دے۔ دعوت الی اللہ کی یہ ذمہ داری جو امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے اس کی حیثیت اختیاری نہیں کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ یہ ذمہ داری ایسی ہے کہ ہر حال میں بقدر استطاعت اس کو پورا کرنا ضروری ہے، اس معاملے میں کوئی بھی عذر قابل قبول نہیں۔

مسلم پرسنل لاء اور خواتین کے حقوق

شریعتِ اسلامی کا سب بڑا امتیاز عدل اور اعتدال ہے، اردو زبان میں عدل کے معنی ’’ انصاف ‘‘ کے کیے جاتے ہیں، لیکن یہ اس لفظ کی مکمل ترجمانی نہیں ہے، عدل کے معنی ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے لحاظ سے ذمہ داری سونپنے اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے اس کے حقوق متعین کرنے کے ہیں، ایک شخص پانچ کیلو وزن اٹھا سکتا ہو اور ایک شخص دس کیلو، تو عدل یہ ہے کہ دونوں کو اس کی طاقت کے لحاظ سے بوجھ اٹھانے کا مکلّف کیا جائے ، ایک شخص کی خوراک چار روٹی ہو اور دوسرے کی دو روٹی، تو عدل یہ ہے کہ دونوں کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے روٹیاں تقسیم کی جائیں ، جو چیز عدل سے ہٹ جاتی ہے، اس میں کہیں افراط پایا جاتا ہے اور کہیں تفریط، اس لئے جو بات عدل کی ہو، وہی راہِ اعتدال بھی ہوتی ہے۔

اسلام نے انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان فرائض اور حقوق کی تقسیم میں عدل کا طریقہ اختیار کیا ہے، سماجی اور خاندانی زندگی میں بھی مردوں اور عورتوں سے متعلق جو فرائض اور حقوق مقرر ہیں ، وہ بھی نہایت عادلانہ اصولوں پر مبنی ہیں اور پوری طرح انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں، خدا نے اس کائنات کو مساوات اور برابری کے اصول پر نہ بنایا ہے اور نہ بسایا ہے، بلکہ فطرت نے صلاحیتوں اور ضرورتوں کے اعتبار سے اکثر مواقع پر تفاوت کو قائم رکھا ہے، انسان اگر اسے مٹانا چاہے تو یہ فطرت سے بغاوت ہوگی اور فطرت سے بغاوت ہمیشہ نقصان ہی پہنچاتی ہے۔

انگریزی اخبار کے ایک الم نگار کا خیال ہے کہ ’مسلم پرسنل لا بورڈ‘ مردوں کا طرف دار ہے، اور اس کی ساری لڑائی مردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے،—— اس طرح کی بات مختلف حلقوں سے وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے —— یہ بالواسطہ طریقہ پر خود مسلم پرسنل لا اور قانونِ شریعت پر حملہ ہے، لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے، اگر یہ لوگ صرف بورڈ کے مرتب کیئے ہوئے ’مجموعہ قوانین اسلامی‘ ہی کو گہری نظر سے دیکھیں، تو ان کو ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہوگی ، مجموعہ کی دفعہ : ۲ میں نکاح کو مرد و عورت کے درمیان شرعی اصولوں پر طے پانے والا

معاہدہ قرار دیا گیا ہے، اس طرح مرد و عورت کو اس معاہدہ کا دو فریق تسلیم کیا گیا ہے، نہ کہ مردوں کو مالک اور عورتوں کو ان کی ملکیت، نکاح میں عورت کے اختیار اور اس کی رضا کو اہمیت دیتے ہوئے، نیز اس کے مفادات کی حفاظت کرتے ہوئے دفعہ: ۴۸ میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں باپ، دادا کی خود غرضی، لالچ، ذاتی مفاد کی رعایت وغیرہ ثابت ہو، تو اس نے نابالغ لڑکی کا جو نکاح کیا ہو، وہ لازم نہیں ہوگا، دفعہ: ۱۹ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ لڑکی کا ولی بلا عذرِ معقول نکاح سے گریز کرے، تو قاضی یا نسبتاً دور کے ولی کو بھی نکاح کر دینے کا حق حاصل ہوگا، دفعہ: ۱۰۴ میں یہ بات لازم قرار دی گئی ہے کہ عاقلہ، بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت ہی سے کیا جائے، ورنہ نکاح درست نہیں ہوگا، دفعہ: ۱۲۲ میں عورت کو اختیار دیا گیا ہے کہ شوہر اس کا ہم پلہ نہ ہو تو وہ اپنا نکاح فسخ کر سکتی ہے۔

اس مجموعہ میں مہر کے احکام بہت تفصیل و تاکید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ دفعہ: ۱۲۸ میں کہا گیا ہے کہ اگر عورت سے نکاح کے وقت مہر نہ ہونے کی شرط کر لی جائے، تب بھی مہر واجب ہوگا، اگر نکاح کے وقت مہر متعین نہ ہو، تو مہر مثل یعنی خاندان کی دوسری عورتوں کے مہر کی مقدار میں مہر واجب ہوتا ہے، دفعہ: ۱۴۸ میں اس کے لئے عورت کے آبائی خاندان کو معیار بنایا گیا ہے، دفعہ: ۱۵۰ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر مہر معجّل ہو، تو عورت اس کی ادائیگی تک اپنے آپ کو روک سکتی ہے۔

اسی طرح اس مجموعہ میں نفقہ سے متعلق احکام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اس کا بنیادی مقصد عورت کے حقوق کا تحفظ ہے، دفعہ: ۱۶۳ میں کہا گیا ہے کہ بیوی مسلمان ہو یا کتابیہ، امیر ہو یا غریب، تندرست ہو یا بیمار، اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہوگا، نکاح کے بعد عورت میکہ ہی میں ہو؛ لیکن اسے اپنے شوہر کے یہاں جانے سے انکار نہ ہو تو دفعہ: ۱۶۶ میں اس کا نفقہ بھی شوہر کے ذمہ واجب قرار دیا گیا ہے، دفعہ: ۱۷۲، ۱۷۳ میں شوہر کی اجازت سے میکہ میں مقیم عورت نیز وہاں رہتے ہوئے اس کا علاج اور ولادت کے موقع پر آنے والے اخراجات شوہر کے ذمہ واجب قرار دیئے گئے ہیں، دفعہ: ۱۸۲ میں عورت کو اس کا حق دار قرار

دیا گیا ہے کہ شوہر کے چھوڑے ہوئے مال سے وہ اپنا نفقہ حاصل کرلے، اور اگر کوئی مال نہ ہوتو دفعہ: ۱۸۳ کے تحت قرض لے سکتی ہے، دفعہ: ۱۸۴ میں کہا گیا ہے کہ اگر بیوی نفقہ معاف کردے، تب بھی اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اور اس کو دوبارہ نفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا، دفعہ: ۱۸۸ میں عورت کی پوشاک کے معاملہ میں موسم اور عرف کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے، اور دفعہ: ۱۸۹ میں کہا گیا ہے کہ شوہر پر بیوی کی رہائش کے لئے مناسب حال رہن سہن کی بنیادی ضرورتوں پر مشتمل علاحدہ جگہ دینا ضروری ہے۔

دفعہ: ۲۰۵ میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور ایذا رسانی سے بچنے، دفعہ: ۲۰۶ میں اعتدال کے ساتھ ایک دوسرے کی جنسی خواہش پورا کرنے کے واجب ہونے اور دفعہ: ۲۰۸ میں جنسی تعلق میں فطری طریقہ کی پابندی کے احکام ہیں، دفعہ: ۲۰۹ میں عورت کی اجازت کے بغیر مرد کو نرودھ استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے، دفعہ: ۲۱۰ میں لکھا ہے کہ بیوی کو اسقاطِ حمل یا مانع حمل اشیاء کے استعمال پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، دفعہ: ۲۰۷ میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر بیوی کو شوہر سے خطرہ ہو، تو شوہر اسے سفر میں ساتھ لے جانے پر مجبور نہیں کرسکتا، اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو خوراک، رہائش، لباس اور شب باشی میں ان کے درمیان برابری کا سلوک ضروری ہے، دفعہ: ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶ میں طلاق سے پہلے اصلاحِ حال کی تدابیر بتلائی گئی ہیں، دفعہ: ۲۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ شوہر کے لئے کسی بھی حال میں بیوی کو اپنے گھر سے نکال دینا جائز نہیں۔

دفعہ: ۲۲۰ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ لڑکی یا اس کے والدین یا اس کے اقارب سے مطالبہ کرکے نقد یا سامان لینا رشوت اور حرام ہے اور اس کو واپس کرنا واجب ہے، اسی طرح اگر مطالبہ نہ ہو لیکن عرف ورواج میں لڑکے کو کچھ دینے کی رسم نے شرطِ نکاح کا درجہ حاصل کرلیا ہو، تو دفعہ: ۱۲۲ میں اسے بھی رشوت اور ناجائز قرار دیا گیا ہے، دفعہ: ۲۲۲ میں کہا گیا ہے کہ شوہر و بیوی کے اولیاء یا اقارب جو تحفہ دلہن کو دیں، وہ اسی کی ملکیت ہوگی اور عورت ہی کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہوگا، اگر لڑکی کے باپ نے لڑکی کے لئے سامانِ جہیز فراہم کیا اور نکاح

سے پہلے اس کی موت ہوگئی، تو وہ سامان اسی لڑکی کی ملکیت ہوگی، دوسرے ورثہ کا اس میں کوئی حق نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہو: دفعہ: ۲۲۶)

حق پرورش میں ماں اور اس کے قرابت داروں کو ترجیح دی گئی ہے (دفعہ: ۱۳۲) یہاں تک کہ اگر خلع میں عورت کے حق پرورش سے دستبرداری کی شرط لگادی گئی ہو، تب بھی یہ شرط باطل ہوگی، (دفعہ: ۲۴۵) اگر عورت مطلقہ ہو اور بچہ اس کے زیر پرورش ہو، تو وہ بچہ کے باپ سے اجرتِ پرورش، اور دودھ پلا رہی ہو، تو اس کے ساتھ دودھ پلائی کی اجرت کی بھی حقدار ہوگی (دفعہ: ۲۴۷) قانونِ طلاق کے باب ششم میں تفویض طلاق سے متعلق دفعات ہیں، جس کے ذریعہ عورت کو اپنے آپ پر طلاق واقع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

خلع کا ایک مستقل باب چار دفعات پر مشتمل ہے، جس میں عورت کے لئے کوئی وجہ بتائے بغیر شوہر سے علاحدگی کی راہ بتائی گئی ہے، فسخ وتفریق کا باب دفعہ: ۳۲۲ تا ۳۴۴ پر مشتمل ہے، ان دفعات میں ان عورتوں کی دشواری کا حل پیش کیا گیا ہے، جو شوہر کی طرف سے ظلم یا حق تلفی کا شکار ہیں، خواہ یہ حق تلفی قصداً ہو یا عجز ومجبوری کے تحت اور ان صورتوں میں فسخ نکاح کی گنجائش رکھی گئی ہے، دفعہ: ۳۷۳ شق: ''ذ'' میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر بیوی کو کوئی چیز ہبہ کی گئی ہو، تو اس سے رجوع نہیں کیا جاسکتا، گو زوجین کے درمیان علاحدگی ہوگئی ہو، قانون میراث میں بیوی، بیٹی، بہن، ماں، نانی، دادی وغیرہ کے حقوق تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اسی طرح بعض لوگ جو بیٹی بہن وغیرہ کو حق میراث سے محروم کردیتے ہیں، ان کو خواتین کے حق کے سلسلہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

یہ عائلی زندگی سے متعلق آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مرتب کئے ہوئے 'مجموعہ قوانین اسلامی' کا سرسری جائزہ ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قانونِ شریعت میں خواتین کی کتنی زیادہ رعایت ہے اور بورڈ نے اس کو دفعہ وار مجموعہ کی شکل دے کر خواتین کے حقوق کا تحفظ کرنے کی کتنی بہتر اور مؤثر کوشش کی ہے؟ اس کے علاوہ بورڈ نے ایک نکاح نامہ بھی مرتب کیا ہے، اس نکاح نامے کا بھی اصل مقصد مظلوم خواتین کے لئے انصاف کو آسان

کرنا اور عدالتوں کی سرگرانی سے بچانا ہے۔

آج جس مغربی تہذیب کو عورت کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، اگر گہرائی کے ساتھ سوچا جائے تو اس نے عورت کی تذلیل میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے اور آزادی کے نام پر اس کو اِس بات پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ فرائض مادری کو بھی ادا کرے اور فریضہ پدری کا بھی کچھ حصہ اپنے ذمہ لے لے، اسے بچے بھی پیدا کرنا ہے، اپنے بچوں کو دودھ پلانا اور ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی انجام دینا ہے، امورِ خانہ داری سے بھی نمٹنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملازمت بھی کرنی ہے اور کسبِ معاش میں بھی ہاتھ بٹانا ہے، پھر اس کی رسوائی کا سروسامان اس طرح کیا گیا کہ ماچس کی ڈبیہ سے لے کر زیورات، کپڑوں اور فلموں کے اشتہار تک ہر جگہ اس کے حسن کو بے حجاب اور غیرت وحیاء کو بے لباس کیا جاتا ہے، کیا کوئی شریف انسان اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو بے لباسی کی حالت میں دیکھنا گوارہ کرے گا، پھر کیسا ظلم ہے ان جوان اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جن سے ان کی غیرت سستے داموں خرید کی جاتی ہے اور ان کی غربت و احتیاج کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے، افسوس کہ ہمارے نام نہاد دانشوروں کو عورت کے ساتھ روا رکھا جانے والا یہ ستم نظر نہیں آتا، پھر بے حیائی کے عام ہونے اور مردانہ فرائض کا بوجھ عورتوں پر رکھ دینے کی وجہ سے خاندانی نظام بکھر رہا ہے، رشتے کھوکھلے ہوتے جارہے ہیں اور عورت جب اپنی جسمانی کشش کھودیتی ہے تو سماج میں ایک پرانے اور فرسودہ سامان کی طرح بے قیمت ہو جاتی ہے، اس پہلو کو یہ حضرات پیش نظر نہیں رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی تمام انسانی طبقات کے لئے سایہ رحمت ہے ؛ کیوں کہ وہ قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے اور انسان کے لئے وہی قانون اور نظامِ زندگی مفید اور نافع ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت سے مطابقت رکھتی ہو، اس سے منہ موڑنا، اپنے لئے انجام کار بربادی کو دعوت دینا ہے!

طلاق شدہ عورت کا نکاح

انسانی سماج کی تشکیل خاندان سے ہوتی ہے اور خاندان نکاح سے وجود میں آتا ہے، نکاح سے صرف میاں بیوی ہی کا رشتہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ دادیہالی، نانیہالی اور سسرالی خاندان بھی دراصل اسی رشتہ کا پھیلاؤ اور اس کی سایہ دار شاخیں ہیں، اسی لئے انسانی زندگی میں نکاح کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے اسلام میں نکاح کی بڑی ترغیب دی گئی ہے، اور تجرد کی زندگی کو اسی قدر ناپسند کیا گیا ہے۔

نکاح کے ذریعہ جو رشتے وجود میں آتے ہیں، جیسے والدین اور اولاد وہ قدرتی اور فطری ہوتے ہیں، ان رشتوں کا وجود میں آنا اور باقی رہنا انسان کی رضامندی اور خوشنودی پر موقوف نہیں ہے، یہاں تک کہ انسان ان رشتوں کو ختم کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا، لیکن خود نکاح ایسا رشتہ ہے جو انسان کی باہمی رضامندی اور اس کے اپنے ارادہ واختیار سے وجود میں آتا ہے، قاعدہ ہے کہ جو کسی رشتہ کو وجود میں لاسکتا ہے وہ اس رشتہ کو ختم بھی کرسکتا ہے، اس لئے نکاح کے ساتھ اس بات کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ اگر نکاح سکون کی چھاؤں بننے کے بجائے نفرت کا زہر گھولنے لگے، تو مرد وعورت ایک دوسرے سے مناسب طریقہ پر علاحدگی اختیار کرلیں، اسی کا نام ''طلاق'' ہے۔

جیسے نکاح ایک فطری ضرورت ہے، اسی طرح طلاق بھی بعض حالات میں ضرورت بن جاتی ہے، طلاق کی مثال بالکل آپریشن کی سی ہے، آپریشن ایک ناگوارِ خاطر عمل ہے، لیکن بعض اوقات انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ناگزیر ہوجاتا ہے، ایسے وقت میں آپریشن سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہوسکتی، اسی طرح ازدواجی رشتہ سکون اور طمانینت کی چھاؤں ہے، اور اس کا مقصد سفر زندگی کے سرد وگرم اور تلخ وشیریں حالات میں ایک دوسرے کی دل داری و غم خواری ہے، لیکن اگر زوجین کے درمیان ایسا بعد پیدا ہوجائے کہ یہ رشتہ دلداری کے بجائے دل ا؟ زاری کا باعث بن جائے، تو اس رشتہ کو ختم کردینے میں ہی شوہر اور بیوی دونوں کی بھلائی ہوتی ہے، اسی لئے اسلام نے ایک ناپسندیدہ ضرورت کی حیثیت سے طلاق کی گنجائش

رکھی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں ہندو اور عیسائی مذہب میں طلاق کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، ہندو مذہب میں بیوی کی حیثیت ایک طرح سے مملوکہ جائیداد کی ہے، اس لئے ملکیت اور وفاداری کا تقاضہ سمجھا گیا کہ وہ خواہی نہ خواہی اپنے آپ کو شوہر کے ساتھ جوڑے رہے، یہاں تک کہ اس وفاداری کا کمال یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کے ساتھ اپنے آپ کو نذر آتش کر لے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زندگی بھر بیوہ رہے اور خاندان میں ایک منحوس وجود کی حیثیت سے اپنے آپ کو باقی رکھے۔

بائبل میں حضرت مسیح کا قول نقل کیا گیا ہے کہ: ''جسے خدا نے جوڑا ہے اسے کوئی نہ توڑے'' اس فقرہ سے عیسائی علماء نے یہ بات مستنبط کی کہ نکاح کے بعد پھر اس رشتے کو توڑا نہیں جا سکتا، حالانکہ اس کی حیثیت محض ایک اخلاقی ہدایت کی تھی نہ کہ مستقل قانون کی، چنانچہ عیسائی مذہب میں نکاح کے بعد طلاق کا کوئی تصور نہیں، بعد کو چل کر جب لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر عورت زنا کی مرتکب ہو تو میاں بیوی میں تفریق کر دی جائے گی، اور پھر زنا کی دو قسمیں کی گئیں، جسمانی زنا یعنی بدکاری اور روحانی زنا یعنی عیسائیت سے ارتداد، لیکن یہ تفریق بھی صرف اس حد تک ہوتی کہ زوجین ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں، لیکن عورت کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں ہوگی، گویا عیسائی مذہب میں بھی مطلّقہ کے نکاحِ ثانی کا کوئی تصور نہیں۔

اسی پس منظر میں چند سال پہلے ایک غیر معمولی خبر یہ آئی کہ برطانیہ کے شہزادہ چارلس نے اپنا دوسرا نکاح مطلّقہ خاتون سے کیا ہے، یہ شہزادہ کا ایسا جرم تھا کہ برطانیہ کے قصر شاہی میں ملکہ نے ان کی تقریبِ نکاح رکھنے سے انکار کر دیا، اور جب یہ جوڑا تفریح کے لئے امریکہ گیا تو صدرِ امریکہ جناب بش نے صاف طور پر کہا کہ ان کے استقبال کے لئے وہائٹ ہاؤس کا دروازہ بند ہے، گویا برائی اور بدکاری کوئی عیب نہیں ہے؛ لیکن قانونی رشتہ اتنا بڑا عیب ہے جس کو کسی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا، مغرب اپنے آپ کو ایک ترقی یافتہ معاشرہ قرار دیتا ہے، لیکن دوسری طرف فکر و خیال کی پستی اور قانونِ فطرت سے بغاوت کا یہ حال ہے کہ آج بھی

مطلّقہ سے نکاح کو عیسائی روایت کی بنیاد پر مذموم سمجھا جاتا ہے، کیا یہ عمل انصاف اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے کہ مطلّقہ عورت بے آبرو ہو اور اپنی عفت و پاکدامنی کا سودا کرے تو یہ تذلیل قابل قبول ہے؟ اور وہ اپنا نیا گھر بسائے تو اس کی اجازت نہ ہو؟

ہندو معاشرہ میں بھی مطلّقہ اور بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا ہے اس لئے جب کوئی عورت شوہر کی موت یا کسی اور وجہ سے تنہا ہو جاتی ہے، تو اسے ہمیشہ تنہائی اور کس مپرسی ہی کی زندگی گذارنی پڑتی ہے، یہ صورتِ حال عورتوں کے لئے سراسر نا منصفانہ ہے، اوّلاً تو یہ عورت کو مجبور اور غیر محفوظ بنا کر رکھنا ہے، شوہر بیوی کے لئے معاشی کفالت کا بھی ذمہ دار اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ بھی ہے، شوہر کی موجودگی خود اس کے لئے بہت بڑا حصار ہے، دوسرے قدرت کی طرف سے انسان میں جو صنفی جذبات رکھے گئے ہیں، عورت کے ان جذبات کا قتل بھی ہے، جب کہ نفسیاتی طور پر ایک ایسی عورت جو ازدواجی زندگی گذار چکی ہو، ان جذبات کا زیادہ احساس وادراک رکھتی ہے، تیسرے یہ غیر فطری زندگی عورت کو غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، اور اس سے نہ صرف اس عورت کی عزت پامال ہوتی ہے؛ بلکہ سماج میں بھی گندگی پھیلتی ہے، اور اخلاقی بگاڑ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

اسلام نے تجرد کی زندگی کو ناپسند کیا ہے، خواہ کنوارے مرد و عورت ہوں یا وہ پہلے شادی شدہ رہ چکے ہوں اور اب تجرد کی حالت میں ہوں، قرآن مجید نے خاص طور پر حکم دیا ہے کہ جو مرد بغیر بیوی کے ہوں یا عورتیں بغیر شوہر کے، ان کے نکاح کر دو، ''وانکحوا الایامیٰ منکم'' (نور:۳۲) اس کے مخاطب سرپرست اور اہل خاندان بھی ہیں اور سماج کے لوگ بھی، بعض دفعہ کسی کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے یا شوہر کی وفات ہو جاتی ہے اور مرد و عورت اولاد کی وجہ سے دوسرا نکاح کرنے میں حیا محسوس کرتے ہیں، حالانکہ وہ اس کے ضرورت مند اور خواہش مند ہوتے ہیں، ان حالات میں خاندان کے ذمہ دار لوگوں کا فریضہ ہے کہ وہ خود کھڑے ہوں اور اس فریضہ کو انجام دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجرد کی زندگی کو بہت ہی ناپسند فرمایا، آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے، اور جس کو میری فطرت پسند ہو اسے چاہیے کہ وہ میری سنت اختیار کرے، (مجمع الزوائد: ۴/۲۵۲) ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے جو لوگ تجرد کی زندگی گزار رہے ہوں وہ بدترین لوگ ہیں، "**شرارکم عزابکم**" روایتوں میں انھیں شیطان کا بھائی قرار دیا گیا (دیکھئے: حوالہ سابق: ۴/۲۵۰) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو نکاح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے، وہ مجھ میں سے نہیں، "**من کان موسرا لان ینکح ثم لم ینکح فلیس من**" (حوالہ سابق: ۴/۱۵۲)

یہ ہدایات جیسے کنوارے مردوں اور عورتوں کے لئے ہیں، اسی طرح ان مردوں اور عورتوں کے لئے بھی ہیں جو ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد کسی وجہ سے اپنے رفیقِ حیات سے محروم ہو گئے ہوں، پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت مجموعی گیارہ نکاح فرمائے ہیں، ان میں سوائے امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب کی سب بیوہ یا مطلّقہ تھیں، ان میں متعدد ازواج وہ تھیں جو ایک سے زیادہ ازواج سے گزر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں تھیں، خود امّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایسی ہی ازواج میں سے تھیں، ان کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی تھے، اور دوسرے ابو ہالہ حضرت زینب بن خزیمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبیدہ بن حارث اور جہم بن حارث کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں امت کے لئے اسوہ ونمونہ رکھا گیا کہ سماج میں جو عورتیں مطلّقہ اور بیوہ ہوں ان سے نکاح کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے، اور نہ ان کو منحوس اور نامبارک تصور کرنا چاہیے، افسوس کہ ہندو سماج سے متاثر ہونے کی وجہ سے بیوہ اور مطلّقہ عورتوں کے ساتھ نا رَوا سلوک رَوا رکھا جاتا ہے اور ہر مطلّقہ عورت کے بارے میں یہ بات فرض کر لی جاتی ہے کہ اس کی غلطی اور بد خلقی کی وجہ سے طلاق کی نوبت آئی ہوگی، حالانکہ اکثر واقعات میں میاں بیوی کی علاحدگی میں نامناسب رویہ ان مردوں کا ہوتا ہے جو اپنی بیوی کے حقوق سے غافل اور بے پروا ہوتے ہیں، بیوہ اور مطلّقہ عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز اور

نامنصفانہ برتاؤ ظلم و جور بھی ہے اور بہت سی سماجی برائیوں کی جڑ ہے، لیکن حیرت ہے کہ ہندوستان کی اَن پڑھ اور توہمات کی اسیر عوام پر ہی نہیں بلکہ مغرب کے ''ترقی یافتہ ترقی پسند معاشرہ'' پر بھی ہے کہ ان کے یہاں گناہ تو کوئی عیب نہیں، لیکن انسان کی ایک فطری ضرورت آج بھی عیب شمار کی جاتی ہے!

طلاق شدہ خواتین اور سماج کی ذمہ داریاں

نکاح ایک ایسا رشتہ ہے جس کے ذریعہ شوہر و بیوی کو جہاں شریک حیات اور غمگسار میسر آتا ہے، وہیں عورت اور بچوں کو ایک سہارا حاصل ہوتا ہے، عورت ذہنی یکسوئی کے ساتھ بچوں کی پرورش کرتی ہے، بچے اطمینان وسکون کے ساتھ تعلیم وتربیت میں مشغول ہوتے ہیں، شوہر کسبِ معاش کی تگ ودو میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے اور گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رہتا ہے، اگر کسی وجہ سے یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو عورت سب سے زیادہ دشواریوں سے دوچار ہوتی ہے، اس کے لئے خود اپنی زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور بچے چوں کہ ماں کی ممتا کے بغیر زندگی کے ناہموار راستوں کا سفر طے نہیں کر سکتے ؛ اس لئے جیسے ایک مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپائے رکھتی ہے؛ اسی طرح ماں اپنی بے سہارگی کے باوجود بچوں کو اپنے سینہ سے چمٹائے رکھتی ہے اور بچے بھی ماں کی گود میں جو سکون و راحت محسوس کرتے ہیں، سونے کی پلنگ بھی انھیں وہ راحت نہیں پہنچا سکتی ؛ اسی لئے اگر رشتہ ٹوٹ جائے اور طلاق کی نوبت آجائے تو خاندان بکھر جاتا ہے اور ماں اور بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں۔

ایسے مسائل کو حل کرنے کے لئے شریعت نے نفقہ و کفالت کا ایک پورا نظام رکھا ہے اور اس میں عورت اور چھوٹے بچوں کی خصوصی رعایت کی گئی ہے، افسوس کہ ہمارے سماج میں ایک تو طلاق کے بے جا واقعات پیش آتے ہیں، اور اگر طلاق کا واقعہ پیش آ ہی گیا تو طلاق کے بعد مطلّقہ عورت اور بچوں سے متعلق جن حضرات کی جو ذمہ داریاں ہیں، وہ ان کو ادا نہیں کرتے ، اس کی وجہ سے بہت سے سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی کوتاہ عملی کی وجہ سے اسلام کی بدنامی ہوتی ہے اور لوگوں کو شریعت اسلامی پر زبان کھولنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر کسی عورت کو طلاق دی جائے تو عدت کا نفقہ تو واجب ہے ہی۔ (المحیط البرہانی:۳/۳۵۵) اور بہتر ہے کہ یک مشت کوئی رقم بھی دے دی جائے ؛ تا کہ مستقبل کی زندگی کے لئے کوئی سہارا بن سکے، اس کو ''متاع'' کہتے ہیں، قرآن مجید نے متاع دینے کی ترغیب دی ہے : ''وللمطلقات متاع بالمعروف'' (البقرۃ:۲۴۲) اور متاع کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، یہ

طلاق دینے والے مرد کی استطاعت اور اس کے ظرف کے اعتبار سے ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ زندگی گزار چکا ہے اور جس کو زندگی کی راہ میں اس نے تنہا چھوڑ کر بے وفائی کا ارتکاب کیا ہے، وہ اس کے ساتھ کیا حسن سلوک کرسکتا ہے؛ تاکہ اس کی اس حرکت کی کچھ تلافی ہوسکے۔

لیکن عدت کے خرچ اور متاع کے علاوہ بعض اور ذمہ داریاں ہیں، جو اکثر حالات میں طلاق دینے والے شخص پر عائد ہوتی ہے اور وہ دو ہیں: ایک یہ کہ اگر اس کے بچے بھی ہیں تو وہ ان کا مناسب نفقہ ادا کرے، جس سے خوراک، پوشاک، علاج، تعلیم اور رہائش کی ضرورت پوری ہو، اور وہ جس سماج میں رہتا ہے، اس سماج کے معیار کے مطابق پوری ہو، اگر اس نے دوسرا نکاح کیا اور دوسری بیوی اور اس سے پیدا ہونے والے بچے اس کے ساتھ ہیں اور مطلّقہ بیوی سے پیدا ہونے والے بچے اپنی ماں کے ساتھ ہیں تو جس معیار کے مطابق اپنے ساتھ رہنے والے بچے کی پرورش کرتا ہے، ضروری ہے کہ اسی معیار کے مطابق اپنی سابقہ بیوی سے ہونے والے بچے کی بھی پرورش کرے، اگر اس نے ان دونوں بچوں کے درمیان مساوات اور برابری کا معاملہ نہیں کیا تو وہ گنہ گار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کی باز پرس ہوگی، اگر اپنی اولاد کے درمیان برابری کا برتاؤ نہیں کیا جائے، یا ایک بیوی سے پیدا ہونے والے بچوں اور دوسری بیوی سے پیدا ہونے والے بچوں کے درمیان برابری کا معاملہ نہ کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جور (ظلم) قرار دیا ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب الھبات، حدیث نمبر: ۱۶۲۳)

صاحب اولاد مطلقہ عورت کا دوسرا حق یہ ہے کہ جب تک وہ عورت ان بچوں کی پرورش کرتی رہے، اس وقت تک اس عورت کو پرورش اور نگہداشت کے عمل کی اُجرت دی جائے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''اجرت حضانت'' کہتے ہیں۔ (البنایہ: ۴۴۶/۵) یہ اجرت اتنی ہونی چاہئے کہ عورت کے کھانے پینے کی، لباس و پوشاک کی اور علاج و معالجہ کی ضرورت پوری ہو جائے، اور یہ بھی واجب ہوگا کہ اس کے لئے مناسب رہائش کا انتظام کرے۔

(ردالمحتار:۳/ ۱۶۵) گویا جب تک عورت طلاق دینے والے سابق شوہر کے بچوں کی پرورش کررہی ہے، نفقہ کے بقدر اس کی اجرت ادا کرنا واجب ہے اور حق پرورش لڑکوں کے سات آٹھ سال تک اور لڑکیوں کے بالغ ہونے تک ماں کو حاصل ہوتا ہے، یہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر ہے۔(العنایۃ:۴/ ۳۷۳ا) امام مالکؒ کے نزدیک لڑکی اگر بالغ بھی ہوجائے تو جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے، ماں پرورش کی حق دار رہے۔(البیان والتحصیل:۵/ ۱۲۰) اور موجودہ دور میں یہی رائے زیادہ قابل عمل ہے، جوان لڑکی کو تنہا باپ کی پرورش میں دے دینا یا ایسی جگہ رکھ دینا جہاں اس کے قریب العمر سوتیلے بھائی بھی رہتے ہوں، فتنہ سے خالی نہیں ہے، ماں جس طرح بیٹی کی عفت وعصمت اور عزت وآبرو کی نگہداشت کرسکتی ہے نہ باپ کرسکتا ہے اور نہ سوتیلی ماں سے اس کی امید کی جاسکتی ہے، اس طرح طلاق پانے والی عورت کو پانچ دس سال کی ایسی مہلت مل جاتی ہے جس میں اس کو اپنے گذران کا سہارا ہوجاتا ہے اور یہ ایسی مدت ہوتی ہے جس میں وہ اپنی زندگی کو ایڈجسٹ کرسکتی ہے۔

مطلقہ عورت سے متعلق بڑی ذمہ داری اس کے باپ کی ہے، اگر طلاق دینے والا مرد موجود نہ ہو، یا عورت کو ضروریات زندگی حاصل نہیں ہو پارہی ہو، خواہ اس لئے کہ کسی بچہ کی پرورش اس کے ذمہ نہیں ہے، کہ وہ اجرتِ پرورش کی مقدار ہو، یا اس لئے کہ مرد کو دینا چاہئے ؛لیکن اللہ سے بے خوفی اور اپنی ذمہ داری سے غفلت کی بنا پر وہ اپنا فریضہ ادا نہیں کرتا، ان تمام صورتوں میں باپ کی ذمہ داری ہے کہ بیٹی کا نفقہ ادا کرے، اس کے پیدا ہونے کے وقت جس طرح اس نے اس کا استقبال کیا تھا، اسی طرح خدانخواستہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہوکر واپس آتی ہے تو اس وقت بھی اس کا استقبال کرے اور اسے بوجھ نہ سمجھے؛ کیوں کہ وہ اسی کے دل کا ٹکڑا اور اسی کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

نفقہ کے معاملہ میں شریعت نے بیٹی کو بیٹے پر مقدم رکھا ہے، بیٹا اگر بالغ ہوجائے تو باپ پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔(فتاویٰ قاضی خاں علی الھندی:۱/ ۲۱۹) اسی طرح اگر بیٹا کسب معاش پر قادر ہے تو باپ اسے مجبور کرسکتا ہے کہ وہ خود محنت کرے اور اپنی

روزی روٹی کے مسائل کو حل کرے؛ لیکن اگر لڑکی بالغ ہو جائے تو جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، باپ پر اس کا نفقہ واجب ہے۔ (فتح القدیر: ۴/۴۱۰) اور اگر وہ کسبِ معاش پر قادر ہو تب بھی باپ اسے اس پر مجبور نہیں کر سکتا۔ (فتح القدیر: ۴/۴۱۰) اسی طرح اگر بیٹی بیوہ ہو جائے یا اسے طلاق دے دی جائے اور اس کے پاس اتنی دولت نہیں ہو کہ وہ خود اپنی ضروریات پوری کر سکے تو پھر والد پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری لوٹ آئے گی اور اس پر بیٹی کے اخراجات پورے کرنا ضروری ہوگا۔ (فتح القدیر: ۴/۴۱۰) نیز باپ کا یہ نفقہ ادا کرنا بطور احسان کے نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس کا شرعی فریضہ ہے؛ اس لئے اس کے دوسرے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کو اپنی بہن پر خرچ کرنے سے روک دے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جیسے دوسرے لوگوں پر خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہے، اسی طرح اپنی اولاد پر خرچ کرنے میں بھی ثواب ہے؛ چنانچہ حضرت ابن مسعود انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: جب کوئی مسلمان اپنے بال بچوں پر اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے تو اس میں بھی صدقہ کا ثواب ہوتا ہے۔(**صحیح البخاری، باب فصل النفقه علی الاھل**، حدیث نمبر: ۱۵۳۵) اور خاص کر بیوہ عورت کی خدمت واعانت کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، حضرت ابوہریرہؓ آپ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ بیوہ عورت کی خدمت کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح، یا اس شخص کی طرح ہے، جو رات بھر نماز پڑھتا ہو اور دن میں روزہ رکھتا ہو: **"کالمجاھد فی سبیل اللہ او کالقائم اللیل، الصائم النھار"** (**صحیح البخاری، باب السعی علی الارملہ**، حدیث نمبر: ۶۰۰۶) ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا، جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دیں گے، اس میں آپ نے یتیم یا بیوہ کی کفالت کرنے والے کو بھی شمار کیا۔ (المعجم الاوسط: ۸/۱۱۷، حدیث نمبر: ۲۹۲۹) نیز حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب بالکل آخر آخر میں تین باتوں کی نصیحت فرمائی: نماز کے معاملہ میں اللہ سے

ڈرو، غلاموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، دو کمزور لوگوں —— بیوہ عورت اور یتیم بچہ —— کے سلسلہ میں اللہ سے ڈرو، (شعب الایمان: ۱۳؍۴۰۴)

جو حکم بیوہ کا ہے وہی حکم بہ درجہ اولیٰ اس مطلقہ عورت کا ہے، جس کا کوئی سہارا نہیں؛ کیوں کہ بیوہ کو لوگ رحم کا مستحق سمجھتے ہیں اور مطلقہ کے بارے میں عام طور پر یہ سوچ ہوتی ہے کہ اس کو اس کی بدزبانی و بداخلاقی کی وجہ سے طلاق دی گئی ہوگی؛ اس لئے رحم کا جذبہ کم ہوتا ہے، اور اس کی مجبوری اور بڑھی ہوئی ہوتی ہے؛ حالاں کہ طلاق کے اکثر واقعات میں مرد کی زیادتی ہوتی ہے نہ کہ عورت کی؛ اس لئے وہ زیادہ رحم کی مستحق ہے، پس جو اجر کسی بیوہ کی پرورش میں ہے، مطلقہ کی پرورش میں بدرجہ اولی ہوگا اور اگر وہ مطلقہ بیٹی یا بہن وغیرہ ہو تو اس میں اجر اور بھی بڑھ جائے گا؛ کیوں کہ یہ ایک بے کس اور ضرورت مند کی مدد بھی ہے اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ بھی۔

اگر مطلقہ کے پاس خود اپنے نفقہ کا سامان نہ ہو، اور والد بھی نہ ہوں تو پھر ان کے نفقہ کی ذمہ داری دوسرے محرم رشتہ داروں سے متعلق ہو جاتی ہے۔ (عمدۃ القاری: ۲۱؍۱۳) بھائیوں بہنوں، چچاؤں پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کا نفقہ واجب ہے؛ بشرطیکہ وہ ضرورت مند ہوں اور خود کسب معاش سے قاصر ہوں۔ بہت بڑے حنفی فقیہ علامہ سرخسیؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ جو مختلف رشتہ داروں پر نفقہ واجب ہوتا ہے، یہ صرف مستحب یا مستحسن نہیں ہے؛ بلکہ واجب ہے؛ اس لئے محرم رشتہ دار بچوں، عورتوں اور معذور مردوں کا نفقہ ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا: ’’**یجبر علی نفقة کل ذی رحم محرم منه الصغار والنساء واهل الزمانة من الرجال**‘‘ (**المبسوط للسرخسی**: ۵؍۲۲۳) لیکن اللہ سے بے خوفی، احکام شریعت سے بے اعتنائی، رشتوں کے معاملہ میں بے مروتی اور خود غرضی کی وجہ سے آج کل والدین اور دادا، دادی کے علاوہ دوسرے لوگوں سے یہ توقع رکھنا صحراء سے پانی کی امید رکھنے کے مترادف ہے کہ وہ احکام شریعت کے مطابق مطلقہ خواتین کا نفقہ ادا کریں گے؛ اس لئے والدین کی موجودگی میں بیٹی اگر خدانخواستہ طلاق یا بیوگی سے دوچار ہو جائے تو اولاً تو

اس کے نکاحِ ثانی کی فکر کرنی چاہئے، قرآن نے ایسے لوگوں کے نکاح کا حکم دیا ہے: **"وانکحوا الایامی منکم"** (سورۃ نور:۳۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عہد میں جوں ہی کوئی خاتون بیوہ یا مطلقہ ہوتی تھی، جلد سے جلد ان کا نکاح کر دیا جاتا تھا، عدت گذرنے سے پہلے ہی ان کے رشتے آنے لگتے تھے؛ اس لئے قرآن مجید نے عدت وفات گذرنے سے پہلے رشتہ طے کرنے کو منع فرمایا۔ (سورۃ البقرہ:۲۳۲) اس طرح نہ صرف ان کی کفالت ہوتی تھی؛ بلکہ ان کو ایک مکمل خاندان مل جاتا تھا، افسوس کہ آج کل والدین ایسی خواتین کے نکاح کی طرف توجہ نہیں دیتے، بعض اوقات ایک نوجوان لڑکی بیوہ ہوتی ہے اور اسے پوری زندگی بیوگی میں گزارنا پڑتا ہے، وہ خود حیا سے کہہ نہیں پاتی اور ماں باپ توجہ نہیں دیتے ہیں، غور کیجئے یہ خواتین کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے، اگر کوئی شوہر یا بیوی چند دنوں ایک دوسرے سے دور رہیں تو یہ چیز ان کو ذہنی طور پر بے سکون کر دیتی ہے، تو ایک لڑکی کو زندگی بھر تجرد کی سزا دی جائے، کیا یہ انصاف کی بات ہے؟ اس لئے ان کے نکاح کی فکر کرنی چاہئے، اور اگر وہ خود حیا کریں تو ان کو سمجھانا چاہئے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے ان کا نکاح نہ ہو سکے تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ ان کی کفالت کا مناسب انتظام کیا جائے، اس انتظام کی ایک شکل یہ ہے کہ والدین اپنی جائیداد کا ایک حصہ ایسی بے سہارا بیٹی کو ہبہ کر دیں، جس سے آئندہ اس کی گذرِ اوقات کا انتظام ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حالات میں اس بات کو ناپسند فرمایا ہے کہ اولاد کے درمیان نابرابری برتی جائے، اولاد میں سے کسی کو کوئی چیز دی جائے اور دوسرے کو نہیں دی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کا ایک معاملہ آیا، حضرت بشیر بن سعدؓ نے اپنے صاحبزادہ نعمان ابن بشیرؓ کو کوئی خاص چیز خصوصی طور پر ہبہ کرنی چاہی اور ان کی خواہش تھی کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنایا جائے؛ چنانچہ وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور اپنی گزارش پیش کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو یہ چیز دی ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر میں ایسے نامنصفانہ اور ظالمانہ عمل پر گواہ نہیں بن سکتا: **"لا اشھد علی**

الجور'' (نسائی، کتاب النحل، حدیث نمبر:۳۷۱۱) چنانچہ وہ اس سے باز آ گئے؛ لیکن یہ حکم عام حالات کے لئے ہے، اگر خصوصی حالات کی بنیاد پر کسی کو زیادہ دے دیا جائے، یا اولاد میں سے ایک کو دیا جائے اور دوسرے کو نہ دیا جائے تو وہ اس ممانعت میں شامل نہیں ہے، مثلاً ایک شخص کے کئی بچے ہیں، بعضوں نے تعلیم حاصل نہیں کی، بعض کاروبار میں لگ گئے؛ لیکن ایک بیٹا تعلیم کی طرف متوجہ ہے اور اس نے میڈیکل انٹرسٹ پاس کرلیا ہے تو اب باپ ایک خطیر رقم اس کی فیس پر ادا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ یہ ایک خاص مصلحت کی وجہ سے ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک بچہ کے جاہل رہنے کی وجہ سے یا اس کی تعلیم کے وقت والد کے تنگ دست ہونے کی وجہ سے تمام ہی بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھنا پڑے گا، ظاہر ہے کہ یہ شریعت کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگرچہ تمام اولاد کے درمیان مساویانہ سلوک کرنا چاہئے، اور یہی بہتر ہے؛ لیکن یہ ہر حال میں واجب نہیں ہے، اگر اولاد میں سے کسی کی مجبوری یا اس کی کسی خاص ضرورت کی وجہ سے اس کو خصوصی طور پر کچھ زیادہ دیدے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے:''**وان كان بعض اولاده مشتغلا بالعلم دون الكسب لا باس بان يفضله على غيره**'' (مجمع الانہر:۳۵۸/۲) صحابہؓ کے دور میں بھی ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو عطیہ دینے میں ترجیح دی، حضرت ابوبکر صدیقؓ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کھجور کی پیداوار میں سے بیس وسق (اس زمانہ کا ایک پیمانہ) اپنے تمام بچوں کے مقابلہ زیادہ دیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ کو اپنے صاحبزادہ حضرت عاصمؓ سے خصوصی انس تھا؛ چنانچہ انہوں نے ان کو خصوصی طور پر کچھ چیزیں عطا فرمائی تھیں۔ (شرح السنہ للبغوی:۲۹۷/۸) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ام کلثوم سے ایک صاحبزادی تھی، انھوں نے ان کو اپنی دوسری اولاد کے مقابلہ چار ہزار درہم زیادہ عنایت فرمائے۔ (عمدۃ القاری:۱۴۷/۱) غرض کہ ماں باپ کے لئے گنجائش ہے کہ اپنی اولاد میں سے کسی کی خصوصی حالت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس کو جائیداد کا کوئی حصہ اضافی طور پر ہبہ کردے؛ اس لئے اگر والدین کے اندر استطاعت ہو اور خدانخواستہ کوئی

بیٹی ایسی حالت سے دوچار ہو اور اس کے اندر ایسی صلاحیت نہیں ہو کہ وہ خود کسبِ معاش کر سکے تو بہتر ہے کہ اس کے لئے کچھ سرمایہ محفوظ کر دے، یا اپنی زمین و مکان کا کوئی حصہ ہبہ کر دے، جو اس کے لئے سہارا بن سکے۔ اگر والد موجود نہ ہوں یا اس موقف میں نہ ہوں کہ اس کی کفالت کر سکیں تو پھر خاندان کے لوگوں کو اجتماعی طور پر اس ذمہ داری کو انجام دینا چاہئے ، جیسے اگر مطلقہ عورت کے چار بھائی ہیں تو چاروں مل کر اس کے خرچ کو اپنے اوپر تقسیم کر لیں ، اگر اس کے کئی چچا یا کئی ماموں ہوں تو ان سب کو مل کر اس ذمہ داری کو ادا کرنا چاہئے ، ورنہ عند اللہ سب کے سب جواب دہ ہوں گے ، اور حق تلفی ایسا گناہ ہے کہ انسان کی عبادتیں بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتیں ، کیا بہتر ہو کہ مسلم سماج میں خاندان کا ایک اجتماعی نظام تکافل ہو ، جیسے ایک شخص کے تحت آنے والی دو پشتیں ، بیٹا ، باپ اور دادا مل کر ایسا نظام بنائیں کہ اگر خاندان کی کوئی عورت بیوہ ہو جائے یا طلاق کی نوبت آ جائے یا اس کا شوہر معذور و مفلوج ہو اور اس کے لئے کوئی سہارا نہیں ہو ، تو ہم اجتماعی طور پر ایسی خواتین کی کفالت کریں گے ، اگر خاندان کی دو پشتوں کو سامنے رکھا جائے ، جو دادا سے لے کر پوتوں تک ہو تو عام طور پر اس کی تعداد پچیس تیس تک پہنچ جاتی ہے ، اس میں دس پندرہ افراد کمانے والے ہوتے ہیں اور ان کمانے والوں میں بعض پر زکوٰۃ بھی واجب ہوتی ہے اور خاندان کے اس مختصر ڈھانچہ میں بمشکل ایک آدھ ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت ہو سکتی ہے ، جن کی اولاد کمانے اور ان کی کفالت کرنے کے لائق نہیں ہوئی ہو ، اتنے سارے افراد مل کر بآسانی ایسی ایک آدھ بیوہ و مطلقہ عورت کی بے سہارگی کو دور کر سکتے ہیں ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے ، حضور کے چچاؤں میں حضرت ابو طالب غریب تھے ، دوسرے چچا حضرت عباسؓ صاحب ثروت تھے اور حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مالی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت عباسؓ کو تیار کیا اور حضرت ابو طالب سے پیش کش کی کہ ہم دونوں آپ کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنا چاہتے ہیں ، حضرت ابو طالب حضرت عقیل کو تو اپنے پاس سے ہٹانے پر آمادہ نہیں ہوئے ؛ لیکن حضرت علیؓ کو آپ کی اور حضرت جعفرؓ کو حضرت عباسؓ کی کفالت

میں دے دیا، پس اپنے اعزہ کی کفالت کرنا اور ان کا سہارا بننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ افسوس کہ امت میں ترجیحات کا شعور ختم ہو گیا ہے، بعض حضرات بار بار عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں، حج نفل ادا کرتے ہیں، مسجد کی تزئین و آرائش پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں، چھوٹی سی آبادی جہاں سو پچاس مصلّی بھی جمع نہیں ہوتے، وہاں لق ودق مسجد تعمیر کرتے ہیں، پہلے سے اچھی خاصی مسجد موجود ہوتی ہے؛ لیکن اس کو منہدم کر کے پرشکوہ مسجد بناتے ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے نماز کی قبولیت بڑھ جائے؛ لیکن صلہ رحمی کا جو فریضہ شریعت کی طرف سے عائد کیا گیا ہے، اس سے غافل ہیں، ایک بے سہارا عورت کی سسکیاں ان کے گوشِ دل تک نہیں پہنچ پاتیں، اور باپ کی شفقت و محبت سے محروم بچوں کے آنسو انہیں تڑپانے سے عاجز ہیں، ہماری یہ بے شعوری نہ صرف سماج میں ظلم و ناانصافی کو بڑھاوا دیتی ہے؛ بلکہ اس سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور لوگوں کو شریعت اسلامی پر زبان کھولنے اور انگلیاں اٹھانے کا موقع ملتا ہے، کاش! ہم سماج کے اس فراموش کردہ طبقہ پر بھی محبت کی نگاہ ڈالیں اور ایمانی تقاضوں کو پورا کریں۔

تین طلاق سے متعلق حالیہ فیصلہ اور ملت اسلامیہ کے لیے لائحۂ عمل

سپریم کورٹ نے ابھی تین طلاق کے سلسلہ میں اپنا فیصلہ سنایا ہے، جو ۳۹۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس مقدمہ کا آغاز بالکل عجیب انداز پر ہوا، حقیقت یہ ہے کہ ہندو قانونِ میراث کے تحت ہندو لڑکی کو اپنے باپ کے بعض متروکات میں حصہ نہیں ملتا تھا، ۲۰۰۵ء میں اس غلطی کی اصلاح کی گئی، اسی بنیاد پر ایک ہندو خاتون پھول وتی اپنے بھائیوں کے خلاف عدالت میں گئی، ہائی کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ دیا، اور ۲۰۰۵ء کے ترمیم شدہ قانون کے مطابق والد کے ترکہ میں جو حصہ ملنا چاہیے تھا، اس کے دینے کا حکم دیا، بھائیوں نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی اور وہاں فیصلہ الٹ گیا، پھول وتی نے ہائی کورٹ کے فیصلہ کے تحت جو حق پایا تھا، اس سے محروم ہو گئیں۔

عجیب بات ہے کہ جج صاحبان ایک ہندو خاتون کو تو فطری انصاف نہیں دلا سکے؛ لیکن انہیں مسلمان عورتوں پر رحم آ گیا، اور انھوں نے ایک بالکل غیر متعلقہ بات کہہ دی کہ عورتوں کے حق میں مسلم قوانین بھی غیر منصفانہ ہیں؛ اس لیے مفادِ عامہ کے تحت اس پر مقدمہ چلنا چاہیے، پھر کیا تھا سنگھ پریوار کے اشارہ پر بعض نام نہاد مسلم خواتین نے عدالت میں تین طلاق، حلالہ اور تعددِ ازدواج کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا، عجیب بات ہے کہ ان میں بعض خواتین وہ ہیں کہ جن کے شوہر ہندو ہیں، اور ان کی شادی ہندو میرج ایکٹ کے تحت ہوئی ہے، پھر میڈیا نے ایسا تاثر دیا کہ گویا تمام مسلم خواتین ایسی ہی سوچ رکھتی ہیں؛ حالاں کہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جب دستخطی مہم چلائی تو چھ کروڑ کے قریب مسلمان مردوں اور عورتوں نے تحریری طور پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا کے حامی ہیں، جن میں ساڑھے تین کروڑ کے قریب دستخط خواتین کے تھے، میڈیا والوں کو مسلم سماج سے الگ تھلگ چند عورتوں کا مؤقف تو نظر آیا؛ لیکن کروڑوں مسلمان عورتوں کی طرف سے قانونِ شریعت کی تائید نظر نہیں آئی۔

بہر حال اس مقدمہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیت علمائے ہند کے

بشمول کئی مسلم تنظیمیں فریق بنیں اور انھوں نے شریعت کا نقطۂ نظر پیش کیا، عدالت نے معمول کے خلاف تیز رفتاری کے ساتھ اس مقدمہ کی سماعت کی اور بالآخر مؤرّخہ ۲۲/اگست ۲۰۱۷ء کو اس کا فیصلہ ہوا، اس مقدمہ کی سماعت اور اس کا فیصلہ پانچ رکنی بینچ نے کیا، جن میں سے ہر جج الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے تھے؛ چوں کہ فیصلہ باتفاق رائے نہیں ہوا، کئی نکات پر ججوں کی رائے منقسم تھی؛ اس لیے فیصلہ میں خاصا تضاد معلوم ہوتا ہے، بہرحال بحیثیت مجموعی اس فیصلہ میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

(۱) اس فیصلہ میں ایک دفعہ کی تین طلاق کو ایک ہی طلاق مانا گیا ہے، یہ اہل حدیث اور شیعہ حضرات کے نقطۂ نظر کے مطابق ہے، احناف، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، ظاہر ہے اتنی بڑی تعداد پر ان کے یقین کے برخلاف رائے مسلط کرنا مناسب نظر نہیں آتا، ہونا تو یہ چاہیے کہ جس گروہ کا جو نقطۂ نظر ہو، اس کے مطابق ان کا فیصلہ ہو، دوسرے: اس سے انجام کار خود عورتوں کو دشواری ہوگی، عدالت ایک طلاق واقع ہونے یا طلاق واقع نہ ہونے کا حکم جاری کرسکتی ہے؛ لیکن لوگوں کے یقین کو بدل نہیں سکتی، اب اگر عدالت نے تین طلاق کو ایک مان کر یا واقع نہ مان کر نکاح کی گنجائش باقی رہنے یا خود نکاح کے باقی رکھنے کا حکم مرد کے دعویٰ پر جاری کردیا، اور عورت اور اس کے خاندان کے لوگ اس رشتہ کو حرام سمجھتے ہیں، تو وہ عملاً اس مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی، اس طرح وہ ازدواجی حقوق سے بھی محروم رہے گی اور اس کے لیے دوسرے نکاح کی گنجائش بھی نہیں رہے گی اور اگر عدالت نے عورت کے دعویٰ پر فیصلہ کیا تو ہوسکتا ہے کہ مرد مجبور ہوکر عورت کے اخراجات ادا کردے؛ لیکن وہ اس عورت کے ساتھ رشتہ کو حرام سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو جسمانی تعلق سے دور رکھے، تو کیا عدالت عورت کو یہ حق دلا سکے گی؟ اس لیے تین طلاق کے باوجود رشتہ کے باقی رہنے کا دعویٰ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، عملی طور پر اس کا نقصان عورت کو ہوگا، وہ اپنے تمام یا بعض ازدواجی حقوق سے محروم بھی رہے گی اور اس پر دوسرے نکاح کا راستہ بھی بند ہوجائے گا۔

(۲) عدالت نے نہ صرف ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا ہے؛ بلکہ چھ مہینے کے لیے اس پر پابندی بھی عائد کردی ہے، یہ بات مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کی رائے کے خلاف ہے، جو لوگ ایک دفعہ کی تین طلاقوں کو تین نہیں مانتے، ان کے یہاں بھی ایک طلاق تو واقع ہو ہی جاتی ہے، اور اگر ایک ہی دن تین طلاقیں الگ الگ مجلس میں دی جائیں، تو بالاتفاق تینوں واقع ہوجاتی ہیں؛ اس لیے عدالت کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کی متفقہ رائے اور قرآن وحدیث سے مستنبط کیے جانے والے متفقہ نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔

(۳) عدالت کے اس فیصلہ میں ایک مثبت پہلو بھی موجود ہے، اور وہ یہ ہے کہ عدالت نے تسلیم کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء بنیادی حق میں شامل ہے، یہ بات چیف جسٹس جناب جے ایس کھیہر اور جسٹس سید عبدالنظیر نے تو کہی ہی ہے، جسٹس کورین جوزف نے اگرچہ تین طلاق کے معاملہ میں جسٹس نریمن اور جسٹس یو یوللت سے اتفاق کیا ہے؛ لیکن وہ بھی اس نکتہ پر چیف جسٹس کے ساتھ ہیں، اس طرح گویا پانچ میں سے تین ججز نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاء بنیادی حقوق میں شامل ہے، اور یہ دستور کی دفعہ: ۲۵ کے دائرہ میں آتا ہے، یہ ایک اہم ترین کامیابی ہے، اور اس کی بنیاد پر آئندہ مسلم پرسنل لاء کے ان مسائل میں بھی قانونی جنگ لڑی جاسکتی ہے، جن کے بارے میں مسلم پرسنل لاء مخالف قوتیں سوال اٹھاتی رہتی ہیں۔

(۴) فیصلہ میں بعض ججوں نے یہ بات بھی کہی ہے کہ تعددِ ازدواج سے متعلق قانونِ شریعت میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے؛ اسی لیے مدعیان کی طرف سے اپنے دعویٰ میں اس مسئلہ کو اٹھانے کے باوجود عدالت نے اس پر نہ کوئی بحث کی اور نہ کوئی فیصلہ کیا، یہ بھی ایک مثبت پہلو ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس فیصلہ کے پس منظر میں مسلمانانِ ہند کے لیے لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے؟ تو اس بارے میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں:

اَوّل یہ کہ اس فیصلہ سے وہی لوگ متأثر ہوں گے، جو اپنے معاملات کو عدالت میں

لے جائیں، اگر مسلمان شریعت کے مطابق آپس میں اپنے معاملات کو طے کرلیں، دارالقضاء اور شرعی پنچایتوں کے ذریعہ فیصلہ کرائیں، مساجد کے ائمہ سے رجوع ہوں اور کورٹ میں جانے سے گریز کریں، تو ان پر اس فیصلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور بحمد اللہ عمومی طور پر مسلمانوں کا مزاج یہی ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام کردی گئی ہیں، وہ اس کے مقابلہ میں کسی دوسری بات کو قبول نہیں کرتے ،نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں عدالتوں کے مخالف شریعت فیصلے موجود ہیں؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک فی صد مسلم مطلقہ خواتین بھی اس کے لیے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتیں، اور رشتہ نکاح ختم ہوجانے کے باوجود رشتہ نکاح کو باقی رکھنے کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ نازک ہے؛ کیوں کہ نفقہ کا تعلق مال سے ہے اور اس کا تعلق عزت و ناموس سے۔

اس لیے مسلمانوں کا یہ ذہن بنانا چاہیے کہ وہ ایسے مسائل کو عدالتوں میں نہ لے جائیں اور انہیں شریعت مخالف فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہ دیں؛ بلکہ باہمی مفاہمت سے معاملہ حل کرلیں، اس میں ان کے لیے دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی، اس میں دین و ایمان کا بھی تحفظ ہے اور عزت و وقار کا بھی اور سب سے بڑھ کر اپنی ملت کو رسوائی سے بچانے کا یہی واحد راستہ ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنی اجتماعیت کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیں، نہ غلط فہمی میں پڑیں اور نہ غلط فہمی پیدا کرنے والوں کی سازشوں کا شکار ہوں، عدالت کے فیصلہ میں جو کچھ باتیں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے خلاف کہی گئی ہیں، وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ مقدمات کی صحیح پیروی نہیں ہوسکی؛ بلکہ اس کا سبب وہ فضاء ہے، جو سنگھ پریوار کے خریدے ہوئے میڈیا کے ذریعہ بنائی گئی اور جس کو ملک کے اِقتدارِ اعلیٰ نے تقویت پہنچائی، یہاں تک کہ یومِ آزادی کے موقع پر لال قلعہ کی فصیل سے بھی وزیر اعظم نے اس مسئلہ کو چھیڑنا ضروری سمجھا، اس مسئلہ کا نہ قوم کے مفاد سے کوئی تعلق تھا نہ ملک کے مصالح سے اور نہ خواتین کو اس سے کوئی فائدہ پہنچنے والا ہے۔

تین طلاق کا تناسب بعض سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 0.33 ہے، افسوس کہ بعض لوگ ایسے مواقع پر بغیر سمجھے بوجھے دینی تنظیموں پر انگشت نمائی شروع کر دیتے ہیں؛ حالاں کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیت علمائے ہند دونوں نے پوری قوت کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی، بحث کے لیے بہترین وکلاء کا انتخاب کیا گیا، ان کی بحث کے مقابلہ میں مخالف وکیل کی بحث پھیکی پڑ گئی، ان تنظیموں نے حلف ناموں میں دستوری اور شرعی نقطۂ نظر سے جتنے مضبوط دلائل پیش کیے، مخالفین کے حلف نامے ان کے مقابلہ میں صاف طور پر ہلکے اور بے وزن معلوم ہوتے ہیں، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس کے لیے ماہر وکلاء کا ایک پینل تشکیل دیا، بورڈ کے جنرل سکریٹری نے اپنے دو سکریٹریز، لیگل کمیٹی کے کنویز اور وکلاء نیز شریعت کے ماہر علماء کے ساتھ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک ہفتہ دہلی میں قیام کیا اور سبھی لوگوں نے شب و روز محنت کر کے اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کی کوششیں کیں، صدر بورڈ نے صورتِ حال پر مسلسل نظر رکھی اور سرپرستی فرماتے رہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ مقدمہ کا فریق دلائل پیش کر سکتا ہے، فیصلہ کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے، مسلمان اس صورتِ حال سے گزر رہے ہیں کہ ملک کے تمام اداروں میں اکثریت اور اقلیت کے لیے الگ الگ پیمانے بنا دیے گئے ہیں، اب یہی دیکھیے کہ ۱۹۸۱ء میں کرشنا بنام متھورا اہیر، ۱۹۹۴ء میں مہارشی آویدس بنام گورنمنٹ آف انڈیا، ۱۹۹۶ء میں مدھو کیشور بنام حکومت بہار اور ۱۹۹۷ء میں احمد آباد گووند ایکشن گروپ بنام انڈین یونین کے مقدمات میں ہندو روایت اور ہندو قانون کو دستور سے ماوراء رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا ہے؛ لیکن مسلمانوں کے مذہبی تشخص کے بارے میں بالکل جداگانہ سوچ اختیار کی جاتی ہے، ایسی صورتِ حال میں اگر ہم خود تنقید اور بے اعتمادی کے ذریعہ اپنے اجتماعی اداروں کو کمزور کر لیں گے تو یہ اپنے دشمنوں کو تقویت پہنچانے اور ان کے منصوبوں کو کامیاب کرنے کے مترادف ہوگا؛ اس لیے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ حقیقی صورتِ حال کو سمجھیں، جلد بازی میں کوئی رائے قائم نہ کریں اور خود اپنے اداروں کو نقصان نہ پہنچائیں، اینٹ اینٹ جوڑ کر ایک مدت میں دیوار بنتی ہے؛ لیکن اس کو منہدم کرنے میں کوئی

وقت نہیں لگتا، تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بنتا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے آشیانہ کو جلانے کے درپے ہو تو ایک لمحہ بھی اس کو خاکستر بنانے کے لیے کافی ہے!

نکاح نامہ؛ موجودہ حالات میں اس کی ضرورت اور افادیت

انسان کے لیے ایک بہت بڑی ضرورت خاندان کی ہے، اسی لیے اس کو ''سماجی حیوان'' کہا جاتا ہے، خاندان رشتہ داروں کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے، انسان جن رشتوں میں بندھا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر تین ہیں: دادیہال، نانیہال اور سسرال، لیکن غور کیا جائے تو ان سہ رخی قرابت داریوں کی بنیاد نکاح ہے، والدین کا رشتہ نکاح اولاد کو دادیہالی اور نانیہالی خاندان سے جوڑتا ہے اور خود اس کا نکاح سسرال کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے، اسی لیے اسلام میں نکاح کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور بے نکاحی زندگی کو ناپسند کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں نکاح کو ایک دنیوی اور نفسانی عمل سمجھا جاتا تھا اور نکاح سے بچنے کو خدا کی قربت کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا، لیکن اسلام دینِ فطرت ہے، وہ فطرت سے بغاوت کا قائل نہیں، بلکہ اس رَوش کے اختیار کرنے کا قائل ہے، جو راہِ فطرت پر قائم ہو، اسی لیے اس نکاح کو پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور دوسرے انبیاء کی مقدس سنت قرار دیا۔

اسلام میں نکاح کا تصور یہ ہے کہ دو مرد و عورت کے درمیان زندگی کی رفاقت کا معاہدہ ہے، نکاح کی وجہ سے عورت مرد کی ملکیت اور جائیداد نہیں بن جاتی کہ لاکھ چاہے مگر اسے رہائی نصیب نہ ہو؛ بلکہ دوسرے معاہدات کی طرح یہ بھی ایک معاہدہ ہے، اور اسلام چاہتا ہے کہ زندگی کے دونوں رفیق ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ اس معاہدہ کو نباہتے رہیں، ہاں! اگر کسی وجہ سے فریقین کے درمیان ایسی نفرت اور دوری پیدا ہوگئی کہ اب ان کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے، رفاقت ایک دوسرے کے لیے بوجھ ہو جائے اور یہ رشتہ سکون و طمانینت کی شبنم کے بجائے نفرت و عداوت کی آگ بن جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ وہ بہتر اور خوش گوار طریقہ پر ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کرلیں، اس معاہدہ کو ختم کردیں اور دونوں اپنی اپنی زندگی کے نئے دَور کا آغاز کریں، **فامساک بمعروف او تسریح باحسان ۔** (البقرۃ: ۲۲۹)

معاہدات اور بھی ہوتے ہیں، خرید وفروخت بھی ایک معاہدہ ہے، کرایہ داری اور ملازمت بھی دو فریقوں کے درمیان معاہدہ ہے، اسی طرح شرکت ومضاربت کے مالی معاہدات ہیں؛ لیکن نکاح ایسا معاہدہ ہے جس سے کئی خاندانوں کا باہمی تعلق جڑا ہوا ہے اور جس سے آنے والی نسل کی تربیت اور کفالت وغیرہ کے بہت سے مسائل بھی متعلق ہیں، اس لیے اس کی ایک خصوصی نوعیت ہے، اسی لیے اس معاملہ کے طے پانے سے پہلے خطبہ رکھا گیا ہے، جس میں طرفین کو تقویٰ کی تلقین کی جاتی ہے اور ان کے لیے دعائیں بھی کی جاتی ہیں، خطبہ نکاح میں بار بار ان آیات کا ذکر جن میں تقویٰ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ایک خاص مصلحت کے تحت ہے، اور وہ یہ ہے کہ میاں بیوی کا تعلق جلوت سے زیادہ خلوت کا ہے، اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی اور حق تلفی کو خدا کے خوف کے سواء اور کوئی چیز نہیں روک سکتی، اسی لیے خاص طور پر اور بار بار تقویٰ کی تلقین کی گئی ہے۔

نکاح اصل میں تو زبانی ایجاب وقبول ہی سے وجود میں آتا ہے، لیکن جن معاہدات میں بقیہ امور مستقبل میں ادا طلب ہوں، ان میں تحریری ریکارڈ مرتب کر لینا افضل طریقہ ہے اور خود قرآن مجید نے اس کی صراحت کی ہے۔ (البقرۃ: ۲۸۲) نکاح میں اکثر اوقات مہر بعد میں ادا کیا جاتا ہے، اس لیے یہ بھی ان معاہدات میں داخل ہے، بہت سے قانونی مسائل میں بھی نکاح کے مستند ریکارڈ کی ضرورت پیش آتی ہے، اس لیے اگر نکاح کے معاہدہ کو تحریری طور پر بھی مرتب کر لیا جائے تو یہ عین مزاجِ شریعت کے مطابق ہے، اسی لیے اکثر مقامات پر حکومت کی طرف سے یا مسلمانوں کے کسی مذہبی ادارہ کی طرف سے نکاح نامے دستیاب ہیں، یہ نکاح نامے آئندہ پیدا ہونے والی بہت سی امکانی نزاعات کو ثابت کرنے میں مدد ومعاون ہیں۔

نکاح نامہ میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی فریق اس سے مکر جائے تو اس کے خلاف دلیل بنتا ہے، نکاح نامہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس عورت کے بطن سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں، وہ اسی مرد کی اولاد ہیں، مرد پر ان کے

نفقہ اور کفالت کی ذمہ داری ہے، اور ان بچوں کو اس مرد کے ترکہ میں حق میراث حاصل ہے، نکاح نامہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ عورت کب سے اس مرد کی طرف سے نفقہ کی حق دار ہے، نکاح نامے کی وجہ سے بہت سے ان رشتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے، نکاح نامہ سے مہر کی مقدار معلوم ہوتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نکاح کے وقت مہر ادا کیا گیا یا نہیں؟

موجودہ دَور میں مسلمانوں کی احکامِ شریعت سے ناواقفیت اور سماجی بگاڑ کی وجہ سے خدا سے بے خوفی کے باعث ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ''نکاح نامہ'' میں زوجین کے لیے خوش گوار زندگی گزارنے اور ایک دوسرے کے ساتھ معتدل تعلقات قائم رکھنے کے سلسلہ میں ضروری ہدایات بھی ہوں، چناں چہ دکن کے نکاح نامہ میں حقوق الزوجین کو بہتر طریقہ پر واضح کر دیا گیا ہے، خطبہ نکاح کے موقع سے زوجین کو جو ہدایات دی جاتی ہیں، وہ بڑی اہم ہوتی ہیں، لیکن ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہیں، اگر خطبہ کے ساتھ نکاح نامہ میں بھی ضروری ہدایات درج ہوں، تو یہ نکاح نامہ طرفین کے لیے تذکیر کا باعث ہوگا۔

ہندوستان کے حالات میں ایک اہم مسئلہ میاں بیوی کے باہمی نزاعات کو حل کرنے کا ہے، اگر زوجین میں تعلقات خراب ہوں، تو بجائے اس کے کہ فریقین کسی مذہبی ادارہ میں یا مذہبی شخصیت کے پاس جائیں اور اپنے معاملہ کو سلجھائیں، ایسے وکلاء کے پاس پہنچ جاتے ہیں جن کو مسئلہ حل کرنے سے زیادہ مقدمہ کو آگے بڑھانے اور مقدمہ کی درازی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فیس وصول کرنے سے دلچسپی ہوتی ہے، اس صورتِ حال کی وجہ سے سماج میں بہت ہی تکلیف دہ واقعات پیش آ رہے ہیں، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ مرد کسی جائز شرعی سبب کے بغیر طلاق دے دیتا ہے، یا شرعی اصولوں کی رعایت کیے بغیر تین طلاقیں دے دیتا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مرد کی زیادتی یا باہمی ناچاقی کی وجہ سے عورت علاحدگی حاصل کرنا چاہے اور خدا ناترس شوہر طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو ان کے لیے بڑی دشواری

پیش آتی ہے، اگر وہ عدالت میں جائے تو غیر مسلم جج کی طرف سے فسخ نکاح کا فیصلہ شرعاً معتبر نہیں، دوسرے عدالتی کارروائیوں کا طویل سلسلہ ایسا ہے کہ ان مقدمات میں دسیوں سال لگ جاتے ہیں، چناں چہ بعض دفعہ وکیلوں کے اکسانے پر عورتیں جھوٹا ڈوری کیس کر دیتی ہیں اور بہت سے بے قصور شوہر، ان کے ماں باپ اور بھائی بہن راتوں رات گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور انہیں ضمانت بھی نہیں ملتی۔

ان کا حل اصل میں وہی ہے جو خود قرآن مجید نے متعین کیا ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات اس حد تک بڑھ جائیں کہ وہ آپس میں انہیں حل نہیں کر سکیں تو چاہیے کہ دونوں فریق حکم مقرر کر لیں، حکم ان دونوں کے درمیان میل ملاپ پیدا کرنے یا جو مناسب حال ہو، وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرے۔ (النساء: ۳۵) حکم ایسا ہونا چاہیے جو احکامِ شرعیہ سے واقف ہو، اللہ کا خوف رکھتا ہو، غیر جانب دار اور مسائل کو حل کرنے میں مخلص ہو، ہر آبادی، سماج اور خاندان میں ایسے لائق اور مناسب حکم کا ملنا دشوار ہے، لیکن اگر وہاں دار القضاء یا شرعی پنچایت قائم ہے، تو قاضی شریعت (جو مسلمانوں کے منتخب امیر یا مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد کی طرف سے فسخ نکاح کے بشمول مسائل اور اختلاف کو حل کرنے کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں) یا شرعی پنچایت کے ذمہ داران کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان اوصاف کے حامل ہوں گے۔

اس لیے ہندوستان کے خصوصی حالات کے پس منظر میں نکاح نامہ میں ضروری تنقیحات و معلومات اور زوجین کے لیے مناسب ہدایات کے ساتھ تحکیم کی شق داخل کرنا بھی بہت ہی مناسب اور مختلف دشواریوں کا حل ہے، اور اس طرح مسلمان اپنے آپ کو عدالتوں کی گراں باریوں سے بچا سکیں گے، طلاق کے واقعات کم ہوں گے، ڈوری کیس کے ناخوش گوار واقعات روکے جا سکیں گے اور طرفین کے لیے یہ بات ممکن ہو سکے گی کہ وہ جلد اور سستا انصاف حاصل کر سکیں۔

اسی پس منظر میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' نے نکاح نامہ مرتب کیا ہے، یہ

نکاح نامہ نکاح سے متعلق ضروری تنقیحات اور طرفین سے متعلق معلومات پر تو مشتمل ہے ہی اور زیادہ تر یہ حصہ دکن کے نکاح نامہ سے ماخوذ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نکاح نامہ میں زوجین کے لیے ضروری ہدایات، میاں بیوی کے حقوق اور تین طلاق کی مذمت بھی شامل ہے، اور آخر میں ایک اقرار نامہ بھی ہے، جس میں زوجین عہد کرتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو مقامی دار القضاء یا شرعی پنچایت ثالث ہوگی اور اس کا فیصلہ طرفین کے لیے قابل قبول ہوگا، اس اقرار نامہ سے نہ صرف یہ کہ زوجین کے باہمی اختلافات کو حل کرنے میں سہولت پیدا ہوگی، بلکہ دار القضاء کے نظام کو بھی تقویت پہنچے گی، اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مرتب کردہ مجوزہ نکاح نامہ کی ابتداء عرصہ پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے عہد میں ہوئی اور اس نکاح نامہ کے پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ایک مستقل سیمینار رکھا، اس سیمینار میں پورے ملک سے علماء اور اربابِ افتاء، سماجی امور کے ماہرین اور دانش وروں کی بڑی تعداد شریک ہوئی اور مختلف پہلوؤں پر بحثیں ہوئیں، پھر بورڈ کے اجلاسِ بنگلور میں نکاح نامہ کا ایک مسودہ بحث اور غور وفکر کے لیے پیش کیا گیا، اس مسودہ پر جو آراء سامنے آئیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس نے بعض ترمیمات کے ساتھ نکاح نامہ کا مسودہ بورڈ کے ارکانِ عاملہ اور اہم علماء اور مفتیان کو روانہ کیا، پھر اس سلسلہ میں جو آراء آئیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے جزوی ترمیمات کی گئیں اور بالآخر بورڈ کی مجلس عاملہ نے اسے آئندہ اجلاسِ عام میں پیش کرنے کے لیے آخری شکل دی، اور بھوپال کے اجلاسِ عام میں اس کو منظوری حاصل ہوئی۔

اس نکاح نامہ کا جہاں ملت کے سنجیدہ اور باشعور افراد کی طرف سے استقبال کیا جا رہا ہے، وہیں ذرائع ابلاغ نکاح نامہ کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ اس نکاح نامہ نے مردوں سے طلاق کا حق چھین لیا ہے، کوئی کہتا ہے کہ

عورت کو طلاق کا حق دے دیا گیا ہے، کہیں سے آواز اٹھتی ہے کہ اس سے مظلوم عورتوں کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی، یہ ساری باتیں خلافِ واقعہ ہیں، شریعت کے احکام میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی؛ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد سے حق طلاق چھین لیا جائے، یا مرد سے لے کر عورت کو حق طلاق منتقل کر دیا جائے؟! اسی طرح یہ کہنا کہ عورتوں کے مسائل حل کرنے میں اس سے مدد نہیں ملے گی، قطعاً درست نہیں ہے، اس سے عورتوں اور مردوں دونوں کے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی؛ کیوں کہ اس سے کم وقت میں بغیر کسی خرچ کے انصاف مل سکے گا اور طرفین اپنے حقوق پاسکیں گے، مسلم سماج مقدمہ بازی کی لعنت سے بچ سکے گا اور مسلمانوں کے اپنے شرعی عدالتی نظام کو تقویت حاصل ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ نکاح نامہ بہت سی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کا علاج ہے اور اس کو رواج دینے اور عام کرنے کی ضرورت ہے، تین طلاق کے سلسلہ میں خاص کر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

مذہب پر عمل کرنا بنیادی حقوق میں شامل ہے

ذرائع ابلاغ کی جانب سے یہ دعویٰ کیا جارہا تھا کہ مسلم خواتین طلاقِ ثلاثہ کے خلاف ہیں اور بے بنیاد سروے دکھا کر حکومت ہند یہ باور کرانے کی کوشش کررہی تھی کہ وہ مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے طلاقِ ثلاثہ کے خلاف ہے۔ لیکن دستخطی مہم کے بعد حکومت کی آواز مدھم پڑنے لگی ہے، ان کے وزراء کے تیور بدل گئے ہیں، الیکٹرانک میڈیا کا انداز بھی بدلا بدلا سا نظر آرہا ہے۔ اب تک مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے وزیر اعظم کے دفتر، وزارتِ داخلہ، لاء کمیشن، خواتین کمیشن کو ایک کروڑ سے زائد دستخط شدہ فارم بھیجے جاچکے ہیں اور یومیہ حکومت کو ایک لاکھ سے زائد دستخط شدہ فارم وصول کرائے جارہے ہیں۔ یہ مہم مکمل طور پر کامیاب ہے اور بورڈ نے ٹکراؤ کی صورت نہ اختیار کرتے ہوئے حکومت کے سامنے اپنا موقف واضح کردیا ہے۔ جب کہ حکومت نے یہ بات باور کرلی ہے کہ ہندوستانی مسلمان کسی قیمت پر شریعت میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔ اس دستخطی مہم کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پوری قوت کے ساتھ مسلم خواتین آگے آئیں اور انہوں نے شریعت اسلامیہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا، اس سے پہلے کبھی بھی خواتین کو اتنا فعال اور متحرک نہیں دیکھا گیا۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کچھ منحرف قسم کے لوگ بددیانتی سے کام لے رہے تھے اور وہ میڈیا میں آکر کہا کرتے تھے کہ فلاں گروپ نے پانچ ہزار عورتوں کا سروے کیا اور نوے فی صد عورتوں نے کہا کہ وہ قانونِ شریعت کی مخالف ہیں، طلاقِ ثلاثہ کا قانون ختم ہونا چاہیے، ایک تو یہ کہ انہوں نے پانچ ہزار عورتوں کا سروے کیا بھی یا نہیں؟ یا نام نہاد مسلمان عورتوں کا سروے کیا ہوگا؟ جن عورتوں نے اس وقت کورٹ میں مقدمہ دائر کیا ہے ان کا نکاح بھی ہندو میرج ایکٹ کے تحت ہوا ہے۔ ان میں سے بعضوں کے شوہر بھی ہندو ہیں۔ پھر یہ کہ انہوں نے جو سروے کیا تو وہ اپنے مزاج کی خواتین کا ہی کیا، جب کہ ایک کروڑ سے زائد دستخط شدہ فارم وزیر اعظم دفتر، وزارتِ داخلہ، لاء کمیشن اور خواتین کمیشن کو بھیجے جاچکے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی زبان پر لگام لگا اور ان کے بلند بانگ کھوکھلے دعوے کی قلعی کھلی۔ یہ دو بڑے فائدے

ہوئے ہیں دستخطی مہم کے۔

بہت ہی زور و شور سے مسلم مرد و خواتین نے دستخطی مہم میں حصہ لیا اور وہ تمام فارم لاء کمیشن، وزیراعظم دفتر، خواتین کمیشن تک پہنچے ہیں اور اس کی وجہ سے حکومت کی آواز بھی مدھم ہوئی ہے۔ دستخطی مہم کا یہ فیصلہ بورڈ کا بہت ہی دانش مندانہ اور سوچ سمجھ کر لیا گیا اہم فیصلہ تھا جس میں کسی قسم کی ٹکراؤ کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور الحمدللہ بورڈ اپنے اس مقصد میں سوفی صد کامیاب ہے۔ بورڈ یہ چاہتا ہے کہ وہ اس تمام ذخیرے کو صدر جمہوریہ کے سامنے پیش کرے لہٰذا بورڈ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

جہاں تک بات وزیراعظم کی ہے تو وہ کوئی ہٹلر، مسولینی یا ڈکٹیٹر نہیں ہے، نہ ہی اس ملک میں کسی قسم کی آمریت نافذ ہے۔ دستورِ ہند کی دفعہ 25 اور 26 میں ہندوستان کے ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے اور یہ بنیادی حقوق کی دفعات ہیں جو ناقابل تنسیخ و ترمیم ہیں۔ دفعہ 25 میں فرد کی مذہبی آزادی کا ذکر ہے اور دفعہ 26 میں گروہ کی مذہبی آزادی کا ذکر ہے۔ پارلیمنٹ یا عدلیہ کو اس میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کا کوئی اختیار نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ لوک سبھا میں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہے راجیہ سبھا میں ابھی بھی وہ اقلیت میں ہے اس لیے اس طرح کا کوئی بل پاس کرنا یا قانون سازی کرنا مشکل ہے۔ اور وزیراعظم کا اس طرح سے کہنا سراسر غلط ہے اور دستورِ ہند کے ساتھ مذاق ہے اور یہ ان کے منصب اور عہدے کے مغایر ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ہم ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کریں گے۔ اس سلسلہ میں پیش رفت ہو رہی ہے، بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ بورڈ میڈیا سیل قائم کرے گا اور اس کا آغاز میڈیا ورکشاپ سے ہوگا۔ اس ورکشاپ میں فنی ماہرین اور قانونِ شریعت کے ماہرین کی نگرانی میں کچھ علماء اور پروفیشنل نوجوانوں کو میڈیا کی تربیت دی جائے گی، اور پھر وہ لوگ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں بورڈ کی بہتر ترجمانی کے فرائض انجام دیں گے اور ان شاء اللہ اس کام کو مختلف زبانوں میں انجام دیا جائے گا۔ اسی طرح بورڈ کی یہ بھی کوشش ہے کہ سوشل میڈیا کو اپنا مضبوط ہتھیار بنا کر اسلام اور مسلم پرسنل لاء

کی ترجمانی کے لیے اس کو استعمال کرے گا۔ ہمارا اپنا چینل ہونا چاہیے لیکن اس سلسلہ میں پہل مسلم سرمایہ دار بھی کر سکتے ہیں اور وہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ بورڈ کے ذمہ داران اور دیگر علماء کی سرپرستی ونگرانی میں اس کام کو شروع کریں۔ تاہم مجھے خود بھی اس اہم ضرورت کا احساس ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہم الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اور بطورِ خاص سوشل میڈیا کے ذریعہ ان مسائل کو طشت از بام کریں، جیسے ہندوؤں کے یہاں بیٹیوں کو صرف نقد مال میں وراثت دی جاتی ہے اور زمین اور مکان وغیرہ میں بیٹیوں کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا۔ جب کہ اسلام نے یہ کہا ہے کہ ایک تنکا سے لے کر پہاڑ تک میں بیٹے بیٹیوں کے درمیان وراثت کی تقسیم ہوگی۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب بادشاہ کو متہم کیا جاتا ہے جب کہ اورنگ زیب نے مندروں کو بڑے بڑے عطیات دیئے، وہیں شیواجی نے بڑے بڑے مندروں کو توڑا، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم ہندو لاء میں جو کمیاں ہیں اس کو اُجاگر کریں لیکن اس کا اُسلوب دعوتی ہو نہ کہ تنقیدی۔ جہاں تک سوشل میڈیا، فیس بک اور یوٹیوب کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں کوششیں جاری ہیں، ان شاء اللہ اس جانب خصوصی توجہ دی جائے گی، اور اس سلسلہ میں تو میں کہنا چاہوں گا کہ یہ مسئلہ تمام امت مسلمہ کا ہے اور اس کام کو تمام ملّی تنظیموں کو کرنا چاہیے اس سلسلہ میں چاہیں تو تمام ملّی و دینی تنظیمیں مشترکہ طور پر ایک لائحۂ عمل تیار کر کے مضبوطی کے ساتھ اس کام کو کریں یہی وقت کی ضرورت ہے۔ بورڈ بھی اس سلسلہ میں مستقل کوشاں ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ائمہ، علماء اور دانش وران واقف نہیں ہیں تو اس میں ان کا خود قصور ہے، ایسے لوگ جوامت کی رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیتے ہوں اور وہ ایسے مسائل سے ناواقف ہوں جو اس ملک میں مسلمانوں کے لیے موت وزیست کا مسئلہ ہو۔ ان کے ملّی وجود کے باقی رہنے یا نہ رہنے کا مسئلہ ہو، ان کی ملّی شناخت کے باقی رہنے یا گم ہوجانے کا مسئلہ ہو۔ اس سلسلہ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے متعدد کتابیں، کتابچے اور پمفلٹ شائع کیے گئے ہیں، خبرنامہ جاری کیا گیا ہے، اس کی ویب سائٹ موجود ہے، ہر سال اس کے اجلاس عام ہوتے ہیں، جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں، اس موضوع پر وقفہ وقفہ سے

اخبارات ورسائل میں مختلف مضامین شائع کیے جاتے ہیں، پھر بھی بورڈ کوشش کرے گا کہ اس کو مزید لوگوں تک پہنچانے کے لیے مختلف منصوبوں کو بروئے کار لائے۔ بورڈ صرف چند عہدیداروں کا نام نہیں ہے بلکہ تمام ملّی تنظیمیں اس میں شامل ہیں اوران سب کومل کراس کام کو کرنا چاہیے۔ یہ ذمہ داری صرف بورڈ کی نہیں ہے بلکہ ہراس شخص کی ہے جو اللہ اوراس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ قانونِ شریعت سے واقفیت حاصل کرے، اس لیے کوئی بھی مسلمان یہ کہہ کر بریٔ الذمہ نہیں ہوسکتا کہ مجھے قانونِ شریعت کا علم نہیں تھا، اس لیے میں نے یہ کام نہیں کیا۔ اگر کوئی شخص سڑک پر بائیں جانب چلنے کی بجائے دائیں جانب چلے اور اس کا ایکسیڈینٹ ہوجائے اور یہ کہے کہ مجھے علم نہیں تھا تو یہ اس کی حماقت تصور کی جائے گی۔ قانون سے لاعلمی اپنا قصور ہے نہ کہ قانون بنانے والے کا۔ ویسے بورڈ پوری کوشش کررہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کا پیغام معاشرہ کے ہر فرد تک پہنچے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کوئی تنظیم نہیں ہے جو ضلع اور بلاک سطح پر اپنے تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل کرے بلکہ بورڈ ملّی تنظیموں کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ ہندوستان کی تمام مسلم تنظیمیں اس میں شامل ہیں، تنظیمی کام کرنا بورڈ کے دستور سے خارج ہے۔ اگر بورڈ بھی اُوپر سے نیچے تک اپنی تنظیمیں قائم کرتا ہے تو دوسری تنظیمیں بورڈ کو اپنا حریف سمجھنے لگیں گی، جب کہ بورڈ تمام ملّی تنظیموں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ اس سلسلہ میں ان تنظیموں کے ذمہ داروں سے اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ ضلعی اور بلاک سطح پر مسلم پرسنل لاء کا تعارف کرائیں۔

اس کے بالمقابل آر ایس ایس ایک تنظیم ہے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ وہ تنظیموں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ آر ایس ایس تنظیم ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے مختلف مقاصد کے لیے مختلف شاخیں بنا رکھی ہیں لیکن پرسنل لاء کوئی تنظیم نہیں ہے۔ اس طرح کے کام دیگر ملّی تنظیمیں کررہی ہیں اور بہت ہی اچھے انداز سے کررہی ہیں بالخصوص جماعت اسلامی نے ملک بھر میں اس طرح کے اداروں کا جال بچھا رکھا ہے، جمعیت علمائے ہند اور دیگر تنظیمیں بھی کام کررہی ہیں، یہ کام بورڈ کے دائرہ سے خارج ہے۔ بورڈ کا کام قانونِ شریعت کا

تحفظ ہے، حکومت سے تحفظ، عدالتی فیصلوں کے منفی اثرات کو زائل کرنا اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ رضا کارانہ طور پر قانونِ شریعت پر عمل کریں۔

شریعت پر نشانہ اور ملاؤں کا بہانہ

جب سے سپریم کورٹ میں تین طلاق سے متعلق کچھ نام نہاد مسلم خواتین نے دعویٰ دائر کیا ہے اور موجودہ حکومت نے اپنی مسلم دشمنی کے ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کے مؤقف کے خلاف کورٹ میں تحریری بیان داخل کیا ہے، تب سے پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک نیشنل میڈیا اور سوشل میڈیا پر ایک نئی بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ قرآنی طریقۂ طلاق کو اپنانا چاہیے، ملاؤں کے بتلائے ہوئے طریقۂ طلاق کو مسترد کر دینا چاہیے، یہ دراصل عناد اور مخالفت کا ایک طریقہ ہے کہ اگر براہِ راست اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا جائے تو مسلمان اسے برداشت نہیں کریں گے؛ اس لیے جو لوگ اسلام کے سچے ترجمان اور اس کی فکر کے محافظ ہیں، ان کو برا بھلا کہا جائے؛ اسی لیے مولویوں، ملاؤں اور مدرسہ والوں کو کوسا جاتا ہے، ان کے بارے میں تحقیر آمیز باتیں کہی جاتی ہیں، اور یہ تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا اسلام ایک اچھا مذہب ہے، اور قرآن تو ایک بہتر کتاب ہے؛ لیکن سارا فساد مولویوں اور ملاؤں نے پیدا کیا ہے۔

قرآنی طریقۂ طلاق کے بارے میں عام طور پر تین باتیں کہی جاتی ہیں:

(۱) طلاق کا ارادہ شوہر کی طرف سے حَکَم کے سامنے رکھا جائے، جو مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کرے، پھر اگر وہ مسئلہ کو سلجھا نہ سکے تب طلاق دی جائے، اس کے بغیر جو طلاق دی جائے، وہ معتبر نہیں ہے۔

(۲) طلاق صرف ایک یا دو بار دی جائے، اگر تین بار طلاق دے دی تو یہ واقع نہیں ہوگی؛ کیوں کہ یہ قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے۔

(۳) حلالہ کا مسئلہ مولویوں کا گھڑا ہوا ہے، قرآن مجید نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

اب ان تین نکات پر غور کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ان آیات کو دیکھنا چاہیے، جن میں طلاق کا ذکر ہے — قرآن مجید کی کل نو آیتوں میں طلاق کا ذکر آیا ہے، جن میں ایک سورۃ طلاق میں ہے، ایک سورۃ تحریم میں اور بقیہ سورۃ البقرۃ میں، سورۃ البقرۃ کی

آیت نمبر۲ ۱۳ تا ۲۲۸ میں ایک، دو اور تین طلاق پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ (آگے اس کی تفصیل آرہی ہے) سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر: ۲۳۷ میں مطلقہ عورت کے مہر کے مسائل کا، اور آیت نمبر ۱۴۲ میں مطلقہ کے لیے متاع کا ذکر ہے، اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۳۲ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ مطلقہ عورت خود اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہے، اور اگر وہ سابق شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کو روکا نہیں جا سکتا، سورۃ تحریم کی آیت کا تعلق خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے ہے اور سورۃ طلاق کی آیت نمبر: ۱ میں بنیادی طور پر دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے: ایک یہ کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے تو عدت کا لحاظ رکھتے ہوئے دے، دوسرے: عدت کے دوران مطلقہ کو رہائش کی سہولت فراہم کرے، غور کیا جائے تو جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے، ان سب میں زیادہ تر طلاق پر مرتب ہونے والے احکام ذکر کیے گئے ہیں، طلاق دینے کا طریقہ نہیں بتلایا گیا ہے، صرف سورۃ طلاق کی آیت نمبر: ۱ میں طریقۂ طلاق کے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ طلاق دیتے ہوئے عدت کا لحاظ رکھنا چاہیے، یعنی اس طرح طلاق نہ دینی چاہیے کہ عدت طویل ہو جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایسی پاکی کی حالت میں طلاق دی جائے، جس میں بیوی کے ساتھ قربت نہیں ہوئی ہو؛ کیوں کہ اگر حیض کی حالت میں طلاق دے تو اس حیض اور اس کے بعد کے طہر (پاکی) کے بعد مزید تین حیض عدت کے طور پر گزارنے ہوں گے، اور اگر بیوی سے صحبت کے بعد طلاق دے اور کہیں حمل ٹھہر گیا، تو عدت درازتر ہو جائے گی، بس یہی ایک آیت ہے، جس میں طریقۂ طلاق پر گفتگو فرمائی گئی ہے، بقیہ جتنی آیتیں ہیں، ان میں طلاق کے اثرات پر تو روشنی ڈالی گئی ہے؛ لیکن طریقۂ طلاق پر کوئی واضح حکم نہیں دیا گیا ہے، اس کے باوجود قرآنی طریقۂ طلاق اور غیر قرآنی طریقۂ طلاق کی تقسیم اور ایک کو قرآن کا بتایا ہوا طریقہ کہنا اور ایک کو ملاؤں کا بتایا ہوا طریقۂ طلاق کہنا کہاں کا اِنصاف ہے؟

طریقۂ طلاق کے سلسلہ میں پہلی بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن مجید نے طلاق سے پہلے حَکَم کے سامنے معاملہ پیش کرنے کو ضروری قرار دیا ہے، اور مولویوں نے اس طریقۂ کار کو

ختم کر دیا ہے، جن آیات سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:

''مرد عورتوں پر نگراں ہیں؛ اس لیے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، پس نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں، اور شوہر کی عدم موجودگی میں جیسا کہ اللہ نے محفوظ رکھا ہے، اپنی (عزت و آبرو اور مال) کی حفاظت کرتی ہیں، اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمھیں اندیشہ ہو، ان کو نصیحت کرو، ان سے بستر الگ کرلو، اور ان کی سرزنش کرو، اگر وہ فرماں برداری کریں تو ان پر (زیادتی کا) راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ بلندی اور بڑائی والے ہیں، اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے خاندان سے اور ایک حَکَم عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان جوڑ پیدا کر دیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ علم والے اور باخبر ہیں۔'' (النساء: ۳۴۔۳۵)

ان آیات پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان میں بتایا گیا ہے کہ مرد صدرِ خاندان ہے، اور عورت پر جائز امور میں اس کی اطاعت واجب ہے؛ چوں کہ حقوق اور فرائض کے بارے میں اکثر نزاع پیدا ہو جاتا ہے، اور میاں بیوی کی ہمہ وقتی رفاقت کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع کا امکان زیادہ ہوتا ہے؛ اس لیے خاص طور پر میاں بیوی کے بارے میں بتایا گیا کہ اگر بیوی شوہر کے حقوق کے بارے میں کوتاہی کرے، اور اس کی وجہ سے تعلقات میں ناخوش گواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے شوہر ذاتی طور پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرے، اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: (الف) پند و نصیحت کے ذریعہ سمجھانا۔ (ب) عارضی طور پر ترکِ تعلق کر لینا۔ (ج) تنبیہ و فہمائش کرنا۔ اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ ہو تو سماج کو چاہیے کہ ان کے باہمی جھگڑے طے کرنے کے لیے دونوں خاندان سے ایک ایک حَکَم لے کر اختلاف کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔

یہ پورا مضمون ان ہی دو آیتوں میں آیا ہے، نہ اس سے پہلے دور تک طلاق کا ذکر ہے نہ اس کے بعد؛ بلکہ اس پوری سورۃ ہی میں طلاق کا کہیں ذکر نہیں ہے، اگر یہ آیت طلاق سے متعلق ہوتی تو اس ارشاد کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آتا، یہ تو ایک عمومی نصیحت ہے؛ چوں کہ

ازدواجی رشتہ خاندان کے استحکام کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے؛ اس لیے خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ اس میں دراڑ پیدا نہیں ہونی چاہیے، شوہر بھی ذاتی طور پر اس کے لیے کوشش کرے، اور سماج بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے، اس کا تعلق خاص طلاق کے مسئلہ سے ہے ہی نہیں؛ بلکہ یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ میاں بیوی میں کسی بھی قسم کا اختلاف پیدا ہو تو اسے اسی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس آیت کے پس منظر میں زوجین کو نصیحت کی جاسکتی ہے کہ طلاق میں عجلت نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ اگر تعلقات میں ناخوش گواری پیدا ہو جائے تو اس کو حل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے، اور آخری چارۂ کار کے طور پر ہی طلاق دی جائے؛ لیکن اس کی حیثیت طلاق کے لیے شرط کی نہیں ہے، غور کریں تو ان دونوں آیتوں میں جن مراحل کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں تین (پند و نصیحت، ترکِ تعلق، تنبیہ و فہمائش) تو وہ ہیں، جن کا تعلق شوہر اور بیوی کی خلوت سے ہے، ان کو تو عدالت کے سامنے ثابت کرنا بھی دشوار ہے، اگر ان دونوں آیتوں میں آنے والے احکام کو طلاق کے مسئلہ سے جوڑا جائے، اور طلاق واقع ہونے کے لیے طلاق سے پہلے ان امور کو پورا کرنا شرط قرار دیا جائے تو عدالت میں طلاق کے واقع ہونے کی بات کو ثابت کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔

پھر یہ بات بادی النظر میں بہتر معلوم ہوتی ہے کہ اگر زوجین آپس میں مسئلہ کو حل نہ کر سکیں تو پہلے خاندان کے بزرگوں، یا سماج کے کسی اور ذمہ دار شخص کے ذریعہ نزاع کو سلجھانے کی کوشش کی جائے؛ لیکن غور کیا جائے تو اس کو لازم نہ کرنے میں عورتوں ہی کا مفاد ہے؛ کیوں کہ طلاق زندگی کا بند دروازہ نہیں، جس کے آگے کوئی راستہ نہ ہو؛ بلکہ یہ ایک مرحلہ کا اختتام ہے اور دوسرے مرحلہ کا آغاز ہے، طلاق کے ذریعہ زندگی کا ایک باب بند ہوتا ہے اور دوسرا کھلتا ہے، عورت کا پہلا رشتہ نکاح ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے نکاح کی راہ ہموار ہوتی ہے، اگر شوہر پر یہ بات لازم قرار دی جائے کہ وہ ان اسباب و وجوہ کی وضاحت کرے، جن کی وجہ سے اس نے طلاق دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ بہت سی دفعہ ان کا ظاہر کرنا خود عورت کے مفاد میں

نہ ہو، ایسے مواقع پر ایک شریف اور باعزت میاں بیوی اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ علیحدگی ہو جائے اور ایسے واقعات پردہ ہی میں رہیں؛ تاکہ کسی فریق کی بے عزتی اور بے آبروئی نہ ہو اور اگر طلاق کا سبب عورت کی طرف سے پائی جانے والی کوتاہیاں نہ ہوں، تب بھی اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ خدا ناترس شوہر جھوٹ بولے اور اپنی بیوی کے کردار پر حملہ کرے؛ تاکہ طلاق دینے کے عمل کو درست ثابت کر سکے، ہر دو صورت میں عورت کے لیے آئندہ زندگی کا آغاز مشکل ہو جائے گا، جب سماج تک یہ بات پہنچے گی کہ فلاں شخص کی بیوی پر بدکردار، بد اخلاق، بدزبان اور نافرمان ہونے کا الزام ہے تو غور کیجیے کہ کوئی شخص اس کو اپنی بیوی یا بہو بنانے کو تیار ہوگا؟ —— ہندوستان کے موجودہ معاشرہ کی صورتِ حال یہ ہے کہ کنواری لڑکیوں کا رشتہ ملنا دشوار ہوتا ہے، وہاں کیا ایسی عورتوں کا رشتہ ملنا آسان ہوگا، جن کی کمزوریاں طشت از بام ہو چکی ہوں، یا وہ ہوں تو بے قصور؛ لیکن انہیں بدنام کر دیا گیا ہو؟...... اس لیے حقیقت یہ ہے کہ طلاق سے پہلے تحکیم کو ضروری قرار دینا نتیجہ کے اعتبار سے عورت کے لیے نقصان دہ ہے نہ کہ فائدہ مند۔

دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ قرآن میں تین طلاق دینے کی ممانعت کی گئی ہے؛ اس لیے اگر تین طلاق دے دے تو یا تو وہ واقع ہی نہیں ہوگی، یا ایک واقع ہوگی، یہ بھی درست نہیں ہے، قرآن میں یہ حکم صراحتاً منقول نہیں ہے کہ تم ایک طلاق دو، یا دو طلاق دو، یا تین طلاق دو؛ بلکہ صرف طلاق کے اثر و نتیجہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر ایک یا دو طلاق دے تو کیا حکم ہوگا، اور تین طلاق دی جائے تو کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے:

''دو طلاقیں دی جائیں، یا تو بھلے طریقہ پر روک لیں، یا خوش گوار طریقہ پر چھوڑ دیں، اور تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان کو دیا ہے، ان میں سے کچھ واپس لے لو، سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، تو اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ پائیں گے تو ان دونوں کو اس میں کچھ

مضائقہ نہیں ہے کہ بیوی کچھ دے دے (تاکہ شوہر اس کو طلاق دے دے) یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں؛ اس لیے ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائیں، وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر شوہر نے انہیں طلاق دے دی تو بیوی اس کے لیے حلال نہیں ہوگی جب تک وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کچھ حرج نہیں ہے کہ ایک دوسرے سے رجوع کرلیں (یعنی دوبارہ نکاح کرلیں) بشرطیکہ انہیں اطمینان ہو کہ وہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کو قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے احکام ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ سمجھ دار لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ: ۲۲۹۔۲۳۰)

قرآن مجید کی یہ آیتیں بالکل واضح ہیں، اور ان میں تین احکام بیان کیے گئے ہیں:

اوّل یہ کہ اگر ایک یا دو طلاق دی جائے تو شوہر کے لیے بیوی سے رجوع کرنے کی گنجائش باقی رہتی ہے، ایسی صورت میں شوہر کا ارادہ رشتہ باقی رکھنے کا نہیں ہو تو چاہیے کہ عدت گزر جانے دے، اور خوش گوار طریقہ پر بیوی کو رخصت کردے، اور اگر واقعی بیوی کے ساتھ خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنے کا عزم ہو تو اس سے رجوع کرلے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بہتر طریقہ پر زندگی گزارے۔

دوسرا حکم خلع کا دیا گیا کہ اگر شوہر و بیوی محسوس کرتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے احکام کے مطابق وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے اور آپس میں یہ معاہدہ ہو جائے کہ بیوی مہر واپس کردے اور شوہر طلاق دے دے تو یہ بھی درست ہے، مگر بہتر یہی ہے کہ شوہر دی ہوئی چیز واپس نہ لے۔

تیسرا حکم یہ معلوم ہوا کہ اگر دو طلاق کے بعد شوہر نے تیسری طلاق بھی دے ہی دی، تو اب عورت مرد کے لیے مکمل طور پر حرام ہوگئی، ان کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے نکاح کرنا جائز نہیں؛ البتہ اگر عورت کا کسی اور مرد سے نکاح ہو، سوء اتفاق کہ اس سے بھی نباہ نہ ہو سکا، اور پھر اس سے بھی طلاق ہوگئی، تو اب وہ عورت پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔

غور کیجیے کہ اس آیت میں کہیں بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر تیسری طلاق دے دے تو طلاق واقع نہیں ہوگی؟ اگر چہ کہ بلا وجہ تین طلاق دینا یا ایک ساتھ تین طلاق دے دینا گناہ ہے اور ایسا نہیں کرنا چاہیے؛ لیکن اس ممانعت کا بھی آیت میں واضح طور پر کوئی ذکر نہیں ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے؛ اسی لیے فقہاء بھی اس کو منع کرتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں کہیں بھی یہ بات نہیں فرمائی گئی کہ اگر تین طلاق دے دی جائے تو تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی؛ بلکہ اس کے برخلاف قرآن کہتا ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی؛ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ آیات صرف اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ ایک، دو اور تین طلاقیں دینے کا کیا اثر مرتب ہوگا؟

تاریخ کا تحفظ

ہندوستان میں مسلمان اس وقت جن حالات سے گذر رہے ہیں، وہ بڑے صبر آزما اور تشویش ناک ہیں، آر، ایس، ایس نے اپنے اصل نظریہ پر کام کرنا شروع کر دیا ہے، فساد کی تو طویل تاریخ ہے؛ لیکن مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمان دہشت زدہ ہو جائیں اور ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ اکثریت کے سامنے سپر انداز ہو جائیں؛ لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں جذب کر لیا جائے، وہ اپنی شناخت سے محروم ہو جائیں، ان میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے، اس کے لیے وسیع الاطراف پروگرام بنایا گیا ہے، جواب آہستہ آہستہ بے غبار ہوتا جا رہا ہے، ایک طرف نصابِ تعلیم میں تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں، دوسری طرف ملک اور ملک کی آزادی کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے، تیسری طرف الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ہندو تصورات اور تہذیبی طور طریقوں کو تقویت پہنچانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، یہ اتنے خطرناک اقدامات ہیں کہ جن کی سنگینی کا اندازہ مستقبل میں ہی ہو سکے گا، اگر ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو پھر اس کی تلافی شاید ممکن نہ ہوگی۔

تاریخ کو بدلنے کا کام اتنی تیز رفتاری کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اب مغلوں کا ظالم و لٹیرا ہونا، اورنگ زیب کا مندر شکن ہونا اور ایسے مسلمان فرماں روا جن کی ہندو دوستی مسلَّم تھی، جیسے: اکبر، یا جن کی رواداری کی مثال دی جاتی تھی، جیسے: ٹیپو سلطان یا نظام حیدر آباد، ان کا بھی فرقہ پرست اور ہندو دشمن ہونا عام پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ایک مسلَّم بات بنتی جا رہی ہے، دوسری طرف دلتوں اور بودھوں پر برہمنوں کی طرف سے جو مظالم ہوئے، اس سچائی کو مسخ کیا جا رہا ہے۔

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے حل کی طرف متوجہ ہوں، کسی بھی قوم کے لیے اس کی تاریخ بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی لیے تاریخ کو قوموں کا حافظہ کہا جاتا ہے، تاریخ سے انسان ہمت و حوصلہ حاصل کرتا ہے، تاریخ مایہ عبرت اور اثاثہ موعظت ہے، ماضی کی تاریخ مستقبل کے لیے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہے، جو قومیں

تاریخ سے محروم ہوں، ان کی مثال بے نسب آدمی کی سی ہے، جو ہمیشہ احساسِ کمتری سے دوچار رہتا ہے اور مقابلہ و مقاومت کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، غور کیجیے کہ قرآن مجید ہدایت و موعظت کی کتاب ہے اور یہی اس کا موضوع ہے؛ لیکن قرآن کا ایک قابل لحاظ حصہ قصص وواقعات پر مشتمل ہے، اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار آیات واقعات وقصص سے متعلق ہیں، ۲۶ پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقوام اور دعوت حق سے ان کے انکار کا تو بار بار ذکر آیا ہے اور چھ سورتیں تو ایسی ہیں جو خاص انبیاء کے نام پر ہیں، اس کے علاوہ متعدد سورتیں کسی قوم، کسی شخصیت یا کسی اہم واقعہ سے موسوم ہیں اور وجہ اس کی وہی ہے کہ تاریخ کسی بھی قوم کے لیے سامانِ حوصلہ بھی ہوتی ہے، سرمایۂ عبرت بھی اور نقش راہ بھی! اسی لیے قرآن انبیاء اور اقوام کے قصص و واقعات کو نقل کرتے ہوئے عبرت و موعظت کے پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتا جاتا ہے، کبھی کہتا ہے: "فَانظر كَيفَ كَانَ عَاقِبَة المفسِدِينَ" (النمل:۱۴) کبھی کہتا ہے: "فَانظر كَيفَ كَانَ عَاقِبَة الظَّالِمِينَ" (القصص:۴۰) یعنی دیکھو کہ مفسدین اور ظالمین کا کیا انجام ہوا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہ سامانِ موعظت ہے: "هٰذَا ذِكر"، کبھی فرعون کی سرتابی اور اس کا انجام نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ اس میں اہل خشیت کے لیے عبرت ہے: "اِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخشىٰ" (النازعات:۲۶) اسی طرح احادیث میں انبیاء اور ان کی اقوام نیز عربوں کے ابتدائی حالات سے متعلق اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اس سے تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے یہاں تاریخ اور تذکرہ کا موضوع ہمیشہ سے اصحاب تصنیف کا ایک مقبول اور پر کشش موضوع رہا ہے اور علم کی دنیا میں تاریخ کے موضوع پر جتنا بڑا سرمایہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے، شاید ہی کوئی اور قوم اس میں اس کی ہمسر ہو، اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک پوری اسلامی تاریخ روشنی میں ہے، اسلام سے مسلمانوں

کا رشتہ مستحکم اور استوار رکھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، خود ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے جو پُر جوش کردار ادا کیا اس میں بھی مسلم تاریخ نے ایک اہم محرک کی حیثیت سے تقویت پہنچائی ہے، مسلمانوں کا یہ احساس کہ انہوں نے کبھی غلامی کا جوا اپنی گردن پر برداشت نہیں کیا ہے اور انہوں نے سر جھکانے کے بالمقابل آزمائش اور ابتلاء کے موقعوں پر سر کٹانے کو ترجیح دی ہے، ان کے جوش جنوں میں اضافہ کیا اور تمام تر بے سروسامانی کے باوجود ان کو ایک ایسی قوم کے مقابلہ استقامت و پامردی عطا کی کہ جس کی حکومت میں اس وقت کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے کسی قوم کو اس کی تاریخ سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچہ کی خاندانی شناخت گم ہو جائے، ایسے بچہ کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور کسی دوسرے خاندان کے ساتھ ضم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہوتا، اسی طرح جب کوئی قوم اپنی تاریخ سے محروم ہو جائے یا اپنی تاریخ کے بارے میں احساسِ کمتری کی شکار ہو جائے، تو اسے مرعوب کرنا اور فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریتی اور طاقت ور گروہ کے ساتھ جذب کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں، جس کی واضح مثال اس ملک میں دلت ہیں، جو اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود زبردستی ہندو تہذیب میں جذب کر لیے گئے ہیں اور برہمنوں کے لیے آلہ کار اور خدمت گار ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ اسی تجربہ کو دوہرانا ہے، مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کی تاریخ مسخ نہیں کی، جن لوگوں سے صدہا برس ان کی جنگیں ہوئیں، جن قوموں کے ساتھ ان کے معرکے ہوئے اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی، ان کے ساتھ بھی مسلمان مؤرّخین نے کبھی نا اِنصافی روا نہیں رکھی، اِس لیے کہ قرآن مجید کی واضح ہدایت ہے کہ کسی قوم کی برائی، اس کے ساتھ ناانصافی کا جواز فراہم نہیں کرتی: ”لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا“ (المائدۃ: ۸) خود ہندوستان پر عرب مؤرّخین اور سیاحوں نے قلم اُٹھائے ہیں، جو خامیاں تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے اور خود ہندو مؤرّخین کو ان سماجی کمزوریوں کا اعتراف ہے اور جو خوبیاں

تھیں ان کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے، ہندوستان کے علم وحکمت، طب و معالجہ کی صلاحیت اور بہادری وغیرہ کا تفصیل سے ذکر آیا ہے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملک جس کو مسلمانوں نے وسعت ووحدت عطا کی، معاشی فراخی دی، امن و امان دیا، عدل ومساوات سے آشنا کیا، سماجی انصاف کی دولت دی، اس کے چپہ چپہ پر تاریخی عظمت کے نقوش سجائے اور اسی زمین کو اپنا مسکن اور مدفن بنایا، ان کی قربانیوں کو وہ لوگ مسخ کرنا چاہتے ہیں جن کے تلوؤں میں اس ملک کے بنانے، سنوارنے اور بچانے میں شاید ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم اس صورتِ حال کا قانون اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کریں اور دوسری طرف مسلمان مؤرّخین اِنصاف پسند غیر مسلم مؤرّخین کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان کی آزادی اور اس کی تعمیر کی بابت مسلمانوں کی جدو جہد کی تاریخ مرتب کریں اور دُرست علمی مواد قوم وملک کے سامنے پیش کریں، نیز اس ملک میں شودروں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے گئے، تاریخی اور مذہبی حوالوں سے ان کو پیش کریں؛ تاکہ لوگ حقائق سے واقف ہوسکیں، یہ ایک طرف اس ملک کے ساتھ بہی خواہی ہوگی، انصاف ہوگا، اس سے وطنی ہم آہنگی پیدا ہوگی، لوگ حقائق سے واقف ہوسکیں گے اور دوسری طرف خود مسلمان نوجوان اور آنے والی نسل احساسِ کمتری سے محفوظ رہے گی اور اپنی تاریخ سے اس کا رشتہ مربوط اور استوار رہے گا، اگر اس وقت اس صورتِ حال پر توجہ نہیں دی گئی تو پھر آئندہ شاید ان مضرتوں کی تلافی ممکن نہ ہو۔

عملیات — شرعی نقطۂ نظر

پریشان حال لوگ عامل حضرات کے پاس دین کی نسبت سے آتے ہیں، ایسے لوگوں کی طرف سے ضرورت مندوں کا استحصال، ان سے غیر معمولی مقدار میں رقوم کی وصولی، یہاں تک کہ عزت وآبرو پر بھی دست درازی کے واقعات حد درجہ افسوس ناک ہیں، اچھے اور برے واقعات سماج میں دن ورات پیش آتے رہتے ہیں اور جب کسی معاشرہ میں برائی کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور جرائم روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں، تو لوگوں کی نگاہ میں ان واقعات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، کوئی بات کتنی بھی نامناسب ہو، لیکن جب آنکھیں انھیں دیکھنے اور کان ان کے سننے کے خوگر ہو جائیں، تو اس کی سنگینی اور شناعت کا احساس کم سے کم ہوتا جاتا ہے، لیکن یہی واقعات اگر دینی مراکز اور دینی شخصیتوں کی نسبت سے سامنے آئیں، تو دل پر چوٹ لگتی ہے اور دین اور اہل دین کا اعتماد واعتبار مجروح ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو شفاء اور مؤمن کے لیے رحمت قرار دیا ہے، **وننزل من القرآن ماهو شفاء و رحمة للمؤمنين** (اسراء:۸۲) — اصل میں تو قرآن مجید دل کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے، وہ کفر وشرک اور نفاق کی بیماری سے قلب کو نجات عطا کرتا ہے، **شفاء لما فی الصدور** (یونس:۵۷) — لیکن کیا اللہ کی یہ ''کتابِ اعجاز'' جسم انسانی کے لیے بھی باعث شفاء ہے؟ اس میں اختلاف ہے اور اکثر اہل علم اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید سے شفاء جسمانی بھی حاصل ہوتی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۱۶، نیل الاوطار: ۸/۲۱۲) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ بچھو گزیدہ شخص پر سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے شفاء عطا فرمائی۔ (نیل الاوطار: ۸/ ۲۱۵) — خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الفلق و الناس کے ذریعہ شفاء جسمانی کا ذکر موجود ہے۔

اسی طرح بعض بیماریوں سے شفاء کے لیے دعائیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، بعض دعائیں مطلق بیماری کے لیے ہیں اور بعض دعائیں متعین بیماریوں کے

لیے، مشہور محدث امام ابوزکریا نوویؒ نے ماثور دعاؤں اور اذکار کو ''کتاب الاذکار'' کے نام سے جمع فرمایا ہے، یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں ایسی بہت سی دعائیں موجود ہیں — نیز یہ بات عقل وخرد کے بھی خلاف نہیں، جن مادی دواؤں کو ہم کھاتے اور ان سے صحت یاب ہوتے ہیں، ان میں یہ خصوصیت اور نافعیت خالق کائنات ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، تو اگر اللہ تعالیٰ وہی تاثیر وصلاحیت الفاظ اور کلمات میں پیدا کردیں تو یقیناً یہ بھی باعث تعجب نہیں ہے، اس پر انسانی تجربات بھی شاہد ہیں، بہت سے مواقع پر کسی آیت کے پڑھنے یا دَم کرنے یا کسی دعاء کے پڑھنے کی وجہ سے شفاء حاصل ہوتی ہے اور انسان عملاً اس کا تجربہ کرتا ہے، اسی لیے صحیح یہی ہے کہ دعائیں بھی، قرآنی آیات بھی اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ بھی شفاء کی تاثیر رکھتے ہیں، اور یہ اسباب کے درجہ میں ہیں، اصل شفاء اللہ ہی کی مشیت اور اسی کے حکم سے ہے۔

روحانی عمل کے ذریعہ علاج کی مختلف صورتیں ہیں، دعاء کرنا، کوئی آیت، ذکر یا دعاء پڑھ کر دَم کرنا، قرآن مجید کی آیت، دعاء یا اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کو لکھنا اور اسے دھو کر پینا اور لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا — جہاں تک شفاء کی دعاء کرنے کی بات ہے، خواہ اپنے لیے یا دوسرے کے لیے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ پر دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ دعاء فرماتے تھے:

''اللهم رب الناس ، اذهب البأس ، واشف انت الشافي ، لا شفاء الا شفاءک، شفاء لا یغادر سقما.'' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۳۵۱، **باب دعاء العائد للمریض**)

اے! انسانیت کے پروردگار! تکلیف کو دور کردیجیے اور شفاء عطا فرمائیے، کہ آپ ہی شفاء عطا فرما سکتے ہیں، ایسی شفاء جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے۔

حضرت عثمان بن ابوالعاصؓ سے مروی ہے، کہ مجھے اسلام قبول کرنے کے بعد سے جسم میں درد کا احساس رہتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ جہاں پر تکلیف

ہو، وہاں ہاتھ رکھو، تین دفعہ بسم اللہ کہو اور سات دفعہ پڑھو:

"اعوذ بعزة اللّه و قدرته من شر ما اجد واحاذر." (مسلم، حدیث نمبر: ۲۲۰۲، **باب استحباب وضع يده على موضع الالم مع الدعاء**)

میں اللہ تعالیٰ کے غلبہ اور قدرت کی پناہ میں آتا ہوں، ان چیزوں کی شر سے جس سے میں دوچار ہوں اور جس سے ڈرتا ہوں۔

دوسری صورت پڑھ کر دَم کرنے اور پھونکنے کی، یہ بھی حدیث سے ثابت ہے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سونے کے وقت معمول مبارک تھا کہ سوتے وقت قل ہو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر اپنے اوپر دَم فرماتے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۵۰۱۷، **باب فضل المعوذات**)

— حضرت عائشہؓ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ جب گھر کے لوگوں میں کوئی بیمار پڑتا، تو اس پر بھی آپ معوذات یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر دَم فرمایا کرتے، پھر جب آپ مرض وفات کی حالت میں تھے، تو حضرت عائشہؓ آپ پر دَم کیا کرتی تھیں۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۷۰) — پھونکنے اور دَم کرنے کو حدیث میں رقیہ (راء پر پیش) سے تعبیر کیا گیا ہے اور صراحتاً آپ سے اس کی اجازت ثابت ہے، حضرت عوف بن مالکؓ راوی ہیں کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کرتے تھے، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ مجھ پر پیش کرو، کہ اگر اس میں کوئی مشرکانہ بات نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، **لا بأس بالرقى مالم يكن فيه شرك** (مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۸۸) — جب براہِ راست جھاڑ پھونک کی اجازت ہے، تو اگر پانی پر دَم کیا جائے اور اسے مریض کو پلایا جائے یا تیل پر دَم کیا جائے اور اس سے جسم کی مالش کی جائے تو یہ صورت بھی درست ہونی چاہیے۔

یہ صورت کہ کسی برتن پر قرآن مجید کی آیت یا دعاء زعفران یا کسی اور شئ سے لکھی جائے اور اسے دھو کر پلایا جائے، ثابت ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے

ایک طویل دعاء نقل کی ہے، جس کی ابتداء "**بسم اللّٰہ، لاالہ الا اللّٰہ الحلیم الکریم، سبحان رب العرش العظیم، الحمد للّٰہ رب العالمین**" سے ہوتی ہے، کہ اس دعاء کو صاف برتن میں لکھ کر اسے پلایا جائے، اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ناف سے متصل چھینٹیں ماری جائیں، اسی سے استدلال کرتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

ویجوز ان یکتب للمصاب وغیرہ من المرضی شیئا من کتاب ا و ذکرہ بالمداد المباح ویغسل ویسقیٰ۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۹/ ۶۴)

بیمار اور مبتلائے مصیبت شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب یا ذکر میں سے کچھ جائز روشنائی سے لکھنا، دھونا اور پلانا جائز ہے۔

البتہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے ذکر کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے لکھا جائے وہ پاک ہو اور جس چیز پر لکھا جائے وہ بھی پاک ہو، تاکہ قرآن مجید کی بے احترامی نہ ہو، کیوں کہ قرآن کی بے احترامی سخت گناہ ہے، بلکہ جانتے، بوجھتے ایسا کرنے میں کفر کا اندیشہ ہے، لہٰذا خون سے قرآنی آیات واذکار کو لکھنا جائز نہیں۔

عمل کی چوتھی صورت لکھا ہوا تعویذ ہے، لکھا ہوا تعویذ گلے میں لٹکانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تعویذ لکھ کر گلے میں لٹکانا، بازو یا کسی اور حصہ میں باندھنا جائز نہیں، دوسری رائے اس کے جائز ہونے کی ہے، بشرطیکہ مشرکانہ کلمات سے خالی ہو اور یہی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیاطین وغیرہ سے حفاظت کی دعاء بتائی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اپنے بچوں کو یہ دعاء باضابطہ یاد دلاتے تھے اور جو اُن میں سے بڑے نہیں ہوئے تھے ان کے لیے دعاء لکھ کر ان کو پہنا دیتے تھے، **ومن لم یدرک کتبھا و علقھا علیہ** (مصنف ابن ابی شیبہ: ۸/ ۳۹) ـــــ علامہ ابن ابی شیبہ نے مختلف تابعین سے نقل کیا ہے کہ وہ تعویذ لکھنے اور اسے پہنانے کے قائل تھے، مشہور محدث سعید بن مسیّب سے نقل کرتے ہیں، کہ اگر چمڑے پر لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں، عطاء، مجاہد، محمد بن سیرین، ضحاک بڑے پایہ کے تابعی علماء گذرے

ہیں اور صحابہ کے صحبت یافتہ ہیں، ان سب سے لکھے ہوئے تعویذ کا جواز منقول ہے، حضرت عائشہؓ اور ائمہ مجتہدین میں سے امام احمدؒ کی طرف بھی یہی بات منسوب کی گئی ہے (دیکھئے: الموسوعة الفقهية: ۳۳/۱۳) — علامہ ابن تیمیہؒ نے عورت کے دردِ زہ کے سلسلہ میں جو دعاء لکھی اور دھوکر پلانے کی بات فرمائی ہے، اس میں کاغذ پر لکھنے اور عورت کے بازو میں باندھ دینے کا بھی ذکر آیا ہے، اس طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی لکھے ہوئے تعویذ کا جواز ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ (تمیمہ) لٹکانا شرک ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے زمانہ کے بعض اہل علم اس کو مطلقاً منع کرتے ہیں، لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا منشاء اور تھا، اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ ایک یہودی کے پاس جھاڑ پھونک کے بارے میں جایا کرتی تھیں، اسی بابت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ تنبیہ فرمائی تھی (دیکھئے: ابوداود، حدیث نمبر: ۳۸۸۳) — اس لیے آپ کا منشاء غیر مسلموں کے پاس جھاڑ پھونک کرانے اور ان سے تعویذ لینے کی ممانعت کا تھا، کیوں کہ ان سے علاج کرانے میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ مشرکانہ کلمات کا استعمال کرتے ہوں، اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جھاڑ پھونک کو بھی شرک قرار دیا، حالاں کہ پھونکنا اور دَم کرنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔

جھاڑ پھونک ہو، لکھ کر اور دھوکر پلانا ہو یا لکھا ہوا تعویذ ہو، ہر صورت میں چند باتیں ضروری ہیں، جس کو حافظ ابن حجرؒ نے اس طرح لکھا ہے:

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تین شرطیں پائی جائیں تو جھاڑ پھونک جائز ہے، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو یا اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا ذکر کیا جائے، دوسرے عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں جس کا معنی سمجھ میں آتا ہو، تیسرے اس بات کا یقین ہو کہ یہ جھاڑ پھونک بذاتِ خود مفید و مؤثر نہیں، اصل مؤثر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ (فتح الباری: ۱۰/۱۹۵)

اللہ تعالیٰ کے کلام اور اسماء وصفات کی شرط اس لیے رکھی گئی ہے، کہ اللہ ہی سے مدد اور شفاء کا طلب گار رہو اور شرک کا شائبہ تک پیدا نہ ہو، عربی زبان میں ہونا اس کے مفہوم سے آگہی بھی اسی لیے ضروری ہے کہ کوئی مشرکانہ کلمہ شامل نہ ہو جائے، تیسری شرط بھی اسی لیے ہے کہ انسان کا خدا پر یقین رہے، گویا اصل یہی ہے کہ جھاڑ پھونک اور تعویذ شرک سے خالی ہو، جیسا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا بأس بالرقی مالم یکن فیه شرک** (مسلم، حدیث نمبر: ۵۶۸۸) —— اسی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ غیر مسلموں کے پاس تعویذ اور عمل کے لیے نہیں جانا چاہیے، کیوں کہ اس صورت میں مشرکانہ تعویذ اور جھاڑ پھونک میں مبتلا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے؛ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت گذر چکی ہے کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کو اسی وجہ سے منع فرمایا تھا، ہاں! مسلمان عامل غیر مسلموں کا علاج کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ انسانی خدمت ہے اور انسانی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے کی مدد کرنا واجب ہے؛ چناں چہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بھی ثابت ہے کہ مسلمانوں کے قافلہ نے ایک غیر مسلم سردارِ قبیلہ کا علاج کیا تھا۔ (نیل الاوطار: ۸/ ۲۱۵)

سب سے اہم مسئلہ عامل حضرات کے طرزِ عمل اور ان کے رویہ کا ہے، اس سلسلہ میں چند اُمور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے:

اَوّل یہ کہ اجنبی عورتوں کے سلسلہ میں جو شرعی احکام ہیں، عاملین ان سے مستثنیٰ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے بہت شدت سے منع فرمایا ہے کہ مرد کی کسی غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی ہو، اس لیے غیر محرم عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا جائز نہیں۔

دوسرے شریعت میں اس سے بھی زیادہ ممانعت غیر محرم کو ہاتھ لگانے کی ہے، کیوں کہ اس سے زیادہ فتنہ کا اندیشہ ہے، مادّی طریقۂ علاج میں بعض دفعہ جسم کے کسی حصہ کو دیکھنے یا چھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، کیوں کہ جسمانی کیفیت ہی کے ذریعہ مرض کی تشخیص ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ روحانی طریقۂ علاج میں مرض کی تشخیص کے لیے اس کی ضرورت نہیں، اس لیے اس صورت کو ڈاکٹری معائنہ پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، یہی حال غیر محرم کا چہرہ

دیکھنے کا بھی ہے، کہ اگر جوان لڑکی یا خاتون ہو، تو چہرہ کا پردہ بھی ضروری ہے، عام طور پر عامل حضرات ان اُمور کے بارے میں احتیاط نہیں برتتے، نتیجہ کار خود فتنہ سے دوچار ہوتے ہیں، دوسروں کو فتنہ میں مبتلا کرتے ہیں اور دین واہل دین کی رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔

تیسرے جھوٹ سے احتیاط بھی ضروری ہے، جب بھی کوئی شخص عملیات کی دنیا میں پہنچتا ہے، تو ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص یا تو جادو کا شکار ہے یا اس پر جنات سوار ہیں، گویا بیماریاں دنیا سے اٹھ چکی ہیں، پیسہ حاصل کرنے کی غرض سے خواہ مخواہ ہر شخص کو اس وہم میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ وہ مسحور یا آسیب زدہ ہے، یقیناً تمام عامل حضرات ایسا نہیں کرتے، لیکن ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے، یہ جھوٹ دھوکہ کو بھی شامل ہے، اس لیے گناہ بالائے گناہ ہے۔

چوتھی بہت ہی قابل توجہ چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے نہ کہ توڑنے کا اور غیب کی باتوں سے اللہ ہی واقف ہیں، لیکن عام طور پر عامل حضرات اپنے زیر علاج لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ تم کو فلاں شخص نے جادو کر دیا ہے، تم پر تمہارے سسرال والوں کی طرف سے سحر ہے، وغیرہ۔اس طرح کی باتوں کی وجہ سے کئی خاندان بکھر گئے ہیں، والدین اور اولاد کے درمیان، ساس اور بہو اور بھائی اور بھائی کے درمیان خلیج حائل ہوگئی ہے، میاں بیوی کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو چکی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ماں بیٹی کے تعلقات میں ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں، اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں مسلمانوں کے دلوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، لیکن ایسی باتوں کے ذریعہ دل جڑنے کے بجائے ٹوٹتے ہیں۔

جادو ایک اَن دیکھی چیز ہے، انسان اس سلسلہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ جادو کس نے کیا ہے؟ بعض دفعہ تو لوگ آنے والوں کی نفسیات کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر ساس بہو کے تعلقات کشیدہ ہیں، نند، بھاوج میں کھچاؤ ہے یا بھائیوں میں کچھ اختلاف ہے، تو ان رشتہ داروں کی طرف نسبت کر دی جاتی ہے اور کشیدہ تعلقات کے پس منظر میں آدمی فوراً ان کا یقین

بھی کر لیتا ہے، بعض عامل حضرات بقول ان کے جنوں سے اگلواتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ مجھے فلاں شخص نے بھیجا ہے، جن ایک ایسی مخلوق ہے، جو انسانوں کے وجود میں سما سکتی ہے، اس لیے یہ بات ممکن ہے کہ واقعی یہ بولنے والا جن ہی ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت انسان جن کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، وہ تو اس قدر جھوٹ بولتے ہیں اور رائی کو پہاڑ بنانا جانتے ہیں، تو کیا کسی جن کی بات کی سچائی پر یقین کیا جا سکتا ہے؟

جادو کرنے کو حدیث میں شرک قرار دیا گیا ہے، گویا کسی کو جادوگر کہنا یا کسی پر جادو کرانے کا الزام لگانا دراصل اس پر کفر یا ایک کفریہ کام میں شرکت کا الزام لگانا ہے اور حدیث میں کسی مسلمان کو کافر کہنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے، اسی لیے فقہاء نے بھی کسی پر کفر کا حکم لگانے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنے کی تلقین کی ہے، لیکن بعض عامل حضرات کو کسی خاص شخص یا رشتہ دار کی طرف جادو کی نسبت کرنے میں کوئی احتیاط نہیں ہوتی، اختلاف پیدا ہوتا ہے اور اختلاف میں شدت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک بعض دفعہ قتل وخون کی نوبت بھی آجاتی ہے — عامل حضرات کو چاہیے کہ یا تو صرف مطلوبہ دعاء بتا دیں، تکلیف کے سبب کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہیں یا اگر سحر یا آسیب بتائیں تو کسی کی نشان دہی سے گریز کریں اور صاف کہہ دیں کہ اس کا علم اللہ کو ہے، ہم اس سلسلہ میں کوئی صحیح اور یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔

چھٹی قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ کو اختیار کرتے ہیں، ان کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے ان اعمال پر اور بعض دفعہ عمل کرنے والے ''باباؤں'' پر قائم ہو جاتا ہے، اس سے لوگوں میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی پیدا ہو جاتی ہے، بیماریوں کے لیے معالجین کے پاس جانے کے بجائے لوگ عاملین کے یہاں چکر لگاتے رہتے ہیں اور اگر مسلمان عاملین سے فائدہ نہیں ہوا، تو غیر مسلم عاملین تک پہنچتے ہیں، ہر طرح کے مشرکانہ فعل پر آمادہ ہو جاتے ہیں، خواتین خاص طور پر اس میں آگے ہوتی ہیں، مال و اسباب بھی ضائع کرتی ہیں، عزت وآبرو سے بھی ہاتھ دھوتی ہیں اور اپنا ایمان بھی گنواتی ہیں،

اس لیے عامل حضرات کو چاہیے کہ ان کا عمل قرآنی آیات، ماثورہ دعاؤں، اسماء حسنیٰ اور احادیث میں منقول اذکار تک محدود رکھیں اور خاص کر لوگوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ شفاء اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوتا ہے، ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

ایک اہم مسئلہ تعویذ پر اُجرت لینے کا بھی ہے، بنیادی طور پر جھاڑ پھونک اور تعویذ انسانی خدمت ہے اور اس کو خدمت ہی کے پہلو سے انجام دینا چاہیے، سلف صالحین کا یہی طریقہ رہا ہے، یہ تو مسئلہ کا اخلاقی پہلو ہے— لیکن فقہی اعتبار سے کیا تعویذ کی اُجرت لی جاسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اِختلافِ رائے ہے، اکثر اہل علم نے اس کو جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سواروں پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا، جن میں وہ بھی شامل تھے، یہ دستہ ایک عرب آبادی کے پاس سے گذرا، وہاں اس نے قیام کیا اور مقامی لوگوں سے خواہش کی کہ ان کی ضیافت کریں، لوگوں نے انھیں مہمان بنانے سے انکار کردیا، اتفاق کہ سردار قبیلہ کو بچھو یا سانپ نے ڈس لیا، وہ لوگ ان حضرات کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ ہمارا سردار موت کے قریب ہے، کیا آپ میں سے کوئی شخص جھاڑ پھونک جاننے والا ہے؟ حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا، ہاں! لیکن ہم کچھ لے کر جھاڑیں گے، ان لوگوں نے تیس بکریوں کی پیش کش کی، حضرت ابوسعید خدریؓ نے سات دفعہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر ان پر دَم فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اسے صحت یاب کیا۔

ان لوگوں نے حسب وعدہ بکریاں بھیج دیں، چوں کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کا یہ مطالبہ اپنے اجتہاد پر مبنی تھا اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت نہیں تھی، اس لیے بعض حضرات نے اسے درست سمجھا اور کھانے میں شریک رہے اور بعض نے کھانے سے انکار کردیا، جب یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے پورا واقعہ بیان کیا، اَوّل تو آپ نے دریافت کیا کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ سورۃ الفاتحہ سے مریض کو دَم کیا جاسکتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یہ بات میرے دل میں (من

جانب اللہ) ڈالی گئی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کھاؤ اور مجھے بھی کھلاؤ، مختلف محدثین نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۶۳) — اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تعویذ پر اُجرت لی جاسکتی ہے، اسی لیے اکثر فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

البتہ بعض فقہاء نے اس سے منع کیا ہے، جن میں امام ابن شہاب زہری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ قرآن مجید پر اُجرت حاصل کرنا ہے۔ (عمدۃ القاری: ۵/ ۶۴۷) — اس لیے بہتر یہ ہے کہ عملیات کو مستقل ذریعہ معاش نہ بنایا جائے، بلکہ دوسرے ذرائع معاش کو اختیار کرتے ہوئے گاہے تعویذ پر کچھ ہدیہ بھی لے لیں، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کے سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پہلے زمانہ میں ہر جگہ قیام کے لیے ہوٹل اور سامان کے لیے بازار دستیاب نہیں ہوتے تھے اور ریگستان کا سفر اتنا طویل ہوتا تھا کہ جو سامان لوگ ساتھ لے جاتے، وہ راستہ میں ختم ہوجاتا تھا، اس لیے مسافرین کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، اسی لیے یہ بات قبائلی روایت کے مطابق واجبی اخلاقیات میں شامل تھی، کہ مسافروں کو مہمان بنایا جائے، اسی اُصول کے تحت اہل مکہ حج وعمرہ کے لیے آنے والوں کی ضیافت کا اہتمام کیا کرتے تھے، پس اس عہد کے عرف کے اعتبار سے آبادی کے لوگوں کا ضیافت سے انکار کرنا دراصل ایک طرح کی حق تلفی تھی، ممکن ہے اس لیے حضرت ابوسعید خدریؓ نے اپنے عمل کا معاوضہ طلب فرمایا ہو — لہٰذا بہتر تو یہی ہے کہ اسے مستقل ذریعہ معاش نہ بنایا جائے اور خدمت کے نقطۂ نظر سے انجام دیا جائے۔

اور اگر اُجرت لی ہی جائے تو ایسی اُجرت ہونی چاہیے، جس میں دھوکہ اور غبن فاحش نہ ہو، دھوکہ سے مراد یہ ہے کہ زیادہ اشیاء منگائی جائیں، کم خرچ کی جائیں اور باقی واپس نہ کی جائیں یا جو چیز مطلوب نہیں ہو وہ بھی منگائی جائے یا اس کے پیسے وصول کیے جائیں — غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ کسی عمل یا وقت کی اتنی اُجرت لی جائے، جو اس عمل اور وقت کی اُجرت سے بھی زائد ہو، مثال کے طور پر ایک شخص کی اُجرت ۶ رگھنٹوں کی دوسو روپئے سے تین سو روپئے تک ہوسکتی ہے، تو اس کی ایک گھنٹے کی اُجرت ساٹھ روپئے قرار پاتی ہے، اگر ساٹھ

روپئے کے بجائے سو روپئے اِتنے وقت اور محنت کی اُجرت لی جائے تو غبن فاحش ہے، جسے مکروہ قرار دیا گیا ہے، اسی لیے اُجرت میں بھی توازن اور اُصولِ شرع کی رعایت ہونی چاہیے، ایسی شکایتیں سامنے آتی ہیں کہ بعض اوقات بیوہ عورتوں کو اپنے زیورات فروخت کر دینے پڑے اور بعض غریب و پریشان حال لوگوں کو آٹو رکشا سے بھی دست بردار ہو جانا پڑا، یہ ایک تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں اور جس کام سے بھی وابستہ ہوں، ان کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی حدود پر قائم رہیں اور اس سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کریں، اس میں آخرت کی حفاظت بھی ہے اور دنیا کی فلاح بھی! اور خاص کر جو لوگ ایسے کام کرتے ہوں، جن کا رشتہ دین سے جڑا ہوا ہو، ان کو اپنے کردار کے بارے میں بہت ہی محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے، کہ ان کی کوتاہیوں سے صرف انہیں کی نہیں؛ بلکہ دین اور اہل دین کی بدنامی بھی ہوتی ہے۔

دینی اداروں، تنظیموں اور جماعتوں میں اختلافات: اسباب اور حل

تعمیر مشکل ہوتی ہے اور تخریب آسان، گھر بنانے اور بسانے میں مدت لگ جاتی ہے؛ لیکن گرانے اور اُجاڑنے میں وقت نہیں لگتا، اُن کاشت کاروں کا دَرد دِل پوچھیے، جو موسمِ سرما کی ٹھنڈک، موسمِ گرما کی شعلہ ریز دُھوپ اور برسات کی رِم جھم بارش کے درمیان دِن رات ایک کر کے کھیت بوتے ہیں، درخت لگاتے ہیں، اسے سیراب کرتے ہیں اور اس کی حفاظت ونگرانی کے لیے ہر طرح کی مشقت گوارہ کرتے ہیں؛ لیکن سیلاب کی موجِ بلا خیز چند گھنٹوں میں ان سب کو روند ڈالتی ہے اور ساری محنت چند لمحوں میں تخت وتاراج ہو کر رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسی نظام پر بنایا ہے؛ کہ کسی چیز کے اوجِ کمال پر پہنچنے میں دیر لگتی ہے؛ لیکن اس کے بکھرنے اور ٹوٹنے پھوٹنے میں دیر نہیں لگتی، اِنسان کے اَپنی پیدائش سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک پہنچنے میں کتنا سارا وقت لگ جاتا ہے؛ لیکن جب موت کا فرشتہ آدھمکتا ہے تو دُنیا سے آخرت کا سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔

قدرت کا یہ نظام جیسے کائنات میں پھیلی ہوئی چیزوں اور اِنسانوں کے بارے میں ہے، اسی طرح قوموں، جماعتوں اور گروہوں کے سلسلہ میں بھی ہے، کوئی بھی گروہ اَپنا اِجتماعی ڈھانچہ برسوں میں تیار کر پاتا ہے، جیسے پرندے تنکے چن چن کر آشیانے بناتے ہیں، ایسے ہی اس اِجتماعیت سے جوڑنے کے لیے ایک ایک فرد پر محنت کی جاتی ہے، تب جا کر کہیں ایک ''آشیانہ'' تیار ہوتا ہے؛ لیکن پھر بھی وہ طوفانوں کی زد میں رہتا ہے، اَگر اس کے بنانے والوں اور بسنے والوں نے اس کو بچا کر نہ رکھا اور اس کے تنکے نوچنے شروع کر دیئے تو بکھرنے میں دیر نہیں لگتی، اس اِجتماعیت کو وجود میں لانے کے لیے شروع میں ایک طویل اور پُر مشقت راستہ طے کیا جاتا ہے، مخالفتوں سے گذرنا پڑتا ہے، جان و مال اور عزت وآبرو کی قربانی دینی پڑتی ہے، لوگوں کی خوشامد کی جاتی ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس سے تعلق وجہ اِعزاز بن جاتا ہے اور اس کا اِکرام ہوتا ہے، یا تو کانٹوں کے بستر تھے، یا اَب پھولوں کی سیج بچھائی جاتی ہے، اس وقت وہ لوگ گذر چکے ہوتے ہیں، جنہوں نے اس کو سینچا تھا، اَب یہ سرمایہ جن لوگوں کے

ہاتھوں میں آتا ہے، اَگر انھوں نے اَپنے سلف کے راستہ کو بھلا دیا، قربانی کے بجائے آسانی کا اور اِتحاد و یکجہتی کے بجائے اَپنی رائے پر اِصرار اور اَپنے رُفقاء سے بے نیازی کا طریقہ اِختیار کرلیا تو اللہ کی مدد اُٹھ جاتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اِجتماعیت کے ساتھ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا: ”ید اللّٰہ علی الجماعة“ (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۴۰۲۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو ایک مثال دے کر واضح فرمایا کہ بکریوں کا ریوڑ اگر ایک ساتھ چلتا رہے تو کمزور و نازک اندام جانور ہونے کے باوجود اس کی حفاظت ہوتی ہے، اور اگر کوئی بکری ریوڑ سے بچھڑ جائے تو بھیڑیا اس کو اپنا شکار بنالیتا ہے۔ (سنن ابی داود، حدیث نمبر: ۵۴۷)

بھیڑیا ایک تشبیہ ہے، یعنی ایک باہری طاقت، جو اِسلام کا دُشمن ہو، وہ اَفرادِ ملت کو اَپنا شکار بنالیتا ہے، افراد کو شکار کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کو آلہ کار بنالیا جائے، اُمت محمدیہ کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اُمت کے کھلے ہوئے دُشمنوں سے اس درجہ نقصان نہیں پہنچا، جتنا نقصان اُن دُشمنوں سے پہنچا، جو حقیقت میں بھیڑیئے تھے؛ لیکن انھوں نے بکریوں کی کھال پہن رکھی تھی، یہ ایک سازش پر مبنی عمل ہوتا ہے، کچھ لوگ تو واقعی اپنے مفادات کے لیے سوچ سمجھ کر دشمن کے آلہ کار بنتے ہیں اور بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے، جو سادہ لوحی اور بے شعوری میں اس سازش کے آلہ کار بن جاتے ہیں؛ حالاں کہ وہ مخلص ہوتے ہیں، ان کو غلط راستہ پر ڈالنے کے لیے ان کے مذہبی جذبات کا استحصال کیا جاتا ہے، انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کررہے ہو، وہ حق کو نافذ کرنے اور باطل کو ختم کرنے کی کوشش ہے؛ لیکن حقیقت میں ان کا یہ عمل باطل کو تقویت پہنچاتا ہے اور حق وسچائی کو کمزور کردیتا ہے، اس کی ایک واضح مثال ”داعش“ ہے، جن کا خون بہایا جارہا ہے، وہ بھی مسلمان ہیں اور جو لوگ خون بہارہے ہیں یا بہانے میں شامل ہیں وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور بمقابلہ دوسرے مسلمانوں کے بہ ظاہر اسلام پر زیادہ کاربند نظر آتے ہیں؛ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وہ ان دشمنانِ اسلام کے آلہ کار ہیں، جو چاہتے ہیں کہ مسلمان برادرکشی میں مبتلا ہوجائیں؛ تاکہ اختلاف و

انتشار ان کو کمزور سے کمزور تر کر دے اور اسلام کی شبیہ کو خراب کرنا آسان ہو جائے۔

غور کیا جائے تو یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے ہی شروع ہو چکا تھا، مدینہ منورہ میں ایک عمارت مسجد کے نام سے بنائی گئی؛ تاکہ وہاں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جائیں، اگر قرآن مجید نے اس سازش سے پردہ نہ اُٹھادیا ہوتا تو یقیناً سیدھے سادھے مسلمان اس کو دین کی ایک خدمت ہی تصور کرتے اور وہاں ان کی آمد ورفت شروع ہو جاتی؛ لیکن قرآن نے اس کو ''مسجد ضرار'' قرار دے کر منہدم کرنے کا حکم دیا (تفسیر ابن کثیر: ۲۱۲/۴) اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر منافقین نے بے بنیاد تہمت لگائی اور انھوں نے اس جھوٹ کو ٹھیک اسی طرح پھیلایا جیسے آج کل میڈیا جھوٹ کو سچ بنانے کی فکر کرتا ہے، آخر کچھ سادہ لوح سیدھے سادے مسلمان بھی اس سازش کا شکار ہو گئے، یہاں تک کہ جب بعض مخلص مسلمانوں نے اس فتنہ کے سرچشمہ عبداللہ بن اُبی کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اوس وخزرج کی لڑائی نہ بھڑک اُٹھے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۶۶۱) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہؓ کی برأت کا صاف صاف اعلان نہ ہو جاتا تو یہ اسلام کی دعوتی کوششوں کے لیے ایک زبردست دھکا ثابت ہوتا۔

پھر عہد صحابہ میں دیکھیے ! سیّدنا حضرت عثمان غنیؓ نے اسلام کے لیے جو قربانیاں دیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مدح فرمائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دو صاحب زادیاں ان کے نکاح میں رہیں، حضرت عثمانؓ کے قبیلہ کی غالب اکثریت فتح مکہ تک اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہی اور غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق کی قیادت کی؛ لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے قبیلہ کے فکری رجحان اور عملی رویہ کے برخلاف بالکل ابتداء میں اسلام قبول کر لیا اور اسلام کے راستہ میں مشقتیں اُٹھائیں، اپنے عہد خلافت میں جمع قرآن مجید کی خدمت انجام دی، ان سب کے باوجود ایک یہودی ''عبداللہ ابن سبا'' نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ایسی سازش رچی، جو خلیفہ مظلوم کی شہادت کا باعث بن گئی اور بہت سے سیدھے سادے مسلمان بھی اس سازش کا شکار ہو گئے اور انہوں نے سب کچھ یہ سمجھ کر کیا کہ نعوذ باللہ! یہ ظالم

حکمراں کے خلاف جد و جہد ہے، حضرت عثمان غنیؓ نے اس وقت ایک تاریخی بات ارشاد فرمائی:

فو اللّٰہ لئن قتلتمونی لا تتحابون بعدی ابدا ، ولا تصلون بعدی جمیعا ابدا ، ولا تقاتلون بعدی عدوا جمیعا ابدا۔ (الطبقات الکبریٰ:۳/۱۷)

خدا کی قسم! اگر تم نے مجھے قتل کیا تو میرے بعد کبھی تم میں محبت باقی نہیں رہے گی، میرے بعد ایک ساتھ نماز نہیں پڑھو گے، میرے بعد ایک ساتھ دشمن سے جنگ نہیں کرو گے۔

آہ! اور سو بار آہ! کہ آج حضرت عثمان غنیؓ کی اس بددُعا کو سر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ اسٹیج پر اتحاد و اتفاق کی باتیں کرتے ہیں، وہی اسٹیج سے نیچے اُترنے کے بعد اپنے متبعین کو نفرت پر اُکساتے ہیں، ہماری نمازیں ایک مسجد میں نہیں ہوتیں، ہر فرقہ کی الگ الگ مسجدیں ہیں، جن میں ان کے سوا دوسرے لوگ نماز نہیں پڑھ سکتے، دشمن سامنے کھڑا ہے، لیکن ہمارا اختلاف ہے کہ کم ہی نہیں ہوتا؛ چہ جائیکہ ہم مل جل کر ان کا مقابلہ کریں — یہ ایک ایسی سازش تھی، جس نے مستقبل کی تاریخ پر نہایت افسوس ناک اثر ڈالا، مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہوگئے اور نہ صرف یہ واقعہ بالآخر خلافت راشدہ کے ختم ہونے کا سبب بنا؛ بلکہ مستقبل میں مذہبی قیادت اور سیاسی قیادت بھی الگ الگ ہوگئی اور صدیوں ایک ایسا بادشاہی نظام پروان چڑھتا رہا، جو زیادہ تر دینی اقدار سے خالی ہی رہتا تھا، پھر عہد صحابہؓ میں ہی ایک وقت ایسا آیا کہ توقع قائم ہوگئی تھی کہ خلیفہ راشد حضرت علیؓ اور شام کے فرماں روا حضرت معاویہؓ کے درمیان صلح ہو جائے گی؛ لیکن کچھ عجمی نژاد لوگوں کی سازشوں سے یہ صلح بکھر کر رہ گئی اور ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا، جو ایک مستقل اعتقادی مکتبِ فکر بن گیا اور ہمیشہ کے لیے اُمت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، دُشمنانِ اِسلام نے ہمیشہ اس تقسیم سے فائدہ اُٹھایا اور آج بھی اُٹھا رہے ہیں۔

پھر تاریخ کے ہر موڑ پر مسلمانوں کے زوال اور ہزیمت کا بنیادی سبب یہی بنا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ دشمنوں کا آلہ کار بن گیا، تاتاریوں کے ہاتھ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور خلافت عباسی کا محل زمین بوس ہوگیا، پھر عثمانی ترکوں نے پانچ سو سال سے زیادہ

اسلامی مقدسات اور عالم اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کی؛ لیکن بعض عرب اور ترک ضمیر فروشوں نے وطنی تعصب کے جھنڈے بلند کیے اور سادہ لوح عرب اور ترک مسلمانوں کا جم غفیر ان کے ساتھ ہو گیا، آخر خلافت عثمانیہ کا چراغ بجھ گیا اور مسلمانوں کی وحدت کی ایک علامت—— جو اعداء اسلام کی آنکھوں میں چبھتی تھی —— ختم ہو گئی، خود ہندوستان کی تاریخ بھی یہی رہی ہے کہ قریب قریب ساری مسلم حکومتیں مسلمانوں میں پائے جانے والے ایک منافق گروہ اور عام مسلمانوں کے ان کے جھنڈے نیچے جمع ہو جانے کی وجہ سے ختم ہوئیں اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے اشارہ پر ہوا، جو اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے، اس لیے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس اُمت کو نقصان پہنچانے کی سازش ہمیشہ دُشمنانِ اسلام کی طرف سے ہوتی رہی ہے، انہوں نے ہمیشہ اس کے لیے مسلمانوں ہی کی صفوں میں گھسے ہوئے لوگوں کا استعمال کیا ہے اور اس صفائی سے کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک کارِ ثواب اور دینی خدمت سمجھ کر وہ حرکتیں کیں، جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی اور اسلام کو کمزور کرنے والی تھیں۔

جو لوگ دینی کاموں کو انجام دیتے ہیں اور اچھے جذبہ سے انجام دیتے ہیں، انہیں مطمئن نہ ہو جانا چاہیے کہ انھیں ان کی دین داری کی وجہ سے کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ ڈاکو اسی گھر میں ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں دولت ہو، اسی طرح دُشمنانِ اسلام کی طرف سے ہمیشہ اسی گروہ کو شکار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اسلام سے گہری وابستگی رکھتا ہو، دوسرے لوگوں کے بارے میں شیطان سوچتا ہے کہ یہ تو پہلے ہی سے ہمارا کام کر رہا ہے؛ اس لیے ان کے کام میں خلل ڈالنے کی ضرورت نہیں، دینی اداروں، درس گاہوں اور جماعتوں کو ہمیشہ اس پہلو سے اپنا جائزہ لیتے رہنا اور چوکنا رہنا چاہیے، برصغیر میں اگر پچھلے تین دہائیوں کی تاریخ دیکھی جائے تو بعض بڑی بڑی درس گاہوں کے ٹکڑے ہو گئے، بعض بہت ہی فعال تنظیمیں تقسیم در تقسیم کا شکار ہو گئیں، اس کے نتیجہ میں ان کا وقار و اعتبار متأثر ہوا، مسلمانوں کی معتبر ترین شخصیتیں جن کو مسلمانوں کی وحدت کی علامت سمجھا جاتا تھا، بے وزن ہو گئیں، اس بکھراؤ نے کام کو متأثر کیا، مسلمانوں کی آپسی محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی، مسلم مخالف

طاقتوں پر جو بھرم قائم تھا، وہ ختم ہو گیا اور انہیں اس اختلاف سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا، اس لیے ہمیں ضرور اپنے زوال ونقصان کی اس تاریخ سے سبق لینا چاہیے، جو مریض اپنی بیماری کو جاننے اور اس کا علاج کرنے کے لیے تیار نہ ہو، وہ کبھی صحت یاب نہیں ہوسکتا، اس بیمار سے بڑھ کر کوئی کم نصیب نہیں، جو خود اپنی بیماری کا احساس نہ کر سکے۔

اداروں، تنظیموں اور اجتماعی کاموں میں اختلافات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ — ان پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے اور آپ اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے، سیاست سے وابستہ تنظیموں میں زیادہ تر سیاسی مفادات اختلافات کی بنیاد بنتے ہیں، جو ادارے تجارتی نوعیت کے ہیں، ان میں معاشی مفادات کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے؛ لیکن مذہبی اداروں، تنظیموں اور جماعتوں میں بنیادی طور پر دو باتیں اختلاف کا سبب بنتی ہیں، ایک: عہدہ و جاہ کی طلب، دوسرے: اپنی رائے پر اصرار۔ کتنی ہی دینی درس گاہیں ہیں، جہاں صدر، سکریٹری یہاں تک کہ منصب ''شیخ الحدیث'' کے لیے بھی جھگڑے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے اصحابِ علم وفضل کھلے طور پر مطالبہ کرتے ہیں کہ مجھے بخاری شریف پڑھانے کا موقع دیا جائے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے کہ بخاری شریف پڑھانے ہی سے نجات متعلق ہو، اگر کوئی شخص نورانی قاعدہ اور قاعدۂ بغدادی اخلاص کے ساتھ پڑھائے تو عجب نہیں کہ قیامت کے دن جنت میں جانے والے خوش نصیب قافلہ میں وہ آگے آگے ہو اور بخاری پڑھانے والے اضطراب و بے چینی کے ساتھ اپنی باری کے منتظر ہوں۔

یہی بات دینی تنظیموں کی قیادت کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ کسی تنظیم یا جماعت کے سربراہ بننے یا اس کی منتظمہ کے رکن بننے میں خصوصی اجر وثواب ہو، اجر و ثواب کے زیادہ مستحق تو وہ گمنام لوگ ہیں، جو گردِ کارواں کی طرح پیچھے پیچھے رہتے ہیں؛ لیکن اللہ کی رضا کے جذبہ سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، نہ شہرت ونام وری کے طلب گار ہیں اور نہ کسی صلہ کے خواست گار! دینی کاموں سے وابستہ لوگوں میں اس جذبہ کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، انہیں سمجھنا چاہیے کہ عمارت کی اساس ان گنبدوں اور میناروں پر نہیں ہوتی، جو

دُور سے نظر آتے ہیں؛ بلکہ ان بنیادوں پر ہوتی ہے، جو زمین میں دفن ہوتی ہیں اور جن کو کوئی دیکھ نہیں پاتا، دینی کام کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بنیاد کا پتھر بنانے کی کوشش کریں۔

اس جذبہ پر قابو پانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہدہ کی طلب سے منع فرمایا، یہاں تک کہ ارشاد ہوا کہ جو شخص کسی عہدہ کا طالب ہو، اسے وہ عہدہ نہ دیا جائے، خلفاء راشدینؓ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی عہدہ طلب نہیں کیا؛ بلکہ مسلمانوں نے ان کو اپنا سربراہ منتخب کیا؛ اسی لیے اللہ کی نصرت ان کے ہم رکاب رہی، بعد کو پوری اُمت میں فتنہ کا دور شروع ہوا، خاندانی بادشاہتیں قائم ہوئیں، لوگ عہدے طلب کرنے لگے، یہاں تک کہ اس کے لیے قتل وقتال تک کی نوبت آنے لگی، تو پھر مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کی مدد روٹھ گئی اور آہستہ آہستہ وہ عزت و سربلندی کی چوٹی سے ذلت ونکبت کی پستی میں جا گرے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ عہدہ ومنصب اعزاز کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ یہ ذمہ داری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری میں آنے والے لوگوں کے بارے میں جواب دہ بھی ہے: ’’**کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته**‘‘ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۸۵۳) یہ احساسِ ذمہ داری جتنا بڑھے گا، عہدوں کی طلب کم ہوگی اور اگر اسے اعزاز سمجھا جائے گا تو عہدوں کی پیاس بڑھے گی اور چوں کہ عہدے محدود ہیں؛ اس لیے ٹکراؤ پیدا ہوگا اور اگر نظر کام پر رہے گی تو چوں کہ کام کا میدان وسیع ہے؛ اس لیے اس میں شامل ہونے والوں کی کثرت تقویت کا باعث ہوگی نہ کہ ٹکراؤ کا!

دوسرا سبب یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ قربانی کے دو ہی محل ہیں، ایک: جان، دوسرے: مال؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قربانی کی ایک اور قسم ہے اور وہ ہے رائے کی قربانی، اکثر ملّی اختلافات کو حل کرنے میں اس قربانی کا بہت اہم رول ہوتا ہے، بعض لوگ

اپنے نقطۂ نظر پر اس درجہ اصرار کرنے لگتے ہیں کہ دوسرے نقطۂ نظر کو سننا ہی نہیں چاہتے، وہ چاہتے ہیں کہ فیصلہ ہماری ہی رائے پر ہونا چاہیے، یہ اندازِ فکر دین کے مزاج کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر اپنی رائے کے مقابلہ میں اپنے رفقاء کے مشورہ کو ترجیح دی ہے، اس سلسلہ میں غزوۂ اُحد کا واقعہ مشہور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے تھی کہ مدینہ میں رہ کر دُشمنوں کا مقابلہ کیا جائے، کچھ نوجوان صحابہؓ — جو جذبہ جہاد سے سرشار تھے — نے اس کو بزدلی خیال کرتے ہوئے رائے دی کہ باہر نکل کر دشمنوں کے حملہ کا جواب دیا جائے، انھوں نے کسی حد تک اس پر اصرار بھی کیا؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے قبول کر لی، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کی رائے ہی درست تھی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس بات کو اپنی زبان پر نہیں لائے اور نہیں فرمایا کہ فلاں حضرات کی رائے پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو اس قدر جانی نقصان اُٹھانا پڑا، خلفاء راشدینؓ اور بالخصوص حضرت عمرؓ نے کئی مواقع پر اپنے رفقاء کی رائے سن کر ان فیصلوں کو بدل دیا، جو وہ کر چکے تھے؛ اس لیے کبھی بھی اپنی رائے پر ایسا اصرار کہ گویا اسی میں خیر وبہتری ہے، نہ گھریلو معاملات میں درست ہے اور نہ اجتماعی معاملات میں، اکثر و بیشتر اپنی رائے پر اصرار ہی کی وجہ سے اجتماعی کاموں میں ٹوٹ پھوٹ پیدا ہوتی ہے اور یہی انتشار کا سبب بنتا ہے۔

اجتماعی کاموں میں دو باتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے: امارت اور شورائیت — امارت یہ ہے کہ کسی ایک شخص کو ادارہ یا تنظیم کا سربراہِ اعلیٰ منتخب کر لیا گیا ہو، امیر ادارہ و تنظیم کا امین ہوتا ہے نہ کہ مالک! وہ گویا گاڑی کا انجن ہوتا ہے، پہیئے کتنے ہی مضبوط ہوں؛ جب تک کوئی کھینچنے والا انجن نہ ہو، گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی اور انجن کتنا ہی طاقت ور ہو، اگر اس کو پہیوں کا ساتھ حاصل نہ ہو تو اس کی طاقت اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی؛ اسی لیے دونوں کی اہمیت ہے، سربراہ کی بھی اور اس کے شرکاء کار کی بھی، سربراہ سے تو لوگوں کا تعلق اطاعت وفرماں برداری کا ہونا چاہیے، سربراہ کا حکم چاہے طبیعت کے خلاف ہو؛ لیکن عمل اسی پر کیا جائے گا؛

بشرطیکہ اس کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو اور عام مسلمانوں کی کامیابی سربراہ کی اطاعت میں ہے؛ اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پورا پورا اسلام اسی وقت معاشرہ میں آسکتا ہے، جب کہ مسلمانوں کا جماعتی نظام ہو اور یہ جماعتی نظام امیر کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، کسی سربراہ کے بغیر لوگوں کا اکٹھا ہو جانا بھیڑ تو کہلا سکتا ہے، اسے جماعت نہیں کہا جا سکتا اور امیر کی امارت لوگوں کی اطاعت وفرماں برداری ہی سے قائم ہو سکتی ہے نہ کہ طاقت وقوت سے!

نظم امارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر سفر میں تین اشخاص جا رہے ہوں تو ان میں بھی کسی کو امیر بنا لو۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر:۲۶۰۹) خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب بھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو مدینہ میں کسی کو والی یعنی عارضی امیر بنا کر جاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معیاری طریقہ تو یہی ہے کہ ایک شخص مستقل امیر ہو؛ لیکن امارت کی مدت یا اس کے دائرۂ کار کو محدود کیا جا سکتا ہے، فقہی اعتبار سے اس کی اصل یہ ہے کہ امیر عام لوگوں کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور وکیل بنانے والے کو اختیار حاصل ہے کہ وہ وکیل کے کام یا اس کے اختیارات کو محدود کر دے، پھر یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ''اصلح'' یعنی جماعت کا سب سے بہتر شخص ہی امیر ہو، اس پر اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو: ''**ولو کان عبداً حبشیاً مجدعا**'' (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:۲۸۶۲) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظالم سربراہ کی اقتداء میں بھی جمعہ قائم کرتے رہو۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر:۱۰۸۱) نیز فقہاء نے لکھا ہے کہ جب تک کسی امیر سے کفر کا ارتکاب نہ ہو، اس کی اطاعت واجب ہے۔ (شرح طیبی علی المشکوٰۃ: ۸/۲۵۶۰) بلکہ اگر کوئی شخص زبردستی امیر بن جائے اور غلبہ حاصل کر لے تو اس کی بھی اطاعت واجب ہے: ''**وقد اجمع الفقهاء علی وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه**'' (نیل الاوطار: ۷/۲۰۸) امیر کی اطاعت کا یہ حکم

ظالموں کی مدد کی تلقین نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد اُمت کی اجتماعیت کی حفاظت ہے؛ اس لیے جو لوگ کسی ادارہ، جماعت یا تنظیم سے وابستہ ہوں، ان کو جائز باتوں میں بہرحال اپنے امیر و سربراہ کی اطاعت کرنی چاہیے، چاہے وہ اس کے فیصلہ کو نتائج کے اعتبار سے غلط سمجھتے ہوں۔

اجتماعی کاموں کے لیے دوسری اہم ضرورت ''شورائیت'' ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود کو صلاحیت کے اعتبار سے ایک ناقص وجود رکھا ہے، اس لیے جب ایک فرد کسی کام کو نہیں کر پاتا ہے تو بہت سے افراد مل کر اس کو انجام دیتے ہیں اور اجتماعی قوت سے وہ کام ہو جاتا ہے، ایک شخص ایک چٹان کو اپنی جگہ سے کھسکا نہیں سکتا؛ لیکن جب لوگوں کا جم غفیر اپنا ہاتھ لگاتا ہے تو چٹان اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے، یہ اجتماعی کاموں کی ایک مثال ہے، انسان جیسے اپنی جسمانی قوت کے اعتبار سے عاجز و نامکمل ہے، اسے دُور تک دیکھنے کے لیے چشمہ کی، آواز پہنچانے کے لیے مائیک کی اور فاصلہ طے کرنے کے لیے سواری کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح وہ عقل و فہم کے اعتبار سے بھی عاجز ہے، اس کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بہت سے لوگوں کی مدد درکار رہتی ہے؛ اس لیے اجتماعی کاموں میں خاص کر شورائیت ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے اہم کام مشورہ ہی سے انجام پانے چاہئیں: ''**وأمرھم شوریٰ بینھم**'' (شوریٰ: ۳۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا گیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اہم مسائل میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کیجیے: ''**وشاورھم فی الأمر**'' (آل عمران: ۱۵۹)؛ حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی جیسا ذریعہ علم حاصل تھا اور آپ کو بظاہر مشورہ کی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی تلقین فرمائی گئی؛ تاکہ اُمت اس کو اپنے لیے اُسوہ بنائے، خلفاء راشدین کے عہد میں بھی امیر کے ساتھ شوریٰ ہوا کرتی تھی اور اس کو اس درجہ اہمیت حاصل تھی کہ جب عراق کی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں اور ان زمینوں کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا کہ ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال کی ملکیت بنا لیا جائے تو تقریباً ایک ماہ تک مباحثہ و مناقشہ کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد فیصلہ ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے پیش آنے والے شرعی مسائل کے بارے میں حکم فرمایا کہ جب کوئی اہم اور نیا مسئلہ پیش آئے تو اہل علم وفضل کو جمع کرو، ان سے مشورہ کرو اور تنہا اپنی رائے پر فیصلہ نہ کرو: "**تشاورون الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأى خاصة**" (**المعجم الاوسط للطبرانی**، حدیث نمبر: ۱۶۱۸) اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت سیّدنا حضرت علیؓ کو دی، جن کا تفقہ صحابہؓ کے درمیان بھی مسلّم ہے اور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء میں سب سے بڑھ کر قوتِ فیصلہ کا حامل قرار دیا: "**و أقضاهم علی بن ابی طالب**" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۵۴) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مشورہ سے کام کرے گا، اسے شرمندگی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا: "**ولا ندم من استشار**" (**المعجم الاوسط**، حدیث نمبر: ۶۶۲) ایک اور روایت میں ہے کہ جو کسی مسلمان سے مشورہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بہتر پہلو کی توفیق عطا فرمائیں گے۔ (**المعجم الاوسط**، حدیث نمبر: ۸۳۳۳)

لیکن مشورہ کے سلسلہ میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ مشورہ اہم اُمور میں ہو نہ کہ معمول کے کاموں میں۔ دوسرے: یہ ضروری نہیں ہے کہ مشورہ دینے والوں کا ہر مشورہ مان لیا جائے، مشورہ دینے والوں کو چاہیے کہ زیر مشورہ مسئلہ سے متعلق اللہ نے جو بات اس کے دل میں ڈالی ہے، اس کو پیش کردے اور حسبِ ضرورت اس کے اسباب ووجوہ کو واضح کردے، پھر اگر مشورہ مان لیا جائے تو یہ احساس پیدا نہ ہو کہ میں بہت صائب الرائے شخصیت ہوں؛ اسی لیے میری رائے مان لی گئی ہے؛ بلکہ خیال کرے کہ اب یہ سبھوں کی مشترکہ رائے ہے اور دُعا کرے کہ اس کی رائے کسی نقصان کا باعث نہ بن جائے اور اگر رائے قبول نہ کی جائے تو برا نہ مانے اور اجتماعی رائے سے جو فیصلہ ہو، اس پر ایسی خوش دلی کے ساتھ عمل کرے کہ گویا یہ اسی کی رائے تھی، اجتماعی کاموں میں بعض دفعہ لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان سے تو اپنی رائے کو مشورہ کہتے ہیں؛ لیکن انداز ایسا اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی فیصلہ ہے، یہ طریقہ درست نہیں ہے ـــــ امارت وشورائیت کے اسی متوازن امتزاج سے اسلام کے اجتماعی

نظام کی تشکیل ہوتی ہے، امارت ہو اور شورائیت نہ ہو تو انسان امیر کے بجائے آمر و ڈکٹیٹر بن جاتا ہے، شورائیت ہو؛ لیکن کوئی سربراہ نہ ہو تو اس کی مثال اس گاڑی کی ہے جس کو بیک وقت کئی ڈرائیور چلانے کی کوشش کریں، اس سے قدم قدم پر اختلاف اور تضاد پیدا ہوگا اور کام میں ترقی نہیں ہوگی۔

مذہبی گروہوں اور جماعتوں کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے دو راستے ہیں، ایک: صلح؛ اور یہ سب سے بہتر راستہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**الصلح خیر**'' (نساء: ۱۲۸) صلح میں تین پہلو اختیار کیے جا سکتے ہیں: ایک پہلو ایثار کا، کہ کوئی ایک فریق اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو جائے، صلح نام ہی اسی کا ہے کہ نزاع کو ختم کرنے اور اختلاف کو دُور کرنے کے لیے کوئی فریق اپنا حق چھوڑنے یا اپنے حق کا کچھ حصہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے، اس کی بہترین مثال حضرت حسن بن علیؓ کا عمل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے اشارہ کے مطابق ان کی خلافت جائز تھی، ان کو اکابر صحابہؓ کی تائید حاصل تھی، اس کے باوجود انھوں نے خلافت سے دستبرداری کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کو ختم کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ پیشین گوئی حضرت حسنؓ کے اس اعلیٰ کردار کی تعریف فرمائی تھی اور ان کی تحسین کی تھی، حقیقت یہ ہے کہ ایثار سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا؛ بلکہ بڑا بن جاتا ہے، وہ عہدہ و منصب کو ہار جاتا ہے؛ لیکن دلوں کو جیت لیتا ہے۔

دوسرا پہلو انتظامی ڈھانچہ کی توسیع کا ہے، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگ انتظامی ڈھانچہ سے الگ کر دیئے گئے اور نظم و نسق میں شامل نہیں رکھے گئے تو ان کو ناگواری ہوتی ہے، اسی سے انتشار پیدا ہوتا ہے، اگر ایسے لوگوں کو نظم کا حصہ بنا دیا جائے تو ان کی زبان بند ہو جاتی ہے اور اتفاق و اتحاد کی فضاء قائم ہو جاتی ہے۔

تیسرا پہلو اختیارات کی تحدید کا ہے، شریعت میں واضح طور پر امیر و شوریٰ کے دائرۂ کار کی تحدید نہیں کی گئی ہے، صحابہؓ کے دور میں اس کی بالکل حاجت نہیں تھی؛ کیوں کہ ورع و تقویٰ کا غلبہ تھا، مشورہ دینے والے اخلاص کے ساتھ اور خیر خواہی کے جذبہ سے مشورہ دیتے

تھے، انہیں اپنے مشورہ پر اصرار نہیں تھا اور امیر بھی فراخ دلی سے مشورہ کو قبول کرتا تھا، اس کے سامنے اُمت کی بھلائی اور اللہ کی رضا جوئی کے سوا کوئی اور جذبہ نہیں ہوتا تھا، اختلاف کو دُور کرنے کے لیے یہ ہوسکتا ہے کہ امیر کو کچھ حدود کا پابند بنا دیا جائے، مثلاً: یہ کہ فیصلہ میں کچھ لوگ اس کے ساتھ شامل کر دیئے جائیں، یا فیصلہ کو تنہا اس پر چھوڑنے کے بجائے غلبہ آراء کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے، جیسا کہ بڑے بڑے دینی اداروں اور مذہبی تنظیموں کا عرف ہے، پڑوسی ملک میں اکابر علماء نے سربراہِ ملک کے لیے اس اُصول کو قبول کیا تھا کہ ان کی مدت محدود ہوگی اور وہ پارلیمنٹ کی اکثریتی رائے کو قبول کرنے کے پابند ہوں گے، اس کی نظیر حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کی ہے، حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کے بارے میں وصیت فرمادی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنادیا جائے اور اگر ایک نام پر اتفاق نہ ہو پائے تو غلبہ آراء پر فیصلہ کیا جائے، اسی بنیاد پر حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب ہوا؛ البتہ غلبہ آراء پر اتفاق کا فیصلہ ایسے انتظامی اُمور میں کیا جائے گا، جن میں دونوں پہلو مباح ہوں، جو بات شرعاً واجب یا ممنوع ہو، اس میں غلبہ آراء کا اعتبار نہیں ہوگا، ان کے سلسلہ میں تو قرآن وحدیث اور فقہاء کے اجتہاد کے مطابق ہی فیصلہ ہوگا، خواہ اس رائے کے حاملین کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، غرض کہ صلح کی یہ تین بنیادیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ کوئی ایک فریق پیچھے ہٹ جائے اور ایثار سے کام لے۔ دوسرے: انتظامی ڈھانچہ جیسے شوریٰ میں ایسی توسیع کردی جائے کہ ہر فریق مطمئن ہوجائے۔ تیسرے: امیر وسربراہ کے اختیارات کو محدود کردیا جائے اور وہ شوریٰ کی رائے کا پابند ہوکر کام کرے۔

اختلافات کو حل کرنے کی دوسری صورت ''تحکیم'' ہے، قرآن مجید نے نزاعات کو حَکَم کے ذریعہ حل کرنے کی تلقین کی ہے۔ (نساء: ۳۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی ہونے کے باوجود غزوہ بنوقریظہ کے موقع پر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان حضرت سعد ابن معاذؓ کو حکم بنایا، اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے اختلافات کو حل کرنے کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو اپنا حکم تسلیم کیا، نیز فقہاء نے نزاعات کے حل کے

سلسلہ میں تحکیم کو ایک مستقل طریقہ مانتے ہوئے اس کے اُصول وضوابط اور حدود وشرائط مقرر کیے، اس لیے اختلاف کو دُور کرنے کا یہ ایک بہترین حل ہے کہ چند معتبر، معروف، احکام شریعت سے واقف اور غیر جانب دار اہل علم کی کمیٹی بنادی جائے، جو مختلف حضرات کے نقطۂ نظر کو سنیں، پھر اس ادارہ یا تنظیم یا جماعت کی مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کریں اور فریقین اس فیصلہ کو تسلیم کرلیں۔

بہر حال! جو لوگ ملت کے اجتماعی کاموں سے مربوط ہوں، ان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فرد سے زیادہ اہمیت اس ادارہ، تنظیم اور جماعت کی ہے، جس سے وہ وابستہ ہے، اگر افراد کے مفادات مجروح ہوں تو اس کا نقصان انفرادی ہوگا اور اگر کسی ادارہ یا جماعت کا نقصان ہو تو اس کا نقصان ملّی اور اجتماعی ہوگا۔

ان سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی اداروں اور جماعتوں میں اگر اختلاف پیدا ہوجائے تو ان کو ان امور پر توجہ دینی چاہیے:

ا:.... ذمہ داروں کو اپنے گردوپیش کا جائزہ لینا چاہیے، کہیں ان کی صف میں ایسے لوگ تو شامل نہیں ہیں، جو دانستہ یا نادانستہ دین سے یا اس ادارہ یا جماعت سے بغض رکھنے والوں کے آلہ کار ہوں اور ان کے لیے کام کررہے ہوں، ایسے لوگوں کو جلد سے جلد وہاں سے ہٹادینا چاہیے۔

۲:.... ذمہ داروں کو خود اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ عہدہ کو انہوں نے ایک اعزاز سمجھ رکھا ہے یا ذمہ داری؟ اور ان کو اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیے کہ ان کے کام میں اخلاص کی قوت موجود ہے یا نہیں؟ اگر ظاہری وسائل مہیا ہوں؛ لیکن جذبہ اخلاص مفقود ہو تو اس کی مثال اس گاڑی کی ہے جو دیکھنے میں تو بہت عمدہ اور سجی سجائی ہو؛ لیکن اس کا انجن کام نہ کرتا ہو، یہ دینی کاموں میں کامیابی اور فتنوں سے حفاظت کی کلید ہے۔

۳:.... اجتماعی نظام کے قیام کی بنیاد امارت پر ہے، یعنی سب لوگ مل کر کسی کو امیر تسلیم کرلیں، خواہ وہ صلاحیت کے اعتبار سے، عمر کے اعتبار سے اور مطلوبہ اوصاف کے اعتبار

سے کم ہی درجہ کے ہوں؛ کیوں کہ امیر کے لیے سب سے افضل ہونا ضروری نہیں۔

۴:....انفرادی کمیوں کو اجتماعی عمل کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے؛ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ امیر کے ساتھ ایک دو حضرات کو معاون کے طور پر شامل کر لیا جائے کہ امیر ان کو اعتماد میں لے کر ہی فیصلہ کیا کرے، تنہا فیصلہ نہ کرے۔

۵:....جو اُمور شوریٰ سے متعلق ہیں، ان میں امیر کو پابند کیا جائے کہ اِختلافِ رائے کی صورت میں وہ اس رائے پر فیصلہ اور عمل کرنے کا پابند ہوگا، جو اکثریت کی ہوگی۔

۶:....کام سے جڑے ہوئے مختلف حلقوں کی تشفی کے لیے شوریٰ میں ایسی توسیع کر دی جائے کہ مختلف حلقوں اور علاقوں کی نمائندگی ہو جائے۔

۷:....اگر ادارہ اور جماعت کے دائرہ میں موجود لوگوں کے ذریعہ اتفاق رائے نہ ہو سکے تو تین ایسے بزرگ علماء کو حکم بنایا جائے، جو مؤقر اداروں اور تنظیموں کی نسبت سے اُمت میں معتمد سمجھے جاتے ہوں۔

خدا کرے! نقار خانہ میں طوطی کی یہ آواز سنی جائے اور مسئلہ کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو! **وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان**

مذہبی جلسے: اہمیت اور طریقۂ کار

اللہ نے پوری انسانیت کو؛ بلکہ جنوں کو بھی اپنی عبادت کرنے کے لیے پیدا فرمایا ہے؛ لیکن اس امت کے لیے صرف عبادت کافی نہیں، اسے یہ امتیاز بخشا گیا ہے کہ وہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کے بعد کارِ نبوت انجام دے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے منع کرے، اسی کو قرآن مجید میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا گیا ہے— ''معروف'' کے اصل معنی مشہور اور جانی پہچانی چیز کے ہیں، مقصد یہ ہے کہ نیکی کی طرف اس قدر دعوت دو کہ سماج میں اس کا عام چلن ہو جائے، وہ عرف و رواج کا درجہ حاصل کر لے اور ہر عام و خاص اس کے مطابق عمل کیا کرے، ''منکر'' ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اَن جانی اور اَن پہچانی ہو، جو مشہور نہ ہو، اور جو عادت و رواج کے خلاف ہو، قرآن مجید نے برائی کو ''منکر'' سے تعبیر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ برائی سے اس قدر روکا جائے کہ وہ معاشرہ میں ایک اَن پہچانی چیز بن جائے، جو عام رواج و معمول کے خلاف ہو۔

یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب معاشرہ میں معروف کی دعوت اور برائی سے روکنے کی مہم پوری اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ انجام دی جائے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بے شک نیکی کی دعوت اور برائی سے روکنا دین کا سب سے بڑا استون (قطب اعظم) ہے، یہ وہ اہم ترین کام ہے جس کے لیے اللہ نے تمام انبیاء کو مبعوث فرمایا، اگر اس کی بساط لپیٹ دی گئی، اس کے علم اور اس پر عمل سے غفلت برتی گئی تو کارِ نبوت معطل ہو جائے گا، دین داری میں اضمحلال آجائے گا، انحطاط چھا جائے گا، گمراہی پھیل جائے گی، جہالت کی کثرت ہوگی، فساد بڑھ جائے گا، تباہی عام ہو جائے گی، شہر ویران ہو جائیں گے، اللہ کے بندے ہلاک کر دیئے جائیں گے اور انہیں اپنی ہلاکت کا احساس بھی قیامت سے پہلے نہیں ہو سکے گا.... الخ'' (احیاء علوم الدین: ۳۰۶/۲)

امام غزالیؒ جیسے شریعت کے رمز شناس نے جب دعوتِ دین کی اہمیت پر قلم اٹھایا ہے

تو ایسا لگتا ہے کہ لہو میں قلم ڈبو کر اور محبت کی انگیٹھی سے دل کو جلا کر یہ تحریر لکھی ہے؛ کیوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی انسانیت کی فلاح و کامیابی کی کلید ہے، اگر معروف کی طرف بلانے والے اور منکر سے روکنے والے لوگ باقی نہ رہیں گے تو دنیا شر و فساد کی آماج گاہ بن جائے گی اور فرشتوں کو نسل انسانی سے جس فساد اور خون ریزی کا اندیشہ تھا، وہ ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے گا؛ اسی لیے امت کے علماء اور صلحاء نے ہمیشہ دین کے اس شعبہ کو بے حد اہمیت دی ہے، امام الحرمین نے لکھا ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ صرف حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے؛ بلکہ اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے پوری امت کی ذمہ داری ہے۔ (شرح نووی علی مسلم: ۲/۲۳)

لیکن دعوتِ دین کا کوئی خاص طریقہ قرآن وحدیث میں متعین نہیں کیا گیا ہے، داعی کی صلاحیت، مدعو کے مزاج اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق مختلف طریقوں پر دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا ہے، مسلم حکومتوں کا فریضہ ہے کہ وہ طاقت کی لاٹھی استعمال کر کے معاشرہ میں نیکیوں کو رواج دیں اور برائیوں کو روکیں، شریعت سراپا رحمت ہے، شارع تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہیں اور جن پر شریعت نازل کی گئی ہے، وہ رحمۃ للعالمین ہیں، اس کے باوجود جرائم پر سرزنش کرنے کا حکم دیا گیا اور بعض جرائم پر نہایت سخت سزائیں مقرر کی گئیں، یہ اسی لیے کہ بعض دفعہ نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے کے لیے طاقت وقوت کا استعمال بھی مطلوب ہوتا ہے، مساجد میں جمعہ وعیدین کے خطبوں کا اہتمام اور وقتاً فوقتاً لوگوں سے اصلاح وتربیت کی گفتگو کا مقصد بھی دعوتِ دین ہی ہے، خانقاہیں اور مدارس شب وروز جس کام میں مشغول ہیں، وہ بھی دعوت ہے، اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ لوگوں کو متوجہ کرنا بھی دعوت کا ایک مؤثر طریقہ ہے اور یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

غیر مسلموں یا مسلمانوں کے ایک گروہ کو جمع کر کے انہیں دین کی طرف بلانا بھی ایک ایسا طریقۂ دعوت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے اور آپ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کے عمل سے بھی، قرآن مجید میں حضرت نوح، حضرت لوط اور حضرت

ابراہیم علیہم السلام وغیرہ کے دعوتی خطابات نقل کیے گئے ہیں، جن میں ''یا قوم'' (اے میری قوم!) سے خطاب کیا گیا ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ جس وقت اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں نے دعوت پیش فرمائی، اس وقت ان کے سامنے بہت سارے لوگ موجود تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصر کے فرعون سے، فرعون کے جمع کیے ہوئے جادوگروں سے اور خود اپنی قوم بنی اسرائیل سے بار بار خطاب فرمانے کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے حواریوں سے خطاب کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے اور بائبل میں بھی، اور بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہودیوں اور خاص کر یہودی علماء سے بھی اصلاحی خطابات فرمائے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز ہی اسی انداز پر فرمایا، جب حکم دیا گیا کہ آپ اپنے خاندان کے لوگوں پر حق کی دعوت پیش فرمائیں: وَاَنذِر عَشِيرَتَكَ الاَقرَبِينَ (الشعراء:۲۱۴) تو آپ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو جمع فرمایا، ان کے لیے کھانے کا بھی نظم کیا اور پھر ان پر توحید کی دعوت پیش فرمائی؛ بلکہ بعض سیرت نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دو دفعہ ایسا اجتماع منعقد کیا، پھر جب آپ کو عمومی طور پر دعوتِ دین کا حکم دیا گیا تو آپ نے صفا کی چوٹی پر چڑھ کر تمام اہل مکہ کو اس پہاڑ کے دامن میں جمع فرمایا اور ان سے خطاب کیا، فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع سے آپ نے جو اثر انگیز خطبات دیئے ہیں وہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کو، کہ انھوں نے نہایت تحقیق اور حسنِ ترتیب کے ساتھ ''حیاۃ الصحابہؓ'' میں ان مضامین کو جمع فرما دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کا ایک مسنون اور ماثور طریقہ لوگوں کے ایک گروہ کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنی باتیں رکھنا بھی ہے، موجود دور کے عرف میں اس کو جلسہ، اجتماع یا کانفرنس وغیرہ کہتے ہیں، ماشاء اللہ مذہبی جماعتیں، تنظیمیں، ادارے، دینی مدارس، انجمنیں، نیز عام مسلمان ایسے اجتماعات اور جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، یہ ایک خوش آئند بات ہے، اور

یقیناً معاشرہ پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے؛ بہ شرطیکہ مقررین تعمیری گفتگو کریں اور مسلمانوں میں نفرت پھیلانے والی باتوں سے اجتناب کریں؛ چناں چہ دوسرے مذاہب کے متبعین میں ایسے اجتماعات کا تصور نہیں تھا؛ لیکن اب وہ بھی مسلمانوں کا دیکھا دیکھی ایسے پروگرام منعقد کرنے لگے ہیں۔

مگر کوئی بھی کام اس وقت بہتر اور اجر وثواب کا حامل ہوتا ہے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق اور دین وشریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، کوئی کام بہ ظاہر بہت بھلا معلوم ہو اور اس پر اللہ اور اس کے رسول کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو تو وہ کام نامقبول ہے اور عام طور پر ایسا کام مؤثر اور نتیجہ خیز بھی نہیں ہوا کرتا، مثلاً: نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے؛ لیکن وہی نماز اگر سورج نکلنے کے وقت، سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت اور سورج کے ڈوبنے کے وقت پڑھی جائے تو کارِ ثواب نہیں؛ بلکہ باعث گناہ ہے؛ کیوں کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت کے خلاف ہے، اور کیوں کہ اس میں سورج کی پرستار قوموں سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

اسی اصول پر ہمیں اجتماعات اور جلسوں کا بھی جائزہ لینا چاہیے، افسوس کہ آج کل ہمارے مذہبی جلسوں اور دینی اجتماعات میں بھی کئی غیر شرعی امور شامل ہو گئے ہیں، جیسے بہت سی دفعہ بلا اجازت الیکٹرک کے ستونوں پر تار ڈال دیا جاتا ہے، نہ محکمہ بجلی سے اجازت لی جاتی ہے اور نہ اسے اجرت ادا کی جاتی ہے، سڑکوں کو گھیر کر جلسے کیے جاتے ہیں، حالاں کہ اس جگہ سے عام لوگوں کا اور خاص کر راہ گیروں کا حق متعلق ہے، حکومت سے بھی اجازت نہیں لی جاتی، یقیناً یہ صورت بجلی اور جگہ کی چوری یا غصب میں شامل ہے، اگر چہ بعض دفعہ حکومتی ذمہ داران بھی ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے لیے ان کا عمل حجت نہیں ہے، ہمارے لیے تو قرآن وحدیث اور صحابہ کرامؓ کا طریقہ دلیل ہے۔

بعض دفعہ جلسوں میں اسراف اور فضول خرچی بھی حد سے گذر جاتی ہے، ضرورت

سے زیادہ روشنی، قمقمے، پھول، پتی، استقبالیہ گیٹ، ڈائس کا ڈیکوریشن، حالاں کہ دین کی بات پہنچانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو استنجاء، وضوء اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا، اگرچہ کوئی شخص نہر کے کنارے پر کیوں نہ ہو؟ آپ نے سوتے وقت چراغ کو بجھا دینے کا حکم دیا، قرآن وحدیث میں کثرت سے فضول خرچی یعنی بے ضرورت خرچ اور ضرورت سے زیادہ خرچ کو منع فرمایا گیا ہے — کیا دینی پروگراموں کے لیے اس فضول خرچی کی اجازت ہوسکتی ہے؟

ہمارے یہ پروگرام بعض اوقات عام لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں، خاص کر پورے محلّہ میں پروگرام کو نشر کرنا، مسلمانوں، غیر مسلموں، صحت مندوں اور بیماروں سبھوں کو اس کے سننے پر مجبور کرنا، بہت سے لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت سے بڑھ کر کون سا ذکر ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ نماز میں نہ بہت زور سے تلاوت کریں اور نہ بہت پست آواز میں کہ شرکاءِ نماز بھی نہ سن سکیں؛ بلکہ آواز کو معتدل رکھیں: **وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا** (الاسراء: ۱۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی راحت کا اس درجہ پاس ولحاظ تھا کہ آپ سلام بھی ایسی آواز میں فرماتے کہ جس سے سونے والوں کو خلل نہ ہو، دین کے اس مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں کہ رات کا وقت ہو، لوگ سوئے ہوئے ہوں اور اس درمیان کوئی شخص زور سے قرآن مجید پڑھے تو وہ گنہگار ہوگا: ''**لو قراء فی اللیل جھرًا والناس ینام یاثم**'' (**البحر الرائق، باب الامامۃ: ۱/۳۶۴**) — سوچیے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل کیا اللہ تعالیٰ کے حکم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے؟

یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم جذبات کی رو میں اس بات کا بھی لحاظ نہیں رکھتے کہ کہیں ہم دین کی تعظیم کے نام پر دین کی بے احترامی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں؟ — قرآن مجید کا ادب یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو لوگ خاموش رہیں اور توجہ سے سنیں، اگر کوئی مجلس

قرآن کی تلاوت کے لیے منعقد کی گئی ہو اور اس میں لوگ بات چیت کرنے لگیں تو بات کرنے والے گناہ گار ہوں گے اور اگر کہیں لوگ اپنی ضرورتوں میں مشغول ہوں اور وہاں کوئی شخص قرآن کی تلاوت شروع کردے، نتیجہ یہ ہو کہ لوگ قرآن کی طرف دھیان نہ دے سکیں، کھانے پینے، خرید وفروخت، بات چیت اور دوسری ضروریات میں مشغول رہیں تو قرآن پڑھنے والا گناہ گار ہوگا؛ اس لیے کہ وہی شخص غلط جگہ اور غلط وقت کا انتخاب کر کے قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بن رہا ہے، آج کل ہمارے جلسوں میں عمومی صورتِ حال یہی ہوتی ہے، قرآن پڑھا جاتا ہے، دینی باتیں بیان کی جاتی ہیں، جلسہ گاہ سے باہر دور دور تک آواز پہنچانے کا نظم کیا جاتا ہے، لوگ دنیا کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، قرآن کی تلاوت اور دین کی باتیں ان کے کانوں تک پہنچتی ہیں؛ لیکن اپنے مشاغل کی وجہ سے نہ وہ سنتے ہیں اور نہ وہ خاموش رہتے ہیں — کیا ہمارا یہ طریقہ قرآن مجید کی اور دینی باتوں کی بے احترامی کے مترادف نہیں ہے؟

پھر مزید ستم یہ ہے کہ بعض اوقات ہم کلمہ طیبہ، قرآنی آیات، احادیث، اللہ اور اللہ کے رسول کے اسماء مبارکہ کے جھنڈے، پوسٹر، بینر وغیرہ بھی لگاتے ہیں اور جلسہ ختم ہونے کے بعد نہیں دیکھتے کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ یہ مبارک اور مقدس کاغذ اور کپڑے کے ٹکڑے سڑکوں پر گرتے ہیں اور لوگوں کے قدموں سے روندے جاتے ہیں، اس بے تعظیمی کی ذمہ داری کس پر آئے گی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد جاگنے اور گفتگو کرنے سے منع فرمایا، خود آپ کا معمول مبارک یہ تھا کہ سوائے اس کے کہ کوئی ضروری دینی بات ہو آپ عشاء کے بعد آرام فرمایا کرتے تھے، عشاء کے بعد جلد سو جانے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ لوگ بہ آسانی فجر کی نماز ادا کرسکیں اور جن لوگوں کو تہجد پڑھنے کی توفیق ہو، وہ آخر شب میں بیدار ہوسکیں؛ لیکن بعض اوقات یہ جلسے رات دیر تک ہوتے رہتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں بہت سے سامعین فجر کی نماز سے محروم رہتے ہیں، پس کیا جلسوں کی یہ ترتیب دین کے مزاج سے ہم آہنگ ہے؟

حاصل یہ ہے کہ جلسے اور اجتماعات دعوت و اصلاح کے مؤثر ذرائع ہیں۔ یہ انبیاء کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہیں؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو منعقد کرنے میں شریعت کی حدود اور دین کے مزاج کو پیش نظر رکھا جائے، یہ دوسرے کے لیے تکلیف دہ نہ ہو، زور زبردستی نہ ہو، غیر شرعی طریقے پر ایسی چیزوں کا استعمال نہ کیا جائے، جن کے ہم مالک نہیں ہیں، یہ جلسے صرف کان کی لذت کا سامان نہ ہوں؛ بلکہ ان کے ذریعہ امت کو عمل کا پیغام ملے، ہم اپنے اجتماعات کے لیے قرآن و حدیث اور صحابہؓ کے عمل کو بنیاد بنائیں، نہ کہ ہم جوش و جذبہ میں برادرانِ وطن کے طریقوں کی پیروی کرنے لگیں، تبھی یہ جلسے سماج میں صالح تبدیلیاں لانے اور معاشرہ کو ایک نمونہ کا معاشرہ بنانے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں، کاش، ہم پوری دردمندی کے ساتھ ٹھنڈے دل سے ان سچائیوں پر غور کریں!

کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا اِلحاد بھی ساتھ؟

مدارس کے فارغین کو عصری تعلیمی اداروں سے استفادہ کرتے ہوئے عصری علوم کو حاصل کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس میں علماء وارباب دانش کے درمیان فکر ونظر کا اختلاف پایا جاتا ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ دینی مدارس کے فارغین کو عصری دانش گاہوں میں شریک نہیں ہونا چاہیے، اِس کے دو نقصانات ذکر کیے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اس سے دینی خدمت کے میدان میں افراد کم ہو جائیں گے اور مدارس کا جو بنیادی مقصد ہے وہی حاصل نہیں ہو سکے گا، دوسرے: جب مدارس کے یہ فارغین عصری درس گاہوں میں جائیں گے تو وہ وہاں کے ماحول سے متاثر ہو جائیں گے، اُن کی وضع قطع تبدیل ہو جائے گی اور وہ اصل ڈگر سے ہٹ جائیں گے، یہ دونوں باتیں بے اصل نہیں ہیں؛ لیکن موجودہ حالات میں طلبہ کی اتنی بڑی تعداد مدارسِ اسلامیہ سے فارغ ہو رہی ہے کہ اُن کو جگہ نہیں مل پاتی؛ بلکہ بعض دفعہ تو غول کا غول بڑے شہروں میں ملازمت کی تلاش میں مدرسوں اور مسجدوں کا چکر لگاتا ہوا نظر آتا ہے اور جب جگہ فراہم نہیں ہوتی ہے تو سخت مایوسی کا شکار ہوتا ہے، اُن میں سے کچھ تو چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگ جاتے ہیں، کچھ ہمت ہار کر بے دلی کے ساتھ کمیٹیوں کے تحت ایک طرح کی غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور کچھ اور —— جو کسی قدر ذہین و باصلاحیت ہوتے ہیں —— بے ضرورت مدرسہ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، بچوں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ اگر ایسے دس مدرسوں کو جمع کر دیا جائے تب بھی طلبہ کی مطلوبہ تعداد پوری نہ ہو سکے، گذشتہ دنوں مجھے ایک ایسے شہر جانے کا موقع ملا جہاں چھ سات منزلہ بلڈنگ تھی اور اس میں سے ایک ایک منزل میں تین مدرسے قائم تھے، ظاہر ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر قائم ہونے والے یہ ''مدارس'' اُمت پر بوجھ ہیں اور بہت سی دفعہ یہ مدارس کے بارے میں بدگمانی کا سبب بھی بنتے ہیں؛ اس لیے آج سے تیس چالیس سال پہلے تک تو یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اگر مدارس کے فضلاء دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئے تو دینی خدمت گذاروں کی کمی ہو جائے گی؛ لیکن اب یہ صورتِ حال نہیں ہے، رہ گیا دیہاتوں میں معلمین کا دستیاب نہیں ہونا تو یہ علماء کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ اس لیے

ہے کہ دیہاتوں میں سہولتوں کے مہیا نہ ہونے، حق الخدمت کے ناقابل بیاں حد تک کم ہونے اور خود فضلاء میں داعیانہ جذبہ مفقود ہونے کی وجہ سے علماء وہاں جانے کو تیار نہیں ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عصری دانش گاہوں میں جانے والے بہت سے فضلاء مدارس اپنی اس پہچان کو قائم نہیں رکھ پاتے، جو مدرسہ کی تعلیم وتربیت کی بنیاد پر انہیں حاصل ہوئی تھی؛ لیکن اس سلسلہ میں خود مدارس کو غور کرنا چاہیے کہ اُن کے طریقۂ تعلیم وتربیت میں کیا کمی ہے کہ وہ اپنا رنگ دوسروں پر ڈالنے کے بجائے خود دوسروں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں؛ حالاں کہ جو نوجواں دینی جماعتوں اور تحریکوں سے مربوط ہوتے ہیں وہ بہت جلد اپنے فکر وعمل میں اس درجہ پختہ ہوجاتے ہیں کہ ان پر مخالف ماحول کی کوئی آنچ نہیں آتی، دوسرے: اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ عصری تعلیمی اداروں میں بھی ایسے اہل علم کی ضرورت ہے، جو دین سے واقف ہوں، اِس کی ضرورت پرائمری سطح سے لے کر یونی ورسیٹیوں تک ہے، اگر مدارس کے فضلاء کو اس میدان میں خدمت کا موقع مل جائے خواہ سرکاری ادارے ہوں یا پرائیویٹ، تو ان کی تعلیم وتربیت طلبہ پر بہتر اثر ڈالتی ہے، ہندوستان کی بعض یونی ورسیٹیوں میں آج سے پچاس سال سے پہلے کمیونسٹ اور بے دین اساتذہ کا غلبہ تھا، اسلامک اسٹڈیز میں ایسے اساتذہ اسلامیات پڑھاتے تھے جو برملا قرآن وحدیث کا انکار کرتے تھے اور اسلام کے بارے میں طلبہ کے ذہن میں زہر گھولتے تھے؛ لیکن گذشتہ کم از کم پچیس سالوں سے یہ صورتِ حال بدل چکی ہے اور اب عصری جامعات میں مدارس کے علماء نمایاں مقام حاصل کررہے ہیں، یہاں تک کہ بعضوں نے آئی، اے، ایس اور آئی، پی، ایس بننے میں بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان میں سے بعض تو اپنی دینی وضع قطع کے ساتھ مخالف ماحول میں خدمت کررہے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اگرچہ اپنی اس روایتی شناخت پر قائم نہیں رہ سکے؛ لیکن کم سے کم ان کی وہ سوچ باقی رہی، جو وہ مدارس سے لے کر گئے تھے، اس کے نتیجے میں اِلحاد اور بددینی کی فضا دور ہوئی، آج مختلف اقلیتی یونی ورسیٹیوں میں اِس کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں، جو لوگ اتنے کمزور کردار اور کوتاہ فکر کے حامل ہوں کہ عوام کی ناک کی طرح اُن کی شکل بدلتی

رہتی ہو، اگر عصری اداروں میں نہ جائیں اور مدرسہ و مسجد کے علاوہ زندگی کے کسی اور شعبہ میں چلے جائیں، تب بھی ان کا یہی رویہ سامنے آتا ہے۔

اس لیے دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مدارس کے فضلاء کو دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی سہولت کے لحاظ سے عصری تعلیمی اداروں سے بھی استفادہ کی کوشش کرنی چاہیے، خود تحریک مدارس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے سر سید احمد خاں مرحوم کو خط لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ مدرسہ عربیہ دیوبند سے تعلیم حاصل کر کے طلبہ علی گڑھ جائیں نیز آپ نے سر سید احمد خاں کی خواہش پر اپنے داماد عبداللہ انصاری کو شعبۂ دینیات کے ذمہ دار کی حیثیت سے وہاں بھیجا تھا؛ اِس لیے معتدل رائے یہی ہے کہ جن فارغین مدارس کو فراغت وقت میسر ہو، مالی استطاعت ہو اور مزید حصولِ علم کی پیاس ہو تو وہ اِس نیت سے عصری تعلیمی اداروں سے استفادہ کریں کہ وہ اِسے کسبِ معاش کے ساتھ ساتھ کسبِ معاد کا اور خدمتِ دنیا کے ساتھ ساتھ خدمتِ دین کا بھی ذریعہ بنائیں گے۔

اِدھر کچھ عرصہ سے مدارس کے فضلاء مزید حصولِ تعلیم کے لیے عصری جامعات کا رُخ کر رہے ہیں، عام طور پر ان کا داخلہ شعبہ اسلامک اسٹیڈیز، شعبہ عربی اور شعبہ اردو میں لیا جاتا ہے اور اپنے سابقہ تعلیمی پس منظر کی وجہ سے وہ اِن شعبوں میں امتیازی مقام حاصل کرتے ہیں، بعض اوقات یہ ان کے لیے روزگار کا وسیلہ بھی بن جاتا ہے اور اس سے خود ان کی ذات اور خاندان کو فائدہ پہنچتا ہے؛ لیکن ان کی یہ تعلیمی کاوش اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، اگر ان کا داخلہ دوسرے تعلیمی شعبوں جیسے قانون، معاشیات، میڈیا، تاریخ وغیرہ میں ہونے لگے تو اس سے ان کو بھی فائدہ ہوگا اور قوم وملت کو بھی، وہ اِن شعبوں میں اسلام اور مسلمانوں کی ترجمانی کر سکیں گے، جو غلط فہمیاں اسلام کے خلاف پھیلائی جا رہی ہیں، ان کو دور کر سکیں گے اور آئندہ اگر انہیں اِن ہی شعبوں میں تدریس کا موقع مل گیا تو وہ ایک بصیرت مند مسلمان قانون داں، مسلمان صحافی اور مسلمان ماہر معاشیات وغیرہ تیار کر سکیں گے، یہ یقیناً ایک بڑا کام ہوگا؛ لیکن یہ فضلاء اِن شعبوں میں کس طرح داخلہ لیں اور ان نامانوس مضامین کو

کیوں کر پڑھیں؟ اس کے لیے برج کورس کا ایک طریقہ کار سوچا گیا، اب حکومت مختلف اقلیتی یونی ورسٹیوں میں ایسے برج کورس کا راستہ کھول رہی ہے؛ تاکہ مدارس کے فضلاء کو خصوصی تعلیم وتربیت کے ذریعہ دوسرے شعبوں میں داخلہ کے لیے تیار کیا جائے اور وہ امتحان پاس کر کے اِن شعبوں میں داخل ہوں، یہ ایک بہتر قدم ہے اور اگر اِس کا صحیح استعمال ہو تو اس کا اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چناں چہ ملک کی پہلی اقلیتی یونی ورسٹی ''مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ'' ـــــ جس کی ایک روشن تاریخ اور تعلیمی خدمت کا زبردست ریکارڈ ہے ـــــ نے بجاطور پر ''برج کورس'' کے قیام میں پیش قدمی کی اور وہاں مدارس کے فضلاء داخلہ لینے لگے، جو لوگ دینی وعصری تعلیم کے امتزاج کے سلسلے میں معتدل فکر رکھتے ہیں اور وسیع افق میں اسلام کی ترجمانی اور نئی نسل کی تربیت اور ذہن سازی کے بارے میں سوچتے ہیں، ان کے لیے یقیناً یہ خبر بڑی خوش آئند تھی؛ لیکن افسوس کہ بقول علامہ اقبالؒ:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
میں سمجھتا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

بجائے اِس کے کہ دین دار ماہرینِ فن کے ذریعہ اِن فضلا کی تعلیم وتربیت کی جاتی، وہاں ایک ایسے صاحب کو اِس کام پر مامور کر دیا گیا جن کا نام ''شاذ'' ہے اور جو واقعی اسم بامسمیٰ ہیں، ان کی فکر ''الف'' سے ''ی'' تک شذوذ، تفرد، توارث سے بغاوت اور سلفِ صالحین کے مسلمات سے انکار بلکہ ان کی بے توقیری پر مبنی ہے، اِس کی تفصیل یہ ہے کہ دین کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر ہے، قرآن مجید متن ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی ہدایت

کے لیے بھیجا گیا ہے اور حدیث پیغمبر کی زبان اور عمل سے قرآن مجید کی تشریح ہے، خود قرآن نے آپ کے شارحِ قرآن ہونے کی حیثیت کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا ہے" وَاَنزَلنَا اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم وَلَعَلَّھُم یَتَفَکَّرُونَ" (النحل: ۴۴) اور پھر آپ کی یہ تشریحات آپ کی طرف سے نہیں ہیں؛ بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کے بیان کی ذمہ داری بھی لی ہے:"ثُمَّ اِنَّ عَلَینَا بَیَانَہ" (القیامۃ: ۲۰) تو قرآن ہی کی طرح بیان قرآن یعنی حدیث بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:"کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں، اپنی طرف سے نہیں فرماتے؛ بلکہ وحی الٰہی کی بنا پر فرماتے ہیں:"وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی، اِن ھُوَ اِلَّا وَحی یُّوحٰی"(النجم: ۳-۴) یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ جو کچھ تلاوت کرتے ہیں، وہ اللہ کی وحی کی بنا پر، اگر ایسا کہا جاتا تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ صرف قرآن اللہ کی طرف سے ہے، جس کی تلاوت کی جاتی ہے؛ بلکہ فرمایا گیا کہ آپ جو کچھ بھی بولتے ہیں، یہ سب اللہ کی طرف سے وحی ہے، خواہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر الفاظ اُتارے ہوں جیسا کہ قرآن مجید ہے، یا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر اپنی مرضیات کا القا کیا ہو اور آپ نے اس کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو، جیسا کہ حدیثیں ہیں؛ اسی لیے حکم ربانی ہوا کہ رسول جو کچھ بھی عطا فرمائیں، اسے قبول کرو اور جن باتوں سے بھی روک دیں، ان سے بچو، خواہ یہ حکم اور ممانعت قرآنِ کریم میں مذکور ہو یا نہ ہو: "مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَمَا نَھَاکُم عَنہُ فَانتَھُو" (الحشر: ۷) اِس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے بیشتر احکام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحتوں کو نظر انداز کر کے عمل نہیں کیا جاسکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی وضاحت اپنے قول سے بھی فرمائی ہے اور عمل سے بھی، جن لوگوں نے آپ کے اقوال کو اپنے کانوں سے سنا ہے، اور جن باتوں کو سمجھنے میں دشواری ہوسکتی تھی، ان کے بارے میں استفسار کیا ہے، نیز آپ کے ایک ایک عمل کو سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ کی خاموشی سے کسی قول یا فعل پر آپ کی رضامندی کو محسوس کیا

ہے اور پھر قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات و معمولات کو لوگوں تک پہنچایا ہے وہ ہیں اصحابِ رسول، ان کے ارشادات حدیث کے لیے شرح و وضاحت کا درجہ رکھتے ہیں اور گویا حدیث رسول ہی کا ایک حصہ ہیں؛ اِسی لیے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ میرے بعد بہت سارا اختلاف دیکھو گے، اس وقت وہ لوگ حق پر ہوں گے، جنھوں نے میرا اور میرے صحابہؓ کا طریقہ اختیار کیا ہوگا: ''**ما انا علیه و اصحابی**'' (ترمذی، ابواب الایمان، حدیث نمبر: ۲۶۴۱) نیز آپ کا ارشاد ہے کہ تم اس طریقے کو اختیار کرو، جو میرا اور میرے خلفاء راشدین کا ہے، ''**علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین**'' (**ترمذی، ابواب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۷۶**) اِس طرح کتاب اللہ، سنتِ رسول اور صحابہ کے وہ اقوال جو صرف ان کے اجتہاد پر مبنی نہ ہوں اور جن میں عقل و قیاس کا دخل نہ ہو، ایک اکائی کا درجہ رکھتے ہیں، اِن میں سے ایک پر دوسرے کو چھوڑ کر مکمل عمل ہو نہیں سکتا، نہ قرآن پر پورا پورا عمل کیا جا سکتا ہے، اگر حدیثیں نظر انداز کر دی جائیں، اور نہ منشاء نبوی کو پوری طرح سمجھا اور عمل میں لایا جا سکتا ہے، اگر صحابہؓ کی توضیحات سے صرفِ نظر کر لیا جائے۔

قرآن و حدیث میں بعض اُمور کو اِس درجہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن کا ایک ہی معنی متعین ہے، عام طور پر اُن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا؛ لیکن کچھ احکام ایسے الفاظ میں دیئے گئے ہیں، جن میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، ایسے مسائل میں بعض وہ ہیں جن پر خود اُمت کا اتفاق ہے، اِس اتفاق کو اصطلاح میں ''اجماع'' کہتے ہیں، یہ بھی شریعت کی ایک اہم دلیل ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت کسی غلط بات پر مجتمع نہیں ہو سکتی: ''**لا یجتمع امتی علی ضلالة**'' (ترمذی، ابواب الفتن، حدیث نمبر: ۲۱۶۷) اور یہ بات عقل میں بھی آتی ہے کہ کسی بات پر تمام اہل علم کا متفق ہو جانا کسی بنیاد و دلیل کے بغیر نہیں ہو سکتا؛ اس لیے یہ بھی دین میں حجت ہے اور اس سے آیات و احادیث کی غلط معنی آفرینی، دور از کار تاویل اور ہوا و ہوس پر مبنی تشریح کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

کتاب وسنت، آثارِ صحابہؓ اور اُمت کی اجماعی واتفاقی آرا کو سامنے رکھ کر اور جن آیات واحادیث میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف افعال کا موقع ومحل واضح نہ ہونے کی وجہ سے بظاہر تعارض تھا، یا ان کا صریحاً کتاب و سنت میں ذکر نہیں ہے اور غور وفکر کی مختلف جہتیں ان کے سلسلہ میں موجود ہیں، ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے امت کے معتبر، بالغ نظر، خشیتِ الٰہی سے مامور مخلص اور دیدہ ور علماء نے عام مسلمانوں کی سہولت کے لیے زندگی کا پورا نظام مرتب کیا اور جن مسائل کا تعلق اعتقادات و ایمانیات سے تھا، ان کو علم کلام کا نام دیا گیا اور ان سے شغف رکھنے والے متکلمین کہلائے، اور عملی زندگی کے احکام وقوانین کو ''فقہ'' کا نام دیا گیا اور اس کی خدمت کرنے والے فقہاء کہلائے، نیز جن لوگوں نے قرآن وحدیث کی اخلاقی تعلیمات اور تزکیۂ نفوس سے متعلق امور کو جمع کیا اور ان کو سامنے رکھ کر افراد کی تربیت کی، ان کو صوفیاء کہا گیا اور ان کے اس علم کو ''تصوف'' کا نام دیا گیا، اس میں شبہ نہیں کہ تصوف میں بعد کے دین ناآشنا لوگوں نے بعض عجمی تصورات ورواجات کو اپنا لیا، جو درست نہیں ہے؛ لیکن بہتر حال وہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی اخلاق ہی کی مرتب شکل ہے اور اسی لیے اِس کو ''علم الاخلاق'' بھی کہتے ہیں؛ لہٰذا کلام، فقہ اور بدعات و بے جا رسومات سے پاک تصوف دراصل قرآن وحدیث ہی کی عملی صورت گری سے عبارت ہے، یہ ایک ایسی مرتب اور منضبط شکل ہے کہ اس کے ذریعہ دین کے تمام شعبوں پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

جناب راشد شاذ صاحب بہ مشکل قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا اقرار کرتے ہیں؛ لیکن حدیث رسول کے منکر ہیں، صحابہؓ کے اقوال وافعال کی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، اُمت کے اجماع اور اتفاق کو حجت ماننا اُن کے نزدیک ایک غلط مفروضہ ہے اور جب دین کے یہ بنیادی مأخذ ان کی نظر میں غیر معتبر اور ناقابل تسلیم ہیں تو ظاہر ہے کہ علم کلام، فقہ اور تصوف کا ان کے یہاں کیا گذر ہوگا وہ تو اُن کی نظر میں دریا بُرد کر دیئے جانے کے لائق ہے، اس لیے وہ اپنی کتابوں میں قدم قدم پر ایمان وعقیدہ کی تشریح کرنے والے متکلمین، قرآن

مجید کی شرح ووضاحت کا فریضہ ادا کرنے والے مفسرین، اجتہاد واستنباط کے ذریعہ عملی زندگی سے متعلق احکام مرتب کرنے والے فقہاء نیز صوفیاء اور سلف صالحین کا استہزا کرتے ہوئے خوب محظوظ ہوتے ہیں، ان کو مطالعہ تاریخ بھی انہیں یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں سب سے بُری قوم مسلمان ہیں، اِس اُمت کی بداعمالیاں، بداطواریاں اور کوتاہیاں اُن کی نگاہوں کے سامنے اِس طرح ہیں کہ گویا دوپہر کی دھوپ؛ لیکن اس امت کی اخلاقی خوبیاں اور ان کے علمی وفکری کارنامے ان کی نظر میں اتنے کم ہیں کہ دوربین کی آنکھوں سے بھی نظر نہ آئیں۔

یہ جو میں نے عرض کیا کہ وہ قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا بمشکل اقرار کرتے ہیں، یہ ''بمشکل'' کا لفظ بے وجہ نہیں ہے، وہ قرآن مجید کے کتابِ الٰہی ہونے کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح وتفسیر میں ایسی بے جا تاویل وتوضیح کی راہ اختیار کرتے ہیں، جو گذشتہ چودہ سال کے عرصہ کے سلف صالحین کی تشریح سے یکساں مختلف ہے، قرآن مجید ابدی کتاب ہے اور قیامت تک کی انسانیت کی ہدایت کے لیے ہے؛ لیکن شاذ صاحب کی خنجر بے داد سے قرآن مجید کی یہ حیثیت بھی محفوظ نہیں رہ سکی اور وہ قرآن کے بعض احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے لیے مخصوص مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اب یہ احکام تبدیل کر دیئے جائیں، جیسے قرآن نے بیٹیوں کے مقابلہ میں بیٹوں کا حصہ دوہرا رکھا ہے؛ کیوں کہ خاندان کی ساری مالی ذمہ داریاں بیٹوں پر رکھی گئی ہے اور بیٹیوں کو ان سے فارغ رکھا گیا ہے، شاذ صاحب کا خیال ہے کہ اب دونوں کا حصہ برابر کر دینا چاہیے، گویا قرآن کو بھی وہ اس کے دوام واستمرار اور آفاقیت کے تصور کے ساتھ نہیں مانتے؛ چوں کہ مسلم سماج میں رہتے ہوئے اور اسلام کا نام پر لے کر قرآن مجید کا سِرے سے انکار ممکن نہیں تھا؛ اس لیے انہوں نے بہ تکلف اس کے کتابِ الٰہی ہونے کا اقرار تو کر لیا؛ لیکن یہ بھی اُن کے لیے کڑوا گھونٹ ہے جو اُتارے حلق سے نہیں اُترتا، اِس سلسلہ میں اُن کی کتاب ''ادارکِ زوالِ اُمت'' نہایت گمراہ کن کتاب ہے اور فکری شذوذ وانحراف کی ایک افسوس ناک مثال ہے، جو اُمت کو الحاد، مذہب بے زاری اور خدا بے زاری کی طرف لے جاتی ہے، افسوس اور بالائے افسوس یہ بات ہے کہ

کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے مدارس اسلامیہ کے ''برج کورس'' کے لیے ایسے شخص کو ذمہ دار مقرر کیا ہے، جن کی دینی وعصری تعلیم کے درمیان پل بننے کی اُمید تو کم ہی ہے؛ لیکن اس بات کا پورا پورا اندیشہ ہے کہ یہ شعبہ اسلامی اقدار اور دینی مسلمات سے انکار کے درمیان ضرور پل بن جائے گا، اور یہ اندیشہ واقعہ کی جو صورت اختیار کر رہا ہے، جیسا کہ اس شعبہ کے فارغین کے تحریری نمونوں سے معلوم ہوتا ہے۔

یونی ورسٹی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے نام پر ایسی اسلام مخالف حرکتوں کو روکے، اور مدارس کا فریضہ ہے وہ اپنے فضلاء کو حقیقی صورتِ حال سمجھائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سونا سمجھ کر بے قیمت پیتل خرید کر لیں، نیز خود فضلا کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی تحریک سے متأثر نہ ہوں، اس حقیر نے جب اخبار میں دیکھا کہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی میں بھی برج کورس شروع ہونے جا رہا ہے تو دل کانپ اُٹھا کہ کہیں یہ شاذ صاحب کے ایجنڈے کی توسیع تو نہیں ہے اور میں نے مانو کے محترم وائس چانسلر سے اس موضوع پر گفتگو بھی کی، مجھے بڑی خوشی ہے کہ انہوں نے اِس حقیر کے نقطۂ نظر کو قبول کیا اور کہا کہ یہاں ہرگز ایسا کچھ نہیں ہوگا، خدا کرے دوسری اقلیتی یونی ورسیٹیاں میں اس کو پیش نظر رکھیں، اگر ایک شخص شراب کہہ کر شراب بیچے تو ہمیں ایک جمہوری ملک میں اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے؛ لیکن اگر شراب کو شہد کہہ کر بیچا جائے تو سچائی کا اظہار اور حقیقت کی وضاحت ضروری ہے؛ کیوں کہ یہ ایک دھوکہ ہے اور اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ کوئی شخص پوری اُمت کو اپنے دھوکہ کا شکار بنادے، اور بالخصوص ایسی صورت میں کہ یہ کسی شخص کے ذاتی افکار کا مسئلہ نہیں رہ گیا ہے؛ بلکہ ایک ایسی دانش گاہ —— جسے مسلمانوں نے اپنے خونِ جگر سے پالا ہے، اس کے اقلیتی کردار کو بچانے کے لیے زبردست جدوجہد کی ہے اور آج بھی اس کا یہ کردار داؤ پر لگا ہوا ہے —— کو ایسے نادرست افکار کے رنگ میں رنگنا ملتِ اِسلامیہ کی گراں قدر کوششوں کے ساتھ بے وفائی ہے، اس پس منظر میں یہ سطور لکھی گئی ہے، وما ارید الا الاصلاح واللّٰہ ھو المستعان.

سوشل میڈیا — صحیح اور غلط استعمال؟!

انسان اپنی تمام ضروریات اپنے آپ پوری نہیں کرسکتا، اسے اپنی خواہش، اپنی ضرورت اور اپنا مدعا دوسروں تک پہنچانا پڑتا ہے، پہنچانے کے عمل کو''ابلاغ'' کہتے ہیں، ابلاغ کے لیے انسان کو دو قدرتی ذرائع مہیا کیے گئے ہیں، ایک: ''زبان'' جس کے ذریعہ آپ قریب کے لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، دوسرے: ''قلم'' جس کے ذریعہ آپ کوئی بات لکھ سکتے ہیں اور اسے کسی ذریعہ سے دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں، ابلاغ کے یہ دو ذرائع شروع سے استعمال ہوتے رہے ہیں، قرآن مجید میں انبیاء کی دعوت کا ذکر آیا ہے، وہ قوم کو اپنی بات سمجھانے کے لیے زبانی تخاطب کا طریقہ استعمال کیا کرتے تھے، تحریر کے ذریعہ دور تک اپنی بات پہنچانے کی مثال بھی قرآن مجید میں موجود ہے؛ چناں چہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا بلقیس کو خط ہی کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچایا تھا اور ایک پرندہ نے نامہ بر کا فریضہ انجام دیا تھا۔ (النحل:۹۲)

جب کوئی عمومی دعوت و مشن ہو تو اس کے لیے ایسا ذریعہ استعمال کرنا جو ایک ہی وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، مکہ میں پہلے سے یہ طریقہ آرہا تھا کہ جب بیک وقت تمام اہل مکہ کو کوئی اہم خبر پہنچانی ہوتی تو صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اعلان کیا جاتا، تمام لوگ پہاڑی کے دامن میں جمع ہو جاتے اور کہنے والا اپنی بات کہتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نبوت سے سرفراز کیے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ تک دعوتِ توحید پہنچانے کے لیے اسی قدیم ذریعہ ابلاغ کو اختیار کیا؛ البتہ اس میں جو بعض غیر اخلاقی طریقے شامل کر لیے جاتے تھے، جیسے: شدت مصیبت کے اظہار کے لیے سروں پر خاک اڑانا یا بے لباس ہو جانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اجتناب فرمایا۔

پورے جزیرۃ العرب تک اپنی بات پہنچانے کا ذریعہ مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات میں منعقد ہونے والے حج اور تجارتی اجتماعات تھے، حج میں تو پورے عرب سے لوگ کھنچ کھنچ کے آتے ہی تھے، اس کے علاوہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ کے میلے بھی لگتے تھے، ان اجتماعات

میں جو بات کہی جاتی، جو تقریریں کی جاتیں اور جو اشعار پیش کیے جاتے، پورے عرب میں اس کی گونج سنی جاتی اور لوگوں میں اس کا خوب چرچا ہوتا، پوری سرزمین عرب تک اپنی بات پہنچانے کا اس سے مؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں تھا؛ حالاں کہ ان میلوں میں یہاں تک کہ حج میں بھی بہت سی منکرات شامل ہوا کرتی تھیں؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفاسد سے بچتے ہوئے دعوت اسلام کو عرب کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے اس موقع کا بھرپور استعمال فرمایا، یہی چیز حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ کے دامن اسلام میں آنے کا ذریعہ بنا اور یہیں سے اسلام کی کرن مدینہ کی سرزمین تک پہنچی اور ایک آفتاب عالم تاب بن کر پورے عالم پر درخشاں ہوئی۔

لیکن ابھی عرب سے باہر اسلام کو پہنچانے کا مرحلہ باقی تھا اور اس کے لیے خط و کتابت کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا؛ چناں چہ ہجرت کے چھٹے سال جب اہل مکہ سے صلح ہوگئی، جو ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور اہل مکہ کی یلغارِ مسلسل سے مسلمانوں کو کچھ اطمینان ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام یہی کیا کہ عرب کے گرد و پیش موجود بڑی طاقتوں اور اس وقت کی معلوم دنیا کے حکمرانوں تک دعوتی خطوط بھیجے، حدیث کی متداول کتابوں میں تو چھ فرماں رواؤں کے نام خطوط کا ذکر ملتا ہے؛ لیکن دنیائے تحقیق کے تاج دار ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ کے بقول ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، یہاں تک کہ چین تک یہ دعوت پہنچائی گئی، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور دراز علاقوں تک پیغام حق پہنچانے کے لیے پوری وسعت کے ساتھ اس ذریعہ ابلاغ کا استعمال فرمایا۔

کائنات میں ارتقاء کا عمل جاری ہے، ہر صبح جب طلوع ہوتی ہے تو اپنے جلو میں ترقی کا ایک نیا پیغام لے کر آتی ہے اور ہر شب جب کائنات کی فضاء پر چھاتی ہے تو وہ کسی نئی حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا مژدہ سناتی ہے، ترقی کا یہ سفر جیسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں جاری ہے، اسی طرح ذرائع ابلاغ کے میدان میں بھی پوری قوت اور تیز گامی کے ساتھ جاری و ساری ہے؛ بلکہ اس میدان میں ٹکنالوجی کی ترقی دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے مقابلہ زیادہ تیز

ہے، ہم لوگوں نے اپنے بچپن میں دیکھا کہ اس وقت ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر ہی بہت بڑی چیز تھی اور فون و ٹیلی گرام کو حیرت واستعجاب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا؛ لیکن آج اگر کوئی شخص ان ایجادات کو حیرت ورشک کی نظر سے دیکھے تو بچے بھی اس پر ہنسیں گے؛ چناں چہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے دُور دُور تک اپنی بات پہنچانے کو آسان کر دیا اور اس کی رفتار ہوا کی رفتار سے بھی بڑھ گئی، افسوس کہ مسلمان ان تمام مرحلوں میں مسلسل پسماندگی کا شکار رہے، ہم ترقی کے قافلہ کا سالار بننے کی بجائے اس قافلہ میں شامل آخری فرد بھی نہ بن سکے اور گردِ کارواں بننے ہی کو اپنے لیے بڑی نعمت سمجھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر عالمی اعتبار سے یہودی حاوی ہو گئے، مسلمان ممالک میں ان کے ایجنٹوں کا بول بالا ہو گیا، اور میڈیا کے ہتھیار سے ہمارے ملّی مفادات، تہذیبی اقدار، قومی وقار اور دینی افکار کا اس طرح قتل کیا گیا کہ شاید توپ اور ٹینک کے گولوں اور فائیٹر جہازوں کی طرف سے ہونے والی آگ کی برسات بھی ہمیں اس درجہ نقصان نہیں پہنچا پاتی: ''فیا اسفاہ ویا عجباہ!''

ادھر بیس سے پچیس سال کے درمیان ابلاغ کے ایسے ذرائع عام ہوئے، جن کو ''سوشل میڈیا'' کہا جاتا ہے، اس کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس پر اب تک حکومت یا کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے، خدا کرے یہ صورتِ حال باقی رہے، اس میں خاصا تنوع بھی ہے، جس میں واٹس اپ، فیس بک، یوٹیوب، ٹیوٹر، اسکائپ وغیرہ شامل ہیں؛ لیکن یہ ایک بہتا ہوا سمندر ہے، جس میں ہیرے اور موتی بھی ڈالے جاسکتے ہیں اور خس وخاشاک بھی، اس میں صاف شفاف پانی بھی اُنڈیلا جاسکتا ہے اور گندہ بدبودار فضلہ بھی، اس سے دینی، اخلاقی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے مفید چیزیں بھی پہنچائی جاسکتی ہیں اور انسانی واخلاقی اقدار کو تباہ کرنے والی چیزیں بھی، دوسری طرف اس کا اثر اتنا وسیع ہو چکا ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کا نفوذ اس درجہ کا ہے کہ اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے؛ اس لیے اگرچہ بہت سے لوگوں نے خلوص اور بہتر جذبہ کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کی؛ لیکن بالآخر انہیں اس کی سرکش موجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا

ہی پڑا؛ اس لیے اب ہمیں اس ذریعہ ابلاغ کے مثبت اور منفی اور مفید ونقصان دہ پہلو کا تجزیہ کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں تمام مسلمانوں اور خاص کر ملت کی نوجوان نسل کی رہنمائی کرنی چاہیے۔

☆ سوشل میڈیا کے جو منفی اور نقصان دہ پہلو ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) یہ جھوٹی خبریں پھیلانے کا ایک بڑا انیٹ ورک بن گیا ہے اور اکثر بہت سی باتیں کسی تحقیق کے بغیر اس میں ڈال دی جاتی ہیں؛ کیوں کہ اس پر حکومت یا کسی ذمہ دار ادارہ کی گرفت نہیں ہے، جب کہ اسلام نے ہمیں جھوٹ تو جھوٹ؛ ہر سنی ہوئی بات نقل کر دینے اور بلا تحقیق کسی بات کو آگے بڑھانے سے بھی منع کیا ہے۔ (حجرات:٦)

(۲) عام جھوٹی خبروں کے علاوہ یہ لوگوں کی غیبت کرنے، ان کی کوتاہیوں کو طشت از بام کرنے، یہاں تک کہ لوگوں پر بہتان تراشی اور تہمت اندازی کے لیے بھی وسیلہ بن گیا ہے اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب کسی اچھے آدمی کے بارے میں کوئی بُری بات کہی جائے، خواہ وہ بات کتنی ہی نا قابل اعتبار ہو تو لوگ اس کا آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے ہیں، جس کی کھلی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت کا واقعہ ہے، جو خود عہد نبوی میں پیش آیا اور بعض سادہ لوح مسلمان بھی منافقین کے اس سازشی پروپیگنڈہ سے متأثر ہو گئے۔

(۳) اس ذریعہ ابلاغ کو نفرت کی آگ لگانے اور تفرقہ پیدا کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کیا جاتا ہے، فرقہ پرست عناصر تو یہ حرکت کرتے ہی ہیں؛ لیکن خود مسلمانوں کے درمیان مسلکی اختلافات کو بڑھاوا دینے میں اس کا بڑا اہم رول رہا ہے، اس میڈیا پر مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے انسانیت دشمن جذباتی مقررین کی تقریریں بھی موجود ہیں اور مسلمانوں کے مختلف مسالک کے درمیان مناظروں کی شرم ناک محفلیں بھی! جو بہت تیزی سے باہمی نفرت کو جنم دیتی اور فساد کی آگ بھڑکاتی ہیں۔

(۴) اس میڈیا کا دہشت گردی اور تشدد کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے اور

استعمال کرنے والوں میں مختلف مذاہب کے خودساختہ نمائندے شامل ہیں، جنھوں نے لوگوں کی نگاہوں میں دُھول جھونکنے کے لیے مذہب کا مقدس لباس پہن رکھا ہے۔

(۵) اس ذریعہ ابلاغ کا سب سے منفی پہلو ''فحشاء'' کی اشاعت اور بے حیائی کی تبلیغ ہے، جو چیز انسان کو اپنے خلوت کدہ میں گوارہ نہیں ہوسکتی، وہ یہاں ہر عام وخاص کے سامنے ہے، یہ اخلاقی اقدار کے لیے تباہ کن اور شرم وحیاء کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں اور افسوس کہ حکومتیں ایسی سائٹوں کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتیں، ورنہ سماج بے حیائی کے اس سیلابِ بلاخیز سے بچ سکتا تھا۔

☆ ان منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے بہت سے مثبت اور مفید پہلو بھی ہیں اور اس کا صحیح استعمال کرکے اسلامی اور انسانی نقطۂ نظر سے بہت سے اچھے کام کیے جاسکتے ہیں، جن کا تذکرہ مناسب ہوگا:

(۱) بچوں، جوانوں، عورتوں، بوڑھوں اور عام مسلمانوں میں ان کی ضرورت کے لحاظ سے دین کی تعلیم واشاعت اور اخلاقی تربیت کے لیے اس کو آسانی کے ساتھ بہت مؤثر طریقہ پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۲) اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں اور زیادہ تر اسی راستہ سے کی جاتی ہیں، اسی میڈیا سے ان کا مؤثر طور پر رَدّ کیا جاسکتا ہے۔

(۳) تعلیم کے لیے اب یہ ایک مؤثر ذریعہ بن چکا ہے اور جیسے ایک طالب علم کلاس روم میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتا ہے یا اپنے ٹیوٹر کے سامنے بیٹھ کر کلاس روم کی کمی کو پورا کرتا ہے؛ اسی طرح وہ اس ذریعہ ابلاغ سے بھی علم حاصل کرسکتا اور اپنی صلاحیت کو پروان چڑھا سکتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی کوردہ دیہات میں بیٹھے ہوئے طالب علم کے لیے بھی اس کے ذریعہ مشرق ومغرب کے ماہر ترین اساتذہ سے کسبِ فیض کرنا ممکن ہے، ایسے تعلیمی مفادات کے لیے اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

(۴) صحت وعلاج کے شعبہ میں بھی اس سے مدد لی جاسکتی ہے؛ بلکہ لی جارہی ہے،

اس کے ذریعہ ماہر ترین معالجین سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ایک ملک میں ایک ڈاکٹر آپریشن کرتے ہوئے کسی دوسرے ملک کے کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے مستفید ہوسکتا ہے۔

(۵) موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا نیز نیشنل اور انٹرنیشنل الیکٹرانک میڈیا جھوٹی خبریں بنانے اور پھیلانے، نیز سچی خبروں کو دبانے اور چھپانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے میں لگا ہوا ہے اور نہایت مہارت کے ساتھ مظلوم کو ظالم اور ظالم کو مظلوم بنا کر پیش کر رہا ہے، ان حالات میں سوشل میڈیا کے ذریعہ سچائی کو پیش کرنے اور جھوٹ کی قلعی کھولنے کی اہم خدمت انجام دی جاسکتی ہے؛ چناں چہ عالمی وملکی سطح پر کئی واقعات ایسے ہیں، جن میں سوشل میڈیا کی حقیقت بیانی نے ظالموں اور دروغ گویوں کو شرمندہ کیا ہے۔

☆ ضرورت اس بات کی ہے کہ سوشل میڈیا کا اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کی مضرتوں سے نئی نسل کو بچایا جائے؛ کیوں کہ جن چیزوں میں نفع اور نقصان دونوں پہلو ہوں اور اس ذریعہ کو بالکل ختم کر دینا ممکن نہ ہو تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے لیے یہی حکم ہے کہ اس کو مفید طریقہ پر استعمال کیا جائے اور نقصان دہ پہلوؤں سے بچا جائے، جس چاقو سے کسی جانور کو حلال طریقہ پر ذبح کیا جاسکتا ہے اور کسی بیمار کو نشتر لگایا جاسکتا ہے، وہی چاقو کسی بے قصور کے سینہ میں پیوست بھی کیا جاسکتا ہے، تو ہمارے لیے یہی راستہ ہے کہ ہم چاقو کے صحیح استعمال کی تربیت کریں۔

اس پہلو سے سوشل میڈیا میں جن باتوں سے نئی نسل کو بچانے کی ضرورت ہے، ان میں چند اہم نکات یہ ہیں:

(۱) چھوٹے بچوں کو جہاں تک ممکن ہو، اس سے دُور رکھا جائے؛ تا کہ ان کی پہنچ ایسی تصویروں تک نہ ہو جائے، جو ان کے ذہن کو پراگندہ کر دے یا قتل وظلم کے مناظر دیکھ کر ان میں مجرمانہ سوچ پیدا ہو جائے۔

(۲) طلبہ وطالبات اور نوجوانوں کو تعلیمی اور تعمیری مقاصد کے لیے ایک مختصر وقت ان ذرائع سے استفادہ کے لیے مخصوص کر لینا چاہیے؛ کیوں کہ اس کا بہت زیادہ استعمال

انسان کو وقت ضائع کرنے کا عادی بنا دیتا ہے اور پیغامات کی تسلسل کی وجہ سے وہ بعض اچھی چیزوں کو بھی اتنی دیر تک دیکھنے کا خوگر ہو جاتا ہے کہ اصل کام سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے، یہ بھی ایک طرح کا لہو ولعب ہے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ صحت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت نقصان دہ ہے۔

(۳) جو عمل عام حالات میں جائز نہیں ہے، وہ ان ذرائع کے ذریعہ بھی جائز نہیں ہے، جیسے: جھوٹ، بہتان تراشی، لوگوں کی کوتاہیوں کو طشت ازبام کرنا، مذاق اُڑانا، سب وشتم کے الفاظ لکھنا یا کہنا، یہ سب کبیرہ گناہ ہیں اور ان سے بچنا شرعی فریضہ ہے۔

(۴) ایسی خبریں لکھنا یا ان کو آگے بڑھانا جن سے اختلاف بڑھ سکتا ہے، جائز نہیں ہے، اگرچہ کہ وہ سچائی پر مبنی ہوں؛ اس لیے کہ جو سچ مسلمانوں کے دلوں کو پارہ پارہ کرتا ہو اور انسان اور انسان کے درمیان نفرت کی بیج بوتا ہو، اس سے وہ جھوٹ بہتر ہے، جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور اختلاف کو اتحاد سے بدلنے کا کردار ادا کر سکے۔

(۵) ایسی چیزیں دیکھنا، دِکھانا، لکھنا اور پڑھنا، سب کا سب حرام ہے، جو فحشاء اور بے حیائی کے دائرہ میں آتا ہو، خواہ وہ تصویر کی شکل میں ہو یا آواز کی، تحریر کی شکل میں ہو یا کارٹون کی، شعر کی شکل میں ہو یا لطیفہ کی، ان سے اپنی حفاظت کرنا اس دور میں نوجوانوں کے لیے بہت بڑا جہاد اور ایک عظیم عبادت ہے۔

(۶) سوشل میڈیا پر اسلام اور پیغمبر اسلام، مسلمانوں کی تاریخ اور مقدس مقامات و شخصیات کے بارے میں ایسی نازیبا باتیں بھی آجاتی ہیں، جو بجا طور پر نوجوان تو کیا ہر مسلمان کے خون کو گرما دینے اور دل کو کھولا دینے کے لیے کافی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ہمیں صبر، سنجیدگی اور متانت سے کام لینا چاہیے اور ایسے جذباتی رَدّ عمل کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، جو نفرت کو بڑھانے والا ہو، اگر ناشائستہ باتوں پر اس طرح کے کومنٹ (Comment) کیے گئے تو جو لوگ اسلام، امن اور انسانیت کے دشمن ہیں، ان کا مقصد پورا ہو جائے گا، اس کی بجائے علم کی روشنی میں مدلل اور سنجیدہ طریقہ پر ان کا جواب دینا اور ان کی بات پر ریمارک کرنا

چاہیے؛ کیوں کہ جذبات واشتعال سے وہ لوگ کام لیتے ہیں، جن کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی، جن کے پاس دلیل کا ہتھیار موجود ہو، ان کو بے برداشت ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۷) نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو ایسی سائٹوں سے دُور رہنا چاہیے، جن کا تعلق دہشت گردوں جیسے ''داعش'' وغیرہ سے ہے، ان کے قریب بھی جانے سے بچنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ چیز غلط راستہ پر لے جاتی ہے یا کم سے کم شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہے؛ اس لیے نوجوانوں کو تہمت کے ان مواقع سے دُور رہنا چاہیے اور کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، جو ان کو غلط راستہ پر ڈال دے یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا راستہ کھول دے؛ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی بھی قسم کی اقدامی یا جوابی دہشت گردی کو پسند نہیں کرتا؛ کیوں کہ اس میں بے قصور لوگوں کی موت ہو جاتی ہے، اسلام تو امن وانسانیت، عفو ودرگذر اور محبت و بھائی چارہ کا پیغامبر ہے نہ کہ نفرت اور ظلم کا سوداگر:

میرا پیغام، محبت ہے جہاں تک پہنچے!

مسلمانوں کے لیے لائحۂ عمل

ملک اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہے، نفرت کی چنگاری اب آتش فشاں بن چکی ہے، اس ملک کی خمیر میں محبت، بھائی چارہ، امن وآشتی، مروّت ورواداری، اخلاقی اقدار کی پاس داری، مذہبی مقدسات کا احترام اور مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان اتحاد وہم آہنگی کی کیفیت تھی اور محبت کی خوش بو اس ملے جلے سماج کو ہمیشہ عطر بار رکھتی تھی؛ لیکن اب صورتِ حال بہت کچھ تبدیل ہوتی جارہی ہے، اس پس منظر میں مسلمانوں کو دو اہم محاذ پر کام کرنا ہے، ایک: اپنی دینی شناخت کو بچانے کا، دوسرے: ملک کی جمہوری قدروں کی حفاظت کا، پہلا کام دین سے محبت کا تقاضہ ہے اور دوسرا وطن سے محبت کا، ان حالات میں ہمیں ایک ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا چاہیے، جو ان دونوں تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

غور کیا جائے تو اس وقت بنیادی طور پر تین باتیں اس سلسلہ میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھا جائے، ایک طرف جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو شکوک وشبہات سے بچایا جائے، دوسری طرف عام مسلمانوں کے اندر پُرمشقت حالات میں بھی دین پر ثابت قدم رہنے کا جذبہ پیدا کیا جائے، صورتِ حال یہ ہے کہ عالمی وملکی سطح پر ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف شکوک وشبہات کے کانٹے بونے میں سرگرم ہیں، اور شب وروز اس کی کوششیں کی جارہی ہیں، اس کے نتیجہ میں کہیں انکار والحاد کی طرف قدم بڑھ رہا ہے، قانون شریعت کو قابل اصلاح قرار دیا جارہا ہے، شریعت کے مسلمہ احکام میں بھی تبدیلی کی باتیں کی جارہی ہیں، بعض مسلمانوں میں بھی یہ سوچ پیدا ہورہی ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، گزشتہ دنوں شریعت کے عائلی قانون کے تحفظ کے سلسلہ میں جو دستخطی مہم شروع کی گئی، تو جہاں بیشتر مسلمانوں نے جوش وخروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا، وہیں کچھ ایسے مرد وعورت بھی پائے گئے جنھوں نے دین وشریعت پر شکوک و شبہات کی اُنگلی اٹھائی اور تعدد ازدواج کے جواز، مرد کو دیئے گئے حق طلاق اور بیٹوں اور

بیٹیوں کے حق میراث جیسے موضوعات کو نعوذ باللہ نا منصفانہ قرار دیا، اسی ذہنی اِرتداد کی مثال مسلم پرسنل لا کے خلاف عدالت عظمیٰ میں داخل ہونے والی ایک درجن سے زیادہ نام نہاد مسلم خواتین کی درخواستیں ہیں، اگرچہ کئی دہائیوں سے کچھ خدا بےزار لوگوں کی طرف سے ایسی آوازیں اٹھائی جارہی تھیں؛ لیکن اسلام دشمن فرقہ پرست طاقتوں کو پہلی بار اس کا موقع ملا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر خود مسلم سماج کی طرف سے اس طرح کی نامسعود آواز بلند کی گئی ہے۔

دوسری طرف ذرائع ابلاغ اور نصابی کتابوں کے ذریعہ دیو مالائی کہانیوں کا تقدس ذہنوں میں بٹھایا جارہا ہے، معصوم بچوں سے برادرانِ وطن کی کتابوں کے اشلوک پڑھائے جارہے ہیں، مشرکانہ ترانے رائج کیے جارہے ہیں، ایسے نعرے لگوائے جاتے ہیں، جو مخالف اسلام تصور پر مبنی ہیں، جو چیز بار بار جبر کے ذریعہ کرائی جاتی ہے، وہ بھی آہستہ آہستہ ذہن کے لیے قابل قبول ہونے لگتی ہے، انسان اس کے جواز کے راستے ڈھونڈھنے لگتا ہے، اور بالآخر اختیار اور رضامندی کے ساتھ اسے قبول کرلیتا ہے، یہ ایک ایسا فکری اِرتداد ہے، جو دبے پاؤں مسلم سماج میں داخل ہوا تھا اور اب اس کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے، یہ اعلانیہ دعوت ارتداد تو نہیں ہے، لیکن مسلمانوں میں ارتداد پیدا کرنے کی ایسی کوشش ہے کہ ان کی اگلی نسلیں ہنسی خوشی اس کو قبول کرلیں۔

ان حالات میں ایک طرف پورے شعور کے ساتھ دلیل اور عقل وحکمت کے ہتھیار کے ذریعہ شکوک وشبہات کے ان کانٹوں کو نکالنے کی ضرورت ہے، جو دلوں میں گھر کرتے جارہے ہیں اور جن کے ایک وبائی مرض کی طرح پھیل جانے کا اندیشہ ہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کو آزمائشوں کے باوجود دین پر استقامت اور ثابت قدمی کی اہمیت بتانے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون“ (آل عمران: ۲۰۰)

یہاں ”صبر“ کے معنی دین کے راستہ میں ہونے والی تکلیفوں کو برداشت کرنے اور

"صــابــروا" سے مخالف اسلام طاقتوں سے مقاومت اور حکمت کے ساتھ ان کا مقابلہ اور "رابـطـوا" سے اسلامی مملکت اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے معنی مراد لیے گئے ہیں، چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کا تعلق صرف جہاد سے نہیں ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی تھی:

"لـم یـکـن فـی زمان النبی غزوۃ یرابط فیه" (الـدر الـمنثور بحواله المستدرک للحاکم ۲/۴۱۶)

اور علامہ ابن ابی حاتم سے اس آیت کی تفسیر مروی ہے:

"امـرهم ان یصبروا علی دینهم ولا یدعوه لشدة ولا رخاء ولا سراء ولا ضراء وامرهم ان یصابروا الکفار وان یرابطوا المشرکین" (حوالہ سابق)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے دین پر عمل کرنے کے لیے صبر و برداشت کا مظاہرہ کریں، حالات کی سختی و نرمی، راحت یا تکلیف کی وجہ سے دین کو چھوڑ نہ دیں، مخالفین اسلام کا (مناسب طور پر) مقابلہ کریں اور ان کے مقابلہ میں جمے رہیں۔

نیز بیہقی نے زید بن اسلم سے "رابـطـوا" کی تشریح نقل کی ہے: **"رابـطـوا عـلـی دیــنــکـــم"** (حوالہ سابق) یعنی اپنی دینی سرحدوں کی حفاظت کرو، اس سے معلوم ہوا کہ "ربـــاط" جس کے ایک دن کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا و مافیہا سے بہتر قرار دیا ہے:

"رباط یوم فی سبیل الله خیر من الدنیا وما علیها" (صحیح بخاری ۳/۲۲۴، **کتاب الجهاد والسیر**) اس سے اَصلاً اور اَوّلاً اِسلامی مملکت کی زمینی سرحدوں کی حفاظت تو مراد ہے ہی، مگر اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت بھی اس میں شامل ہے؛ مفہوم میں اس عموم کی تائید لغت سے بھی ہوتی ہے؛ چناں چہ اہل لغت نے "مـرابـطـه" کے معنی کسی چیز پر ایسی گرہ باندھنے کے بیان کیے ہیں جو کھلنے نہ پائے، **"الـمـرابـطة عـنـد الـعـرب: الـعقد علی الشئی حتی لا ینحل"** (تفسیر قرطبی ۱۰/۳۲۷)

اس پس منظر میں ضروری ہے کہ ایک طرف علماء اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار کریں کہ اسلام کے خلاف پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات کا عصر حاضر کے اسلوب اور طرز استدلال کے مطابق جواب دیں اور غلط فہمیوں کو دور کریں، دوسری طرف امت کو سمجھائیں کہ دین حق پر استقامت کے لیے انبیاء، صحابہ اور سلف صالحین نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے کانٹوں کے بستر پر چلنا اور آگ کے دریا میں تیرنا گوارہ کیا؛ لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی کہ مسلمان وہی ہے جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کرنے پر تیار ہو۔

ایک اہم اور قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں مسلمانوں کی تاریخ پر متواتر حملے کیے جا رہے ہیں، فلموں کے ذریعہ، نیشنل اور سوشل میڈیا کے ذریعہ، لٹریچر اور نصابی کتابوں کے ذریعہ، اشتعال انگیز تقریروں اور سمیناروں میں پیش کیے جانے والی بے بنیاد تحریروں کے ذریعہ، پوری قوت کے ساتھ یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کا عہد حکومت اس ملک میں صرف ظلم و بربریت اور دوسری قوموں کے ساتھ جبر وظلم کی ایک طویل داستان ہے، جس میں نہ ان کی جان و مال محفوظ تھی، نہ عزت وآبرو، یہاں تک کہ آریوں کو اس ملک کا اصل باشندہ قرار دیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو بدیشی، بودھوں پر برہمنوں نے جو مظالم ڈھائے، وہ تاریخ کی ایک روشن حقیقت ہے، یہاں تک کہ ان کی بعض مقدس عبادت گاہیں آج بھی ہندوؤں کے زیر تصرف ہیں، اسی طرح شودروں پر ہزاروں سال سے جور وستم روا رکھا گیا ہے اور آج بھی جاری ہے، ان سب کو تاریخ کی سچائیوں کی خاکستر میں دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس کا اثر ایک طرف ہندو ہم وطنوں میں نفرت کی شکل میں اور دوسری طرف خود مسلمانوں کی نئی نسل میں احساس کمتری کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، اس کا ایک پہلو تو سیاسی ہے جو ملی تنظیموں کے کرنے کا ہے، لیکن دوسرا علمی وفکری ہے، جس کی طرف علماء اور اسکالرز کو توجہ دینے کی ضرورت ہے، ماضی قریب میں علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سیّد سلیمان ندویؒ، ڈاکٹر محمد

حمید اللہؒ، سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن صاحبؒ وغیرہ ایسی شخصیات گزری ہیں، جنہوں نے تاریخ کے غبار آلود چہرے کو صاف کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، آج پھر ضرورت ہے کہ علماء اس کی طرف توجہ کریں؛ کیوں کہ مسلم عہد کی تاریخ فارسی کتابوں کے دفینوں میں محفوظ ہے، جس کو علماء ہی باہر لا سکتے ہیں اور اس نفرت انگیز پروپیگنڈے کا جواب دے سکتے ہیں، جس میں تاریخ کو از سر نو لکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، تاریخ کی اہمیت اور اس کے گہرے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مشہور عرب عالم شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے:

”والتاریخ لیس علم الماضی بل ھو علم الحاضر، و المستقبل فی واقع الامر و حقیقته، فالامة التی تستطیع البقاء، ھی الامة التی لھا ضمیر تاریخی، و معرفة التاریخ وعشق له“

افسوس کہ اس اہم ضرورت کی طرف سے مسلمان عمومی طور پر غفلت میں مبتلا ہیں، لیکن حالات کا تقاضہ ہے کہ اب علماء اس فراموش کردہ گوشہ کی طرف بھی توجہ دیں۔

اگر ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں غور کیا جائے تو اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کا تحفظ ہے، تحفظ کی ایک مادی تدبیر ہے، جو ہر انسان انفرادی حیثیت سے اور ہر گروہ اجتماعی طریقہ پر روبہ عمل لاتا ہے اور یقیناً ہمیں اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے، یہ ہمارا شرعی فریضہ اور قانونی حق ہے، لیکن تحفظ کا ایک غیبی نظام بھی ہے، جس کا خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں ذکر فرمایا ہے، چناں چہ ارشاد ہے:

”یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالته والله یعصِمک من الناس، ان الله لا یھدی القوم الکافرین“
(سورۃ مائدہ: ٦٧)

”عصمت من الناس“ سے مراد اعداء اسلام سے حفاظت ہے، چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا تھا اور حضرت ابو طالب روزانہ بنو ہاشم کے کچھ لوگوں کو اس کام پر مامور فرماتے تھے، جب یہ

آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنات اور انسان سے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے؛ اس لیے اب کسی پہرہ دار کی ضرورت نہیں ہے (**المعجم الکبیر للطبرانی ۲۵۶/۱۱**، حدیث: ۱۱۶۶۳) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے کہ آپ کی قیام گاہ پر پہرہ دیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد قبہ سے سر مبارک نکالا اور ارشاد فرمایا: ''تم لوگ واپس ہو جاؤ، اللہ نے خود میری حفاظت فرمائی ہے'' (ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، حدیث: ۳۰۴۶)

یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ اللہ کی طرف سے نازل کیے جانے والے دین کی طرف ہدایت سے محروم لوگوں کو دعوت دینے پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی تحفظ کا وعدہ ہے اور اللہ کی حفاظت سے بڑھ کر کس کی حفاظت ہو سکتی ہے؟

جیسا کہ معلوم ہے کہ بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند سال تک اسلام کی عمومی دعوت نہیں دی، پھر حکم ربانی ہوا:

''فاصدع بما تؤمر وأعرض عن المشركين انا كفيناك المستهزئين'' (حجر: ۹۴-۹۵)

آپ کو جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اسے صاف سنا دیجیے اور مشرکین کی پروا نہ کیجیے، ہم آپ کے لیے تمسخر کرنے والوں کے مقابلہ میں کافی ہیں۔

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک: اعلانیہ دعوت دین کی، دوسرے: مشرکین سے اعراض اور الجھاؤ سے بچنے کی، یعنی جن لوگوں میں دعوت حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو، ان پر مسلسل دعوتی محنت کی جائے اور جو اپنے باطل نقطۂ نظر پر بضد ہوں اور کسی طرح دعوتِ حق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوں تو ان کے ساتھ اعراض اور گریز کا طریقہ اختیار کیا جائے، ان کے ساتھ الجھ کر وقت ضائع نہ کیا جائے، تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اگر دونوں باتوں پر عمل ہو تو جو لوگ دین اور اہل دین کا مذاق اڑاتے ہیں، خواہ یہ مذاق زبان سے ہو یا قلم سے، اور دوبدو ہو یا ذرائع ابلاغ کے ذریعہ، ان کے استہزاء

کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کافی ہیں، اللہ تعالیٰ داعیانِ حق کی مدد فرمائیں گے اور اہل باطل کی بے جا اور جھوٹ پر مبنی کوششوں کو پاش پاش کر دیں گے۔

یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام کو ظاہر کرتی ہیں کہ جب مسلمان دعوت حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے، تحفظ غیبی کی ڈھال انہیں دشمنوں کی تلوار سے بچاتی ہیں اور اہل ایمان کے خلاف کیا جانے والا شور شرابہ بالآخر دم توڑ دیتا ہے، یا تو اعداء اسلام کو ایمان کی توفیق میسر آجاتی ہے اور کعبہ کو بت خانوں سے پاسبان مل جاتے ہیں، یا پھر قدرت کا دست غضب انہیں دبوچ لیتا ہے۔

اسلام کی کشش اور اس کی قوتِ تسخیر ایک ایسی حقیقت ہے جس نے تاریخ کے ہر دور میں اپنا جلوہ دکھایا ہے، مسلمانوں نے اگرچہ مصر کو فتح کیا؛ لیکن مصر کے عیسائیوں نے کسی جبر و دباؤ کے بغیر دامن اسلام میں آنا قبول کیا، چنگیز خاں نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، ان کو پڑھ کر اور سن کر آج بھی آنکھوں کو حق ہے کہ خون کے آنسو روئیں، اور اس کی نسلوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ تاتاری سپاہیوں اور کمانڈروں میں مسلمانوں کے سروں کے بلند مینار بنانے کا مقابلہ ہوتا تھا؛ لیکن آخر تاتاریوں کی مختلف شاخوں نے اسلام قبول کرلیا، ان ہی میں وہ مغل خاندان بھی ہے، جس نے کم و بیش چار سو سال ہندوستان پر پُر شوکت حکومت کی اور اگرچہ دعوت کا زیادہ کام صوفیہ کے ذریعہ ہوا، لیکن انہیں ان حکومتوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی رہی، دو سو سال تک سلجوقی ترکوں کی حکومت رہی اور پانچ سو سال سے زیادہ دنیا کے نقشہ پر عثمانی خلافت سپر پاور کی حیثیت سے باقی رہی، جس کے نام سے مغرب کے ایوان ہائے اقتدار میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا، یہ سب تاتاریوں ہی کی مختلف شاخیں تھیں، سقوط اندلس کے بعد الجزائر میں وحشی بربری قبائل دامن ایمان میں آئے، یہ سب دعوتی کوششوں کا ثمرہ تھا، دعوتی جدوجہد ہی کے ذریعہ انڈونیشیا میں اسلام پھیلا، راجپوتوں کی سنگلاخ زمین میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے ایمان کا پودا لگایا، شیخ فرید الدین شکر گنج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سولہ برادریوں نے مکمل طور پر ان کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا، شیخ جلال الدینؒ نے بنگال

میں ایمان کا چراغ جلایا اور انیسویں صدی میں مولانا کرامت علی جونپوریؒ نے موجودہ بنگلہ دیش میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دی، کہا جاتا ہے کہ ان کی کوششوں سے ایک تا دو کروڑ لوگ مسلمان ہوئے، پورا کشمیر سید علی ہمدانیؒ کے دست فیض پر مشرف بہ اسلام ہوا اور مغربی ہندوستان کے بڑے علاقہ میں شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوئی۔

غرض کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین فطرت ہے؛ اس لیے اس میں ایسی کشش ہے کہ وہ سخت سے سخت دشمن کو بھی اپنا اسیر محبت بنالیتا ہے، اسلام کی اشاعت فاتحین کے ذریعہ نہیں ہوئی؛ بلکہ مبلغین کے ذریعہ ہوئی ہے، تاریخ ادبیات عرب کے مصنف پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے۔''

نیز دعوت اسلام کے مشہور مؤرّخ ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا بیان ہے:

''اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے بعض انتہائی شان دار اور روحانی فتوحات حاصل کی ہیں، دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیئے تھے، گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی ترکوں نے اور تیرہویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔''

اس طویل سمع خراشی کا مقصد یہ ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں سے وطن عزیز میں ہم لوگوں نے دعوت دین کی کوئی منظّم اور مربوط کوشش نہیں کی ہے، ورنہ اس ملک کا جغرافیہ بالکل مختلف ہوتا؛ لیکن اب بھی وقت نہیں گیا ہے، اسلام کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اگر مسلمان اس کام کو لے کر اٹھیں تو کامیابی ان کے قدم چومتی ہے اور اس طرح اللہ تعالی کے غیبی نظام کے مطابق اس امت کے تحفظ کا سروسامان ہوسکتا ہے۔

ضرورت ہے خود احتسابی کی!

درخت جب اندر سے کھوکھلا ہو کر سوکھ جائے تو اس کو گرانے میں نہ دیر لگتی ہے اور نہ دشواری پیش آتی ہے۔ درخت کاٹنے والا بہت آسانی سے اور کم وقت میں اس کو کاٹ دیتا ہے؛ بلکہ جڑیں تک اکھیڑ دیتا ہے، یہی حال قوموں اور گروہوں کا ہے، جو قوم خود اپنے نظریہ پر عمل نہیں کرتی، جو گروہ خود اپنے اصول پر عمل پیرا نہیں ہوتا، جس کے قول وفعل میں کھلا ہوا تضاد ہوتا ہے، جو الفاظ کے دریا تو بہا سکتا ہے؛ لیکن عملی دنیا میں اس کی بساط ایک قطرہ سے زیادہ نہیں ہوتی، وہ قوم اپنی بقاء کی لڑائی نہیں لڑ سکتی اور نہ اپنے چابک دست دشمن کا مقابلہ کرسکتی ہے، قرآن مجید نے یہودیوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے یہی بات کہی ہے کہ ان کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہے۔

اس وقت مسلمان اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ دشمنوں کی دشمنی کا رونا روتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا رونا رویا جائے، جن لوگوں کو آپ کی فکر، آپ کے عقیدہ، آپ کے طرزِ زندگی، آپ کی تہذیب وثقافت، آپ کے تاریخی ورثہ؛ یہاں تک کہ آپ کے وجود اور آپ کے نام سے بھی نفرت ہے، ان سے اس بات کے سوا اور کس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے: ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ آپ کے دین کا تحفظ کریں گے اور آپ کی شریعت کو محفوظ رکھیں گے، ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آگ سے پیاس بجھانے کی اور برف سے ایندھن کے کام آنے کی توقع رکھے؛ اس لیے ہندوستان کے موجودہ حالات میں ضرورت ہے کہ جہاں ہم عوامی رائے عامہ کے ذریعہ پُرامن احتجاج کریں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان پوری جرأت اور اعترافِ حقیقت کے ساتھ آپ اپنا محاسبہ کریں اور اپنے طرزِ عمل میں ایک بنیادی تبدیلی لائیں۔

اس وقت حکومت سے ہم جن مسائل میں نبرد آزما ہیں، اس کے بارے میں ہم خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہمارا یہ رویہ کس حد تک دین کے مطابق ہے؟

اس وقت ایک پیچیدہ اور نازک مسئلہ بابری مسجد کا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ مسجد

تھی، مسجد ہے اور یہ شرعاً ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، نیز بجا طور پر حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ اس مقدمہ کا خود ساختہ عقیدہ اور آستھا کے نقطۂ نظر سے نہیں؛ بلکہ ملکیت کے لحاظ سے اس کا جائزہ لیا جائے، ہمارا یہ دعویٰ سو فی صد درست ہے؛ لیکن غور کیجیے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اوقاف کی جتنی جائیداد پر حکومت اور ہمارے غیر مسلم بھائی قابض ہیں، اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ اوقاف کی جائیداد کے بڑے حصہ کو ان کے متولیوں نے بیچ دیا ہے، خود مسلمان وقف کی جائیداد پر قابض ہیں، جس عمارت کا کرایہ پانچ، دس ہزار روپئے ہونا چاہیے، خود مسلمان اس کا کرایہ پچاس اور سو روپئے ادا کرتے ہیں، یہاں تک کہ مسجدوں کے املاک پر بھی مسلمانوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم خود تو اوقاف میں بے جا تصرف کریں اور اپنی ذاتی املاک کی طرح اس میں تصرف کریں اور حکومت سے اس بات کی توقع رکھیں کہ وہ ہمارے اوقاف کی اور ہماری مسجدوں اور قبرستانوں کی حفاظت کرے گی۔

اسلام نے نکاح کو بہت آسان رکھا ہے، مسلمان عید، بقرعید میں جتنا خرچ کرتے ہیں، نکاح میں اتنا خرچ کرنا بھی ضروری نہیں، صرف ایجاب وقبول سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے، جس میں نہ کوئی کرایہ خرچ ہوتا ہے اور نہ سجاوٹ کی گنجائش ہوتی ہے، نکاح کے ساتھ صرف ایک دعوت، ''دعوتِ ولیمہ'' رکھی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سب سے قیمتی ولیمہ فرمایا وہ اس طور پر کہ ایک بکرا ذبح کیا؛ البتہ نکاح میں ایک لازمی ذمہ داری مہر کی ہے اور اس کو عقد کے وقت ہی ادا کر دینا مسنون ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ برادرانِ وطن کا اثر قبول کرتے ہوئے نکاح کو نہایت ہی مشکل عمل بنا دیا گیا ہے، جس میں بعض اوقات لڑکی والے اپنا گھر تک بیچ دیتے ہیں، لڑکی والوں پر جہیز کا بارگراں تو ہے ہی، ایک بڑی نقد رقم کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے، فنکشن ہال اور کھانے کے مینو تک کی تعیین ہوتی ہے اور یہ سارا بوجھ لڑکی والوں کے سر ڈالا جاتا ہے، دوسری طرف مہر ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کی نوبت آئی تب مہر ادا کیا

جائے گا، اس طرح اسلام کا تصور نکاح مسخ ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں امت کی لاکھوں بیٹیاں سسک سسک کر تجرد کی زندگی گزار رہی ہیں، اس غیر اسلامی اور غیر اخلاقی عمل پر ہمیں حکومت یا قانون نے مجبور نہیں کیا ہے؛ بلکہ یہ ہمارا اپنا بگاڑ ہے۔

شریعت کے خاندانی زندگی سے متعلق قوانین میں مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی گئی ہے، یہ گنجائش اس لیے؛ کہ معاشرہ میں اخلاقی پاکیزگی اور صفائی ستھرائی باقی رہے، بہت سی دفعہ یہ اجازت ایک سماجی ضرورت بھی بن جاتی ہے؛ لیکن قرآن نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ شوہر دونوں بیویوں کے درمیان عدل سے کام لے، اگر وہ عدل قائم نہ کر سکے تو اس کے لیے دوسرا نکاح کرنے کی گنجائش نہیں ''**وَ اِن لم تعدلوا فواحدة**'' کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دوسری شادی کے جو واقعات پیش آتے ہیں، ان میں نوے فی صد واقعات میں دوسرا نکاح کسی ضرورت اور سنجیدہ جذبے کے ساتھ نہیں کیا جاتا؛ بلکہ پہلی بیوی کو تکلیف پہنچانے کے لیے انتقامی جذبہ سے کیا جاتا ہے اور انصاف کی شرط کو اس طرح بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے کہ ایک بیوی کے ساتھ تو محبوبہ اور معشوقہ کا معاملہ کیا جاتا ہے اور دوسری کو اس طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ نہ اسے بیوی کے حقوق ملتے ہیں اور نہ وہ شوہر کی زندگی سے آزاد ہوتی ہے، اس کو لٹکا کر رکھا جاتا ہے، اس طرزِ عمل سے اسلام کی بدنامی ہوتی ہے، لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ یہ ایک درست حکم کا غلط استعمال ہے؛ اس لیے وہ خود اسلام کو اس خدا ناترس شخص کی غلطی کا مجرم سمجھنے لگتے ہیں، حالاں کہ شریعت نے نہ صرف یہ کہ عدل کی شرط کے ساتھ دوسرے نکاح کی اجازت دی ہے؛ بلکہ اس بات کو بہتر قرار دیا گیا ہے کہ اگر ضرورت نہ ہو تو ایک ہی بیوی پر اکتفاء کیا جائے، ایک بیوی کی موجودگی میں بلاضرورت دوسرا نکاح کرنے سے گریز کیا جائے۔

نکاح کا رشتہ محبت وسکون کا رشتہ ہے؛ تاکہ شوہر و بیوی پُرسکون زندگی گزار سکیں، اسی رشتہ سے نسل انسانی کا بقاء اور خاندانی نظام کا استحکام متعلق ہے؛ اسی لیے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب ایک بار رشتہ نکاح قائم ہو جائے تو اسے استوار رکھا جائے اور حتی المقدور اس کو ٹوٹنے

سے بچایا جائے، شوہر کی طرف سے رشتہ نکاح کے ختم کر دینے کو طلاق کہتے ہیں اور بیوی کے مطالبہ پر شوہر کے رشتہ ختم کر دینے کو خلع، شریعت میں طلاق کو بھی ناپسند کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اس کو تمام جائز چیزوں میں سب سے مبغوض اور ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت پر بھی لعنت بھیجی ہے، جو کسی نامعقول سبب کے بغیر خلع کا مطالبہ کرے، پھر اگر طلاق دینی ہی پڑے تو ایک اور زیادہ سے زیادہ دو دفعہ دینی چاہیے، ایک ساتھ تین طلاقیں دینا سخت گناہ ہے، اس سے قطع نظر کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین شمار کی جائیں گی یا ایک؟ اس بات پر تمام ہی اہل علم متفق ہیں کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا گناہ ہے۔

لیکن مسلم سماج میں طلاق کے واقعات کا جائزہ لیا جائے تو نوے فی صد طلاق کے واقعات غصہ، وقتی رنجش یا شوہر کے رشتہ داروں کی طرف سے چڑھانے اور اُکسانے کی بنا پر پیش آتے ہیں، اور اس سے بھی بڑا ستم یہ ہے کہ بہت سے واقعات میں ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی جاتی ہیں، اسی طرح عورتوں کی طرف سے خلع کے مطالبات بعض دفعہ بہت ہی معمولی اسباب اور قوتِ برداشت کی کمی کی بنا پر کیے جاتے ہیں، مسلمانوں کا یہ عمل برادرانِ وطن کے درمیان اسلام کی غلط تصویر پیش کرتا ہے اور یہی تصویر ذریعہ ابلاغ کے ذریعہ پھیلائی جاتی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس میں ذرائع ابلاغ کی مبالغہ آمیزی کا بھی دخل ہوتا ہے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارا سماج ہی اس کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

شریعت اسلامی نے مرحومین کے ترکہ کی تقسیم کا ایک جامع، مربوط اور عادلانہ نظام پیش کیا ہے، اس میں کچھ رشتہ دار وہ ہیں جو ''اصحاب الفروض'' کہلاتے ہیں، یہ وہ حضرات ہیں جن کے حصے خود قرآن مجید میں پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ان میں بیٹوں کے ساتھ بیٹیاں بھی ہیں، شوہروں کی طرح بیویاں بھی ہیں اور اولاد کی طرح ماں باپ بھی ہیں؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اس تقسیم پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے، اکثر و بیشتر ماں باپ کے ترکہ پر بیٹے قبضہ کر لیتے ہیں، یعنی اپنی بہنوں کو ان کے حق سے محروم رکھتے ہیں، بعض دفعہ خود والدین کی بھی یہی سوچ ہوتی ہے کہ مکان، کاروبار اور زمین دار

گھرانوں میں زرعی اراضی پر بیٹیوں کو حق نہ دیا جائے، انہیں تھوڑا بہت نقد رقم دے کر کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کی شادیوں پر پہلے کافی اخراجات ہو چکے ہیں، اسی طرح مرنے والے کا پورا ترکہ لڑکے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، ماں باپ کا حصہ نہیں دیتے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ ماں کی پرورش کے لیے ہم لوگ کافی ہیں، اب انہیں ترکہ میں حصہ کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ اگر کوئی جواں سال یا ادھیڑ عمر شخص کا انتقال ہو گیا، اس نے بوڑھے والدین بھی چھوڑے اور جواں بیوی اور بچے بھی، تو بیوی بچے پورے ترکہ پر قابض ہو جاتے ہیں، اور وہ بوڑھے ماں باپ جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے ان کی پرورش کی تھی اور چھوٹے سے بڑا کیا تھا، ان کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یہ سب ظلم کی مختلف صورتیں ہیں، جو ہمارے سماج کا معمول بن چکی ہیں، اللہ تعالیٰ نے میراث کو بے جا تصرف سے روکنے کے لیے صراحت فرمائی ہے کہ یہ ”فریضة من اللّٰه“ ہے یعنی یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا حصہ ہے، یہ انسان کا مقرر کیا ہوا حصہ نہیں ہے کہ اس کو اس میں کمی بیشی کا اختیار ہو، اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہیں جو عورت کو حق میراث دیتا ہو، دنیا کے دوسرے قوانین نے بھی اسلام کے قانون میراث سے استفادہ کیا ہے؛ لیکن بجائے اس کے کہ ہم دوسروں کے لیے روشنی فراہم کرتے، ہم نے خود اپنی زندگی میں شریعت کا چراغ بجھا دیا ہے۔

اسلام نے تقسیم میراث کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار ترکہ کا مستحق نہیں ہوگا؛ اس لیے اگر مرنے والے کے بیٹے بھی موجود ہوں اور ایسے پوتے بھی جن کے والد دنیا سے گزر چکے ہیں تو چچاؤں کے مقابلہ میں باپ سے محروم پوتوں کو ترکہ میں حصہ نہیں ملے گا؛ لیکن شریعت نے ان کے لیے دوسرا راستہ کھلا رکھا ہے، ایک یہ کہ دادا ترکہ سے محروم ہونے والے پوتوں کے لیے وصیت کر دے؛ تاکہ دادا کی وفات کے بعد ان کو بھی کچھ مل جائے، اور اس ایک تہائی ترکہ تک وصیت کرنے کی گنجائش ہے، دوسری گنجائش یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں پوتوں کو کچھ ہبہ کر دے۔ اس طرح وہ اپنے

ضرورت مند پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کی مدد کر سکتے ہیں؛ لیکن افسوس کہ اس جانب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

اسلام کا قانون نفقہ ایک جامع قانون ہے، جو انسان کو پیش آنے والی تمام صورتِ حال کا احاطہ کرتی ہے؛ اس لیے جیسے اولاد کا نفقہ باپ پر اور باپ نہیں ہو تو دادا پر واجب ہوتا ہے اور بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے، اسی طرح بعض حالات میں بھائیوں، بہنوں اور چچاؤں وغیرہ پر بھی بے سہارا خواتین اور یتیم بچوں کا نفقہ واجب ہے؛ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو بھائی سمجھتا ہے کہ اس پر اس کی بہن کے نفقہ کی ذمہ داری نہیں، یا بچے یتیم ہو جائیں تو چچا یہ نہیں سمجھتے کہ اب ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہمارے بھائی کے بچوں کی بھی ہم پر ذمہ داری ہے؛ بلکہ اگر کبھی کچھ حسن سلوک کر دیا تو اس کو ایک احسان خیال کرتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ غیر مسلم معاشرہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں بے سہارا عورتوں اور بچوں کی کفالت و پرورش کا کوئی مستحکم نظام نہیں ہے، غلط تصور پر مبنی اس تصویر میں میڈیا کے لوگ رنگ بھر کر اسے اور خوف ناک بنا دیتے ہیں اور اسلام کو نعوذ باللہ ایک بے رحم اور غیر منصف مزاج مذہب کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت عدالتیں ایسے فیصلے کر رہی ہیں جو واضح طور پر شریعت سے متصادم ہیں، لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اس کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب خود مسلمان اپنے مقدمات سرکاری عدالتوں میں لے کر جاتے ہیں، اپنے علماء اور قاضی و مفتی سے رجوع کرنے کے بجائے ان لوگوں سے اپنا معاملہ طے کرانے کی کوشش کرتے ہیں جو نہ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، نہ رسول پر، قرآن کے بیان کے مطابق یہ ایک منافقانہ طرزِ عمل ہے کہ زبان سے تو ہم اللہ اور اس کے رسول کی بات مانیں اور عملی طور پر ہم اسے نظر انداز کر دیں۔

اگر ہمیں ملک کے موجودہ حالات کا مقابلہ کرنا ہے اور اپنے دینی تشخص کو بچانا ہے تو سر کٹانے کا جذبہ کافی نہیں، پہلے ہمیں اپنے اندر سر جھکانے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے، شریعت کے احکام خواہ ہماری چاہت اور مفادات کے خلاف ہوں؛ لیکن ہم اس کے سامنے جھک

جائیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کو اپنی خواہشوں اور چاہتوں پر غالب رکھیں؛ کیوں کہ جس قول کے پیچھے عمل کی طاقت نہ ہو، وہ دوسروں کو قائل نہیں کرسکتا، جو شخص اندر سے کھوکھلا ہوگیا ہو اور اس کا جسم زندگی کی حرارت سے محروم ہو، اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ باہر کے دشمنوں کا مقابلہ کرسکے۔

اُمت میں اتحاد کی بنیادیں

ادھر چند ایسے دل دہلا دینے والے واقعات سامنے آئے ہیں، جنھیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور سر شرم سے جھکا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں میں ایک مسلمان میت کی لاش قبر کھود کر اس لیے نکال دی گئی کہ وہ کسی اور مسلک کا ماننے والا مسلمان تھا؛ حالاں کہ اس نے پوری زندگی اسی گاؤں میں مسلمانوں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر گذاری تھی، ایک مسلک کے لوگوں نے موجودہ وزیر اعظم کے ساتھ مل کر کہا کہ فلاں فلاں مسلک کے لوگ دہشت گرد ہیں، ان پر پابندی لگائی جائے، کاش کہ وہ فرقہ پرست پارٹیوں کے بارے میں اس طرح کا مطالبہ کرتے، اسی طرح صوفیاء کے مقدس گروہ کے نام پر ایک ایسی کانفرنس منعقد کی جارہی ہے، جس کا مقصد دوسرے مسلک والوں کے خلاف حکومت کو اُکسانا اور موجودہ فرقہ پرست حکومت کو تقویت پہنچانا ہے، دوسری طرف ایک اہم خبر یہ آئی ہے کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذہبی رہنماؤں نے صدیوں کے اختلافات کو بھلاتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے مل لیا ہے؛ حالاں کہ ان دو عیسائی فرقوں کے اختلاف کی وجہ سے لاکھوں عیسائیوں کی جانیں جاچکی ہیں، یہ ہمارے لیے سرمایۂ عبرت ہے!

ملک کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ دستوری طور پر مسلمانوں اور اقلیتوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، ان کے تعلیمی اداروں کو غصب کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں، بے قصور مسلمان نوجوان گرفتار کیے جارہے ہیں، رام مندر تعمیر کرنے کا اعلان ہورہا ہے اور مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کرنے کی سازش رچی جارہی ہے، اس لیے اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کرسکے کہ مسلمانوں کے لیے اتحاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، عالمی اور ملکی سطح پر ان کی محرومیوں اور نامرادیوں کا اصل سبب باہمی افتراق اور انتشار ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اتحاد کس طرح پیدا ہو؟ —— ایسا اتحاد کہ تمام لوگوں کی سوچ ایک ہوجائے، فکر ونظر کا کوئی اختلاف باقی نہیں رہے، ممکن نہیں ہے، کیوں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے چہرے مہرے اور رنگ وروپ میں اختلاف رکھا ہے، اسی طرح ان میں

مزاج و مذاق کا اختلاف بھی رکھا گیا ہے، اور یہ اختلافِ ذوق قدم قدم پر عیاں ہے، ایک لباس ہی کو دیکھیے، کتنی وضع کے لباس بنائے جاتے ہیں، اور ہر وضع کسی نہ کسی کی نگاہِ انتخاب کے لیے منظورِ نظر بن جاتی ہے، پھر کپڑوں کا رنگ، اور بناوٹ کے اعتبار سے ہر ایک کا ذوق جداگانہ ہے، یہی حال مکان کی تعمیر کا، سواریوں کی پسند کا اور انسان کے استعمال میں آنے والی تقریباً تمام ہی چیزوں کا ہے۔

جیسے اشیاء کے انتخاب میں، ذوق ونظر کی بوقلمونی کارفرما ہے، اسی طرح افکار خیالات اور اخذ واستنباط میں بھی انسانی مزاج و مذاق کی نیرنگی جلوہ فرما ہوئی ہے، اس لیے ملّی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل میں فکر ونظر کا اختلاف واقع ہونا بالکل فطری ہے، یہ اختلاف کبھی معمولی درجہ کا ہوتا ہے اور کبھی شدید بھی ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر اتحاد کا مطلب یہ ہو کہ تمام لوگ ایک ہی فکر کے حامل ہو جائیں اور ہر مسئلہ میں ایک ہی طریقہ پر سوچنے لگیں تو یہ ایسی ہی غیر فطری خواہش ہوگی، جیسے کوئی اس بات کا آرزومند ہو کہ دنیا کے تمام لوگ ایک ہی رنگ اور ایک ہی روپ کے بن جائیں، اصل میں اتحاد کا راستہ یہی ہے کہ اختلاف کے باوجود اتحاد کو قائم رکھا جائے۔

''اختلاف کے باوجود اتحاد'' کے لیے چند باتیں ضروری ہیں:

دو گروہوں کے درمیان خواہ کتنا بھی اختلاف ہو، لیکن بہت سے اُمور میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے، اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ اختلافی اُمور کے بجائے ان اُمور پر نظر رکھی جائے جو قدرِ مشترک ہیں، مسلمانوں کے درمیان اتنی زیادہ باتیں مشترک ہیں کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں اس کا پچاس فی صد بھی شاید ہی مل سکے، مثلاً ہندو بھائیوں کے یہاں آریہ سماجی اور سناتن فرقوں کے درمیان، عیسائیوں میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھیوڈسک کے درمیان خدا کے تصور کے بارے میں بھی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا ہے سکھ مذہب کے ماننے والوں میں عام سکھ اور اور نرن کاری مشن کے اختلاف کو دیکھیے، لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ خدا کی توحید، اللہ تعالیٰ کی صفات، نبوت ورسالت اور محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت، آخرت، بنیادی فرائض، واجبات اور محرمات و ممنوعات کے بابت کوئی اختلاف نہیں، اس لیے مسلمانوں کے لیے اتحاد و اتفاق کا راستہ بہت آسان ہے، اور وہ اختلافی چیزوں کے بجائے مشترکہ اقدار کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ سکتے ہیں۔

غالباً ہندوستان میں مجلس مشاورت نے مسلمانوں میں پہلی بار یہ سوچ پیدا کی اور بعد کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام نے اس تصور کو اور تقویت پہنچائی، پھر بعض اور تنظیموں کے قیام نے مسلمانوں میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے، کہ وہ مشترک مسائل کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھیں، اس ہم آہنگی اور اشتراک کو مختلف میدانوں میں بڑھانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ جب آدمی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتا ہے، مشترک مسائل پر گفتگو کرتا اور سوچتا ہے، تو فاصلے سمٹتے ہیں، مفاہمت پیدا ہوتی ہے، اور ایک دوسرے کی توقیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

غور کیجیے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے، قرآن مجید نے یہودیوں اور عیسائیوں کو دعوت دی کہ ہم قدرِ مشترک پر ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو جائیں اور وہ یہ ہے کہ ہم سب اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائیں: تَعَالَوا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُم اَلَّا نَعبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشرِكَ بِهِ شَيئًا (آل عمران: ٦٤) جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قدرِ مشترک کی بنیاد پر اتحاد کی تشکیل ہو سکتی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ خود اُمت مسلمہ اس اُصول پر آپس میں متحد نہ ہو سکے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ شخصیتوں کے بارے میں لوگوں کی پسند الگ الگ ہوتی ہے، انبیاء پر ایمان لانے کا تو ہر شخص مکلّف ہے، لیکن فقہا و محدثین اولیاء و صالحین اور مشائخ و سلاطین کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کا ذوق اور ان کا رجحان الگ الگ ہو، ایک شخص کچھ بزرگوں سے عقیدت رکھتا ہے، دوسرے شخص کو کچھ دوسرے بزرگوں سے

عقیدت ہو، ایسی صورت میں کم سے کم یہ بات ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنے بزرگوں کے بارے میں کلمہ خیر کہتے ہوئے دوسروں کی خدمات کا بھی معترف ہو، یا کم از کم ان کے بارے میں بدگوئی اور بدکلامی سے گریز کرے، تاکہ ان کے متبعین کی دل آزاری نہ ہو، بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ جب ابولہب کی بیٹی درہ ایمان لائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خواہ مخواہ ابولہب کو برا بھلا نہ کہا جائے، کہ مناسب نہیں ہے کہ کافر باپ کی وجہ سے مومن بیٹی کو تکلیف پہنچائی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کا بھی اس درجہ پاس ولحاظ رکھا ہے، کیا ہم مسلمانوں کے آباء واجداد، ان کے مشائخ و بزرگوں اور دین حق کے خدمت گاروں کے بارے میں بھی اس درجہ تہذیب وشائستگی اختیار نہیں کر سکتے؟ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آپ دوسروں کے بزرگوں کو برا بھلا کہیں گے، تو وہ آپ کے بزرگوں کی شان میں منقبت نہیں پڑھیں گے، اس لیے صحیح طریقہ وہی ہے، کہ خود اپنی زبان کی حفاظت کی جائے، قرآن مجید نے اس لیے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے کہ جب تم انہیں برا کہو گے تو تم جس خدا کے پرستار ہو، وہ ان کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّو اللّٰه عَدوًا بِغَيرِ عِلمٍ (الانعام:۱۰۸) جو اصول قرآن مجید نے غیر مسلموں کے معبودان باطل کے بارے میں دیا ہے کم سے کم ہم ان لوگوں کے بارے میں جو مسلمانوں کے لیے عقیدت و احترام کا مرکز ہیں، یہی رویہ اختیار کریں، تو بہت سارے اختلافات سے ہم بچ سکتے ہیں۔

تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اختلاف کا سلیقہ سیکھیں اگر کسی نظریہ پر آپ خوش سلیقگی اور خوش کلامی کے ساتھ تنقید کریں، تو فریق مخالف آپ کی بات کو قابل غور بھی سمجھے گا، اور کم سے کم یہ ضرور ہوگا کہ نفرت کا آتش فشاں سلگنے نہ پائے گا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِدفَع بِالَّتِي هِيَ اَحسَن فَاِذَا الَّذِي بَينَكَ وَبَينَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيّ

حَمِیم۔(حٰم السجدۃ:۳۴)

بہتر طریقہ پر رد کرو تو ممکن ہے کہ جس شخص سے تمہاری عداوت ہے، وہ تمہارا گرم جوش دوست بن جائے۔

افسوس کہ ''دفاع احسن''، جس کو قرآن مجید نے دوسری جگہ ''جدال احسن'' (النحل: ۱۲۵) سے تعبیر کیا ہے، اب اس کی صلاحیت مسلمانوں میں باقی نہیں رہی ہے، جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لیے بھیجے گئے تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ نرم لب ولہجہ اختیار کریں: ''قولا له قولا لينا'' (طٰہٰ:۴۴) مقام فکر ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ کے پیغمبر ہیں، اور فرعون کھلا ہوا کافر بلکہ کافروں کا سرخیل ہے، اس کے باوجود ان پیغمبروں کو نرم خوئی اور نرم گفتاری کا حکم دیا جاتا ہے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اُمت کے باہمی اختلاف میں بھی اس اُصول پر عمل کرنے کو آمادہ نہیں ہیں۔

اختلاف مذہبی ہو یا سیاسی اور تنظیمی و جماعتی ہو یا مسلکی و مشربی ہر جگہ ہماری زبان عدل اور اعتدال کے حدود کو پھاند جاتی ہے، اور جن باتوں کو نرم لب ولہجہ اور سنجیدہ پیرایہ میں کہا جاسکتا ہے، ان کو بھی ہم ایسی تلخی اور تندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس سے نفرت کی دیواریں اور اونچی ہو جاتی ہیں، شاعر حقیقت شناس کلیم عاجز نے خوب کہا ہے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

— یہ سلیقہ بہت ضروری ہے، اور مسلمان جتنی جلد اسے سیکھ لیں گے، اتنا ہی جلد اپنے آپ کو انتشار اور بکھراؤ سے بچاسکیں گے۔

انسان کے سامنے جب کوئی اہم کام نہیں ہوتا تو وہ غیر اہم کام میں اُلجھ جاتا ہے، اس کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے جب کوئی مثبت اور تعمیری میدان مہیا نہیں ہوتا تو وہ منفی اور تخریبی کاموں میں لگ جاتا ہے، مسلمانوں سے ایک بہت بڑا افریضہ دعوتِ دین کا متعلق ہے،

کہ وہ غیر مسلم ہم وطنوں تک دین کو پہنچائیں، اور ادیانِ باطلہ کی ایسی خوب صورتی کے ساتھ تردید کریں جس سے اختلاف ونفرت پیدا ہونے کے بجائے لوگوں میں قبولیت کا جذبہ بیدار ہو، یہ بات ممکن بھی ہے اور جو لوگ تھوڑا بہت اس کام کو کررہے ہیں، اس کے نتائج بڑے ہی بہتر اور امید افزاء سامنے آرہے ہیں۔

اگر مسلمان اپنے باہمی مسلکی اختلاف میں پہلو تہی سے کام لیں اور اختلاف بڑھانے والی باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دعوتِ دین کی طرف متوجہ ہوں، تو ان کو اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کے استعمال کے لیے ایک بہتر میدان مل جائے گا، ان کی قوتیں صحیح سمت میں خرچ ہوں گی، اور اس سے ان شاء اللہ دنیا میں ایک نیا انقلاب کروٹ لے سکتا ہے۔

مشکلات اور دشواریاں بھیڑیا اور بکری اور سانپ اور نیولے کو اکٹھا کردیتے ہیں، مقامِ افسوس ہے کہ جس اُمت کو اس کے پیغمبر نے آخر آخر تک اتحاد واتفاق کی تلقین کی ہے، اور جس کے درمیان اتفاق واشتراک کے نکات کے مقابلہ اختلافی نکات شاید دو فی صد بھی نہ ہوں، وہ اُمت نقشِ دیوار کو پڑھنا چھوڑ دے اور بلا امتیاز اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کی ارزانی بھی اسے متحد نہ کرسکے، وہ اپنے دشمنوں کی منصوبہ بندی کی طرف سے غافل ہوجائے اور اپنی صفوں کو متحدہ چٹان کے بجائے بکھرے ہوئے ذرات بنالے، کیا اس سے زیادہ کم نصیب بھی کوئی گروہ ہوسکتا ہے؟

باہمی اختلاف اور ملت کی ذمہ داری

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا، جاگتا، ہنستا، بولتا اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لیے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش اور بے زبان رہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں، اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد اور خود غرضی کی وجہ سے ہو، تو یہ مہذب اور شائستہ اختلافِ رائے کی حدوں سے گذر کر باہمی جنگ وجدال، تہمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی ہے، کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں اور تیسرا وہ سماج اور معاشرہ جس میں اس طرح کی نزاع پیش آتی ہو، قرآن حکیم کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے طور پر اس فاصلہ کو سمیٹنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں تو کسی ایک متفق علیہ شخصیت کو فیصل بنالیں، یا دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دین دار، سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں اور ان کو اپنا ''حکم'' مان لیں، ان دونوں حکم کا فریضہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر حکم طرف دار بنے بغیر نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں

گے: ”ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما.“ (النساء: ۳۵)

صلح اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے؛ بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ بھی ہے؛ اس لیے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے، وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حقائق کو قبول کرنے کی جرأت ہو اور اس کی نگاہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

تیسرا طبقہ جو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا، وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ — صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرادیا کرو ”انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون“ (الحجرات: ۱۰) یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادراک ہے اور نہ احساس۔

حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ، صدقہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل چیز بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاحِ ذات البین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے۔ (الادب المفرد، حدیث نمبر: ۱۹۳)۔ ”مونڈ دینے والی چیز“ سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کردینے اور تباہ وبرباد کردینے والی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس ولحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا

ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ اہتمام تھا، عین میدانِ جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی اور مرضِ وفات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت باقی نہیں رہی، تب بھی رفقاء کی مدد سے شریک جماعت ہونے کی کوشش فرمائی، لیکن اس کے باوجود قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضہ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لیے آگے بڑھا دیا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ (بخاری شریف: ۲۶۹) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی؟!

مدینہ منورہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست وگریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لیے ابرِ رحمت بن کر آیا، صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھائے نہ بجھتی تھی، وہ لمحوں میں سرد ہوکر رہ گئی اور دونوں قبیلے اخوتِ اسلامی کے رشتہ سے شیر وشکر ہوکر رہنے لگے، یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اوس وخزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا اور ان کی باہمی محبت کو دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا؛ چناں چہ اس نے اوس وخزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دیئے اور اس زمانے میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف جو اشعار کہے تھے، ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی، بہت تیز تیز تشریف لائے، لوگوں کو شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا، اسی موقع سے سورۃ آلِ عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم پر اسلام ہی کی

حالت میں موت آنی چاہیے، سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو اور اپنے اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو۔ (آلِ عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

زبانِ مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی: ۲۰/۴)

غرض! کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف ونزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے، وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنالے گی اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کر کے رہے گا، اس لیے مسلمانوں میں جو ''اربابِ حل وعقد'' ہوں — یعنی ذمہ دار، سمجھ دار، بااثر، اہل علم و دانش، علماء و مشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین — ان کی نیز ملّی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں ابھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب وعوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عنداللہ وہ اس سلسلہ میں جواب دہ ہوں گے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ کم از کم ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے تعلیمی و اصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں یا مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اور اصلاحی تحریکیں ہیں، وہ سب اکثر اختلاف وانتشار سے دوچار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دولخت بلکہ سہ لخت ہو چکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے اور پھر ان ٹکڑوں کی کئی ٹکڑیاں، یہ اختلاف وانتشار اور صلاحیتوں کا بٹوارہ بحیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کمزور اور بے اثر کر دیتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے!

ریاست تلنگانہ میں ابھی ابھی برادرانِ وطن کا تیوہار گنیش پوجا گذرا ہے، اس علاقہ میں اس تیوہار کو بڑے تزک واحتشام اور شوق واہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے، شہروں میں اس کے بڑے بڑے جلوس نکالے جاتے ہیں، برادرانِ وطن اپنے عقیدہ کے مطابق مذہبی جذبات کا اظہار کرتے ہیں، یقیناً انہیں اس کا پورا پورا حق حاصل ہے اور اگر یہ تقریب قانون کا حق ادا کرتے ہوئے اور امن کو برقرار رکھتے ہوئے منائی جائے تو کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں، مسلمانوں نے اس ملک میں شروع سے بجا طور پر اس کا خیال رکھا ہے کہ ان کا کوئی عمل دوسرے مذہبی گروہوں کے لیے تکلیف اور دل آزاری کا سبب نہ ہو، اس کا خیال رکھنا نہ صرف قانون کے لحاظ سے ضروری ہے؛ بلکہ ہمارے مذہب نے بھی ہمیں یہی تعلیم دی ہے، اسی کا نام ''رواداری'' ہے کہ ہم اپنے مذہب پر عمل کریں، مگر دوسروں کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دیں، نہ ہم کوئی ایسی بات کہیں، جس سے دوسروں کا دل دکھے اور نہ ہم کوئی ایسا عمل کریں، جس سے دوسروں کو خلل ہو۔

لیکن اس بار مختلف مقامات سے اس طرح کی خبریں آئیں کہ وہاں مسلمان مرد و خواتین نے باضابطہ پوجا میں شرکت کی، بالخصوص حیدرآباد کے قریبی شہر نلگنڈہ میں کچھ ایسے لوگوں نے جن کے نام مسلمانوں کی طرح کے ہیں، گنیش جی کا منڈپ بنایا، اس میں مورتیاں رکھیں، مسلمان نوجوان اور برقعہ پوش خواتین وہاں جا کر بیٹھتے رہے اور قول وعمل کے ذریعہ یگانگت کا اظہار کرتے رہے، شہر کے بعض فکرمند اور دردمند بزرگ علماء نے خواص کو توجہ دلائی اور عوام کو روکنے کی کوشش کی؛ لیکن بدقسمتی سے سماج کے ذمہ دار مسلمانوں کو اس کی جیسی کچھ اہمیت محسوس کرنی چاہیے تھی، محسوس نہیں کی گئی، ایک نادانی ان لوگوں کی ہے، جنھوں نے ایسی حرکت کی، اور ایک تغافل ان لوگوں کا ہے، جنھوں نے حوصلہ سے کام لے کر قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایسے واقعہ کو روکنے کی کوشش نہیں کی، اس طرح کے واقعات اب ملک بھر کے مختلف علاقوں میں پیش آنے لگے ہیں، ایسی سوچ کا پیدا ہونا اور مسلمانوں کا یہ طرزِ فکر اختیار

کرنا بڑا ہی خطرناک اور لائق تشویش بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رواداری جائز ہے اور مداہنت ناجائز؛ لیکن رواداری اور مداہنت کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اس لیے بہت بے دار مغزی کے ساتھ دونوں کے فرق کو سمجھنا چاہیے، دوسرے مذہبی طور وطریق کو اختیار کر لینا مداہنت ہے رواداری نہیں ہے، مجھ سے تو میرا کوئی ہندو بھائی دریافت کرے کہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا چاہتا ہوں، اگر چہ کہ میرا ارادہ مسلمان ہونے کا نہیں ہے، تو مجھے اس کے اس ارادہ سے کوئی خوشی نہیں ہوگی؛ بلکہ میں اس کو مشورہ دوں گا کہ بہتر ہے کہ آپ نماز نہ پڑھیں؛ کیوں کہ آپ نماز پر یقین نہیں رکھتے، آپ کا نماز پڑھنا ایسا ہی ہوگا کہ جیسے آپ کا ارادہ تو ہو ممبئی جانے کا، اور آپ کا کوئی دوست دلی جارہا ہو تو آپ اس کے لحاظ میں دلی کی ٹرین میں بیٹھ جائیں، یہ کوئی حقیقت پسندی کی بات نہ ہوگی؛ بلکہ نا سمجھی کا عمل ہوگا۔

ہم جب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے عقیدہ اور عملی زندگی دونوں میں ان تعلیمات کو قبول کیا ہے، جو قرآن وحدیث کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوئی ہیں، ہمارے لیے یہ بات تو ضروری ہے کہ جیسے ہم خود ایک عقیدہ رکھتے ہیں، ہم دوسرے بھائیوں کے لیے بھی اس حق کو تسلیم کریں کہ انہیں بھی اپنی پسند کے مطابق مذہب کو اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، آخرت کا مسئلہ اللہ کے حوالہ ہے؛ لیکن دنیا میں ہمارے لیے کسی پر اپنا عقیدہ تھوپنے کی اجازت نہیں، اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ اگر اللہ کو یہ بات منظور ہوتی کہ سارے کے سارے لوگ مسلمان ہی ہوں تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیا جاتا: ”وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً“ (المائدۃ:۴۸، النحل:۳۹) اس سے معلوم ہوا کہ مذاہب و ادیان کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی مشیت کے دائرہ میں ہے، اس اختلاف کو اس دنیا میں مٹایا نہیں جاسکتا۔

لیکن ہمارے لیے اس بات کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان بھی کہیں اور ایسی باتوں کو بھی قبول کرلیں جو اسلامی عقیدہ سے ٹکراتی ہوں، یہ ہرگز رواداری نہیں،

یہ مداہنت ، نفاق، موقع پرستی اور بے ضمیری ہے، اسلام کے تمام عقائد کی بنیاد توحید ہے، اس عقیدہ کی ترجمانی کلمہ طیبہ ''لا اِلٰہ الا اللہ'' سے ہوتی ہے، اس کلمہ میں اثبات بھی ہے اور نفی بھی، تسلیم بھی ہے اور انکار بھی، اقرار بھی ہے اور براءت کا اظہار بھی، اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موجود ہے اور وہ ایک ہے، یہ پہلو کفر کی ایک خاص قسم ''کفر الحاد'' کی تردید کرتا ہے، الحاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے وجود ہی کو نہ مانا جائے، جیسا کہ آج کل کمیونسٹ کہتے ہیں، یا جیسا کہ بہت سے اہل مغرب اور مشرقی ملکوں کے مغرب زدہ لوگ کہا کرتے ہیں، اس کائنات کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود خدا کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ میں بغیر باپ کے اپنے آپ پیدا ہو گیا ہوں، یقیناً ایسا کہنے والے کو لوگ یا تو پاگل کہیں گے یا سمجھیں گے کہ یہ ثابت النسب نہیں ہے۔

اس کلمہ کا منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خدا نہیں، خدائی میں شرکت نہیں ہے؛ بلکہ وحدت ہے، یہ کفر کی ایک دوسری قسم ''کفر شرک'' کی تردید کے لیے ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں پہلے اسی منفی پہلو کا ذکر کیا گیا ہے، مثبت پہلو کا ذکر بعد میں آیا ہے، قرآن مجید میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں، وہ زیادہ تر شرک کی تردید کے لیے ہیں، مختلف انبیاء نے جو اپنی قوموں کو خطاب فرمایا ہے، اس کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے، ان سبھوں کا ہدف شرک کا رَدّ کرنا تھا، جن جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے، ان کی اصل بیماری شرک ہی تھی؛ البتہ شرک کی مختلف شکلیں ان کے یہاں مروّج تھیں، کوئی قوم مورتی پوجا کرتی تھی، کوئی سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرتی تھی، کسی کے یہاں بادشاہ پرستی مروّج تھی، کوئی جانور کا پرستار تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی معبودیت میں دوسروں کو شریک ٹھہرانا ان میں قدرِ مشترک تھا، اہل علم نے لکھا ہے کہ مسلمان کے لیے توحید کے اقرار کے ساتھ باطل معبودوں سے براءت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۲۵۴/۶) اسی لیے اسلامی عقائد کے مشہور ترجمان امام طحاویؒ اپنی کتاب ''العقیدۃ الطحاویۃ'' میں اور اس کے مشہور شارح علامہ ابن ابی العز حنفی فرماتے ہیں: ''یہی وہ کلمہ توحید ہے، جس کی طرف تمام پیغمبروں نے دعوت دی اور اس کلمہ

میں توحید کا ذکر نفی و اثبات دونوں اعتبار سے ہے، جو حصر کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے کہ اگر صرف خدا کا اثبات ہوتا تو اس میں (دوسرے خدا کی) شرکت کا احتمال ہوسکتا تھا۔'' (شرح العقیدۃ الطحاویۃ: ۱۰۹) ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

''جان لو کہ توحید رسولوں کی بنیادی دعوت ہے، یہ راستہ کی پہلی منزل ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کے ذریعہ سالک اللہ کے مقام تک پہنچ سکتا ہے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نوح نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ (اعراف: ۵۹) اور حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اللہ کی عبادت کرو کہ اللہ کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں۔ (اعراف: ۵۶) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور غیر اللہ کی عبادت سے بچو۔ (نحل: ۳۶) اسی لیے مکلّف پر جو پہلا فریضہ عائد ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' (شرح العقیدۃ الطحاویۃ: ۷۷)

قرآن وحدیث کی اگر تمام تعلیمات کو جمع کیا جائے تو اس کا غالب حصہ عقیدۂ توحید کی تعلیم اور ہر قسم کے شرک کی تردید سے جڑا ہوا ہے، مسلمان جس حال میں بھی رہے اور جیسی کچھ آزمائش سے گذرے؛ لیکن اس کی زبان پر ہمیشہ یہی کلمہ رہے:

''اِنَّمَا امِرت اَن اَعبدَ الله وَلَا اشرِکَ بِه، اِلَیهِ اَدعوا وَِلَیهِ مَابِ ۔'' (الرعد: ۳۶)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف ہماری واپسی ہے۔

مسلمانوں نے سب کچھ برداشت کیا؛ لیکن عقیدۂ توحید کے بارے میں کبھی جانتے بوجھتے مداہنت گوارا نہیں کیا، جب صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حبش کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں انہیں امن وسکون نصیب ہوا تو اہل مکہ کو یہ بات گوارا نہیں ہوئی اور انھوں نے ان کے پاس اپنے نمائندے بھیجے، حبش کے بادشاہ نجاشی نے مسلمانوں کو بھی

طلب کیا اوران کی مخالفت میں آنے والے وفد کو بھی، مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے ایک مؤثر تقریر فرمائی اور اس میں ان خوش گوار تبدیلیوں کا ذکر فرمایا، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عرب کے جاہلی معاشرہ میں آئی، جس نے کانٹوں کو پھول اور ذرّوں کو آفتاب بنا دیا تھا، نجاشی بہت متأثر ہوئے، مسلمانوں کو قیام کی اجازت دی اور مخالفین کے لائے ہوئے تحائف بھی واپس کر دیئے، اہل مکہ نے دوبارہ آپس میں مشورہ کیا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، اور محمد اللہ کا بندہ، تو کل ہم بادشاہ کے سامنے رکھیں گے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کہتے ہیں، جو آپ کے لیے بہت ہی ناگوارِ خاطر ہوگی؛ چناں چہ وہ اس شکایت کو لے کر پہنچے، مسلمانوں کے وفد کی دوبارہ طلبی ہوئی، صحابہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق سوال کا ہمیں کیا جواب دینا چاہیے، حضرت جعفرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم ہم وہی کہیں گے، جو ہمارے رسول نے ہمیں بتایا ہے، چاہے اس کی وجہ سے جو بھی صورتِ حال پیش آئے، انہوں نے پوری قوت کے ساتھ نجاشی کے سامنے یہ بات کہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں، خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں، نجاشی خود صاحب علم تھے، حضرت جعفرؓ کی صدق کلامی اور صاف گوئی نے ان کو بے حد متأثر کیا اور انہوں نے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ جتنی بات اِنہوں نے کہی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہے۔
(مسند احمد: ۱/۲۰۲، حدیث نمبر: ۱۷۴۰)

غرض کہ ایسے نازک حالات میں بھی صحابہؓ نے نہ صرف توحید پر استقامت اختیار کی؛ بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سکوت اختیار کرنے یا اَنجان بن جانے کا راستہ بھی اختیار نہیں کیا، مسلمان فکری پستی کی اِس سطح پر آجائے کہ شرکِ صریح مبتلا ہو جائے، یہ ایک ناقابل تصور بات ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مکہ کے بڑے بڑے سردار ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کے سامنے دو تجویزیں رکھیں؛ تاکہ

آپسی جھگڑا ختم ہو جائے، ایک یہ کہ ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں اور آپ بھی ہمارے بتوں کی پوجا کر لیجیے، یا مدت متعین کر لیں کہ ایک سال آپ کے خدا کی عبادت ہو، ہم اور آپ سب مل کر آپ کے خدا کی عبادت کریں اور ایک سال ہماری مورتیوں کی پوجا ہو اور ہم اور آپ مل کر پوجا کریں، اسی موقع پر سورۃ الکافرون نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ نہ ہم تمہارے معبودوں کی عبادت کر سکتے ہیں اور نہ تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ تنہا ہمارے خدا کی عبادت کرو، تو اس طرح عبادت میں تو اشتراک ممکن نہیں کہ ہم اللہ کو ایک بھی مانیں اور اللہ کے ساتھ شریک بھی ٹھہرائیں؛ لیکن قابل عمل صورت یہ ہے کہ آپ اپنے مذہب پر عمل کریں، ہماری طرف سے کوئی چھیڑ خوانی نہیں ہوگی، اور ہمیں ہمارے مذہب پر عمل کرنے دیں۔ (تفسیر قرطبی: ۲۰/۲۲۵-۲۲۷)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی زبان سے کسی کو شریک ٹھہرائے اور دوسری شکل یہ ہے کہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ اس کا اظہار کرے، جیسے کوئی شخص غیر اللہ کو سجدہ کرے، غیر اللہ کے نام سے جانور ذبح کرے، زبان سے کچھ نہ کہے؛ لیکن غیر اللہ کے سامنے ایسا عمل کرے جس کو پوجا سمجھا جاتا ہو، یہ بھی شرک ہے، صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ کرنے کی اجازت چاہی؛ لیکن آپ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ (ابوداؤد، **باب فی حق الزوج علی المراۃ**، حدیث نمبر: ۲۱۴۰) صحابہؓ نے دوسروں کے سامنے جھکنے کی اجازت طلب کی؛ لیکن آپ نے اس کو بھی گوارا نہیں فرمایا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۲۸) جس وقت دوسری قومیں سورج کی پوجا کیا کرتی تھیں، آپ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے کو منع فرمادیا۔ (**بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ**، حدیث نمبر: ۱۸۵) شریعت کے اسی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے شعلہ چھلکتے ہوئے چراغ کے سامنے نماز پڑھنے کو منع کیا؛ کیوں کہ اس میں آتش پرستوں کی مشابہت ہے۔ (**المحیط البرھانی**: ۵/۳۰۸) نمازی اس طرح نماز پڑھے کہ بالکل اس کے سامنے کسی شخص کا چہرہ ہو، اس کو بھی روکا گیا۔ (حوالہ سابق) کیوں کہ اس میں شرک کا ایہام ہے، اسی مصلحت کے تحت

تصویر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کو منع فرمایا گیا ہے۔ (حوالہ سابق: ۳۰۹/۵) کہ صاحب تصویر کی عبادت کی شکل نہ محسوس ہو۔

دوسرے مذاہب کے شعائر کو اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی؛ چناں چہ مجوسی ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے تھے، اس ٹوپی سے منع کیا گیا، برہمنوں کی طرح کمر میں زنار باندھنے سے منع کیا گیا۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۲۷۶/۲) آتش پرستوں کے یہاں مذہبی تقریب کی حیثیت سے ''نوروز'' منایا جاتا تھا، اس میں شرکت کو بعض فقہاء نے کفر قرار دیا ہے۔ (مالا بد منہ: ۱۳۸)

ممتاز فقیہ اور مصلح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''جو چیزیں دوسری قوموں کی مذہبی وضع ہیں، ان کا اختیار کرنا کفر ہے، جیسے صلیب لٹکانا، سر پر چوٹی رکھنا، جنیو باندھنا، یا ''جے'' پکارنا وغیرہ۔'' (حیات المسلمین: ۲۲۴)

فقہاء نے جن صورتوں کا ذکر کیا ہے، مورتی بٹھانا اور اس کی تعظیم میں وہاں بیٹھنا، یا اس پر پھول چڑھانا اس سے کہیں بڑھا ہوا عمل ہے، اس لیے جہاں بھی جو لوگ اپنی نادانی، ناسمجھی اور غلط رہنمائی کی وجہ سے اس کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کو توبہ کرنی چاہیے، استغفار کرنا چاہیے اور عزم مصمم کرنا چاہیے کہ ہم آئندہ ہر قیمت پر ایسے عمل سے بچیں گے اور دوسروں کو بھی بچائیں گے، دنیا کے چند سکوں کے لیے ایمان کھو دینا پانا نہیں ہے کھونا ہے، اور دنیا کی متاعِ حقیر کے لیے آخرت کا سودا کر لینا فائدہ نہیں ہے نقصانِ عظیم ہے۔ **وما عند الله خير من اللهو ومن التجارة والله خير الرازقين!**

آ تجھ کو بتاؤں میں، تقدیرِ اُمم کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں اعداء اسلام کے ساتھ جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان میں غالباً سب سے سخت معرکہ ''غزوۂ احزاب'' کا تھا، اس غزوہ میں تمام اسلام دشمن طاقتیں یکجا ہوگئی تھیں، اس میں مکہ کے مشرکین بھی تھے، قبیلہ بنوغطفان کے جاں باز بھی ان کے دوش بدوش تھے اور مسلمانوں کے بغلی دشمن یہود بھی اس نازک وقت میں کھل کر مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم ہوگئے تھے، اس طرح بیس ہزار کا لشکر جرار مدینہ کی اس مختصر آبادی کا محاصرہ کیے ہوا تھا، جو محض دو ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی، یہ بڑا نازک وقت تھا؛ اسی لیے مسلمانوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کے مطابق ایک گہری اور وسیع خندق کھودی، سامنے کی طرف سے یہ خندق تھی اور پشت کی طرف سے پہاڑ تھے؛ تاکہ دشمن مسلمانوں تک پہنچ نہ سکیں، تقریباً بیس دن مسلمان محاصرہ کی حالت میں رہے۔

جنگ کے موقع پر یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ فوجیوں کو غذائی رسد اور ضروری سہولتیں حاصل رہیں، تبھی وہ پوری قوت اور جوش وولولہ کے ساتھ حملہ کرسکتے ہیں اور اپنے دفاع کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں؛ لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ یخ بستہ کردینے والی ٹھنڈک اور اس کے ساتھ ساتھ غذا کی نہایت قلت، غذائی صورتِ حال یہ تھی کہ راوی نقل کرتے ہیں:

ترجمہ: ''صحابہ کے پاس دو مٹھی جو لایا جاتا مزہ اتری ہوئی بدبودار چربی کے ساتھ اس کو ان کے لیے پکایا جاتا، جو لوگوں کے سامنے رکھ دیا جاتا، دراں حالیکہ وہ بھوکے ہوتے'' (**صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق وھو الاحزاب**، حدیث نمبر: ۳۷۹۱)

مگر کیا مجال تھی کہ کبھی زبان پر شکوہ آئے، احتجاج ہو یا بطورِ الحاح والتجاء ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرضِ مدعا کیا جائے، وہ ہمیشہ صبر وقناعت کا پیکر بن کر رہتے اور ہر حال میں ان کی زبان اللہ تعالیٰ کے شکر وسپاس سے تر رہتی، معمولی ہتھیاروں سے چٹان کے

پتھروں کو توڑنا اور خشک پتھریلی زمینوں کو کھودنا آسان بات نہیں تھی؛ لیکن صحابہؓ کا حال یہ تھا کہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنا کام کیے جاتے، سخت جسمانی کام کرتے ہوئے، بعض اوقات لوگ نعرہ لگاتے اور نغمے گاتے ہیں، یہ بات ان کے لیے کام کو آسان بناتی ہے اور ان میں نیا جوش وولولہ بھر دیتی ہے، عربوں کے یہاں بھی اس کا رواج تھا؛ چناں چہ صحابہؓ اس موقع سے حوصلہ بڑھانے والے اشعار پڑھتے، ان اشعار کے لفظ لفظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا عشق، اللہ کی قدرت پر بے پایاں یقین اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے کا جذبہ اور صبر وقناعت کا عزمِ مصمم ظاہر ہوتا ہے، آپ بھی ان ایمان افروز اشعار کو پڑھیے جن کو امام بخاریؒ نے اپنے مجموعہ حدیث میں نقل کیا ہے:

ترجمہ: ’’جب تک ہم زندہ رہیں گے اس وقت تک کے لیے ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی‘‘ (**صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب التحریض علی القتال**، حدیث نمبر: ۲۸۴۳)

ترجمہ: ’’خدا کی قسم! اگر اللہ ہمیں ہدایت سے نہ نوازتے تو ہم ہدایت نہیں پاتے اور نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے، پس خداوندا! ہم پر سکینہ نازل فرمایئے اور جب ہمارا مقابلہ دشمن سے ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھیے، ان لوگوں نے ہمارے خلاف زیادتی کی ہے، جب انھوں نے فتنہ پیدا کرنا چاہا تو ہم نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا‘‘ (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۴۱۰۴)

ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء پر فقر و فاقہ کی آزمائش ہے، دوسری طرف یہ جذبہ سرفروشی اور جاں بازی وجان نثاری بھی دوش بدوش ہے، اسی ماحول میں اسلام کا سورج جزیرۃ العرب کے افق پر طلوع ہوا، وہ بلندی کا سفر طے کرتا گیا؛ یہاں تک کہ اس کی کرنیں مشرق سے مغرب تک پھیل گئیں، اس پر ایمان لانے والوں کے ایک ہاتھ میں فولاد کی تلوار ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اخلاق کی تلوار، ان کی زندگی میں اتنی سادگی اور قناعت تھی کہ انھیں متاعِ سیم وزر کی طرف دوڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، دنیا کے لوگ مال و دولت

کے انبار کے ذریعہ اپنی شان وشوکت کے مصنوعی محل کھڑا کرتے ہیں؛ مگر ان کا رعب وجلال ان کی فقر و درویشی میں پنہاں تھا، بڑے بڑے بادشاہوں کو ان سے گفتگو کا یارانہ ہوتا تھا؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوف دامن گیر نہیں تھا کہ میری امت معاشی اعتبار سے پسماندہ ہو جائے گی اور اس فقر و پسماندگی کی وجہ سے اسے ذلت ورسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا؛ بلکہ آپ کو ڈر اس بات کا تھا کہ یہ امت جد وجہد کے جذبہ سے محروم ہو کر عیش وعشرت میں مبتلا نہ ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم! مجھے تم پر فقر ومحتاجی کا خوف نہیں ہے؛ لیکن میں تم پر جس بات کے بارے میں ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم پر دنیا کی نعمتیں بچھادی جائیں گی، جیسے تم سے پہلوں کے لیے بچھادی گئی تھیں، پھر پچھلی قوموں کی طرح تم دنیا کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو گے اور جیسے دنیا کی حرص نے انہیں غفلت اور لہو ولعب میں مبتلا کر دیا تھا، کہیں تم کو بھی غفلت اور لہو ولعب میں مبتلا نہ کر دے'' (بخاری، باب ما یحذر من زهرة الدنیا والتنافس بها، حدیث نمبر: ۶۴۲۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے اپنے بعد تمہارے شرک میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ نہیں؛ لیکن اس بات کا ڈر ہے کہ دنیا کی دولت میں تم ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرو گے'' (دیکھیے: بخاری، حدیث نمبر: ۶۴۲۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں آج عمومی طور پر مسلمانوں کا اور خاص طور پر مسلمان حکمرانوں کا حال دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے بارے میں جس چیز سے ڈرتے تھے، آج امت مسلمہ عملی طور پر اسی مرض میں مبتلا ہے، گذشتہ کچھ عرصہ سے عالم عرب میں آزادی اور جمہوریت کی جو لہر اٹھی ہے، اس نے زور زبردستی سے برسر اقتدار رہنے والے فرماں رواؤں کی نیند حرام کر دی ہے، ساتھ ہی بعض ایسے واقعات سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے، جو اقتدار کی دبیز اور مضبوط دیواروں کی اوٹ

میں چھپے ہوئے تھے، جیسے تیونس کے آمر زین العابدین بن علی جب اپنے ملک سے فرار ہوئے تو اس طرح کہ سولہ ٹن سونے کی اینٹیں ان کے ساتھ تھیں، اس کے ساتھ مال و دولت کے اور جو خزانے لے جائے گئے ہوں گے، ان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مصر کے سابق صدر حسنی مبارک کی بیوی اور بیٹے کئی لدے لدائے جہازوں کے ساتھ مصر سے بھاگے اور خود حسنی مبارک کی دولت کا اندازہ کیا جائے کہ وہ دو بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہے، لیبیا کے صدر کی صورتِ حال یہ ہے کہ ان کی دوسری بیوی دو ٹن سونا لے کر فرار ہو چکی ہیں، ان کی ایک محبوبہ جو یوکرین کی متوطن ہیں اور سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں، وقت کے تیور کو دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ دولت کا ایک انبار لے کر اپنے وطن پہنچ چکی ہیں، پھر قذافی کی عیاشی اور عشرت آرائی کا حال یہ ہے کہ ان کے ساتھ دوسو جوان اور نوجوان خاتون باڈی گارڈ ساتھ ہوتی ہیں اور یوکرین کی محبوبہ نرس کے طور پر ان کے ساتھ رہتیں، دولت جمع کرنے اور دادِ عیش دینے کی قریب قریب یہی صورتِ حال اکثر عرب ملکوں میں ہے، جہاں فرماں رواؤں نے عوام کو اپنا غلام اور ملک کو اپنی ذاتی جائداد سمجھ لیا ہے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کی ہوسِ دولت کو پوری کرنے کے لیے ملک میں موجود بینک کافی نہیں ہوتے؛ اس لیے زیادہ تر مسلم حکمرانوں کے پیسے مغربی ممالک کے بینکوں میں محفوظ کیے گئے ہیں، ان ہی ملکوں میں انہوں نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے اور یہیں بڑے بڑے قصور و محلات واقع ہیں؛ اس لیے جب مغرب کے کٹ پتلی حکمرانوں کے خلاف ان کے ملک میں فضا بنتی ہے تو مغربی قوتیں مخالفین کی مدد کرتی ہیں اور ان کی طرف سے برپا کی جانے والی شورشوں کو تقویت پہنچاتی ہیں، ادھر ان کا تخت اقتدار متزلزل ہوا اور اُدھر ان کے کھاتے منجمد کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی ساری دولت پر قبضہ جما لیا جاتا ہے، ان کے بعض ''بے نامی'' کھاتے بھی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں کوئی ان کے بارے میں پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔

ایک طرف عالمِ اسلام کی یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹے سے ملک جاپان کی مثال ہے، مؤرّخہ ۱۱/ مارچ ۲۰۱۱ء کو

جاپان میں زبردست سونامی آئی، جس کی مثال صدیوں میں نہیں ملتی، یہ ایسی سونامی تھی کہ آٹھ میٹر بلند سمندر کی سرکش موجیں آبادی میں گھس پڑیں اور پوری آبادی کو دھوکر رکھ دیا، مکانات اس طرح گر پڑے کہ گویا بچوں کے کھیلنے کے مٹی کے گھروندے ہوں، کاریں اور بسیں ماچس کی ڈبیوں کی طرح سڑکوں پر بہنے لگیں، سمندری سونامی کے ساتھ ساتھ زمین میں بھی زلزلہ آگیا، اس کے نتیجہ میں تین نیوکلیرری ایکٹر اڑ گئے اور اس کی تاب کاری کے اثرات ایک وسیع علاقہ میں پھیل گئے، ایک ہی وقت میں اس قوم کو زلزلہ، سونامی اور نیوکلیر حادثہ سے گذرنا پڑا؛ لیکن اس قوم نے اپنی حوصلہ مندی، جدو جہد اور قربانی کے ذریعہ ان حادثات کا مقابلہ کیا، نہ دنیا کی دوسری قوموں کے سامنے ہاتھ پھیلایا، نہ آہ و وبکا کی اور نہ پست ہمت ہوئے، جس پامردی کے ساتھ انہوں نے حالات کا مقابلہ کیا ہے، وہ یقیناً ایک مثال ہے اور بجا طور پر پوری دنیا میں ان کی ان کوششوں کو داد دی جارہی ہے، شاعرِ حقیقت شناس علامہ اقبالؒ نے خوب کہا تھا:

آ، تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر وسنان اول، طاؤس ورباب آخر

یعنی جب کوئی قوم ترقی وعروج کا سفر طے کرتی ہے تو وہ تلواروں اور نیزوں سے مزین ہوتی ہے، وہ مشکل حالات کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، وہ عیش وعشرت کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے بجائے جدو جہد کے میدان میں آگے بڑھتی ہے اور جب قوموں کے زوال وانحطاط کا زمانہ آتا ہے تو وہ عیش وعشرت کے نقشے بنانے لگتی ہے اور رقص وسرور سے اپنے دل کو بہلانے کی عادی ہوجاتی ہے، یہی وہ بات ہے کہ جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندیشہ رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ جب کسی قوم میں خیانت اور بددیانتی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ کم ہمت اور بزدل ہوجاتی ہے۔ (طبری، ص: ۲۶۹۶)

اس وقت عالم اسلام کی صورتِ حال یہی ہے کہ اپنی قوم کے ساتھ حکمرانوں کا معاملہ بدترین بددیانتی کا ہے اور صہیونی وصلیبی طاقتوں کے سامنے شرم ناک بزدلی اور کم

حوصلگی کا! عام مسلمانوں کی بھی صورتِ حال یہ ہے کہ وہ علم و تحقیق، محنت اور جدو جہد میں پیچھے ہیں اور عیش پرستی میں آگے، دوسری قومیں ہمیں دیکھتی ہیں اور خندہ زن ہوتی ہیں کہ یہ لٹی پٹی اور ذلیل و رسوا کی ہوئی قوم اپنی محرومی اور کم نصیبی کو بھول کر کس طرح دادِ عیش دے رہی ہے، کاش! ہم اس طرزِ عمل میں تبدیلی لائیں، اپنے اندر حالات کا مقابلہ کرنے اور جدو جہد کے ذریعہ آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں اور عیش و عشرت کے نقشوں کو تج کر، ایک باعزت اور آبرومند امت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اپنے آپ کو لانے کی کوشش کریں۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے!

آج مسلمان دنیا میں ہر جگہ ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزر رہے ہیں، امریکہ اور یورپ سے لے کر چین اور برما تک ہر جگہ مسلمانوں کو رسوا کیا جا رہا ہے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو ایک بے قیمت شیئ ہو چکی ہے، خود مسلم ممالک شام، عراق، افغانستان اور یمن وغیرہ میں مسلمانوں کی آپسی برادر کشی —— جس کے پیچھے صلیبی اور صہیونی سازشیں شامل ہیں —— نے مسلمانوں کے خون کو پینے کے پانی سے بھی زیادہ ارزاں بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حالات ہمیں خود احتسابی کا سبق دیتے ہیں، مسلمانوں کو خود اپنے آپ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، ایک ایسا جائزہ جو ایمان سے لے کر اعمال و اخلاق تک تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہو اور پھر رَبِّ کائنات سے رُجوع کرنے اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کرنے کے جذبہ پر مبنی ہو۔

ہر تکلیف دہ واقعہ کو دوسروں کا قصور قرار دے کر اپنے آپ کو بریٔ الذمہ سمجھنا مؤمنانہ طریقہ نہیں ہے، یہ بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ وہ اپنے اوپر پہنچنے والی مصیبتوں کا ذمہ دار حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اہل ایمان کو قرار دیتے تھے: ”وَاِن تُصِبهُم سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوا بِمُوسٰى وَمَنْ مَّعَه“ (اعراف: ۱۳۱) یہی حال دوسری ان قوموں کا بھی تھا جو ایمان اور عمل سے محروم تھے اور جب ان کی اللہ کی طرف سے پکڑ ہوتی تھی تو وہ اہل ایمان کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ (نمل: ۴۷) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے بارے میں بھی قریش اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ (نساء: ۷۸) قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انسان پر جو آزمائشیں آتی ہیں، وہ اصل میں خود اس کی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں: ”وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيدِيكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيرٍ“ (شوریٰ: ۳۰) اس لیے حالات کی ناموافقت کا سبب دوسروں میں تلاش کرنے کی بجائے اپنے آپ میں تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان حالات کے پس منظر میں بعض سادہ لوح مسلمان سوچتے ہیں کہ اگر وہ دین حق پر ہیں اور خیر امت ہیں، جن کا اللہ نے اپنے دین کی سربلندی کے لیے انتخاب کیا ہے تو پھر ہم اتنی

آزمائشوں اور دشواریوں سے کیوں گزر رہے ہیں؟ یہ بات مسلمانوں کو جادۂ حق سے ہٹانے اور ان کے ایمان کو متزلزل کرنے کے لیے اعدائے اسلام کی طرف سے بھی کہی جاتی ہے؛ لیکن یہ سوچنا درست نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے آخرت میں تو یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر طرح کی نعمت سے سرفراز ہوں گے، جنت ان کی قیام گاہ ہوگی اور وہ ہر طرح کی تکلیف اور ناگوار باتوں سے محفوظ رہیں گے؛ لیکن دنیا میں اس کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ اہل ایمان سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے ان سے دنیا کی زندگی خرید لی ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' (توبہ:۱۱۱)

قرآن مجید نے ایک اور موقع پر بہت وضاحت اور تاکید کے ساتھ کہا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵) الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶) اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۷) (البقرۃ: ۱۵۵-۱۵۷)

اور ہم؛ تم لوگوں کو خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کے کچھ نقصان سے ضرور ہی آزمائیں گے، اس سلسلہ میں آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف واپس ہونا ہے، یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے نوازشیں ہوں گی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زور دے کر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو ضرور ہی آزمایا جائے گا اور آزمائشیں بھی مختلف قسم کی ہوں گی، کبھی ایسا ہوگا کہ مسلمان خوف و دہشت سے دوچار کیے جائیں گے، وہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے معاملہ میں غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہوں گے، آج پوری دنیا اور خود ہمارے ملک میں مسلمان اسی صورتِ حال سے

دوچار ہیں، دوسرے: ان کو معاشی نقصانات سے آزمایا جائے گا، اس معاشی نقصان کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ بالکل فاقوں کی نوبت آجائے، جیسا کہ بعض ملکوں کی صورتِ حال ہے، جن کے قدرتی وسائل پر مغرب نے قبضہ کر رکھا ہے، یہی صورتِ حال برما کے مظلوموں اور شام کے مہاجرین کی ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ یہ نوبت نہ آئے؛ لیکن ان کو معاشی اعتبار سے نہایت پس ماندہ اور اقتصادی نقصان سے دوچار کیا جائے، ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے جائیں گے، جیسا کہ ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ مرکز سے لے کر ریاستوں تک ملازمتوں میں آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کا تناسب بہت ہی کم ہے۔

تیسرے: ان کی آزمائش جانی نقصانات سے ہوگی، ہندوستان میں مسلسل مسلمان اِس مصیبت کا سامنا کر رہا ہے، صرف بھاگلپور، میرٹھ، جمشید پور، راورکیلہ، ممبئی اور گجرات کے فسادات نیز بابری مسجد کی شہادت کے موقع سے ہونے والے بلووں میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے اعداد وشمار جمع کیے جائیں، تو ان کی تعداد عجب نہیں کہ پچیس ہزار کے قریب پہنچ جائے، یہ ایسا جانی نقصان ہے جس سے مسلمان مسلسل دوچار ہوتے آئے ہیں اور باعث افسوس امر یہ ہے کہ جب فسادات کی روک تھام کے لیے ایک سیاسی جماعت نے مسلمانوں کے مطالبہ پر بل مرتب کیا تو ان پارٹیوں نے بھی اس کی تائید کرنے سے انکار کر دیا، جو اپنے آپ کو سیکولر اور اقلیت دوست کہتے ہیں۔

چوتھے: جس چیز سے آزمانے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہے: ثمرات، ثمرہ کے معنی پھل کے ہیں اور اس آیت میں بعض مفسرین نے اس سے اولاد مراد لیا ہے: ''والثمرات الاولاد'' (تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۶۷) — آج بہت سے ملکوں میں والدین کے سامنے ان کی مسلمان اولاد کے قتل کے واقعات ہو رہے ہیں، خود ہمارے ملک میں مسلمان نوجوان ہر وقت اس خطرہ سے دوچار رہتا ہے کہ نہ جانے انہیں بے قصور ہونے کے باوجود دہشت گردی کا الزام لگا کر جیل کی سلاخوں میں ڈال دیا جائے، یہ بھی اولاد کے نقصان کی ایک صورت ہے، جس سے اس وقت ہندوستان کے مسلمان دوچار ہیں؛ اسی لیے مسلمانوں کا ان مصیبتوں سے

دوچار ہونا اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق ہے اور ان کا پیش آنا قابل تعجب نہیں ؛ بلکہ ان واقعات کے پیش آنے کو مسلمانوں کے لیے ایمان ویقین میں اضافہ کا باعث ہونا چاہیے۔

اگر کوئی گروہ ایمان پر قائم رہنے کے باوجود کسی وجہ سے مصیبتوں اور آزمائشوں سے محفوظ نہیں رہتا ہے تو اس کو حسرت وافسوس، نا اُمیدی اور بے یقینی سے دوچار نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ اگر صاحب ایمان ہونے کی وجہ سے کسی کو آزمائشوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تو اس کے سب سے زیادہ مستحق انبیاء کرام تھے؛ لیکن قرآن مجید نے تفصیل سے انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات کا ذکر کیا ہے، جن کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی قوم کی طرف سے سخت تکلیف اور مصیبت سے دوچار ہونا پڑا، حضرت نوح علیہ السلام پہلے پیغمبر تھے، جن کو مشرکین سے سابقہ پیش آیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں طویل عمر عطا فرمائی، انہوں نے اپنی زندگی کے ساڑھے نوسو سال کا غالب حصہ دعوتِ حق کا فریضہ انجام دیتے ہوئے گزارا؛ (عنکبوت:۱۴) لیکن قوم کا رَدّ عمل مسلسل انکار اور سرکشی تھا، وہ مذاق اُڑاتے اور ان کو بُرا بھلا کہتے۔ (شعراء: ۱۱۱) تفسیری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم ان پر سنگ باری بھی کرتی تھی، آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور ایمان لانے والوں کو چھوڑ کر حضرت نوح علیہ السلام کی پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹادی گئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام برگزیدہ پیغمبر تھے کہ ان کے بعد تمام پیغمبران ہی کی نسل سے پیدا ہوئے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، ان کو بڑی بے دردی سے نذرِ آتش کرنے کی کوشش کی گئی اور جو ایندھن آپ کو جلانے کے لیے تیار کیا گیا، قوم کے ایک ایک فرد نے اس میں حصہ لیا؛ لیکن اللہ نے اپنی قدرتِ خاص سے آپ کو بچالیا۔ (انبیاء: ۶۹) بے گانوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی کچھ کم تکلیف نہیں پہنچی، خود والد نے کہا: اگر تم دعوتِ توحید سے باز نہیں آئے تو میں تمہیں سنگ سار کردوں گا۔ (مریم:۴۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے والد بھی نبی تھے، دادا بھی، دادا کے بھائی بھی اور پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی؛ لیکن اس کے باوجود کیسی کیسی آزمائشوں سے گزارے

گئے، اندھیرے کنوے میں پھینکے گئے، ماں باپ سے جدا کیے گئے، نبی زادہ تھے؛ لیکن غلام بنائے گئے اور بازار میں بیچے گئے اور بالآخر قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں؛ یہاں تک کہ مفسرین کی روایت کے مطابق کم وبیش بارہ سال آپ نے قید خانہ میں گزارے۔(تفسیر کبیر: ۱۶/ ۴۹)—— حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل جن آزمائشوں سے گزاری گئی، قرآن مجید نے تفصیل سے ان کو بیان کیا ہے۔(البقرۃ: ۴۹) مفسرین نے اس کی تفصیلات لکھی ہیں کہ فرعون پوری قوم بنی اسرائیل سے بے گار کا کام لیتا تھا، ان سے کھیتی کرائی جاتی تھی، عمارتیں بنوائی جاتی تھیں، پہاڑوں کو تراش کر ستون بنوائے جاتے تھے، جو اِن کاموں کے لائق نہیں تھے، ان سے یومیہ جزیہ لیا جاتا تھا، اگر کوئی شخص سورج کے ڈوبنے سے پہلے پہلے جزیہ ادا نہیں کرتا تو اس کے ہاتھ اس کے گردنوں سے باندھ دیئے جاتے تھے اور عورتوں کے ذمہ کپڑوں کی بنائی اور کڑھائی کا کام ہوتا تھا، پھر ظلم کی انتہا اُس وقت ہوگئی جب فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی، مصر پہنچی اور اس نے قوم فرعون یعنی قبطیوں کے ایک ایک مکان کو خاکستر کر دیا اور بنی اسرائیل اس سے محفوظ رہے، کاہنوں نے اس کی تعبیر بتائی کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص پیدا ہوگا، جو مصر پر غلبہ حاصل کر لے گا، پھر کیا تھا! فرعون کا ظالمانہ حکم جاری ہوا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو، اسے ذبح کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے اور سال ہا سال اس پر عمل ہوتا رہا، یہاں تک کہ خود قبطی سرداروں نے فرعون سے درخواست کی کہ اس سلسلہ کو روکا جائے؛ کیوں کہ بنی اسرائیل کے بچے قتل ہوتے جارہے ہیں اور ان کے بوڑھوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، جو محنت مزدوری کے لائق نہیں ہیں، اس طرح آئندہ ہم لوگوں کو اِن پُر مشقت کاموں کو خود انجام دینا ہوگا۔(تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۵۷)

اس سلسلہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، خوف و دہشت کا عالم یہ تھا کہ مکہ میں حضرت ابوطالب روزانہ بنو ہاشم کے کچھ نوجوانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی حفاظت پر مامور فرماتے تھے۔(المعجم

الکبیر للطبرانی :۲۵۶/۱۱، حدیث نمبر:۱۱۶۶۳) اور مدنی زندگی میں بھی جب تک سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر: ۶۷ نازل نہیں ہوئی، آپ کی قیام گاہ پر پہرا دیا جاتا تھا۔ (ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر: ۳۰۴۶) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ بہت سی دفعہ اپنے بستر میں تلوار رکھ کر سویا کرتے تھے؛ تاکہ اگر دشمن اچانک حملہ آور ہو جائے تو دفاع کیا جاسکے، پوری مکی زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی جان خطرے میں رہی، عین صحن کعبہ میں آپ کو پھانسی دینے کی کوشش کی گئی، قتل کے منصوبے بنائے گئے، طائف میں زخموں سے چور چور ہو گئے، اُحد میں روئے منور سے خون کا فوارہ بہنے لگا، شعب ابی طالب میں تین سال سے زیادہ عرصہ ایسا بائیکاٹ کیا گیا کہ مسلسل فاقوں سے گزرنا پڑا اور بنو ہاشم کے بچے ایک ایک دانے کو ترس گئے، اپنے عزیزوں کی قربانی آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے اپنے آنکھوں سے دیکھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا غم بھی دیکھا، جن کی لاش مسخ کردی گئی تھی، مکی زندگی کے تیرہ سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت مشقت میں گزارے اور مدینہ آنے کے بعد بھی آٹھ سال کا عرصہ اسی طرح گزرا کہ اہل مکہ کی طرف سے تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے، آخر ہجرت کے آٹھویں اور نبوت کے اکیسویں سال مکہ فتح ہوا اور جس محبوب سرزمین سے آپ کو ظلماً نکال دیا گیا تھا، وہی آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں بچھی جاتی ہے، غور کرنے کی بات ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں تھے کہ جیسے اکیس سال کے بعد مکہ کے لوگ دامن اسلام میں آگئے اور انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر طاعت جھکا دیا، یہی اہل مکہ آج سے اکیس سال پہلے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق پیش کی تھی، آپ کی دعوت کے سامنے سر جھکا لیتے ؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان آزمائشوں سے اس لیے گزارا کہ اُمت کو جن جن آزمائشوں سے گزرنا تھا، آپ کو ان تمام دشواریوں سے گزارا جائے؛ تاکہ مسلمانوں کے لیے اپنے نبی کا اُسوہ موجود ہو، دشواریاں ان کے قدموں میں تزلزل پیدا نہ کردیں، وہ مایوس اور نا اُمید نہ ہوں، ان کے سامنے اپنے نبی کی مثال موجود ہو اور یہ بات ان کے لیے ڈھارس اور تسلی کی باعث بنے۔

اس لیے مسلمانوں کو موجودہ حالات سے پریشان ہونا چاہیے اور نہ ان کے یقین میں تذبذب پیدا ہونا چاہیے، انہیں احساس رہنا چاہیے کہ ان کا ابتلاؤں سے دوچار ہونا ان کے نبی کے ایسے حالات سے گزرنے کے مقابلہ میں تو بہت ہی کمتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے اس اُمت کو پیش آنے والے حالات کے پس منظر میں فرمایا کہ اللہ کے یہاں آزمائش کے اعتبار سے افراد اور قوموں کا اجر ہوگا، اللہ جب کسی قوم سے محبت کرتے ہیں تو اس کو آزمائش سے دوچار کرتے ہیں، اگر وہ ان حالات میں بھی اللہ کے فیصلہ پر راضی رہے تو اللہ اس سے راضی ہوجاتے ہیں اور اگر وہ اس پر راضی نہیں رہے تو اللہ بھی اس سے ناراض ہوجاتے ہیں: ''**فمن رضی فله الرضا ومن سخط فله السخط**'' (ترمذی، باب ماجاء فی الصبر علی البلاء، حدیث نمبر:۲۳۹۶)

اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر آپ اپنے گھر سے باہر محلّہ کی سڑک پر نکلے اور دیکھا کہ چند بچے آپس میں گالی گلوچ کر رہے ہیں اور ان میں ایک آپ کا بیٹا بھی ہے تو آپ محلّہ کے بچوں کو تو چھوڑ دیں گے؛ لیکن اپنے بچہ کا کان پکڑ کر گھر لائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ اس کو دو چار تھپڑ بھی لگائیں؛ کیوں کہ آپ دوسرے بچوں کی غلطی کو تو وقتی طور پر نظر انداز کرسکتے ہیں؛ لیکن آپ کا اپنا بچہ — جس سے آپ کا مستقبل جڑا ہوا ہو — کی تھوڑی سی کوتاہی بھی آپ کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے اور آپ فوری طور پر اس کی تنبیہ کرتے ہیں، اسی طرح یہ اُمت خدا کے دین کی سربلندی کے لیے پیدا کی گئی ہے، لوگ اپنے لیے جیتے ہیں اور یہ اُمت انسانیت کے لیے جیتی ہے: ''**خَيْرَ اُمَّتٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاس**'' (آلِ عمران:۱۱۰) اس لیے دوسری قوموں کو تو اس کی کوتاہیوں پر ڈھیل دی جاتی ہے، جس کو قرآن مجید نے ''امہال'' سے تعبیر کیا ہے۔ (طارق:۱۷) لیکن اس اُمت سے اگر کوئی کوتاہی ہو تو فوراً اس کی پکڑ کی جاتی ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی مثال کھیتی کی سی ہے کہ برابر ہوا اس کو ایک طرف سے دوسری طرف ہلاتی رہتی ہے، مؤمن اسی طرح آزمائش سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور منافق کی مثال ایسے درخت کی ہے جو ہلتا نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک ہی دفعہ

کاٹ لیا جاتا ہے: ''مثل المؤمن کمثل الزرع لا تزال الریاح تفیئه ولا یزال المومن یصیبه بلاء ومثل المنافق مثل الشجر الارز لا تهتز حتی تستحصد'' (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۸۶۶)

غرض کہ موجودہ حالات سے نہ گھبرانا چاہیے اور نہ قدم لڑکھڑانا چاہیے، یہ ایک طوفان ہے جو آیا ہے اور گزر جائے گا، ایسا نہیں ہے کہ کسی خطہ میں مسلمانوں کے مغلوب ہو جانے سے اسلام مغلوب ہو گیا؛ بلکہ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمان مغلوبیت سے دوچار تھے، اسلام نے اپنی استدلالی قوت کی بدولت غلبہ اور فتح مندی کی نئی تاریخ رقم کی؛ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم ایمان و یقین کے اس معیار پر اپنے آپ کو لے آؤ، جو اللہ کے یہاں مطلوب ہے، تو انجام کار تم ہی کو غلبہ حاصل ہوگا: ''وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (آلِ عمران: ۱۳۹) علامہ اقبالؒ نے کیا خوب اس کی ترجمانی کی ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مئے کو تعلق نہیں پیمانے سے

مغرب زدہ مسلمان فکر وتہذیب کے دوراہے پر!

جمعیت علمائے کناڈا کی دعوت پر راقم الحروف کو ۹ رفروری ۲۰۱۷ء سے تقریباً دو ہفتوں کے لیے ٹورنٹو اور وِین کووَر کے سفر کا موقع ملا، ٹورنٹو کناڈا کی راجدھانی ہے، اور وِین کووَر وہاں کا مشہور ساحلی تفریحی شہر، جس کو اس کے خوب صورت مناظر کی وجہ سے دنیا کے سات خوب صورت شہروں میں شمار کیا گیا ہے اور کئی دفعہ عالمی رائے عامہ میں خوب صورتی، امن وامان اور ماحول موافق ہونے کے اعتبار سے اس کو اوّل درجہ حاصل ہوا ہے، یہ سفر خاص طور پر اربابِ افتاء کے تربیتی پروگرام کے لیے منعقد کیا گیا تھا، مؤرّخہ: ۱۱ رفروری کو مسجد ابوبکر صدیقؓ کے ''کانفرنس ہال'' میں جدید مسائل اور ان کا حل، اجتہاد اور عصر حاضر، اختلاف اور ادب اختلاف اور ۱۲ رفروری کو اسی ہال میں فقہ الاقلیات یعنی غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے شرعی مسائل، نیز تکثیری سماج میں مسلم وغیر مسلم تعلقات جیسے اہم موضوعات پر توسیعی خطابات رکھے گئے تھے اور اخیر میں سوال وجواب کا کھلا سیشن رکھا گیا تھا، کچھ کمی بیشی کے ساتھ یہی موضوعات وِین کووَر میں بھی تھے، وہاں یہ پروگرام مسجد نور (سرے) کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا، دونوں ہی پروگرام علماء اور اربابِ افتاء کے لیے مخصوص تھے، ٹورنٹو اور اس کے مضافات میں چوں کہ علماء کی تعداد زیادہ ہے؛ اس لیے اس میں ۷۰ سے ۸۰ تک شرکاء کی تعداد تھی اور میرے لیے قابل تعجب بات یہ تھی کہ دوسرے دن شدید برف باری کے باوجود مدعوئین نے بہ پابندی وقت شرکت کی، وِین کووَر کے علاقہ میں علماء کی تعداد کم ہے؛ بلکہ مسلم آبادی ہی کم ہے؛ اس لیے شرکاء کی تعداد نسبتاً کم تھی۔

اِس وقت اِن پروگراموں پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اس حقیر نے وہاں کے جو حالات دیکھے اور ان کو دیکھنے کے بعد جو احساسات قائم ہوئے، ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں؛ کیوں کہ پچھلی دو دہائیوں سے گلوبلائزیشن کے نام پر ہندوستان کے حالات جس طرح بدل رہے ہیں اور جس تیزی سے مغربی تہذیب اپنے بال و پر پھیلا رہی ہے، ان کی وجہ سے آئندہ وطن عزیز پر اور خود مسلمانوں پر جن سماجی اور اخلاقی اثرات کے

پڑنے کا اندیشہ ہے، وہ تقریباً وہی ہیں جن سے اس وقت مغربی معاشرہ دوچار ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہاں رہنے والے مسلمان اس وقت ایک زبردست تضاد سے دوچار ہیں اور فکری و تہذیبی دوراہے پر کھڑے ہیں، جو مسلمان اِن ملکوں میں گئے ہیں، ان کی پہلی نسل اگر دین دار تھی تو وہ اپنی دین داری کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے، دوسری نسل کو بھی ایک حد تک بچائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے؛ لیکن تیسری نسل کو مغربی فکر و تہذیب سے بچانا بے حد دشوار ہوتا ہے، مسلمان ان ملکوں میں مسجدوں کی کثرت کے بارے میں سن کر بہت خوش ہوتے ہیں اور یقیناً یہ ہے ہی ایک خوش آئند بات؛ لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، عام طور پر ان مسجدوں کی آبادی بوڑھوں اور نئے تارکین وطن کے ذریعہ ہوتی ہے، جن کا ایک سیلابِ مسلسل ان ملکوں میں داخل ہوتا رہتا ہے؛ لیکن جو لوگ آپ کو مسجدوں میں پابند نمازی نظر آتے ہیں اور ان کے چہرے اور لباس سے ان کی گہری دینی وابستگی ظاہر ہوتی ہے، خود ان کے گھروں میں بھی بعض اوقات حالات بہت ابتر ہوتے ہیں، ان کے یہاں بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ماں باپ کی قید نگرانی سے آزاد اور دل و دماغ اسلامی افکار کی تابع داری کے جذبہ سے عاری ہیں؛ اس لیے مسلمان گھرانوں میں بھی شوہر و بیوی اور والدین و اولاد کی زندگی میں ایک واضح تضاد نظر آتا ہے، اور جو والدین مادی فوائد کی قربان گاہ پر دینی اقدار کو بھینٹ چڑھانے کو تیار نہیں ہیں، ان کا دِل دردمند خون کے آنسو روتا ہے اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ آگے بڑھنا ناگوار تر ہے اور پیچھے واپس ہونا ناممکن؛ اس لیے وہ سخت کسک کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

اس وقت مغربی تہذیب جس فکری گمراہی اور اخلاقی زوال سے دوچار ہے اور دوچار ہونے سے بڑھ کر اس کی داعی و ترجمان ہے، میں نے جہاں تک غور کیا، اس کے تین بنیادی اسباب ہیں، اور یہ تینوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ایک: مذہب کا انکار اور اس کو ایک فضول چیز سمجھنا، دوسرے شخصی آزادی کا مبالغہ آمیز تصور، تیسرے: خاندانی نظام کی تباہی، اور یہ تینوں باتیں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ جہاں بھی ان میں سے ایک چیز پائی جائے گی، دوسری چیز بھی پائی جائے گی۔

مذہب بے زاری کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ میں ایک عرصہ تک حکومت اور چرچ کے درمیان لڑائی رہی ہے، یہ لڑائی بالآخر چرچ کے جور وستم کی وجہ سے ان کی شکست پر ختم ہوئی اور چوں کہ یورپ کے سامنے صرف عیسائیت ہی تھی، اس لیے انہوں نے اس کی ناکامی و نامرادی کو سامنے رکھ کر یہ بات طے کردی کہ مذہب کا زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، زیادہ سے زیادہ عباداتی رسوم عبادت گاہوں میں انجام دیئے جاسکتے ہیں اور مذہبی تہوار منائے جاسکتے ہیں؛ لیکن لباس و پوشاک، کھانا پینا، لوگوں کے باہمی تعلقات، سماجی زندگی اور معاملات وغیرہ میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوگا، اسی کا اثر ہے کہ مغربی ملکوں میں چرچ فروخت کیے جارہے ہیں، بڑے بڑے چرچوں میں صرف اتوار کو کچھ عمر رسیدہ لوگ آجاتے ہیں اور بس، ہفتہ کے دوسرے دنوں میں مختلف پروگراموں کے لیے انہیں کرایہ پر لگا دیا جاتا ہے، اس طرح مغربی تہذیب کی پہلی اینٹ خدا کا انکار ہے، اگرچہ وہ اپنے آپ کو موروثی نسبت کی وجہ سے عیسائی یا یہودی کہتے ہیں؛ لیکن خدا کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ ان کی زندگی میں کوئی دخل دے۔

یہ ایک بنیادی سوچ ہے، جس پر پورے مغربی تمدن کی اساس ہے، عمل کے بگاڑ کی اصلاح آسان ہوتی ہے؛ لیکن جب بنیادی سوچ ہی درست نہ ہو تو اس کو تبدیل کرنا آسان نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص برائی کو برائی سمجھتا ہو اور اس کا مرتکب ہوتا ہو تو کسی مرحلہ پر یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ آپ اس کو صحیح راستہ پر لے آئیں؛ لیکن اگر کوئی معاشرہ کسی عمل کو برا سمجھتا ہی نہ ہو، تو اس کو اس سے بچانا بظاہر ممکن نہیں؛ اس لیے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم مغربی تہذیب اور اس کے اثرات کا جو رونا روتے ہیں اور اس پر رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہیں، اس کا صحیح حل یہ ہے کہ مغرب زدہ مسلمانوں اور مشرقی قوموں کی سوچ کو بدلا جائے، جو مغرب میں بسنے والی مسلمانوں کی نئی نسل میں عموماً سرایت کرچکی ہے اور دھیرے دھیرے مشرقی ملکوں؛ بلکہ خود مسلمان ملکوں میں بھی اپنا قدم بڑھا رہی ہے۔

بہت سے لوگوں کو مغرب میں پائی جانے والی بعض اخلاقی خوبیوں پر بڑا رشک آتا

ہے، اور اخلاق ہے ہی ایسی چیز جو دلوں کو متأثر کرے اور انسان کو اسیر محبت بنالے، جیسے: ٹریفک اُصول کی رعایت، راستہ چلتے ہوئے بوڑھوں اور کمزوروں کی مدد، عورتوں کے نیم عریاں لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود چھیڑ چھاڑ کے واقعات کا بہت کم پیش آنا، معاملات میں دیانت داری، خرید وفروخت میں دھوکہ دہی سے بچنا، صفائی ستھرائی کا لحاظ، اپنے ملک میں بسنے والی اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک، اگر ان کے ساتھ کوئی ناگوارِ خاطر بات پیش آئے تو ان کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا اور ان کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار کرنا، یہ خوبیاں واقعی قابل تقلید ہیں اور ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ ایمان سے تو محروم ہیں؛ لیکن انھوں نے اسلامی اخلاق کو اپنا طریقۂ زندگی بنالیا ہے۔

لیکن اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو ان کے یہ بہتر اخلاق ایک طرح کا تاجرانہ عمل ہے، ایسے ہی جیسے ایک ہوش مند تاجر کتنا ہی بداخلاق اور بدزبان ہو؛ لیکن وہ اپنے گاہک کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے اور مارکیٹ میں اپنے آپ کو اس طرح رکھتا ہے کہ گاہکوں کے درمیان اس کی خوش اخلاقی کا چرچا ہو، یعنی اس کی زندگی میں ایک تضاد ہوتا ہے، اس کا ایک چہرہ اپنے گاہکوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرا عام لوگوں کے سامنے، مثلاً: مغربی اقوام اپنے ملک میں امن وامان قائم رکھتی ہیں، اگر کسی مسجد پر حملہ ہوا تو ملک کا وزیر اعظم بھی اظہارِ افسوس کے لیے مسجد پہنچتا ہے، ملک کا صدر بھی اقلیتوں کی حمایت میں اپنا بیان دیتا ہے، پولیس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے پوری قوت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، اگر حکومت کا اپنے عوام سے کوئی وعدہ ہو تو اس پر قائم رہتی ہے؛ لیکن دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہی قومیں دوسرے ملکوں اور بالخصوص مسلمان ملکوں میں زبردستی دخل دیتی ہیں، وہی فوج جو اپنے ملک میں ظلم کو برداشت نہیں کر پاتی، دوسرے ملکوں میں لاکھوں افراد کو تہ تیغ کر دیتی ہے، اپنے ملک میں اپنے آپ کو قانون کا پابند رکھتی ہے؛ لیکن جب دوسرے ملکوں میں داخل ہوتی ہے تو بہ جبر اس بات کو منواتی ہے کہ ہمارے فوجی اور کارکن آپ کے ملکی قانون سے مستثنیٰ ہوں گے، یہاں تک کہ مختلف حکومتوں سے ہونے والے معاہدات کو بلا تامل توڑ دیتی ہے اور

اپنے بینکوں میں جمع شدہ کھاتوں کو منجمد کر دیتی ہے۔

اس تضاد کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں امن و امان قائم رہے؛ تاکہ ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری ہو، دنیا بھر سے ماہرین ان کے یہاں پہنچیں، ٹیکنالوجی میں ترقی ہو اور معاشی طور پر ملک آگے بڑھے، داخلی امن اتنا مستحکم ہو کہ انہیں دوسرے ملکوں میں مداخلت کرنے میں پوری یکسوئی حاصل رہے، اگر مغربی قوموں کے اخلاق حقیقی اخلاق ہوتے تو اُنیسویں صدی میں ایشیائی اور افریقی ممالک پر جو مظالم ہوئے، جاپان میں ایٹم بم برسائے گئے، ویتنام کو بارود کا ڈھیر بنا دیا گیا، وسط ایشیائی ریاستوں میں عوام کے مقتل سجائے گئے اور بلقان کی ریاستوں میں مسلمانوں کو جو منصوبہ بند طریقہ پر ہدف بنایا گیا، اس کی نوبت نہیں آتی، اور نہ گیہوں کے ڈھیر، دودھ کی نہریں اور مکھن کے ٹیلے سمندر میں غرق کیے جاتے؛ تاکہ عالمی مارکیٹ میں ان کی پیداوار کی قیمت کم نہ ہو جائے، خواہ بھوک کی وجہ سے افریقہ کے لاکھوں افراد اپنی جانیں گنوا دیں۔

غور کیا جائے تو خدا بیزاری اور مذہب سے بے اعتنائی مغربی تہذیب کے رگ و ریشے میں رچ بس گئی ہے، جب انسان کی زندگی میں خدا کا تصور باقی نہیں رہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنے وجود کا مالک ہے، اسے حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی خواہشات مذہبی اور اخلاقی حدود کی پابند نہیں ہیں، وہ قیود و حدود سے آزاد زندگی بسر کر سکتا ہے، سوائے اس کے کہ ملک کا قانون امن عامہ کے نقطۂ نظر سے کسی بات کو منع کرے، یا کسی عمل سے اس کی نیک نامی متاثر ہو، یا اس کے معاشی فوائد پر ضرب پڑتی ہو، وغیرہ۔ اللہ کا خوف اور بے لوث اخلاقی تقاضے اس کو کسی عمل سے باز نہیں رکھ سکتے، اس وقت پورا مغربی معاشرہ اسی اُصول پر زندگی گزارتا ہے؛ اسی لیے مغربی سماج میں ماں باپ کو یا ٹیچر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچوں کی کسی خواہش میں رکاوٹ بنے، یا ان کی تنبیہ کرے، زنا، شراب اور حد یہ ہے کہ ہم جنسی کی شادی کی قانونی اجازت ہے، اسکول میں شروع سے بچوں کو یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ باپ کا ہونا ضروری نہیں ہے، تنہا ماں کا ہونا کافی ہے، ایک بچہ کی دو مائیں اور دو باپ

بھی ہو سکتے ہیں، لڑکا چاہے تو لڑکی اور لڑکی چاہے تو اس کے لڑکا بننے میں کوئی حرج نہیں ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی پولیس کا نمبر دیا جاتا ہے کہ اگر ماں باپ نے تم کو کوئی تنبیہ کی تو فوراً پولیس کو خبر کر دو اور ان کو پولیس کے نمبر یاد کرائے جاتے ہیں، اسکولوں میں ابتدائی درجوں سے سیکس ایجوکیشن دی جاتی ہے، ان سب کے پیچھے یہی تصور کارفرما ہے کہ افراد کو اپنی اپنی خواہش کے مطابق عمل کی آزادی ہے، ان کے معاملہ میں مذہب یا سماج کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

انفرادی اور شخصی آزادی کے اس مبالغہ آمیز تصور میں خاندان کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں رکھی گئی ہے، جب ایک شخص کے لیے خدا کی بات ماننا ضروری نہیں ہے، تو ایک نوجوان اپنے بوڑھے ماں باپ اور خاندان کے بزرگوں کی رائے کو کیوں اہمیت دے؟ اس لیے بقول اکبر الہ آبادی: ''بیٹے اپنے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں'' وہ کس طرح زندگی گزاریں، کہاں اپنی رات بِتائیں، کس کے ساتھ رہیں، ان کا ساتھ رہنا شادی کے ساتھ ہو یا بغیر شادی کے، کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں؟ ان سب چیزوں میں وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں، ۱۶/سال کی عمر کے بعد لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی اپنے گھر چھوڑ دیتی ہیں، زندگی کا معیار کچھ اس طرح کا ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو کام کرنا ہوتا ہے؛ اس لیے نکاح کے رشتہ میں استحکام ختم ہوتا جا رہا ہے، بین مذہبی شادی عام ہے، طلاق کی کثرت ہے، منشیات پر کوئی پابندی نہیں اور تعلیمی اداروں میں نہایت خطرناک غیر قانونی منشیات کا سیلاب آ رہا ہے؛ چوں کہ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد رہ سکے؛ اس لیے مسلمانوں کی نئی نسل بھی تیزی سے گرفتارِ بلا ہوتی جاتی ہے اور خاندانی نظام کے بکھر جانے کی وجہ سے نہ کوئی اسے روک سکتا ہے اور نہ ٹوک سکتا ہے۔

ہندوستان اس وقت تیزی سے مغرب کے راستہ پر گامزن ہے، یہاں بھی برادرانِ وطن نے اپنے مذہب کو پوجا پاٹ تک محدود کر دیا ہے، افراد کی مبالغہ آمیز آزادی سے متعلق اقوام متحدہ کے چارٹ پر ہمارا ملک دستخط کر چکا ہے اور خاندانی نظام بکھراؤ کی طرف بڑھ رہا

ہے، نوجوانوں میں یہ مزاج بن رہا ہے کہ معاملات میں ہمارے بزرگوں کو دخل دینے کا حق نہیں، عورتوں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ انہیں گھریلو زندگی تک محدود نہیں رکھا جاسکتا، وہ شمع خانہ کی بجائے شمع محفل بننے کے لیے بے چین ہیں، یہ صورتِ حال نہ صرف ہندوستان کی ہے؛ بلکہ اکثر غریب ترقی پذیر اور مسلم ملکوں کی صورتِ حال اس سے مختلف نہیں ہے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی خدا کے تصور اور مذہب کی تعلیمات سے وابستہ ہونی چاہیے؛ اسی لیے اسلام نے جیسے عبادت کے احکام دیے ہیں، اسی طرح سماجی زندگی، معاشی جدوجہد اور اجتماعی نظام کے لیے بھی اُصول وضوابط مقرر کیے ہیں؛ اس لیے اسلام ایک ایسی تہذیب کا تصور پیش کرتا ہے، جو خدا کے احکام اور مذہب کی تعلیمات کے تابع ہو، وہ اگرچہ ہر انسان کی شخصی آزادی کا قائل ہے، اس کے نزدیک ہر شخص پیدائشی طور پر آزاد ہے؛ اسی لیے تمام مالی اور غیر مالی معاملات میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ایجاب وقبول کہا جاتا ہے، خود مذہب کو قبول کرنے کے معاملہ میں بھی جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں ہے: ’’لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ‘‘ (البقرۃ:۲۵۶) لیکن اس کی آزادی اخلاقی حدود کی پابند ہے، وہ شریعت کے مقرر کیے ہوئے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی آزاد ہے اور یہی آزادی اس کے لیے مفید ہے، بے قید آزادی انسان کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتی ہے، آپ کو سڑک پر چلنے کی آزادی ہے؛ لیکن اگر آپ آزادی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مخالف سمت میں چلنا شروع کردیں، یا ریڈ سگنل کی بھی پرواہ نہ کریں تو اپنے آپ کو بھی خطرہ میں ڈالیں گے اور سامنے سے آنے والی سواری کو بھی؛ اس لیے وہی آزادی انسان کے لیے مفید ہے، جو اخلاقی اور شرعی حدود کی پابند ہو۔

اخلاقی حدود کو قائم رکھنے میں ایک اہم کردار خاندان کا ہے، خاندان فرد کی جان و مال اور عزت وآبرو کی بھی حفاظت کرتا ہے، ہر ضرورت میں اس کے کام بھی آتا ہے اور اس کی نگرانی انسان کو بے قید بھی نہیں ہونے دیتی، وہ جب کوئی قدم اُٹھاتا ہے تو اسے ماں باپ کا خوف ہوتا ہے، خاندان کے بزرگوں کا ڈر ہوتا ہے، اپنے چھوٹوں سے حیا دامن گیر ہوتی ہے،

اگر کوئی غلطی کرتا بھی ہے تو چھپ چھپا کر اور لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر، یہ چیز اسے بے راہ روی سے بچاتی اور گناہ کے مواقع سے دور رکھتی ہے، آپسی ظلم وزیادتی سے بھی دور رکھتی ہے، والدین کے حقوق کا پاس ولحاظ پیدا کرتی ہے، میاں بیوی میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور رشتۂ نکاح میں استحکام کا سبب بنتی ہے۔

مغربی تہذیب اپنی پوری قوت، معاشی وسائل، فکری ملمع سازی کی صلاحیت اور پروپیگنڈہ کے ہتھیار کے ساتھ مشرق پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہے، اس صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے تین باتیں ضروری ہیں:

پہلی بات ہے نئی نسل کی فکر سازی، جب تک سوچ تبدیل نہ ہو اسلامی تعلیمات کی حقانیت اس پر واضح نہ ہو، اس کو یہ بات سمجھا نہ دی جائے کہ بے قید آزادی انسان کے لیے زہر ہے نہ کہ امرت، وہ محسوس نہ کرلیں کہ اللہ اور اس کے احکام پر عمل کرنے میں ہی ان کی دنیا سے لے کر آخرت تک کی کامیابی ہے، تب تک ان کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی، دل ودماغ کی تبدیلی کے بغیر صرف زبان سے کسی بات کا قائل ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے پیتل کے برتن پر سونے کا پانی چڑھا دیا جائے اور اسے سونا سمجھ لیا جائے کہ معمولی خراش اس کی حقیقت کو کھول کر رکھ دے گی، اسی طرح بے شعوری کے ساتھ جو بات تسلیم کی جاتی ہے، اس میں ثابت قدمی نہیں ہوتی، فریق مخالف کا ایک ہی حملہ اس کے یقین کو پاش پاش کر دیتا ہے؛ اس لیے ہمیں نئی نسل کی فکری تربیت پر توجہ دینی چاہیے اور قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ عقل وحکمت کی مدد لے کر انہیں قائل کرنا چاہیے؛ تاکہ وہ مغرب کی فکری یلغار کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔

اسی لیے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اپنی نسلوں کی ایمانی تربیت کی بہت فکر تھی، حضرت یعقوب علیہ السلام پر جب موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے صاحب زادوں سے نماز، روزہ کے بارے میں تو سوال نہیں کیا؛ لیکن ایمان کے بارے میں سوال کیا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟: ”مَا تَعبُدُونَ مِن بَعدِی“ (البقرۃ: ۱۳۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ کوشش کرو کہ تمہارے بچوں

کی زبان سے پہلا کلمہ جو نکلے، وہ لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ ہو: ”افتحوا علی صبیانکم اول کلم بلا الہ الا اللّٰہ“ (شعب الایمان، حدیث نمبر: ۲۸۲۸) صورتِ حال یہ ہے کہ جو ماں باپ دین دار ہیں اور کسی حد تک بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے ہیں، وہ بھی بچوں کو صرف وضوء، نماز اور روزہ کے نواقض (یعنی وہ باتیں جوان کو توڑ دینے والی ہیں) سکھاتے ہیں؛ لیکن نواقض ایمان کی تعلیم نہیں دیتے، یعنی ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے، جو انسان کو ایمان سے محروم کر دینے والی ہیں اور جس کی وجہ سے ایک مسلمان دائرۂ اِیمان سے باہر ہو جاتا ہے، اس پر پوری توجہ کی ضرورت ہے، عمل کی کوتاہی سے انسان فاسق اور گنہ گار ہوتا ہے؛ لیکن فکر وایمان میں خلل سے انسان کفر وارتداد تک پہنچ جاتا ہے، کبھی یہ کفر وارتداد واضح صورت میں آپ کے سامنے ہوتا ہے اور کبھی ظاہری دین داری کے پردے میں چھپا ہوتا ہے، مگر ہوتی ہے یہ بھی کفر ہی کی ایک صورت، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

فکری تربیت کے بعد دوسری ضرورت عملی و اخلاقی تربیت کی ہے، یہ بھی بہت ضروری ہے، آج ہمارے سماج میں تصور پیدا ہو گیا ہے کہ بچوں کو اچھے کپڑے پہنانا، عمدہ کھانا کھلانا، ان کی ہر خواہش کو پورا کرنا اور اچھے مہنگے اسکول میں تعلیم دلا دینا کافی ہے، کم سے کم کسی مسلمان کے لیے یہ انداز فکر ہرگز روا نہیں، اگر بچوں کی اخلاقی تربیت نہیں کی گئی تو یہ ساری مادی سہولتیں ضائع ہو جاتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انہیں بہتر ادب سکھاؤ: ”اکرموا اولادکم واحسنوا ادبھم“ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۷۱) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی باپ نے اپنی اولاد کو بہتر تربیت سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دیا: ”ما نحل والد ولداً من نحل افضل من ادب حسن“ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۵۲) ایک اور روایت میں ہے کہ باپ نے اپنی اولاد کے لیے بہتر تربیت سے اچھا کوئی ترکہ نہیں چھوڑا: ”ماورث والد ولداً خیراً من ادب حسن“ (المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۳۶۵۸)

تربیت کوئی ایسا سودا نہیں ہے، جسے بازار سے خرید لیا جائے، جیسے بچوں کے لیے

کھانے پینے کی چیزیں خریدی جاتی ہیں؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ماں باپ خود اپنے بچوں پر وقت لگائیں، وہ روزانہ کم سے کم گھنٹہ دو گھنٹہ اپنے بچوں کے ساتھ دینی باتوں میں گزاریں، انہیں اخلاقی کہانیاں سنائیں، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے منتخب واقعات بتائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ والدین کو کن پہلوؤں سے اپنی اولاد کی تربیت کرنی چاہیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارے بچے ۷ سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو اور نہ پڑھے تو سرزنش کرو اور ان کے بستر الگ الگ کر دو (**سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، حدیث نمبر: ۵۹۴**) کن چیزوں پر خصوصی توجہ دی جائے، ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تین باتوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دو، ایک: نبی کی محبت، دوسرے: اہل بیت کی محبت، تیسرے: قرآن مجید کی تلاوت: "**ادبوا اولادکم علی خصال ثلاث: علی حب نبیکم، وحب اھل بیتہ و علی قراء القرآن**" (الدیلمی: ۱۱/۲۴)

اسی طرح ماں باپ کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کے سامنے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے، جو بچوں کے ذہن پر منفی اثر ڈالنے والی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بچے سے کہے کہ یہاں آؤ، میں یہ دوں گا، پھر وہ نہ دے تو یہ جھوٹ ہے: "**من قال للصبی: تعال ھاک، ثم لم یعطہ فھی کذبہ**" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۹۸۳۶) بعض دفعہ بچہ کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہے؛ لیکن والدین اس کے خلاف ہوتے ہیں، جیسے اولاد کی خواہش ہے کہ ڈاڑھی رکھے؛ لیکن ماں باپ اسے پسند نہیں کرتے، بچے چاہتے ہیں کہ ناجائز ملازمت اور رشوت سے بچیں، مگر والدین اسے بے وقوفی سمجھتے ہیں، بچے چاہتے ہیں کہ سنت کے مطابق نکاح کی تقریب انجام دی جائے؛ لیکن والدین تکلّفات، فضول خرچی اور مطالبہ جہیز وغیرہ پر مصر ہوتے ہیں، بچے چاہتے ہیں کہ ان کا نکاح کر دیا جائے؛ کیوں کہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؛ لیکن والدین کی ضد ہوتی ہے کہ جب تک مکان نہ بنالیں اور فلاں اور فلاں کام نہ کرلیں، اس وقت تک شادی نہ کی جائے، یہ سب باتیں غلط ہیں اور اولاد کو گناہ

کی طرف لے جانے والی ہیں، والدین کو چاہیے کہ اولاد کی تربیت تو کرے ہی اور اگر ان کی تربیت یا کسی اور محرک کی وجہ سے بچوں میں دینی رجحان پیدا ہوجائے تو اس پر عمل کرنے میں والدین ان کا تعاون بھی کریں، ان کا رویہ تعاون کا ہو نہ کہ مخالفت کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس باپ پر رحم کرے گا، جو نیکی کے معاملہ میں اولاد کی مدد کرے: ''رحم اللہ والداً اعان ولدہ علی برہ'' (مصنف لابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ۲۵۴۱۵) ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ نیکی پر اپنی اولاد کی مدد کیا کرو: ''اعینوا اولادکم علی البر'' (المعجم الاوسط، عن ابی ھریرہ، حدیث نمبر: ۶۷۰۴)

تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ اسلامی اسکولز قائم کریں، بچے اپنے بیداری اور نشاط کے اوقات کا زیادہ تر حصہ اسکول میں گزارتے ہیں، گھر آنے کے بعد بھی ان کا اچھا خاصا وقت اسکولی سرگرمیوں ہی کی نذر ہوجاتا ہے، انہیں جو دوست میسر آتے ہیں، وہ بھی ان کے اسکول ہی کے دوسرے طلباء ہوتے ہیں؛ اس لیے موجودہ دور میں بچوں پر نصابی کتابوں کا، اساتذہ کا، اسکول کے ساتھیوں کا اور اسکول میں ہونے والی غیر درسی مصروفیات کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔

دوسری طرف ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ اخلاقی تعلیمات کا کوئی حصہ نہیں ہے؛ بلکہ ایسا مواد شامل نصاب کیا جارہا ہے، جو بچوں کو اخلاقی بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے، مخلوط تعلیم عام ہے، اساتذہ کو اس بات کی ممانعت ہے کہ وہ بچوں کو تنبیہ کریں اور اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں ہمارا نظام تعلیم مکمل طور پر مغربی نظام تعلیم کے سانچے میں ڈھل جائے اور جو دینی و اخلاقی صورتِ حال وہاں ہے، وہی صورتِ حال ہمارے ملک میں بھی پیدا ہوجائے؛ اس لیے اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ مسلمان ایسے اسکول قائم کریں، جس میں معیاری تعلیم کے ساتھ بنیادی دینی تعلیم کا اہتمام کیا جائے، دینی و اخلاقی تربیت دی جائے اور طلبہ وطالبات کے لیے صاف ستھرا ماحول فراہم کیا جائے، ہمیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ ہم ایک سکولر حکومت یا برادرانِ وطن سے اس بات کی توقع رکھیں کہ وہ ہمارے بچوں کو ہمارے

مذہب کی تعلیم دیں گے اور جو ہماری ذمہ داری ہے اس کو وہ ادا کریں۔

غرض کہ آئندہ نسلوں کے ایمان اور اخلاق و اعمال کی حفاظت کے لیے بچوں کو فکری و شعوری طور پر مسلمان بنانا، ان کی اخلاقی تربیت کرنا اور ان کے لیے بنیادی اسلامی تعلیم اور دینی تربیت کے ساتھ اسلامی اسکولوں کو قائم کرنا وقت کی ضرورت ہے، ورنہ ہم عنداللہ جواب دہ ہوں گے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان اپنے گھر کے لوگوں سے متعلق نگراں و ذمہ دار ہے اور جو لوگ اس کی نگرانی میں ہیں، وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے، اسی طرح عورت اپنے شوہر کے گھر کے ساتھ ساتھ اولاد پر بھی ذمہ دار اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے: "**والرجل راع علی اهل بيته، وهو مسئول عن رعيته والمراة راعی علی اهل بيت زوجها، وولده وهی مسئول عنهم**" (صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر: ۷۱۳۸)

ایک بے زبان مظلوم کی نوائے درد!

میں ایک بے زبان ستم رسیدہ ہوں، جس کو چالیس سال سے سفاک دشمنوں نے قید کر رکھا ہے، میری تاریخ بہت قدیم ہے، کہا جاتا ہے کہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح، کنعانی خانہ بدوش میری آغوش میں فروکش ہوئے، اس کے بعد سے میں ہمیشہ ہی لٹتی اور بستی رہی، میری عظمتوں کے کیا کہنے! کہ یہیں قافلۂ نبوت کے سرخیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے آکر اپنا رخت سفر کھولا اور اپنے ایک صاحب زادہ حضرت اِسحٰق علیہ السلام کو میری گود میں بسایا، پھر ان کے بیٹے یعقوب اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، میرے ہی سینۂ گیتی پر داؤد وسلیمان علیہما السلام کا تخت اقتدار قائم ہوا اور انہوں نے عدل وانصاف سے دنیائے انسانیت کو معمور کر دیا، موسیٰ و ہارون، طالوت وسموئیل، زکریا ویحییٰ اور عیسیٰ — علیہم السلام — اور کتنے ہی پیغمبروں نے مجھ ہی کو اپنی دعوت وتبلیغ کا مرکز بنایا، یہیں سے دُور دُور تک ہدایت کی روشنی پہنچی اور بندوں کا ان کے رب سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی گئی، پھر مجھے ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے گذر کر سفر آسمانی طے کیا اور بارگاہِ ربانی میں پہنچے۔

تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں کون ہوں اور یہ کس مظلوم کی فغانِ درد ہے؟ میں قدس ہو، وہی عظیم شہر جس کو مسلمان ''بیت المقدس'' کہتے ہیں اور جس کا نام اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام نے یروشلم (Jerusalem) رکھا تھا، شاید تم نے میری مقدس نسبتوں کو بھلا دیا، تو سنو! کہ میرے بارے میں مقاتل سلیمان جیسے شارح قرآن، محدث اور فقیہ نے کہا تھا:

اس شہر کا کوئی چپہ ایسا نہیں، جس پر کسی نبی مرسل نے نماز نہ پڑھی ہو، یا ملک مقرب نے قیام نہ کیا ہو، حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا اللہ پاک نے بیت المقدس ہی میں قبول فرما کر انہیں حضرت یحییٰ کے تولد کی بشارت دی، انبیائے کرام علیہم السلام نے بیت المقدس ہی میں اللہ کے تقرب کے لیے نذر ونیاز پیش کی، بیت المقدس ہی میں حضرت مریم علیہا السلام کو

بہ حکم خداوندی جاڑے کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل جاڑے میں نصیب ہوئے، یہیں حضرت عیسیٰ بن مریم کی پیدائش ہوئی اور گود میں تکلم فرمایا، یہیں سے اللہ نے انہیں آسمان پر اُٹھایا، یہیں ان پر آسمان سے مائدہ (کھانے سے سجا ہوا دستر خوان) نازل ہوا، بیت المقدس ہی تک (شب اسراء ومعراج میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلمکو لانے کے لیے اللہ نے آپ کے لیے براق کا انتظام فرمایا تھا۔ (مولانا نور عالم خلیل امینی: فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں: ۱۳، بحوالہ الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل)

پھر تاریخ انسانی کے عادل ترین حکمرانوں میں سے ایک، مرد مؤمن اور صحابی رسول حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ھ م ۶۳۶ء کو مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں سے آزاد کرایا، جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیروکار قرار دیتے تھے؛ لیکن انہوں نے توحید کو چھوڑ کر تثلیث کو اختیار کرلیا تھا، پھر تو ہمیں دنیا کی سب سے مقدس ومحترم جگہ ہونے کا شرف حاصل ہوگیا، بڑے بڑے صحابہؓ وتابعین نے اپنے قیام کے لیے میرا انتخاب کیا اور نابغہ روزگار محدثین وفقہاء اور علوم اسلامی کے بحر ناپیدا کنار کے غواص علماء یہاں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کے علم کا فیض جاری ہوا۔

اس کے بعد ۶۳۵ء سے ۱۹۱۷ء یعنی بارہ سو سال تک میری تاریخ کا روشن اور تاب ناک دور رہا، جب میں پوری دنیا کے توحید کے متوالوں کا مرجع تھا، حجاج کی بڑی تعداد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں عبادت انجام دینے کے بعد میرا رُخ کرتی تھی اور سر کے بل چل کر پہنچتی اور قدم بوس ہوا کرتی تھی، یہاں علوم اسلامی کی کتنی مسندِ درس بچھی ہوئی تھیں، عربی زبان اس خطے کی اصل زبان تھی اور عربی واسلامی تہذیب نے ہمیں اپنے ثقافتی ورثہ سے مالا مال کردیا تھا؛ لیکن پھر ایسا ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کے رَدّ عمل میں وہاں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلائی گئی اور عیسائیوں کے مذہبی جذبات کو اُبھار کر صلیبی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ میں پورا یورپ اور پوری عیسائی دنیا متحد تھی، آخر جولائی ۱۰۹۹ء میں صلیبی فوجیں مجھ پر قابض ہوگئیں اور میری پیشانی پر صلیب نصب کردی گئی، یا تو مسلمانوں

کے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے اس طرح ہمیں فتح کیا تھا کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا، عیسائیوں اور یہودیوں کو پوری پوری امان دی گئی اور ان کی عبادت گاہوں کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، یا صلیبی دہشت گردوں نے یہاں ایسا قتل عام کیا کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں تک کو نہیں بخشا گیا، آٹھ روز تک قتل عام ہوتا رہا اور تقریباً ساٹھ، ستر ہزار افراد قتل کر دیئے گئے، جن کی لاشیں پورے شہر میں بکھری ہوئی تھیں، جب میرے احاطہ میں جس کو وہ ''سلیمان کا معبد'' کہتے تھے، وہ داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔

اس وقت مسلمانوں میں غیرت تھی اور مسلمان حکمرانوں کی نظر میں اپنے اقتدار سے زیادہ اسلام کی سربلندی کی اہمیت تھی؛ چنان چہ عماد الدین زنگی اور نور الدین زندگی جیسے حکمرانوں نے پورے خلوص کے ساتھ صلیبی طاقتوں کو شکست دینے اور مجھے واپس حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور آخر اس خواب کو مرد مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی نے پورا کیا، اور ۹۰ سال کے تکلیف دہ وقفہ کے بعد ۱۱۸۷ء میں اسلام کے ہی فرزند ارجمند کے ہاتھوں مجھے ظالموں کے پنجہ استبداد سے آزادی حاصل ہوئی، یہ ترک فاتح ایسا رحم دل تھا کہ اس نے شہر میں کسی بھی خون خرابے کو منع کر دیا اور معمولی فدیہ لے کر مفتوحین کو آزاد کر دیا، اس کے بعد بھی ہم پر اہل تثلیث کی طرف سے یلغار ہوتی رہی؛ لیکن اللہ کی مدد سے اہل توحید ہی کو غلبہ نصیب ہوتا رہا اور میری آبرو محفوظ رہی۔

اللہ ترکوں کو جزاء خیر دے اور ان کی عظمت رفتہ کو واپس لائے کہ انھوں نے صدیوں حکومت کی، ان سے میرا سودا کرنے کی بہت کوشش کی گئی؛ لیکن کبھی انھوں نے دینی غیرت اور ملّی حمیت کو فروخت نہیں کیا، یہاں تک کہ خلافتِ عثمانیہ اہل تثلیث کی سازشوں اور عربوں کی نادانی اور اقتدار کی حرص و ہوس کی وجہ سے کمزور ہوگئی، اب اس کا چل چلاؤ تھا، اس کے علاقے اس کے قبضے سے نکل رہے تھے اور سلطنت قرض میں ڈوب چکی تھی، یہودیوں نے اپنا ایک نمائندہ ''ایمانویل قراصو'' کو سلطان عبد الحمید ثانی ۱۹۱۸ء کے پاس بھیجا کہ اگر سلطان فلسطین

میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کی اجازت مرحمت فرمادیں تو صہیونی تحریک خلافت عثمانیہ کو پچاس کروڑ پاؤنڈ کا اور سلطان کے ذاتی خزانہ کے لیے پچاس لاکھ پاؤنڈ کا نذرانہ پیش کرے گی، یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ خلافت کا پورا قرض ادا ہو جاتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ شایانِ شان اجر عطا فرمائے سلطان کو کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ فرزند غیور یہودیوں کی اس تحریص وترغیب سے ذرا بھی متأثر نہیں ہوا اور اس نے کہا:

''ڈاکٹر ہرزل (جو صہیونی تحریک کا بانی اور محرک تھا) سے جا کے کہہ دو کہ اس سلسلہ میں آج کے بعد کوئی سلسلۂ جنبانی نہ کرے؛ کیوں کہ میں ہرگز دوسروں کو دینے کے لیے ارضِ فلسطین کے ایک بالشت سے بھی دستبردار نہیں ہوسکتا، ارضِ فلسطین میری ملکیت نہیں؛ بلکہ وہ میری قوم مسلم کی ملکیت ہے، جس نے اپنے لہو سے اس کی خاک کو سینچا ہے، یہودی اپنی لاکھوں کی رقم اپنے پاس رکھیں۔ (رسالہ ''التبیان'' قاہرہ، شمارہ نمبر: ۳۸، ۲۴/۴، کالم: ۳، ریاست خلافت عثمانیہ اور فاتحین، بہ قلم ڈاکٹر رضا طیب)

بعض لوگوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سلطان کے سامنے تنکہ گرا ہوا تھا، اس نے اس تنکے کو اٹھایا اور یہودی نمائندہ سے کہا کہ قومی وطن تو دور کی بات ہے، میں یہودیوں کو اس تنکے کے برابر جگہ بھی فلسطین میں دینے کو تیار نہیں ہوں؛ لیکن بالآخر مسلمانوں کی باہمی آویزش اور عربوں کی عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے جنگ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے بعد سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے، عاقبت نا اندیش عربوں نے اپنا پورا وزن ایک عیار اور اسلام دشمن برطانوی فوجی افسر ''لارنس آف عربیہ'' کے پلڑے میں ڈال دیا، جس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ خلافت ختم ہوتے ہی یہ پوری سلطنت عربوں کے حوالہ کر دی جائے گی، اس جنگ میں جرمنی اتحاد کو شکست ہوئی، جس میں ترکی شامل تھا اور برطانوی اتحاد کو کامیابی حاصل ہوئی، اس کے نتیجے میں اس پورے علاقہ کو مغربی ملکوں نے آپس میں تقسیم کر لیا، فلسطین برطانیہ کے حصہ میں آیا اور اس کے وزیر خارجہ ''آرتھو جیمس بالفور'' نے ۱۹۱۷ء میں فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک فوجی وطن قائم کرنے کا وعدہ کیا، جس کو ''وعدۂ بالفور'' کہتے ہیں، پھر تو

برطانیہ نے پوری دنیا سے لا لا کر یہودیوں کو یہاں آباد کرنا شروع کردیا اور ایک یہودی مملکت قائم کرنے کی بھرپور تیاری کرلی، بالآخر نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرار داد نمبر ۱۸۱ پاس کی، جس کے تحت فلسطین کو عربی اور یہودی سلطنتوں میں تقسیم کردیا گیا، یہودی ریاست کو ۵۴ فی صد زمین دی گئی اور عربی ریاست کو ۴۵ فی صد اور ایک فی صد یعنی بیت المقدس کی جگہ کو عارضی طور پر عالمی خطہ قرار دیا گیا؛ چناں چہ ۱۴؍مئی ۱۹۴۸ء کو صہیونیوں نے مملکت اسرائیل کا اعلان کردیا، لاکھوں فلسطینی اُجاڑ دیئے گئے، اس کے بعد سے پھر بار بار ان کا قتل عام ہوتا رہا اور آخر عرب قومیت کے جاہلی جذبہ سے متاثر ہوکر خلافتِ اسلامی کا قصر عالی مقام منہدم کرنے والوں کو ان کی شامت اعمال کی سزا جلد ہی مل گئی۔

ابھی بھی میں عربی ریاست ہی کا حصہ تھا؛ لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مجھ پر بھی اسرائیل نے تسلط جما لیا، اس وقت کے حکمراں موجودہ حکمرانوں سے کہیں بہتر تھے، انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے اور ۱۹۶۷ء کا مقبوضہ علاقہ واپس حاصل کرکے رہیں گے، متعدد بار اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل سے اس کے حق میں قرار داد بھی منظور کرائی گئی؛ لیکن اسرائیل اور مغربی ممالک نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ: ''جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' آخر مسلم حکمرانوں کی حرص وطمع اور ضمیر فروشی نے رنگ لانا شروع کیا؛ چناں چہ ۱۹۶۷ء میں مصری صدر انور السادات نے اسرائیل سے ہاتھ ملا لیا، پھر اُردن نے سر جھکایا، یہاں تک کہ ''تنظیم آزادیِ فلسطین'' جو فلسطینیوں کی اصل نمائندہ تنظیم تھی، نے ۱۹۹۱ء میں میڈرڈ (اسپین) میں اسرائیل سے مذاکرات کیے اور بالآخر ۱۹۹۳ء میں ''معاہدۂ امن'' پر دستخط ہوگئے، اس میں فلسطین کو نہ وطن ملا اور نہ بیت المقدس، نہ پندرہ سے بیس لاکھ اُجاڑے گئے فلسطینیوں کی واپسی کی ضمانت حاصل ہوئی، صرف زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا دے دیا گیا کہ بچے کچھے فلسطینی اسرائیل کی غلامی میں زندگی کی سانس لیتے رہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس معاہدہ میں میرے بیٹوں نے میری آبرو فروخت کردی، نہ اسلامی اقدار کا لحاظ رکھا اور نہ عربی غیرت کا کوئی پاس!

یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ خود فلسطین میں جذبہ شہادت سے سرشار کچھ لوگ اُٹھے اور انھوں نے ظاہری وسائل سے محروم ہونے کے باوجود جہاد شروع کیا، جن میں سرفہرست شیخ عز الدین محمد قسام ہیں، وہ واقعی بڑا مرد مجاہد اور اسلامی حمیت سے سرشار شخصیت کا مالک تھا، مجاہدین کی یہ تحریک ''حماس'' کے نام سے آگے بڑھی اور وہ اب بھی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے میری آزادی کی جدوجہد کر رہی ہے؛ لیکن آہ اور صد بار آہ! کہ جو مسلمان مجھے اپنا قبلۂ اَوّل کہتے ہیں اور اپنے نبی کے سفرِ آسمانی کی پہلی منزل قرار دیتے ہیں، انہوں نے اپنے دل و دماغ صہیونیوں کے ہاتھ بیچ دیئے ہیں، انہوں نے چھپے طور پر اسرائیل سے گہرے دوستانہ مراسم قائم کر لیے ہیں، مصر میں جب سے اس عہد کے سب سے بڑے منافق ''سیسی'' نے ظلم و جور کے ذریعہ اپنی آمریت قائم کی ہے، اس نے حماس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے، امریکہ اور اسرائیل کی ہاں میں ہاں ملا کر عرب حکومتوں نے میری بازیابی کی کوشش کو دہشت گردی قرار دے دیا ہے، اسرائیل نے کئی بار مسلمانوں اور عربوں کے مقتل سجائے ہیں؛ لیکن وہ دہشت گرد نہیں ہیں اور جو لوگ اپنے مادرِ وطن اور مقدس مقامات کی آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں، وہ دہشت گرد ہیں، خلافتِ عثمانی کا جانشین ترکی اور اس کا صدر طیب اُردگان ''بیاباں کی اس شب تاریک میں قندیل رہبانی'' کا درجہ رکھتا ہے، اس کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، قطر نے ہمارے سینہ گیتی پر بسنے والوں کو انسانی مدد فراہم کی، اسی کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے، اسرائیل کے جہاز عرب ملکوں کی فضاؤں سے گذر سکتے ہیں؛ لیکن اس برادر مسلم ملک کا جہاز ان کی فضا سے نہیں گذر سکتا، جب کوئی جھوٹ بولنے اور اس کو پھیلانے کا عادی ہو جاتا ہے تو اس میں سچ کو سننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے؛ اسی لیے ظالموں نے اپنے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے الجزیرہ کی آواز بند کرنے کا تہیہ کر لیا ہے؛ تاکہ مظلوموں کی آہ بھی لوگوں تک نہ پہنچ سکے اور سنا ہے کہ عرب حکمراں مل جل کر میرے کفن دفن کا نظم کرنے کی سازش میں مشغول ہیں کہ حماس کو اُجاڑ دیا جائے، بھاگنے والے فلسطینیوں کو سینا کے بے آب و گیاہ صحرا میں بسا دیا جائے اور غزہ اسرائیل کے حوالہ ہو جائے؛ تاکہ فلسطین کا مسئلہ ختم ہو جائے اور

اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہ ہو۔

میرے سینے سے ہوک سی اُٹھتی ہے، میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر رواں ہے، میرے ہونٹوں سے نکلنے والے فغانِ درد نے بے زبان شجر وحجر کو بھی تڑپا دیا ہے، کاش! کوئی عمر فاروق ظاہر ہوتا اور ہمیں اس اسیری سے نجات دلاتا، کاش! کوئی صلاح الدین ایوبی آتا اور ہمیں اس قید ظلم وجور سے آزاد کرا دیتا، اور کاش! آج کے مسلم حکمرانوں میں کوئی سلطان عبدالحمید ہوتا جو مادی نقصان اور اقتدار سے محرومی کو تو گوارا کر لیتا؛ لیکن دینی حمیت اور ملّی غیرت کا سودا نہ کرتا!!

ایک مظلوم کی فریاد — انصاف کے ایوان میں!

مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں بہت سے غم دیکھے ہیں، چوٹیں سہی ہیں، زخم کھائے ہیں، دکانیں لٹائی ہیں، اپنے عزیزوں اور بزرگوں کی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں، کبھی کبھی عزت و آبرو کی قربانی بھی دین حق پر استقامت کی پاداش میں دی ہے اور اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے لہو کے انمٹ نقوش سے لالہ زار کیا ہے؛ لیکن ۶ ؍دسمبر کا زخم ایسا ناسور ہے، جو کسی طور مندمل نہیں ہوتا اور جب تک دوبارہ یہاں اللہ کا گھر نہ بن جائے اور اس کے میناروں سے اللہ کی کبریائی اور توحید کی اذان جاں فزا بلند نہ ہونے لگے، اس وقت تک اس غم کا مداوا نہ ہو سکے گا، مسلمانوں کی اگلی نسلیں بھی اس غم کو فراموش نہ کرسکیں گی کہ متاعِ غم متاعِ حیات بن چکا ہے اور اسے لٹایا نہیں جاسکتا۔

فرقہ پرست عناصر کہتے ہیں کہ بابری مسجد رام جی کے پیدائشی مقام پر بنائی گئی ہے، یہ دعویٰ عقل ونقل اور تاریخ و آثار ہر پہلو سے غلط ہے، اَوّلاً تو یہ بات ہی متعین نہیں کہ کیا رام جی کا حقیقی معنوں میں وجود تھا یا محض ایک افسانوی نام اور علامتی کردار ہے؟ کیوں کہ رام جی سے وابستہ جو تاریخ ہندو مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہے، اس کے توہماتی اور دیومالائی ہونے میں کسی حقیقت پسند ہندو دانش ور کو بھی شک وشبہ نہیں؛ اس لیے بہت سے ہندو دانش وروں کا بھی خیال ہے کہ رام جی کی حیثیت ایک افسانوی کردار کی ہے نہ کہ حقیقی شخصیت کی، پھر اگر مان لیا جائے کہ رام جی کا حقیقی وجود تھا اور آپ ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے تو سوال یہ ہے کہ ایودھیا سے کون سا علاقہ مراد ہے؟ کیوں کہ آثارِ قدیمہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈینٹ ایم وی این کرشنا راؤ نے انکشاف کیا تھا اور ثبوتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا تھا کہ اصل ایودھیا ہریانہ کا مقام ''بناؤلی'' ہے۔ (قومی آواز دہلی ۶ مارچ ۹۸ء) واضح ہو کہ مسٹر راؤ آثارِ قدیمہ کے ماہرین میں سے ہیں، رام پور کے ایک پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ رام جی کی پیدائش کی اصل جگہ رام پور ہے اور اس سلسلہ میں ان کے پاس ثبوت موجود ہے، اس طرح کے دعویٰ کو بے دلیل نہ سمجھنا چاہیے؛ کیوں کہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شہر کسی نام سے معروف تھا اور یہ اپنی جگہ سے

ہٹتے ہٹتے کافی دور پہنچ گیا، شہر کے باشندے اور کاروباری نقل مکانی کرتے رہے اور پھر وہی دوسری جگہ اس شہر کے نام سے موسوم ہوگئی۔

اگر ایودھیا وہی جگہ ہے جو اس وقت ''ایودھیا'' کہلاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس شہر میں رام جی کی پیدائش کس جگہ پر ہوئی؟ کیوں کہ اس وقت ایودھیا میں تقریباً نو دس ایسے مندر موجود ہیں، جن کی بابت ان مندروں کے متولیوں کا دعویٰ ہے کہ یہی رام جی کی جائے پیدائش ہے، پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں رام جی کی اصل جائے پیدائش معلوم کرنے کے لیے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اس کمیٹی نے کافی تلاش وجستجو کے بعد دو مقامات کے بارے میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ رام جی کی جائے پیدائش ہو، ان میں سے ایک کا نام ''رام جنم استھل'' رکھا گیا اور دوسرے کا ''رام جنم بھومی'' یہ دونوں جگہیں بابری مسجد کے علاوہ ہیں، بابری مسجد کے محل وقوع کے رام جی کے جائے پیدائش ہونے کا ذِکر مفسد اور تفرقہ انداز انگریزوں سے پہلے نہ کسی تاریخی کتاب اور سفر نامہ میں ہے اور نہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں۔

اگر یہ بات فرض بھی کرلی جائے کہ رام جی کی جائے پیدائش وہی جگہ ہے تو بھی اس بات کا ثبوت مطلوب ہوگا کہ اس جگہ پہلے مندر تھا اور اس کو توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی؟ اور اگر اس مقام پر مندر کے پائے جانے کا کوئی ثبوت ملتا ہے تب بھی یہ بات محتاجِ دلیل ہے کہ مسلمانوں نے اس جگہ جبراً مسجد بنائی ہے؛ کیوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقام کے باشندوں نے اس جگہ کو مسلمانوں سے فروخت کردیا ہو اس لیے کہ مسلمانوں کے یہاں مسجد کی زمین خرید وفروخت نہیں کی جاسکتی؛ لیکن دوسری قوموں کے یہاں مذہبی عبادت گاہوں کے بارے میں ایسا تقدس نہیں پایا جاتا؛ چناں چہ یورپ میں یہودی اور عیسائی بے تکلف اپنے چرچ فروخت کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے اس مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کی تھی؛ لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابل یقین ہے؛ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا

گیا بھی ہو، بابر نے خود ترکی زبان میں ''بابرنامہ'' تحریر کیا ہے، نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرّخین نے اس کا ذکر کیا ہے، بابرنامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور مقیم ہوا تھا؛ چناں چہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں ہے کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں۔ (بابر، ص: ۳۹) پروفیسر آر ناتھ (یونی ورسٹی جے پور راجستھان) نے بھی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا۔ (بابر، ص: ۶۹)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہو، اس کی صداقت کو پرکھنے کے لیے ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے، اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے: کیوں کہ بابر کٹر مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا، منصف مزاج غیر مسلم مؤرّخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، راجہ شیو پرشاد نے اپنی کتاب ''آئینۂ تاریخ'' کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دور میں نظم حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا تھا، پروفیسر آر ناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جا سکے، پروفیسر سری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو، یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو، پروفیسر آر سی رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا۔ (بابر، ص: ۸۰)

مشہور محقق جناب سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' میں بابر کی عالی ظرفی اور حسن سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پروفیسر بنرجی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز کرنے کا ذِکر کیا ہے اور اس کی طرف مندر اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت

کو غلط قرار دیا ہے اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے۔ (بابر، ص: ۲۸) یہاں تک کہ بابر نے اپنے وصیت نامہ میں گاؤکشی سے منع کیا ہے؛ تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکرا پادھیائے نے مارچ ۱۹۹۵ء میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے: میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں... رام چرت مانش یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو، یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو، جہاں بابری مسجد تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنائی گئی ہے، اس مقصد کے لیے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کیے کہ مسجد کے ستون غیر اسلامی ہیں وغیرہ، ورنہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں؛ بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کیا تھا، اکبر کو چوں کہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا؛ اس لیے اس نے اس سے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بنوادی، ۱۹۴۶ء سے پہلے بابری مسجد کے محل وقوع کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا؛ بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ عدالت میں گیا اس وقت مہنت رگھو پرداس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو سردی گرمی اور برسات سے بچانے کے لیے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے؛ لیکن ۲۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کو عدالت نے یہ عرض رَدّ کردی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود ہندوؤں کے یہاں بھی مندر کے

انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

پھر غور کیجیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا جائز نہیں؛ البتہ نماز پڑھ لی جائے تو ادا ہو جاتی ہے؛ لیکن مغصوبہ زمین پر نماز ادا کرنے والا گنہ گار ہے اور ظاہر ہے کہ مسجدیں ثواب کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں نہ کہ گناہ کے لیے، تو کوئی مسلمان کیسے ایک زمین غصب کر کے مسجد تعمیر کر سکتا ہے؟ اس لیے نہ عقل اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، نہ تاریخ کی گواہی اس کے حق میں ہے، علم الآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ عقل ہی اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، اس لیے بابری مسجد کا مسئلہ اس ملک کی جمہوریت اور نظامِ عدل کے لیے ایک چیلنج اور امتحان ہے جب تک اس مظلوم مسجد کو انصاف نہیں ملے گا، اس ملک کی جمہوریت اور رواداری کا چہرہ داغ دار ہی رہے گا۔

مظلوموں کے ساتھ مل کر ظالموں کا مقابلہ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے، تو عام طور پر ان کا سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک ''قوم کے سر برآوردہ لوگ'' جن کو باعزت اور بلند مرتبت سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے ''اراذل قوم'' یا ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور کمزور لوگ، جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، ہر نبی کی دعوت اپنی قوم میں ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے ابھرتی تھی، قوم کے سر برآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے تھے؛ البتہ ان میں جو لوگ حقیقت پسند اور نیک خو ہوتے تھے، وہ اپنی بڑائی کو قربان کر کے نبی کی دعوت پر لبیک کہتے تھے؛ لیکن ابتداءً ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوتِ حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ پہل کرتے اور پھر ظلم وجور کی بھٹی میں تپائے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظامِ غیبی کے تحت ہوتا کہ چوں کہ وہ پہلے سے مظلوم وستم رسیدہ ہوتے؛ اس لیے ان کے لیے ظلم وزیادتی اور تحقیر وتذلیل کا رویہ کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوتِ حق کو قبول کرنے میں سردارانِ قوم ہی اصل میں رکاوٹ بنتے ہیں، اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر مخالفت کی، اس لیے نظامِ غیبی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سردارانِ مکہ جمع کر دیئے گئے، اور وہ سب بدر میں ہلاک ہوئے، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دیئے ہیں، بدر کے بعد اہلِ مکہ کے دو ہی قابلِ ذکر سردار باقی رہ گئے، ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، مدینہ میں جو اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہوئی، تو اس کی ایک وجہ وہی تھی جس کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے اوس وخزرج کی خانہ جنگی میں عبداللہ بن ابی کے علاوہ صف اوّل کے تمام قائدین لقمہ اجل بن چکے تھے؛ اس لیے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظّم طاقت موجود نہیں تھی، عبداللہ بن ابی نے

اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی؛ لیکن انصارِ مدینہ پر نشہ ایمانی چڑھ چکا تھا کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے غیبی نظام کے تحت بعثت محمدی سے پہلے ہی سردارانِ مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لیے نرم و ہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورتِ حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو یہی طبقہ ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے معاند تھے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، حالاں کہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں؟ ''قَالُوْا اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الاَرْذَلُوْنَ'' (الشعراء:۱۱۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ نے ''ارذلون'' کا ترجمہ ''کمینے'' سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قومِ نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے کہ سردارانِ قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں: ''وَمَا نَرَاکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا'' (ہود:۲۷)

ہم جس ملک میں رہتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اسی طبقہ میں فٹ کر رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بسا دیا ہے کہ وہ فرماں روائی اور حکمرانی ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں؛ کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازوؤں سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انھوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کم تر ہیں، وہ دوسروں کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے؛ لیکن وہ ملک میں ۵۶ فی صد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں اور اقتدار کے در و بام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملاء قوم ہیں، جن کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے

ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں عدل وانصاف اور سچائی کے سامنے سرخمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ ''دلت'' کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں ''ارا ذل قوم'' کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انہیں نیچ، گنوار اور کم تر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم و جور کی چکی میں پیسی جارہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہورہی ہے، انہیں تحفظات دیئے جارہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انہیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگادیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیر اعظم نہیں بن سکے؛ کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کیے گئے ہیں، اور ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لیے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتایئے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے؟!

جو لوگ مظلوم، دبے کچلے، اور دبائے ہوئے ہوں، ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لیے صرف سیاسی مصلحت نہیں؛ بلکہ دینی اور ملّی فریضہ ہے، چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں لڑتے جو مغلوب ہیں، مرد، عورتیں اور بچے۔'' (النساء:۷۵)

قرآن نے یہاں مغلوبوں کے لیے ''مستضعفین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے ''مستضعفین'' ہیں تو شاید بے جا نہ ہو؛ اس لیے ان کو ساتھ لینا اور اس ملک کے ظالموں کو مشترک تدبیر کے ذریعہ ظلم سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، بدقسمتی سے ہم نے اس اہم کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی؛ بلکہ ہندوؤں کی اونچی برادری سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کم وبیش وہی رویہ اختیار

کیا؛ بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں بھی مختلف دیواریں کھڑی کرلیں، بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہوجاتی ہیں کہ پاس کا آدمی نظر نہیں آتا۔

اس صورتِ حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہنچایا ہے، ایک تو اس ملک میں دعوتِ اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اگر ہم اس طبقہ سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہو سکتے تھے، ہر قوم میں دعوتِ حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے کہ پہلے ایسے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے، پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا تو بالآخر جو طبقہ انہیں پنچ گردانتا تھا، اس کے لیے بھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا، پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا، پھر اہلِ مدینہ نے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ سردارانِ مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہوئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے، یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے، کالے، گورے، عرب، عجم کی کوئی تفریق نہیں، ایک ہی مسجد میں سب کو خدا کی عبادت کرنی ہے، جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو، وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو، اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو، انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں؛ بلکہ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے، یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور مبنی بر انصاف ہے کہ جن قوموں کو پنچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لیے بہت بڑی رحمت باور کرتی ہیں، اگر اسلام کے اس عظیم اصولِ زندگی کو ان محروم و مظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے متأثر نہیں ہوں، اور اس ابر رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں، مگر افسوس اور صد ہزار افسوس! کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اعتبار سے ہم خود اچھوت ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوجاتے، جن کی تعداد ملک میں ساٹھ، پینسٹھ فی صد

سے کم نہیں، تو اگر ہم بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلت ہی کو اپنا ہتھیار اور آلہ کار بناتے ہیں، اگر ہم انہیں قریب کرلیں تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہو جائیں۔

وقت ابھی بھی گیا نہیں ہے، اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہیے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہیے کہ دلت سیاسی وسماجی قائدین کے ساتھ تبادلہ خیال کریں، انہیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے! سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انہیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انہیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیرِ انتظام اسکولوں میں انہیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں، پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کرلیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی کے ساتھ آپ کی طرف راغب ہو جائیں گے، ایک ایسی قوم جو انسان تسلیم کیے جانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل جیتنے کے لیے کافی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں، ایک ٹھکرائی ہوئی قوم کو سینہ سے لگائیں اور انہیں محبت کی سوغات دیں، اس میں ہماری جان ومال کی حفاظت ہے، عزت وآبرو کا تحفظ ہے، سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے دعوت کے وسیع مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔

مظلوموں کے ساتھ مل کر جد و جہد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو پوری انسانیت کے لئے عموماً اور امت محمدیہ کے لئے خصوصاً اسوہ ونمونہ بنایا گیا ہے: **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (الاحزاب:۱۲) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان پر جس طرح کے بھی حالات پیش آئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کو نقش راہ اور نمونہ عمل جائے گا، وہ غالب ہو یا مغلوب، فتح یاب ہو یا شکست سے دوچار، مال دار ہو یا غریب، دوستوں کے درمیان ہو یا دشمنوں کے درمیان، اپنوں سے سابقہ ہو یا بیگانوں سے، ہر جگہ اور ہر حال میں سیرت طیبہ اس کے لئے چراغِ راہ اور خضر طریق ہے، شاید اسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب ومقبول بندے کو ہر طرح کی آزمائشوں سے گزارا ہے، اور وہ تمام مصیبتیں جو اس امت پر آسکتی ہیں، ان سب سے آپ کو بھی دوچار کیا گیا ہے؛ تاکہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو مسلمان نورِ نبوت کی رہنمائی سے محروم نہ رہ جائیں اور انہیں کسی اور چراغ سے روشنی مستعار نہ لینی پڑے۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس میں سیرت کے ایک خاص واقعہ کو پڑھنے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ ہے "حلف الفضول" کا واقعہ، واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنائے جانے سے پہلے ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قبیلہ بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے اور انہوں نے عاص بن وائل سہمی سے اپنا تجارتی مال فروخت کیا، عاص نے قیمت کی ادائیگی میں ٹال مٹول شروع کر دیا اور ظلم وانکار پر اتر آیا؛ چنانچہ اس مسافر نے ٹھیک اس وقت جب قریش صحن کعبہ میں بیٹھا کرتے تھے، بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر لوگوں کو آواز دی کہ ایک مظلوم شخص کی پونجی لے لی گئی ہے، ایک ایسے شخص کی جو اپنے وطن اور بال بچوں سے دور ہے اور حرم محترم کی وادی میں مقیم ہے، اس طرح کے ظلم وزیادتی کے واقعات مکہ میں پیش آتے رہتے تھے؛ لیکن اس اجنبی شخص نے کچھ ایسے درد کے ساتھ اپنی فریاد پیش کی کہ قریش کے رحم دل لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر

نہ رہے اور قریشِ مکہ کے چند اہم خاندان ــــ بنو ہاشم، بنو مطلب، اسد بن عبد العزیٰ، زہرہ بن کلاب اور تمیم ابن مرہ ــــ کی اہم شخصیتیں عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئیں، اور آپس میں معاہدہ کیا کہ مکہ میں کوئی بھی مظلوم ہو، خواہ مکہ کا رہنے والا ہو یا مکہ کے باہر سے آیا ہو، ہم سب مل کر اس کی مدد کریں گے اور ظالم کو حق دینے پر مجبور کریں گے، اس معاہدہ کا نام ''حلف الفضول'' رکھا گیا، یہ نام کیوں رکھا گیا؟ اس سلسلہ میں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ''فضل'' کے معنی زیادتی اور اضافہ کے ہیں اور اس معاہدہ میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اگر کسی شخص پر دوسرے کے ذمہ زائد حق باقی ہو تو وہ اس کو دلایا جائے گا۔ (المعتصر من المختصر لابن یوسف موسیٰ حنفی: ۲/۳۷۵) اور بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ اتفاق سے اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں میں ''فضل، فضالہ اور مفضل'' تھے، یعنی ان تینوں کے نام کا جز ''فضل'' تھا؛ اس لئے اس کو ''حلف الفضول'' یعنی ''فضل والوں کے معاہدہ'' کا نام دیا گیا۔ (فتح الباری: ۴/۴۷۳)

اس معاہدہ کی اس لئے غیر معمولی اہمیت تھی کہ جزیرۃ العرب میں کوئی حکومت قائم نہیں تھی، لا اینڈ آرڈر کے لئے کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا، عرب کے مختلف قبائل کے درمیان بڑا تعصب اور تعصب کی وجہ سے اپنے خاندان کا تحفظ پایا جاتا تھا؛ لیکن اگر کوئی کمزور خاندان ہو یا اجنبی لوگ ہوں تو ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا، ان حالات میں یہ معاہدہ لا اینڈ آرڈر کو قائم رکھنے اور کمزوروں کو طاقت وروں کے ظلم سے بچانے کی ایک منظّم کوشش تھی، اس کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ اس معاہدہ میں قریش کے تمام قبائل شامل تھے، اگر چند اشخاص یا کوئی کم تعداد اور کمزور قبیلہ اس کام کو لے کر اٹھتا تو اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا؛ لیکن اتنے سارے کثیر التعداد اور مکہ کے طاقتور خاندانوں کو نظر انداز کر دینا کوئی آسان بات نہ تھی؛ اس لئے اس معاہدہ کی بڑی اہمیت تھی اور اسی لئے یہ معاہدہ لاقانونیت کے ماحول میں امن وامان اور عدل وانصاف قائم رکھنے کی ایک مثبت اور موثر کوشش ثابت ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس معاہدہ میں شریک تھے اور اسلام کے غلبہ کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر اب

بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا: ''**لو دُعیتُ به الیوم فی الاسلام لاجبته**'' (فتح الباری: ۴۷۳/۴) اور بعض روایتوں میں ہے کہ مجھے اس معاہدہ سے غائب رہنا پسند نہیں، اگرچہ اس کے بدلے مجھے سرخ اونٹنیاں مل جائیں۔ (المعتصر من المختصر: ۳۷۵/۲)

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں اور سیاسی اعتبار سے جس تنہائی کا شکار ہیں، ان کے لئے سیرت کا یہ واقعہ بہترین پیغام اور ان کی دشواریوں کا حل ہے، حلف الفضول کس ماحول میں قائم کی گئی تھی؟ ایسے ماحول میں جب ظالموں کو ظلم سے روکنے والی قوت موجود نہیں تھی، جب مظلوموں کے لئے انصاف حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، جب برائیاں تھیں؛ لیکن برائیوں کو چیلنج کرنے والی کوئی طاقت نہیں تھی —— حلف الفضول کا مقصد کیا تھا؟ معاشرہ میں انصاف کا قائم کرنا، کمزوروں کو انصاف دلانا اور ظلم سے بچانا —— حلف الفضول کا طریقہ کار کیا تھا؟ جمہور کی مدد سے ظالم کا پنجہ تھامنا، اجتماعی شیرازہ بندی کے ذریعہ قیام عدل کی کوشش کرنا، چھوٹی چھوٹی طاقتوں کو جمع کر کے ایک بڑی طاقت اس لئے تیار کرنا کہ ظلم کو روکا جائے اور انصاف قائم کیا جائے۔

ہمارے ملک میں بھی اس وقت یہی صورت حال ہے، ظلم کا خونی پنجہ اتنا طاقت ور ہو چکا ہے کہ علی الاعلان خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، لوگوں کی املاک لوٹی جاتی ہیں، عزت و آبرو پامال کی جاتی ہے، بستیاں اجاڑی جاتی ہیں اور لاشوں پر چڑھ کر اقتدار کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی جد وجہد کی جاتی ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ لوگ اس صورت حال کو دیکھ کر بے قرار ہو جائیں، ہر زبان ایسے ظالم کو ٹوکے، ہر ہاتھ ایسے ظالم کو روکے اور ہر آنکھ ان پر غیظ وغضب کی آگ پھینکے، مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ ظالموں کی حمایت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں، ذرائع ابلاغ درندوں کو فرشتہ بنا کر پیش کر رہے ہیں اور انصاف کے قاتلوں کو ہیرو بنایا جا رہا ہے، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ یہاں ایک نئی شیرازہ بندی کریں، خود آپس کے اختلاف کو نظر انداز کر کے کم سے کم ایک نکاتی ایجنڈے پر متفق ہو جائیں

کہ وہ فرقہ پرست طاقتوں سے ملک کو بچائیں گے، ملی اتحاد کی اس کوشش کے ساتھ ساتھ کم سے کم تین اور طبقات کو ہمیں جمع کرنا چاہئے: اولاً: دوسری اقلیتوں کو، خاص کر سکھ اور عیسائی اقلیت کو، جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سیاسی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہیں، دوسرے: دلتوں کو، جو ہزاروں سال سے مظلومانہ زندگی گزار رہے ہیں اور جن کو اپنے بارے میں یہ اعتراف ہے کہ وہ ہندو نہیں ہیں، انہیں زبردستی ہندو بنا دیا گیا ہے، تیسرے: سیکولر برادرانِ وطن کو؛ کیوں کہ آج بھی ہندو بھائیوں کی اکثریت اس ملک کے فرقہ وارانہ رخ اختیار کرنے پر فکر مند بھی ہے اور متاسف بھی، اگر مسلمان ان تینوں گروہوں کو ساتھ لے کر ایک 'حلف الفضول' قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں، ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم بنائیں جو ہر ظلم کے مقابلہ میں کمر بستہ ہو اور ہر مظلوم کو انصاف دلانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو، کسی دلت کے ساتھ زیادتی ہو تو پُر امن طریقے پر مسلمان احتجاج کریں اور کسی مسلمان کے ساتھ زیادتی ہو تو اس کے تحفظ کے لئے دلت آگے بڑھیں، اگر اس طرح کا کوئی پلیٹ فارم قائم کرنے میں مسلمان کامیاب ہو جائیں تو موجودہ حالات میں یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی اور بہت سے امراض کا مداوا اور مشکلات کا حل ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام عدل، تحفظ اور امن وامان کی برقراری کے لئے غیر مسلم ابنائے وطن کے ساتھ مختلف معاہدات کئے ہیں، خود مکہ میں بھی آپ نے اہلِ مکہ سے پیش کش کی تھی کہ بقائے باہم کے اصول پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں سوسائٹی میں مل جل کر رہیں، قرآن مجید کی سورہ کافرون میں یہی فارمولہ پیش کیا گیا ہے، پھر مدینہ پہنچتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان، یہودی اور مشرک قبائل کے درمیان ایک اہم معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کو قید تحریر میں بھی لایا گیا اور تمام قبائل کے اس پر دستخط لئے گئے، جس کو ''میثاق المدینہ'' کہا جاتا ہے اور حلف الفضول کا واقعہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی نبوت سے پہلے کا ہے؛ لیکن اس کی جو اہمیت آپ کی نگاہ میں تھی، اس کا اندازہ اس جملہ سے کیا جا سکتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا جائے تو میں اس کو قبول کروں گا'' گویا یہ ایک

وقتی تدبیر اور عارضی حکمت عملی نہیں تھی؛ بلکہ ایک اصولی فیصلہ تھا، جو اسلامی تعلیمات کی روح پر مبنی اور اس کے اصول انصاف کا آئینہ دار تھا۔

اس ملک کو بچانے، ملک کے دستور اور اس کی جمہوری قدروں کو بچانے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نہ صرف اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہونے کے لحاظ سے بلکہ خیر امت ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ حقیر اور وقتی مفادات کو نظر میں رکھنے کے بجائے ملک وملت کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھ کر اس سلسلہ میں پیش قدمی کریں، اس کوشش میں منصوبہ بندی بھی ہونی چاہئے، اور ایسی حکمت عملی بھی کہ فرقہ پرست طاقتیں ہماری کوششوں کو ہندو مسلم لڑائی میں تبدیل نہ کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر موجودہ حالات میں مسلمان بے سمتی کا شکار رہے اور انہوں نے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق اپنے لئے راہ عمل متعین نہیں کی، تو اتنے بڑے نقصان کا خطرہ ہے جس کی تلافی دشوار ہو جائے گی۔

حوصلہ نہ ہاریئے!

یو پی کے حالیہ الیکشن نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ملک کے تمام محبّ وطن، انصاف پسند اور سیکولر مزاج شہریوں کو مایوس کر دیا ہے اور ان کے لئے بڑے اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے، اس میں فرقہ پرست طاقتوں کو خود ان کی اُمید سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس میں ایک طرف ان کی کوششوں کا دخل ہے اور دوسری طرف سیکولر پارٹیوں کی غفلت شعاری اور مسلمانوں کی بے شعوری کا، فرقہ پرست طاقتیں عرصے سے اپنی کوششوں میں مشغول تھیں، انھوں نے گاؤں گاؤں اور گلی گلی اپنے لوگوں کو پھیلا دیا تھا، جو دروازہ دروازہ پہنچ کر نفرت انگیز پرچار میں مشغول تھے، نفرت انگیز باتیں آسانی سے لوگوں کے جذبات کو متأثر کرتی ہیں اور بالخصوص اگر غریبوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ فلاں گروہ تمہارا حق کھاتا جا رہا ہے تو اس احساس کی وجہ سے حقیقی مسائل کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور لوگ فرضی مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں، کوشش بہر حال رنگ لاتی ہے، چاہے وہ درست مقصد کے لئے ہو یا نادرست مقصد کے لئے؛ اس لئے یہ کوشش رنگ لائی اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ بی جے پی دو تہائی سے بھی زیادہ اکثریت کے ساتھ اقتدار پر براجمان ہو چکی ہے۔

سیکولر پارٹیاں ایک تو آخر دم تک آپس میں لڑتی رہیں، پارٹی کے اندر بھی انتشار برپا رہا، دوسرے انھوں نے صرف جلسوں اور ریلیوں کو کافی سمجھا، گھر گھر پہنچ کر ذہن سازی کی کوشش نہیں ہوئی اور نہ ان کی طرف سے سوشل میڈیا کا کما حقہ استعمال ہوا، وہ فرقہ پرست پروپیگنڈے کا جواب بھی نہ دے سکے، اور عوام کو یہ نہیں بتا سکے کہ یہ ملک گنگا جمنی تہذیب کا ملک ہے، صدیوں سے یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے آئے ہیں، اس ملک کو آزاد کرانے میں، اس کی ترقی میں اور اس کے تحفظ میں سبھوں کی کوششیں شامل ہیں؛ بلکہ اپنے آپ کو سیکولر کہنے والی پارٹیوں نے نفرت انگیز پروپیگنڈوں کا جواب دینے کے بجائے ذات پات کا اور نام نہاد اقلیت دوستی کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کی بے شعوری کی صورت حال یہ ہے کہ ان کے ووٹ خزاں رسیدہ درخت کے پتوں کی طرح بکھر گئے، پانی کے معمولی قطرات جب موج بن کر متلاطم ہوتے ہیں ،تو وہ چٹانوں کو بھی اپنے راستوں سے ہٹا دیتے ہیں؛ لیکن اگر قطروں میں تقسیم ہوجائیں تو ہوا کا معمولی جھونکا اسے فضا میں تحلیل کر دیتا ہے، اب یہ بات مسلمان سیاسی قائدین کے سوچنے کی ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور آئندہ اس سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟ اور علماء اور مذہبی قائدین کے لئے بھی لمحہ فکر یہ ہے کہ وہ بکھرے ہوئے مسلمانوں کو جمع کرنے میں کیوں ناکام رہے اور کس حد تک اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کی؟

اجتماعیت کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک: ایثار، دوسرے: اجتماعی مفاد کو ترجیح دینا، ایک ہی حلقہ سے جب کئی کئی مسلم اُمیدوار کھڑے ہوں، یا مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی متعدد جماعتیں اپنے اُمیدواروں کو کھڑا کر دیں تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ مسلم ووٹوں کی تقسیم اور اس تقسیم کی وجہ سے فرقہ پرست عناصر کی کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا، ایسے مواقع پر اگر بعض حضرات ایثار سے کام لیں اور اجتماعی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے مقابلہ سے ہٹ جائیں، یا مسلم تنظیمیں آپس میں حلقوں کی تقسیم کرلیں تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی منزل کو پاسکیں گی، ورنہ یہ بے ایثاری اور اجتماعی مفاد کے مقابلہ انفرادی مصالح کو ترجیح دینے کا رجحان سبھوں کو ناکامی ومحرومی سے دوچار کرے گا اور بار بار انہیں اِس تجربے سے گزرنا پڑے گا، اس وقت ملک کے مختلف علاقوں میں مسلمان اسی صورت حال سے گزر رہا ہے، امت میں اتحاد انضمام سے قائم نہیں ہوسکتا ہے، تقسیم سے قائم ہوسکتا ہے، اگر ہم چاہیں کہ سب لوگ ہمارے ساتھ آکر مل جائیں تو یہ بات دوسروں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی؛ لیکن اگر حلقے تقسیم کرلئے جائیں تو ہوسکتا ہے کہ اس سے سبھوں کو کامیابی کا کوئی حصہ مل جائے۔

اتر پردیش کی اس شکست میں کئی سبق آموز پہلو بھی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ اپنے ہر پروگرام کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دینا اور نوشتہ دیوار بنا دینا عقل مندی نہیں ہے، اس سے آپ کے مخالفین جاگ جاتے ہیں، آپ کے عزائم فلک شگاف نعروں کی شکل اختیار کر کے

فضا میں تحلیل ہوجاتے ہیں؛ لیکن آپ کے دشمن ردعمل کے طور پر ایک منصوبہ بناتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہوجاتے ہیں؛ اس لیے الیکشن میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اخبارات کے ذریعہ کرنے کے بجائے سینہ بہ سینہ لوگوں تک پہنچا کر کرنا بہتر ہے، یہ طرزعمل مخالفین کو جگانے کا سبب نہیں ہوتا ہے، آج کل میسیج اور واٹس ایپ کے ذریعہ یہ بات آسان ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کا ایک تھنک ٹینک ہو جو ووٹنگ سے چند گھنٹے قبل گھر گھر اپنا پیغام پہنچائے کہ انھیں اپنے حلقہ میں کس امیدوار کو ووٹ دینا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ کسی مہم پر تشریف لے جاتے تو ساری تیاری ہوتی؛ لیکن قریب ترین رفقا کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ آپ کا کہاں کا ارادہ ہے؟ صرف غزوۂ تبوک کے موقع سے آپ نے صحابہؓ کو پہلے سے اپنے ارادہ سے باخبر کردیا تھا؛ کیوں کہ غالباً مدینہ میں ایسے لوگ نہیں تھے، جن کا رومیوں سے ربط ہو، اگر آپ سے منزل دریافت بھی کی جاتی تو مبہم طریقہ پر فرماتے کہ فلاں علاقہ کی طرف جانے کا ارادہ ہے، متعین طور پر اپنی منزل کا ذکر نہیں فرماتے، یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ نے اپنے سفر کو اس قدر مخفی رکھا اور ایسا نامانوس راستہ اختیار کیا کہ مکہ کی سرحد تک پہنچنے پر بھی لوگوں کو کوئی خبر نہیں ہوسکی، اسی طرح مکی زندگی میں انفرادی طور پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، مگر آپ نے کبھی اس کا اعلان و اظہار نہیں فرمایا؛ بلکہ بعض حضرات کو مصلحت کے تحت قبول اسلام کو چھپانے کا حکم دیا؛ لیکن آج کل مسلمانوں میں قبل از وقت تشہیر کا مزاج عام ہوگیا ہے، نہ صرف سیاسی قائدین بلکہ مذہبی رہنما بھی کھلے عام کسی فریق کی تائید اور کسی کی مخالفت کا اعلان کردیتے ہیں، یہی حال دوسرے معاملات میں بھی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اسلام قبول کرلے تو اخبار میں اشتہار شائع ہوتا ہے: ''فلاں شخص فلاں کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا'' اس میں قبول اسلام سے زیادہ ''دست حق پرست'' کی تشہیر مقصود ہوتی ہے، یہ طرز عمل مسلمانوں کو تمام ہی مسائل میں اور خاص کر سیاسی اعتبار سے بہت نقصان پہنچا رہا ہے، مسلمان خود تو متفق نہیں ہو پاتے؛ کیوں کہ جب ایک ہی جگہ سے کئی کئی مسلمان مسلمانوں کی

خدمت کے نام پر اُٹھیں گے، تو ان کا متحد ہونا ممکن نہیں ہوگا، اسی طرح جب آپ مجمع عام میں کسی کو کلمہ پڑھاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں اس کی تشہیر کرتے ہیں تو فطری طور پر، پہلے جس سماج سے اس کا تعلق تھا، اس سماج کے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے؛ اس لیے موجودہ نازک حالات میں بڑی حکمت سے کام لینے کی اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اور منصوبوں کو صیغہ راز میں رکھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہمارے مخالفین چاہتے ہیں کہ ہم مشتعل ہوں، ہماری گفتگو تیز اور دوسروں کے لئے اہانت پر مبنی ہو، ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ ہمارا لب ولہجہ جتنا تیز ہوگا، مخالفین کا ووٹ بینک اسی قدر مضبوط ہوگا اور انھیں نفرت پھیلانے میں سہولت ہوگی، اشتعال انگیز تقریر چاہے ایک جگہ ہو؛ لیکن اس کا اثر پوری ریاست اور پورے ملک میں ہوتا ہے، چاہے وہاں مسلمان امیدوار میدان میں موجود ہو یا نہ ہو، اس سے عمومی سطح پر مخالفانہ رائے بنتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا سبق ملتا ہے، مدینہ میں منافقین کا ایک ایسا گروہ موجود تھا، جو مسلمانوں کا بغلی دشمن تھا اور مسلم سماج سے ہر طرح کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے زندگی گزار رہا تھا؛ لیکن مسلمانوں کے خلاف ہونے والی ہر سازش میں شریک ہوتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا؛ لیکن آپ کی اعلیٰ ظرفی اور مصلحت اندیشی کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس پردۂ راز کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی؛ کیوں کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ یہ ان مسلمانوں کے لیے غلط فہمی اور رنج کا باعث بنے، جو حقیقت حال سے واقف نہیں تھے اور جن کا منافقین سے قریبی ربط وضبط تھا، اسی طرح یہود قدم قدم پر مسلمانوں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچاتے تھے؛ لیکن آپ نے کبھی بھی پوری قوم یہود کے تئیں سخت رویہ اختیار نہیں فرمایا؛ بلکہ جس قبیلے کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی، آپ نے صرف ان کے خلاف کارروائی کی۔

آپ کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے مدینے میں آباد مختلف لوگوں

سے الگ الگ قبیلے کی حیثیت سے معاملہ طے کیا، تمام یہودیوں کو ایک کمیونٹی کا درجہ نہیں دیا؛ بلکہ آپ نے الگ الگ قبیلے کی حیثیت سے ان سے معاملہ رکھا؛ اسی لئے جب یہودیوں کے ایک قبیلہ کا مسلمانوں سے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ٹکراؤ ہوا تو دوسرا قبیلہ غیر جانب دار ہو گیا، اس ملک میں مسلمانوں کی یہی پالیسی ہونی چاہئے کہ برادرانِ وطن کی مختلف ذاتوں کے ساتھ الگ الگ طریقہ پر معاملات کریں، ہندو بھائیوں میں بڑی تعداد انصاف پسند بھی ہے، ان میں بھی ایک طبقہ ظلم وجور کا شکار رہا ہے، ہم جب مسلمانوں پر ظلم وجور کی باتیں کریں تو تمام ہندوو?ں کو اپنا فریق نہ بنائیں، ہماری گفتگو سنگھ پریوار اور سنگھ ذہنیت کے حامل لوگوں تک محدود رہے اور ہم بار بار اس بات کو واضح کریں کہ ہندو بھائیوں سے ہماری لڑائی نہیں ہے، ہم سب ایک ملک کے باشندہ ہونے کی نسبت سے بھائی بھائی ہیں، ہماری پوری کوشش ہونی چاہئے کہ مسلمان اور غیر مسلم دو مقابل فریق نہ بن جائیں، ورنہ جب ایک طرف اسی فیصد لوگ اور دوسری طرف پندرہ تا بیس لوگ ہوں تو ظاہر ہے کہ کامیابی پہلے فریق ہی کو حاصل ہوگی۔

ان سبق آموز پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس وقت الیکشن کے نتائج سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئی ہیں، وہ اس انتخابی شکست کو اپنی شکست سمجھنے لگے ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، اگر نتیجہ اس کے برعکس ہوتا اور اپنے آپ کو سیکولر کہنے والی پارٹیاں کامیاب ہوتیں تب بھی ایسا نہیں تھا کہ مسلمانوں کو اقتدار میں کوئی بڑا حصہ مل جاتا، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ موجودہ حکومت مسلمانوں سے سب کچھ چھین لے گی، ہم سیاسی پارٹیوں کے سہارے اس ملک میں نہیں رہتے ہیں، ہماری قوت ملک کے دستور سے ہے، جو پارٹیاں اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں، انھوں نے بھی کبھی ہمارے غم کا مداوا نہیں کیا، اور مسلمان ایسا لقمہ تر بھی نہیں ہیں کہ موجودہ حکومت انھیں چبا جائے، ہم اس ملک میں برابر کے شہری ہیں، اس کے چپہ چپہ پر ہمارے خون جگر کے نقوش ثبت ہیں، ہم نے مجبوری کی بنا پر اس ملک میں رہنا قبول کیا ہو، ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں

مسلمانوں کو اجازت دی گئی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو پڑوسی ملک میں چلے جائیں؛ لیکن مسلمانوں نے اپنی پسند سے اس ملک کا انتخاب کیا، اس لیے ہمیں پوری قوت اور دل جمعی کے ساتھ اپنے حقوق کی لڑائی لڑنی چاہیے اور ہمت نہیں ہارنی چاہیے، یہ انتخابی جنگ ایک عارضی واقعہ ہے، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے لیے بزدلی اور ہمت ہارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا کہ مسلمانوں میں حوصلہ ہارنے کا مرض پیدا نہ ہو، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم پر صحابہ کا ایک دستہ بھیجا، اتفاق سے وہ دشمن کے مقابلے میں ٹھہر نہیں پائے، جب واپس ہوئے تو مدینے میں چھپ کر داخل ہوئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری توبہ کو قابل قبول سمجھا، تب تو ہم مدینہ میں ٹھہریں گے، اور اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم مدینے سے واپس ہو جائیں گے؛ چناں چہ فجر کی نماز سے پہلے مسجد میں جا کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارکہ سے باہر نکلے، کھڑے ہو گئے اور شرمندگی کے ساتھ کہنے لگے: ہم بھاگے ہوئے لوگ ہیں: ''نحن الفرارون'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: نہیں؛ بلکہ تم دوبارہ حملے کے لیے پیچھے ہٹے ہو: ''انتم العکارون'' ہم لوگ آگے بڑھے اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مسلمانوں کی کمک ہوں ''انا فئی المسلمین'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۴۷) یعنی اگر مسلمان فوج پیچھے ہٹ جائے تو میں اس کے لئے سہارا ہوں، اس حدیث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ صحابہ جو احساس شکست کی وجہ سے ٹوٹے ہوئے تھے، آپ نے چاہا کہ ان کا حوصلہ ٹوٹنے نہ پائے؛ کیوں کہ جب کسی قوم کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی قوت مقابلہ ختم ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت اس فوج کی ہو جاتی ہے، جو دشمن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دے۔

غزوۂ احد کا موقع صحابہ کے لیے بڑا ہی حوصلہ شکن تھا؛ کیوں کہ اہل مکہ نے مدینے کی

سرحد پر پہنچ کر یہ حملہ کیا تھا، ستر صحابہ شہید کردیئے گئے، بہت سے صحابہ زخمی ہوئے، یہاں تک کہ خود رسول اللہ خون سے لہولہان ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کی ہمت کو سہارا نہ دیا گیا تو ان کی قوت مقابلہ ختم ہوکر رہ جائے گی؛ اسی لئے آپ نے صحابہ کو ترغیب دی کہ وہ اہل مکہ کا پیچھا کریں اور صحابہ نے دور تک مکہ واپس ہونے والی فوج کا تعاقب کیا؛ حالاں کہ وہ خود زخموں سے چور چور تھے، اس کا دہرا فائدہ ہوا کہ ایک طرف صحابہ کا حوصلہ بلند ہوا، دوسری طرف اہل مکہ نے محسوس کیا کہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنا حوصلہ کھودیا ہو؛ اسی لئے حالاں کہ انھوں نے مسلمانوں کو آئندہ سال بدر میں مقابلے کے لئے چیلنج کیا تھا؛ لیکن آئندہ سال مسلمان تو بدر میں پہنچے، مگر اہل مکہ کو اس کی ہمت نہیں ہوسکی۔

غزوۂ احد ہی کے موقع پر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے قرآن نے کہا: ''تم بزدل اور رنجیدہ نہ ہو، اگر تم پختہ ایمان کے حامل ہوجاؤ؟ تو تم ہی غالب رہوگے:'' وَلاَ تَھِنُوا وَلاَ تَحزَنوا وَاَنتم الاَعلَونَ اِن کنتم مؤمِنِینَ'' (آلِ عمران: ۱۳۹) مختلف مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر خازن: ۱/۴۲۴) ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اِنَّ الَّذِینَ قَالوا رَبنَا اللّٰه ثمَّ استَقَاموا تَتَنزَّل عَلَیھِم المَلاَ ئِکَ اَلَّا تَخَافوا وَلَا تَحزَنوا وَاَبشِروا بِالجَنَّۃِ الَّتِی کنتم توعَدونَ۔'' (حٰم السجدۃ: ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا: کہ اللہ ہمارا رب ہے، پھر وہ ثابت قدم ہوئے تو (ان کی مدد کے لئے) ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) تمہیں نہ خوف ودہشت ہو اور نہ رنج وغم، اور تم کو جنت کی خوش خبری ہو، جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا تھا۔

یعنی ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر حوصلہ شکن واقعات پیش نہ آئیں گے، اور وہ رنج وغم سے دوچار نہ ہوں گے؛ لیکن ایسے مواقع پر مسلمانوں کا رَدِّ عمل ان قوموں سے مختلف ہونا چاہیے، جو خدا پر یقین نہیں رکھتے؛ کیوں کہ ان کی منزل دنیا ہے اور ہماری منزل آخرت، یہ

یقین جتنا مضبوط ہوگا، مسلمانوں کے قدم میں اسی قدر جماؤ پیدا ہوگا، حوصلہ شکن حالات سے ان کی ہمتیں ٹوٹیں گی نہیں؛ بلکہ ان کے حوصلے اور مضبوط ہوں گے؛ کیوں کہ ان کے سامنے خدا کا وعدہ ہوگا کہ مسلمان شکست سے دوچار ہوں گے؛ لیکن بالآخر فتح وکامرانی ان ہی کے ہاتھوں ہوگی، جو ہارتا ہے، وہی آئندہ جیتا بھی ہے، جس میں ہارنے کا حوصلہ نہ ہو، وہ کبھی جیت کا منھ نہیں دیکھ سکتا؛ اسی لیے ہمیں ہرگز حوصلہ ہارنا نہیں چاہئے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خدا کے غیبی نظام کے مقابلے دنیا کے مادی نظام پر ہمارا یقین بڑھ جائے، ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کوئی رات ایسی نہیں ہے جس کی صبح نہ ہو، جب رات کی تاریکی گھٹاٹوپ ہو جاتی ہے تو اسی کے جلو سے صبح کا رخ روشن کائنات کے افق پر نمودار ہوتا ہے۔

بے برداشت ہونے سے بچیں!

گذشتہ پارلیمنٹ الیکشن میں فرقہ پرست، فسطائی طاقتوں کی شکست نے ان کو بوکھلا کر رکھ دیا، اور وہ نفرت کی آگ سلگانے کے لیے نئے ایندھن کی تلاش میں ہیں، بعض ریاستوں میں اسمبلی الیکشن کی تشہیری مہم جاری ہے، اس لئے خاص طور پر ایسے موضوعات کی تلاش ہے، جو ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے، اور عوام کو دھوکہ دے کر اور بے وقوف بنا کر ووٹ حاصل کیا جائے، فرقہ پرست طاقتوں نے پہلے بھی یہ سب کچھ کیا تھا اور اس کا خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا تھا، اب دوبارہ یہی کوشش کی جا رہی ہے، ان حالات میں ضرورت ہے کہ مسلمان مشتعل نہ ہوں؛ کہ اس سے ان کے معاندین کا مقصد پورا ہو جائے گا، اس لئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بعض اوقات صبر اور برداشت خود ایک تدبیر ہوتی ہے، بظاہر اس میں جذبات مجروح ہوتے ہیں، لیکن در حقیقت اسی میں کامیابی مضمر ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے، ایک: یہود، دوسرے: منافقین، یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی، اور منافقین بغلی دشمن تھے، عبداللہ ابن ابی ان کا سردار تھا، ابتداء اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام ا کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا؛ بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، مگر اسلام کے بعد عبداللہ بن ابی کا خواب پورا نہ ہو سکا، غالباً اس لئے بھی عبداللہ بن ابی کے سینہ میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتش غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء 'مہاجرین اور انصار' کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبداللہ ابن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا، اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور انصاری صحابیؓ کے درمیان کچھ تکرار ہو گئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخص کا نہ رہا،

بلکہ دو جماعتوں ——انصار و مہاجرین—— کا اختلاف بن گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن عبداللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین و انصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری مثال عربی زبان کے اس محاورہ کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر و تا کہ وہ تم ہی کو کھا جائے'' **سمن کلبک یا کلک**'' پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی ، ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبہ ایمان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح صورتِ حال عرض کر دی، حضرت عمرؓ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا، اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا ، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرا رہے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی، اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی ہے، انصار میں سے اکابر اور سر برآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار ہے؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی، بہر حال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہو گیا اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں

پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے، لیکن خلافِ معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دو پہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوگئے، چلچاتی ہوئی دھوپ، گرم ریت، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر بھی جاتا رہا، در اصل یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا، تا کہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں۔

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبد اللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آگیا، حضراتِ انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہوگیا، تو عبد اللہ ابن ابی کے صاحبزادے — جو مخلص مسلمان تھے — اور ان کا نام بھی عبد اللہ ہی تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں، اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں، لیکن مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاید میں ان کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حکم فرمائیے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورتِ حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو سکتے تھے، اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور درپردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں، اور خود ان کا لڑکا اس کے قتل کے لئے تیار ہے، حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں برکت رکھی ہے۔

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن مجید نے ''صبر'' سے تعبیر کیا ہے، صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں، صبر یہ ہے کہ آدمی

اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے، اس لئے کہ اشتعال اور غیظ وغضب کی حالت میں انسان کی قوتِ فیصلہ کم یا ختم ہو جاتی ہے، اور فراست و دوانش مندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دوررس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا، صلح حدیبیہ ہی کو دیکھئے: بظاہر صلح الف سے یا تک مسلمانوں کی امنگوں کے خلاف تھی، صلح نامہ لکھتے ہوئے "**بسم اللہ الرحمٰن الرحیم**" لکھا گیا، اہل مکہ کے نمائندہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ پر " **باسمک اللّٰھم**" لکھنا پڑے گا، اسے قبول کرلیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی " **محمد رسول اللہ** " لکھا گیا، دوسرے فریق نے "رسول اللہ" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی تیار ہو گئے، حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہو سکا، اور وہ کلمہ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خود محو فرما دیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے، یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں، یہ ساری باتیں عربوں کی

روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار رکھنا یہ بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا، اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جارہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا، اکثر صحابہؓ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہوسکا اور انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کرلئے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی ''فتح مبین'' قرار دیا، (فتح:۱) در اصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح وشام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کو معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف ودہشت کی فضاء میں کھل کر دعوتِ اسلام کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی اور جن لوگوں کو میدانِ جنگ میں فتح نہیں کیا جاسکا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب واذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کم وبیش چودہ سو تھے، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغازِ نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی اور اگلے چار

سال میں ان کی تعداد یقیناً سوا ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوا لاکھ کے قریب تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالت سے گزر رہے ہوں، وہ سیاسی اورافرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصاً، اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں، جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ وغضب پر صبر اور خوش تدبیری کو اور مناسب موقع ومحل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک کر اٹھائیں، ایسا ردِ عمل نہ کریں جو خود کشی کے مترادف ہو اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے، یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہو جانا فرقہ پرستوں کی بڑی کامیابی، اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت ہے اور حقیقت میں فتح مبین!!

کمتر برائی کا انتخاب

ملک کے بعض علاقوں میں الیکشن کا بگل بج چکا ہے اور معرکہ انتخاب پوری طرح گرم ہو چکا ہے، سیاسی جماعتیں سنہرے خواب اور سبز باغ دکھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں، وعدوں کی بہتات بھی ہے اور اپنی خدمات کے بارے میں ادّعات اور دعووں کی فراوانی بھی — ہندوستان کے اکثر علاقے آج بھی روشنی سے محروم ہیں، ہزاروں دیہات اور قریہ جات کا سڑکوں سے رابطہ نہیں، بے روزگاری میں روز افزوں اضافہ ہے، جرائم کی کثرت ہے، ملک کے بڑے بڑے قائدین اور سیاسی رہنماؤں کے بارے میں رشوتوں اور جرائم کے اسکامس بارش کی طرح منظر عام پر آئے ہیں اور آتے جا رہے ہیں، اور کیوں نہ ہو کہ پارلیمنٹ میں بھی اور مختلف ریاستوں کی اسمبلیوں میں بھی پولیس کے نامزد مجرم بڑی تعداد میں موجود ہیں، ایسے لوگوں سے اس کے سوا اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ لیکن جب کسی چیز کی کثرت ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ دل و دماغ اسے قبول کر نے لگتا ہے، اور اس کی شناعت کا احساس کم ہوتا جاتا ہے، یہی کیفیت اس وقت جرائم پیشہ سیاست دانوں کے سلسلہ میں پیدا ہو چکی ہے۔

اپنی کمزوریوں پر پردہ رکھنے اور لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لئے آج کل ایک نیا سلسلہ سیاست کے افق پر فلمی ستاروں کی بارات سجانے کا شروع ہوا ہے اور قومی علاقائی جماعتیں ایک سے ایک فلمی اداکار اور اداکارہ کو اپنے اسٹیج پر لا رہی ہیں؛ تاکہ عوام کو بہتر تماشہ دیکھا سکیں اور نوجوانوں کا شوقِ دید بھی پورا ہو، یہ یقیناً سیاسی قیادت کی سطحیت اور گراوٹ کی بات ہے اور اس انحطاط پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے، اگر آئندہ سیاسی جلسوں میں رقاصاؤں سے رقص کرایا جائے اور گلوکاروں سے گیت سنوائی جائے تو تعجب نہ کرنا چاہئے؛ کیوں کہ جب مقصود سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنانا ہے اور کسی نہ کسی طرح عوام کی بھیڑ اکھٹا کرنا ہے، تو پھر کھیل تماشہ کے ماہرین کا کوئی بھی گروہ سیاست کی بساط پر اتر سکتا ہے اور اپنے کرشموں سے ایک ازدحام جمع کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے موجودہ الیکشن بہت ہی نازک حالات لے کر آیا ہے، فرقہ پرستی اور فاشزم بامِ اقتدار پر چڑھ چکی ہے اور سر توڑ کوشش کر رہی ہے کہ اپنے تختِ اقتدار کو مضبوط سے مضبوط تر کرلے، پوری طرح قوت فیصلہ حاصل کر لے اور اپنے اقتدار کو طویل سے طویل تر کرلے، بہت سی وہ جماعتیں جو سیکولرزم کا نقاب اب تک اوڑھے ہوئی ہیں اور جن کا سیکولرزم حکومت کے فرقہ پرستانہ ایجنڈے کے خلاف مزاحمت کی تحریک بھی پیدا نہیں کر پا رہا ہے، اقتدار کی حرص وہوس نے ان کو اپنے نظریاتی دشمنوں کے ساتھ ایک کشتی کا سوار بنا دیا ہے، بلکہ وہ فرقہ پرست طاقتوں کو اپنا ناخدا تسلیم کر چکے ہیں، دوسری طرف وہ جماعتیں ہیں، جو اپنے آپ کو جمہوریت کا نمائندہ قرار دیتی ہیں، لیکن ان کا ماضی کچھ کم داغ دار نہیں، ان کا حال یہ ہے کہ جماعتی سیاست ان کو ان نظریاتی مقاصد سے زیادہ عزیز ہے، جس کا وہ اپنی زبان سے اور اپنے منشور میں اظہار کرتے ہیں، یہ امنگ اور حوصلہ سے عاری ہیں، ان کی مثال ایسی فوج کی ہے جو نیم دلی کے ساتھ کسی فوج کے مقابلہ کے لئے لے جائی جاتی ہے، نہ اس کے دوست متعین ہیں اور نہ دشمن، یہ دو طرفہ آگ ہے، جس کی حرارت انگیزی میں کم وبیش کا فرق تو ہوسکتا ہے، لیکن کوئی اساسی اور بنیادی فرق ان کے طرزِ عمل میں نہیں ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس صورتِ حال کو ''نرم ہندوتوا'' بہ مقابلہ ''سخت ہندوتوا'' کا نام دیا ہے، انتخاب کی راہیں محدود ہیں اور کوئی ایسی قوت موجود نہیں، جس کے بارے میں یہ توقع کی جاسکے کہ وہ ملک کے اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے گی۔

آخر مسلمان ان حالات میں کیا کریں؟ ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم الیکشن سے اپنے آپ کو الگ کرلیں، یہ بڑی عاقبت نا اندیشی کی بات ہوگی اور جو تھوڑا بہت لوگ الیکشن کے وقت مسلمانوں کا آنسو پونچھنے اور کچھ جھوٹے سچے وعدے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی ختم ہوجائے گا، پھر مسلمان اس ملک میں ایک ذلیل ومقہور گروہ رہ جائیں گے اور سنگھ پریوار اور وی، ایچ، پی جس کے منصوبوں میں پہلے سے یہ بات داخل ہے کہ اقلیتوں کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیا جائے، یہ عملاً ان کے منصوبہ کو کامیاب کرنے کے مترادف ہوگا، اس

لئے الیکشن میں حصہ لینا ایک بہت بڑی ضرورت ہے، اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ووٹ کا حق ضرور ہی استعمال کرے اور یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلمانوں کے ووٹ کو متحد کرنے کی کوشش کریں، ہمارے بکھرے ہوئے ووٹ کی سیاست کے ترازو میں کوئی قیمت نہیں ہوگی، ہمارے متحد ووٹ سے ہی ہم ملک کی سیاست میں اپنا وزن قائم کر سکتے ہیں۔

اس وقت لوک سبھا کی ۵۴۵ سیٹیں ہیں، جن میں سے ۲۰ سیٹیں پارلیمنٹ پر کرتی ہے، اگر مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ مانی جائے تو ۵۴۵ میں سے ۱۱۹ سیٹیں مسلمان کی ہونی چاہئیں جب کہ اب تک مسلمان ممبروں کی تعداد چوبیس سے اڑتالیس تک رہی ہے، اور وہ بھی مسلمانوں کے نمائندے کم اور جس سیاسی جماعت کے واسطے سے منتخب ہوئے ہیں، ان کے نمائندہ زیادہ رہے ہیں، جنوبی ریاستیں آندھرا، تمل ناڈ، کرناٹک اور کیرالہ کی ۱۲۹ سیٹوں میں سے ۶۰ سیٹوں میں مسلمان ووٹرس کی تعداد ۲۰ فیصد سے زیادہ ہے، ملک کے چودہ اضلاع میں مسلمان ووٹرس کا تناسب ۳۳ فیصد سے زیادہ ہے، یوپی میں مسلمان ووٹرس کا تناسب ۱۵ء۹۳ فیصد اور بہار میں ۱۴ء۱۳ فیصد ہے، بہار کے ضلع پورنیہ میں مسلم آبادی ۱۴ء۵۴، کٹیہار میں ۱۰ء ۳۶ اور دربھنگہ شہر میں ۵۴ فیصد ہے، یوپی کے ضلع رام پور میں ۱۲ء۴۷، بجنور میں ۴۵ء۳۹، مراد آباد میں ۶۰ء۳۸، سہارنپور میں ۵۶ء۳۱ مظفر نگر میں ۳۷ء۲۵ اور بہرائچ میں ۲۵ فیصد ہے، لیکن افسوس کہ ان میں سے بہت سے مقامات وہ ہیں، جہاں مسلم ووٹ کے بکھراؤ کی وجہ سے فرقہ پرست جماعتیں الیکشن جیت جاتی ہیں، کم وبیش پارلیمنٹ کے ۴۷ حلقوں میں مسلم ووٹرس کا تناسب ۲۰ فیصد سے زیادہ ہے، اگر ان پارٹیوں اور پارٹی کے امیدواروں کے ووٹ کا تناسب دیکھا جائے جو فتح یاب ہوتی رہی ہیں، تو صاف اندازہ ہوگا کہ اگر مسلمان دانشمندی سے کام لیں اور متحدہ طور پر کسی پارٹی کے حق میں ووٹنگ کریں، تو وہ زیادہ تعداد میں مسلمان یا مسلمان دوست امیدواروں کو کامیاب کر سکتے ہیں اور اگر بادشاہ کا نہیں، تو کم از کم بادشاہ گر کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ نے ایک صاحب سے سوال کیا کہ علم کسے کہتے ہیں؟ انھوں

نے جواب دیا: شر کے مقابلہ میں خیر کو جاننا ''معرفة الخير من الشر'' حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی، کیوں کہ ظاہر ہے کہ جب ایک طرف شر اور دوسری طرف خیر ہو تو خیر کا انتخاب کیا جائے گا اور شر کو چھوڑ دیا جائے گا، پھر فرمایا کہ علم نام ہے دو شر میں سے ایسی چیز کے جاننے کا جو نسبتاً بہتر ہو'' معرفة خير الشرين'' — یہ نہایت اہم قاعدہ ہے، جو کتاب وسنت کے مختلف احکام سے ثابت ہے، برائی کو روکنا واجب ہے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاقت سے روکنے پر قادر نہ ہو تو زبان سے ٹوکنے پر اکتفا کرے اور زبان سے ٹوکنا بھی دشوار ہو تو دل سے برا سمجھنے پر اکتفا کرے، اس کا مقصد یہی ہے کہ بعض دفعہ کسی برائی کو روکنے میں انتشار اور اختلاف کا اندیشہ رہتا ہے، تو مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے موقع پر خاموشی اختیار کر لینا بہتر ہے، چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ میرے بعد تم ایسے حکمرانوں کو دیکھو گے جو تم سے اپنے حقوق کو وصول کریں گے، لیکن تمہارے حقوق ادا نہیں کریں گے، ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جواب دیا کہ ہم انھیں نوکِ شمشیر سے سیدھا کر دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ صبر سے کام لینا، تا آنکہ وہ بھی اللہ کے دربار میں آجائیں اور تم بھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا منشاء یہی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنا حکمرانوں کی بے راہ روی سے زیادہ اہم ہے، اس لئے اسے متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: '' صلوا خلف كل برّ و فاجر'' (اچھے اور برے امام کے پیچھے نماز ادا کرلو) اس ارشاد کا منشاء بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو مقتدی کی نماز کا ضامن قرار دیا ہے، اس لئے امام کو بہتر سے بہتر ہونا چاہئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر قرآن پڑھنے والے، سنت سے سب سے زیادہ واقف وآگاہ اور سب سے زیادہ ورع وتقویٰ رکھنے والے کو امام ہونا چاہئے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاجر کی اقتداء کو بھی جائز قرار دیا اور صحابہؓ نے حجاج بن

یوسف جیسے لوگوں کی اقتداء میں بھی نماز ادا فرمائی، اس کا منشاء بھی وہی ہے کہ امت کو انتشار اور بکھراؤ سے بچایا جائے، کیوں کہ بعض دفعہ ایسے لوگ امامت پر فائز ہو جاتے ہیں جو کردار و عمل کے اعتبار سے مجروح ہوتے ہیں، لیکن اگر انھیں ہٹانے کی کوشش کی جائے تو فتنہ و انتشار کا اندیشہ رہتا ہے، ایسی صورت میں امت کو انتشار سے بچانا زیادہ اہم ہے۔

اسلامی قانون کے ماہرین نے اسی بنیاد پر چند قواعد مقرر کیے ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب ہوگا: **یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام** ۔عمومی نقصان کو دور کرنے کے لئے خصوصی اور شخصی نقصان کو گوارہ کیا جائے گا۔ جیسے کوئی جاہل شخص ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرلے تو اس سے اس کو روکا جائے گا، اگر تاجر گراں فروشی شروع کردے تو اشیاء کا نرخ متعین کیا جا سکتا ہے؛ تاکہ اس اجتماعی نقصان کو دور کیا جا سکے، جب دو برائیاں درپیش ہوں تو کمتر برائی کو گوارہ کر کے بڑی برائی کو روکا جائے گا۔ اس اصول کو فقہاء نے مختلف الفاظ اور تعبیرات میں بیان کیا ہے، مثلاً یہ کہ ''دو شر میں سے کمتر کو اور دو ضرر میں سے ہلکے ضرر کو گوارہ کیا جائے گا'' یا یہ کہ ''جہاں دو نقصان درپیش ہوں تو کمتر نقصان کو گوارہ کر کے بڑے نقصان سے بچا جائے گا۔''

مصلحت اور منفعت کو حاصل کرنے سے زیادہ اہم مفاسد کو دور کرنا ہے۔ یعنی اگر ایک طرف کسی فائدہ کا حصول ہو؛ لیکن اس میں دوسرا پہلو نقصان کا ہو، تو نقصان کے دور کرنے کو ترجیح حاصل ہوگی۔

غور کیجئے! فقہاء کے اجتہادات ان ہی اصولوں پر مبنی ہیں، اور ایک ایسے وقت میں جب کہ سیاست کے حمام میں تمام لوگ بے لباس ہیں اور مسلمان دو مقابل قوتوں کی ضرر رسانی اور تیشہ زنی کا تجربہ کر چکے ہیں، ضروری ہے کہ وہ دانشمندی سے کام لیں اور زیادہ اور کمتر نقصان کا صحیح تجزیہ کر کے لائحہ عمل بنائیں، کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ فراستِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے دو ناگزیر برائیوں میں سے کمتر برائی کو گوارہ کریں۔

ان حالات میں سب سے اولیت اس بات کو حاصل ہے کہ کون سا امیدوار فرقہ

پرست تنظیم کو شکست دے سکتا ہے، اس کو ترجیح دی جائے، خواہ وہ امیدوار مسلمان ہو یا غیر مسلم، دلت ہو یا اونچی ذات کا ہو، اقلیتی پارٹی کی نمائندگی کرتا ہو یا قومی پارٹی کی، اگر ہم نے لازمی طور پر کسی مسلمان امیدوار یا ایک متعین پارٹی ہی کو ووٹ دیا تو ہمارا ووٹ ضائع ہو جائے گا اور ہمارے ووٹوں کی تقسیم سے فرقہ پرست عناصر کو فائدہ پہنچ جائے گا؛ اس لئے بہت ہی سمجھداری و دانشمندی سے کام لینے کی ضرورت ہے، ہمیں ماضی کے ریکارڈ کو بھی سامنے رکھنا چاہئے، بعض سیاسی جماعتیں سیکولرزم کے نام پر ووٹ حاصل کرتی ہیں اور الیکشن کے بعد اقتدار کے لئے فرقہ پرستوں سے جاملتی ہیں، کہیں ہم پھر اس دھوکہ کا شکار نہ ہو جائیں، مسلمانوں میں اتنی فراست ہونی چاہئے کہ وہ ایک ہی سوراخ سے بار بار نہ ڈسے جائیں۔

ایک نیا مشرکانہ نعرہ

اسلام کا سب سے بنیادی عقیدہ ’عقیدۂ توحید‘ ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، ان کی بنیادی تعلیم یہی تھی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہیں اور اسی کی عبادت کرنی ہے، جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی اور کو اس کی خدائی میں شریک نہیں ٹھہرایا جائے؛ اسی لئے علم کلام کے شارحین نے لکھا ہے کہ کلمہ لا اِلٰہ الا اللہ میں نفی اور اثبات دونوں پہلو کی رعایت ضروری ہے کہ اللہ کی ذات معبود ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ۱۰۹) اگر قرآن مجید کی الفاظ کے تہہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو شاید ہی کوئی آیت ہو جس میں صراحتاً یا اشارۃً براہ راست یا بالواسطہ توحید کا ذکر نہ آیا ہو؛ لیکن کم سے کم اکیانوے آیتیں ایسی ہیں، جو صراحتاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بیان کرتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تو اتنی کثرت سے اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں منقول ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی، یہی عقیدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمکی زندگی بھر کی دعوت اور آپ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے پانچ باتوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا اور توحید کو اس کا سب سے پہلا رکن بتایا۔ (بخاری، عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر: ۸) ’ لا اِلٰــہ الا اللــہ ‘ کو جنت میں داخل ہونے کی کلید قرار دیا گیا، حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: جو بھی لا اِلٰہ الا اللہ پر یقین رکھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا: ’’**مــن مــات وهــو يعــلـم انه لا اِلٰه الا الله دخل الجنة**‘‘ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۶) توحید کی ضد شرک ہے، شرک سے مراد ہے: کسی بھی مخلوق کو — خواہ وہ اپنی طاقت، پھیلاؤ، ظاہری نفع رسانی، ضرر رسانی اور علو مرتبت کے اعتبار سے کتنی ہی بڑی ہو — اللہ تعالیٰ کی ذات میں یا آپ کی صفات واختیار میں شریک اور ساجھی ٹھہرانا، توحید کی جتنی زیادہ تاکید کی گئی ہے، شرک کی اتنی ہی زیادہ برائی اور مذمت بیان کی گئی ہے، قرآن مجید نے انبیاء کے اپنی قوموں سے خطابات کا تفصیل

سے ذکر کیا ہے، ان میں ہر جگہ شرک کی مذمت کی گئی ہے اور اس کو سب سے زیادہ مبغوض اور قابل نفرت فعل ٹھہرایا گیا ہے۔

قرآن مجید ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان اللہ کو ایک مانے اور عملی طور پر اپنے آپ کو شرک سے بچائے رکھے؛ بلکہ موقع ومحل کے لحاظ سے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ شرک اور مشرکانہ شعائر (جس میں مشرکانہ نعرے بھی شامل ہیں) سے اپنی براءت اور بے تعلقی کا اظہار کرے؛ اسی لئے پیغمبروں نے اپنی قوم سے کہا کہ میں ان تمام مشرکانہ چیزوں سے بری اور بے تعلق ہوں، جن کو تم کیا کرتے ہو، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ”یَاقَومِ اِنِّی بَرِیئٌ مِمَّا تشرِکونَ“ (الانعام:۷۸) اور حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو گواہ بناتے ہوئے فرمایا کہ تم سب گواہ رہنا کہ میں تمہارے مشرکانہ افعال سے بری ہوں: ”وَاشهَدوا اَنِّی بَرِیئٌ مِّمَّا تشرِکون“ (ہود:۵۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عقیدۂ توحید کی تعلیم دی؛ بلکہ ہر لمحہ اس کو ذہن میں راسخ کرنے کے لئے ایسی دعائیں سکھائیں، جو ہر عمل کے ساتھ انسان کو خدائے واحد کی یاد دلاتی ہے، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد، صبح میں اور شام میں، سفر کی طرف جاتے اور واپس آتے ہوئے، ایک دوسرے کو سلام کرتے ہوئے، غرض کہ کوئی موقع ایسا نہیں جس میں دعاء اور ذکر کے اُسلوب میں اللہ کی وحدت کا یقین انسان کے ذہن میں راسخ نہ کیا گیا ہو، اسی طرح شرک کے جتنے راستے ہو سکتے تھے، اسلام نے ان سب کو بند کیا، بعض گذشتہ آسمانی مذاہب میں مجسمہ بنانے کی اجازت تھی؛ لیکن شریعت محمدی میں اسے منع کر دیا گیا؛ کیوں کہ یہ چیز بتدریج انسان کو شرک تک پہنچا دیتی ہے، اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانے سے منع فرمایا گیا: ”من حلف بغیر الله فقد اشرک“ (ابوداود، عن ابن عمر، حدیث نمبر:۱۵۲۳) قبروں کو اونچی بنانے کی آپ نے ممانعت فرمائی ہے: ”لا تدعن قبراً مشرفاً الاسویته“ (نسائی، عن علی، باب تسویۃ القبور اذا رفعت، حدیث نمبر:۱۳۰۲) کیوں کہ یہ چیز بھی انسان کو شرک تک پہنچا دیتی ہے، بدشگونی کو منع کیا گیا کہ اس میں انسان اپنے نقصان کے لئے خالق کے بجائے

مخلوق کو مؤثر سمجھنے لگتا ہے: ''الطِیَرۃ شرک'' (ابوداود، عن عبداللہ بن مسعود، حدیث نمبر: ۳۹۱۰)

آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے ایسی باتوں کو بھی منع فرمایا، جن میں شرک کا شبہ پایا جاتا تھا، صحابہؓ نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت طلب کی، ظاہر ہے کہ صحابہ عبادت کی نیت سے سجدہ کی اجازت کیسے مانگ سکتے تھے؟ مقصود تعظیم واحترام کے طور پر سجدہ کرنا تھا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے اس سے بھی منع فرما دیا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۶۳۵) رب کے معنی آقا اور مالک کے بھی ہیں، اسی لیے اسلام سے پہلے غلام اپنے مالک کو رب کہا کرتے تھے؛ لیکن چوں کہ رب، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں شامل ہے؛ اس لئے اس بات کی ممانعت کردی گئی کہ کوئی غلام اپنے مالک کو رب کہے، عبد کے معنی بندے کے بھی ہیں اور غلام کے بھی، اسی نسبت بندگی کو ظاہر کرنے کے لئے انسان کو 'عباد اللہ' کہا جاتا ہے، اس لفظی مشابہت سے بچانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے اس بات سے منع فرمایا کہ غلام کو ''میرے عبد'' (یا عبدی) کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ (مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرھا، باب حکم اطلاق لفظ العبدۃ، حدیث نمبر: ۲۲۴۹)

ہر مسلمان اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی توحید اور شرک سے متعلق ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمسے دریافت کیا گیا: وہ دو کون سی چیزیں ہیں جو جنت کو اور دوزخ کو واجب کرنے والی ہیں؟ آپ نے فرمایا: جس کی موت اس حال میں ہو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہو تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ (مسلم عن جابرؓ، حدیث نمبر: ۳۹) اسی لئے کوئی مسلمان اس بات کو گوارہ نہیں کرسکتا کہ اپنی زبان سے مشرکانہ کلمہ کا تلفظ کرے، ہر مسلمان کے لئے حضرت معاذ بن جبلؓ کی یہ حدیث سامنے رکھے جانے کے لائق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے مجھے دس باتوں کی نصیحت فرمائی، جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چاہے تم کو مار ڈالا یا جلا ڈالا

جائے: ''لا تشرک باللہ شیئاً وان قتلت وان حرقت'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۲۸)

اسلام میں عقیدۂ توحید کی اہمیت اور شرک کے ناقابل قبول ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی مخلوق کو محبوب سے بڑھ کر معبود کا درجہ دے دے، محبت ماں باپ سے ہوتی ہے، اولاد سے ہوتی ہے، شوہر و بیوی سے ہوتی ہے، اسی طرح اس مٹی سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ پیدا ہوا ہے، جس کی فضاؤں میں وہ پروان چڑھا ہے، یہ ایک فطری محبت ہے، جیسے انسان کو یہ سمجھانے اور یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں اپنی اولاد سے محبت کرنی چاہئے، اسی طرح وطن کی محبت بھی ایک فطری چیز ہے، انسان پردیس میں رہتے ہوئے اپنے ملک کی ایک ایک چیز کو یاد کرتا ہے، اگر اس کے ملک سے وابستہ کوئی خبر مل جائے تو اسے شوق کی آنکھوں سے پڑھتا ہے، اجنبی ملک میں رہتے ہوئے اپنے وطن کا کوئی آدمی مل جائے تو گھنٹوں اس سے بات کرنا چاہتا ہے، کہیں جا کر اپنے وطن کو واپس آئے تو دل کو سکون اور آنکھوں کو راحت میسر آتی ہے؛ اسی لئے کسی ملک میں رہنے والے کو اس ملک سے محبت کی یاد دلانا ایک بے معنی اور غیر منطقی بات ہے اور پھر یہ بڑا ظلم ہے کہ ایک گھر میں چار بھائی رہتے ہوں اور ایک بھائی دوسرے بھائی سے مطالبہ کرے کہ تم اس گھر سے وفاداری اور محبت ثابت کرو، محبت اور وفاداری کا مطالبہ کرایہ دار اور مزدور سے تو کیا جاسکتا ہے؛ لیکن مالک اور حصہ دار سے نہیں کیا جاسکتا۔

افسوس کہ اس ملک میں نفرت کے سوداگروں کا اقلیتوں کے ساتھ یہی رویہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں انگریزوں کی پشت پناہی اور قوم سے غداری کا راستہ اختیار کیا اور ملک کی آزادی کے لئے ان کے تلووں میں ایک کانٹا بھی نہیں چبھا، یہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے مختلف خود ساختہ نعرے وضع کرتے ہیں اور اس کو حب الوطنی کے لئے کسوٹی قرار دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ ہر آدمی کو وندے ماترم کہنا چاہئے اور اب کہتے ہیں کہ لوگوں کو 'بھارت ماتا کی جئے' کہنا سکھانا چاہئے، سوال یہ ہے کہ آپ کو کیا حق ہے سکھانے کا، کیا

ہمارے ملک کے دستور نے ایسا نعرہ لگانے کی تلقین کی ہے؟

آر، ایس، ایس نے تو اس قسم کی بحثیں اصل مسائل سے توجہ ہٹانے اور اپنی دلت دشمنی کے کھلتے ہوئے راز پر پردہ ڈالنے کے لئے چھیڑ دی ہے؛ لیکن بہت سے مسلمان بھائیوں نے آر، ایس، ایس کی آئیڈیالوجی کو سمجھے بغیر اس کو مادر وطن سے محبت کا ایک سیدھا سادہ جملہ سمجھ لیا ہے، یہ غلط فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ''بھارت ماتا کی جئے'' کا معنی صریح اور متعین طور پر وطن کو معبود قرار دینے کا نہ ہو تب بھی اس فقرہ میں وطن کی معبودیت کا اشارہ ضرور پایا جاتا ہے اور اس کے کئی قرائن ہیں: اول یہ کہ یہ اس بدنام زمانہ ناول میں درج کیا جانے والا نعرہ ہے، جسے ۱۸۸۲ء میں بنگال کے بنکم چندرا چٹر جی نے آنند امت کے نام سے لکھا، اس ناول کا مرکزی خیال ہی یہی ہے کہ وطن کو خدا کا درجہ دیا جائے، دوسرے: ہندوستان میں بنارس اور ہری دوار کے بشمول کم سے کم چار مندر بھارت ماتا کے نام سے بنائے گئے ہیں، بنارس کے مندر کی بنیاد گاندھی جی نے رکھی تھی، جس میں کوئی مورتی نہیں ہے اور دوسرے مندر کی اندرا گاندھی نے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بھارت ماتا کی تعبیر میں ملک کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے، تیسرے: ماتا کے معنی اگرچہ ماں کے ہیں؛ لیکن ہندو دیویوں کو بکثرت ماتا کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے درگا ماتا، کالی ماتا، لکشمی ماتا، یا گائے کو گئو ماتا، چوتھے: 'ماتا' کا ترجمہ سنسکرت میں ماں باپ، لڑکی اور سرپرست کے ساتھ ساتھ درگا کے پاس آنے والے سے بھی کیا گیا ہے، نیز اس کو سنسکرت الفاظ گھٹا کا (Ghataka) اور وسوا (Visva) کا مترادف قرار دیا گیا ہے، گھٹا کا کے معنی مارنے والے کے اور 'وسوا' کے معنی یقین و بھروسہ کئے جانے کے لائق کے ہیں، یہ وہ صفات ہیں جو مختلف مذاہب میں خدا کے لئے ذکر کی جاتی ہیں، پانچویں: بھارت ماتا کو مختلف شکلوں میں ہی پیش کیا گیا ہے، اس وقت آر، ایس، ایس جو تصویر پیش کر رہی ہے، اس کے مطابق اس کے ایک ہاتھ میں تلوار یا ترشول ہے اور وہ شیر پر بیٹھی ہوئی ہے، دوسرے ہاتھ میں بھگوا جھنڈا ہے اور بعض تصویروں میں اس کے کئی کئی ہاتھ ہیں، یہ تقریباً اسی طرح کی تصویر ہے، جو ہمارے ہندو بھائیوں کی دیویوں اور دیوتاؤں کی ہوتی ہے،

چھٹے: یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 'بھارت' کا نام جس راجہ کے نام پر ہے، وہ مرد تھا نہ کہ عورت، اس لئے بھارت ماتا میں اس راجہ کی نسبت نہیں ہوسکتی، یہ کسی مذہبی دیوی ہی کی جیت کا نعرہ ہوسکتا ہے، ساتویں: جئے کے معنی زندہ باد کے بھی ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے ''جئے ہند'' کہا جاتا ہے؛ لیکن چوں کہ جئے میں زندہ رہنے کے معنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ''حی'' (ہمیشہ زندہ رہنے والے) کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا کرتا ہے، شاید اسی لئے ہمارے ہندو بھائی ''جئے شری رام، ہنومان جی کی جئے، جئے بجرنگ بلی، وغیرہ'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، خود سنسکرت لغت میں اس کا ایک ترجمہ ''اِندر کی جیت'' سے کیا گیا ہے (ماتا اور جئے کے یہ ترجمے ''VilliamsMonierSir'' کی سنسکرت، انگلش ڈکشنری سے لئے گئے ہیں)۔

اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ اس فقرہ میں وطن کی معبودیت کا ذکر ہے نہ کہ صرف محبوبیت کا، اگر ایسا نہ ہوتا تو سنگھ پریوار کے لوگوں کو اس لفظ پر اتنا اصرار نہ ہوتا؛ اس لئے کہ ان کے یہاں حب الوطنی مقصود نہیں، اگر وہ محبّ وطن ہوتے تو شروع سے ترنگا لہراتے اور ملک کے دستور پر یقین کا اظہار کرتے؛ لیکن انھوں نے بمشکل تمام کچھ عرصہ پہلے سے یہ کڑوا گھونٹ اپنے حلق سے اتارا ہے، ان کا مقصد اپنے مذہبی تصورات کو دوسری قوموں پر مسلط کرنا ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو کسی بھی قیمت پر ایسے مشرکانہ یا کم سے کم شرک آمیز نعروں کو قبول نہیں کرنا چاہئے، یہ ان کو آزمانے کی اور بتدریج اس مقام تک لانے کی کوشش ہے جو فرقہ پرست تنظیموں کا منصوبہ ہے، ہم وطن سے محبت اس لئے رکھتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے، ہمیں اس کے لئے کسی کی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن کوئی بھی مسلمان جانتے بوجھتے ایسے نعروں کو قبول نہیں کرسکتا۔

وعدہ خلافی — ہمارے سماج میں!

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے آخرت کا نظام یہ رکھا ہے کہ چیزوں کا مہیا ہونا انسان کی خواہشات کے تابع ہوگا، انسان جو چاہے گا فوراً اس کے لیے وہ چیز فراہم ہو جائے گی: ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَاتَدَّعُونَ'' (حم السجدہ: ۳۱) لیکن دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہاں انسان ایک چیز کی خواہش کرتا ہے؛ لیکن وہ اسے بر وقت پورا نہیں کرسکتا، وہ ایک چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے؛ لیکن وہ چیز اسے بروقت مہیا نہیں ہوتی؛ اسی لیے انسان ایک دوسرے سے لین دین کا محتاج ہوتا ہے، اس لین دین میں اکثر عہد و پیمان کی نوبت آتی ہے، اس لیے شاید ہی کوئی انسان ہو جس کو زندگی کے مختلف مراحل میں خود وعدہ کرنے یا دوسروں کے وعدہ پر بھروسہ کرنے کی نوبت نہ آتی ہو، وعدہ کرنے والے پر دوسرا شخص بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے اور بعض دفعہ اس اعتماد پر خود بہت سے معاملات طے کر گذرتا ہے، اس لیے وعدہ کی بڑی اہمیت ہے۔

اسی لیے اسلام میں بڑی تاکید کے ساتھ عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور عہد شکنی کی مذمت کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عہد کو پورا کرو؛ کیوں کہ قیامت کے دن عہد کے بارے میں انسان جواب دہ ہوگا: ''وَاَوْفُوا بِالْعَهْدِ، اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا'' (بنی اسرائیل: ۳۴) قرآن نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو وعدہ کو پورا کیا کرتے ہوں، (البقرۃ: ۲۲) ایک اور موقع پر بھی ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہوں: ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَ مٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ'' (المومنون: ۸) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا بار بار ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے: '' وَلَن يُّخْلِفَ وَعْدَه'' (الحج: ٦) اللہ کے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا کہ وہ وعدہ کے سچے تھے ''اِنَّه كَانَ صَادِقَ الوَعْد'' (مریم: ۵۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعہ بھی ایفائے عہد کی اہمیت اور

وعدہ خلافی کی بُرائی کو بیان فرمایا ہے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس میں تین باتیں پائی جاتی ہوں وہ منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اگر امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (بخاری، حدیث نمبر: ۳۳) نفاق کفر کی ایک قسم ہے اور وعدہ خلافی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق قرار دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وعدہ خلافی کس قدر مذموم بات ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل کے ذریعہ ایفائے عہد کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، عبداللہ بن ابی الحمساء سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید وفروخت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ چیز باقی رہ گئی، میں نے وعدہ کیا کہ میں یہ چیزیں یہاں لے کر آتا ہوں، میں بھول گیا، یہاں تک کہ آج اور آئندہ کل کا دن گذر گیا، تیسرے دن میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ پر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس قدر فرمایا: تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں یہاں تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ (ابوداود، حدیث نمبر: ۴۹۹۶)

وعدہ کی پابندی اور ایفائے عہد کا یہی سبق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے رفقاء نے پڑھا، اور اپنی عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا؛ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وفات کا وقت آیا، تو فرمایا کہ قریش کے ایک شخص نے میری بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام دیا تھا اور میں نے اس سے کچھ ایسی بات کہی تھی جو وعدہ سے ملتی جلتی ہے، تو میں ایک تہائی نفاق یعنی نفاق کی تین میں سے ایک علامت کے ساتھ اللہ سے ملنا نہیں چاہتا، اس لیے میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔ (احیاء العلوم: ۱۳۲/۳) —— ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی نگاہ میں وعدہ کو پورا کرنے کی کس قدر اہمیت تھی؟! دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ اور مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ عہد کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے جوں ہی فارغ ہوئے حضرت ابوجندل صخون میں لہولہان اور پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوئی تشریف لے آئے،

اور مسلمانوں سے عرض کناں ہوئے کہ انہیں مدینہ لے جایا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ اس دفعہ سے جو مکہ سے مسلمان ہوکر مدینہ جانے والوں کو واپس کرنے کے سلسلہ میں ہے، حضرت ابوجندلؓ کو مستثنیٰ رکھا جائے؛ لیکن اہل مکہ نے نہیں مانا؛ چناں چہ بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس فرما دیا، اسی طرح جن غیر مسلم قبائل سے آپ کے معاہدات ہوئے، آپ نے ان معاہدات کا پورا خیال رکھا؛ بلکہ بعض دفعہ مخالفین کی عہد شکنی کو برداشت کرتے ہوئے بھی آپ اپنے عہد پر قائم رہے۔

افسوس کہ اخلاقی انحطاط اور پستی کی وجہ سے آج سماج میں وعدہ خلافی کی نوع بہ نوع صورتیں مروّج ہوگئی ہیں اور لوگوں کے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ قرض وغیرہ کے لین دین ہی سے وعدہ کا تعلق ہے، حالاں کہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں عہد و پیماں سے گذرتے ہیں، معاملات جتنے بھی ہیں، نکاح، خرید و فروخت، شرکت اور پاٹنر شپ، دوطرفہ وعدہ ہی سے عبارت ہے، اسی لیے معاملات کو عقد کہا جاتا ہے، عقد کے معنی دوطرفہ وعدہ اور معاہدہ کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ایفائے عقود کی طرف متوجہ فرمایا ہے: ''وَاَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) نکاح کے ذریعہ مرد عورت کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے اخراجات کی ادائیگی کا عہد کرتا ہے اور عورت جائز باتوں میں شوہر کی فرماں برداری کا وعدہ کرتی ہے؛ لہٰذا اگر شوہر بیوی کے ساتھ حق تلفی کرے یا بیوی شوہر کے ساتھ حکم عدولی تو نہ صرف حق تلفی اور عدول حکمی کا گناہ ہوگا؛ بلکہ وہ وعدہ خلافی کے بھی گناہ گار ہوں گے، بیچنے والا گاہک سے مال کے صحیح ہونے اور قیمت کے مناسب ہونے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ گاہک سے عیب چھپا کر سامان بیچے یا قیمت میں معمول سے زیادہ نفع وصول کرلے اور گاہک کو جتائے کہ اس نے معمولی نفع پر سامان فروخت کیا ہے، تو یہ عقد تجارت کے ذریعہ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جو عہد کرتے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہے۔

جب آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں جو اوقات کار متعین ہوں، آپ ان اوقات میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے کا عہد کرتے ہیں، اگر آپ ان

اوقات کی پابندی نہ کریں، دیر سے دفتر پہنچیں، پہلے دفتر سے نکل جائیں، یا درمیان میں دفتر چھوڑ دیں، یا دفتر کے اوقات میں مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بجائے اپنے ذاتی کام کرنے لگیں، تو یہ بھی وعدہ کی خلاف ورزی میں شامل ہے، بعض شعبوں میں ملازمین کو خصوصی الاؤنس دیا جاتا ہے کہ وہ پرائیویٹ طور پر کوئی اور کام نہ کریں، خاص کر میڈیکل شعبہ میں گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی پوری صلاحیت سرکاری دواخانہ میں آنے والے مریضوں پر خرچ ہو؛ کیوں کہ انسان کی قوت کار محدود ہے، اور جو شخص ہسپتال میں آنے سے پہلے اپنی قوت ڈھیر سارے مریضوں کو دیکھنے پر صرف کر چکا ہو، یقیناً اب جو مریض اس کے سامنے آئیں گے، وہ کما حقہ اس کی تشخیص نہیں کر سکے گا، اب اگر کوئی شخص گورنمنٹ سے الاؤنس بھی حاصل کرے اور نجی کلینک اور نرسنگ ہوم بھی چلائے تو یہ وعدہ خلافی ہی کے زمرے میں آئے گا اور یہ بات تو ستم بالائے ستم ہوگی کہ جب کوئی مریض سرکاری دواخانہ میں آئے، تو معالج اس سے ایسی بے اعتنائی برتے کہ وہ اس کے پرائیویٹ دواخانہ سے رجوع ہونے پر مجبور ہو جائے، یہ وعدہ خلافی کے ساتھ ساتھ عوام پر کھلا ہوا ظلم بھی ہے۔

آج کل بعض سواریوں کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے میٹر لگے ہوئے ہیں، اس میٹر میں فریقین کی رعایت ملحوظ ہے؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ پسنجر کی مجبوری اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے میٹر سے زیادہ پیسے طلب کیے جاتے ہیں، یہ بھی وعدہ خلافی کے زمرہ میں داخل ہے؛ کیوں کہ گورنمنٹ کا ٹیکس لائسنس ٹیکس کے قواعد وضوابط کے ساتھ مربوط ہے، گویا لائسنس لینے والا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی ہدایت کے مطابق ہی پیسے وصول کرے گا، لوگوں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے زائد پیسوں کا طلب گار ہونا اس عہد کی خلاف ورزی ہے۔

وعدہ کا تعلق ہماری تقریبات، جلسوں اور دعوتوں سے بھی ہے، مثلاً: دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ نکاح عصر کے بعد ہوگا؛ لیکن جب تقریب میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب اپنی شانِ خاص کے ساتھ عشاء کے بعد تشریف لائے، دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ طعام ولیمہ ۸ بجے شب میں ہے؛ لیکن حقیقت معنوں میں دعوت کی ابتداء دس بجے شب سے ہوئی، کیا یہ

وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ غور کیجیے کہ لوگ ایسی تقریبات میں شرکت اپنے تعلقات کی پاس داری میں کرتے ہیں، کسی کے یہاں بیماری ہے، کوئی خود بیمار ہے، کسی نے تقریب کے وقت کے لحاظ سے آئندہ پروگرام بنا رکھا ہے، ایسے مواقع پر یہ تاخیر اس کے لیے کس قدر گراں گذرتی ہے آ کر واپس ہونے میں میزبان کی ناگواری کا اندیشہ اور انتظار کرنے میں دوسرے پروگرام متأثر!

افسوس کہ دینی جلسوں اور پروگراموں میں بھی ہم اس کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے، اعلان ہوا کہ نمازِ عشاء کے فوراً بعد جلسہ شروع ہوگا؛ لیکن عملاً مزید دو گھنٹہ تاخیر سے جلسہ کا آغاز ہوا، دعوت نامہ میں صبح ۹ بجے سے جلسہ کا اعلان کیا گیا؛ لیکن جلسہ کا آغاز ہی ۱۱ بجے کے بعد ہوا، یہ وعدہ خلافی بھی ہے اور وقت کی ناقدری بھی، کچھ یہی حال بعض مقررین کا ہوتا ہے، مقرر صاحب کو وقت ۲۰/منٹ کا دیا گیا؛ لیکن جب مائک ان کے ہاتھ میں آیا تو انہیں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اس پروگرام میں ان کے سوا کسی اور کو تقریر کا حق نہیں، اور اس طرح دوسرے مقررین کے لیے یا تو وقت نہیں بچا، یا سامعین کے صبر کا امتحان ہوتا رہا؛ حالاں کہ اسلام نے تمام عبادتوں کو وقت کے ساتھ مربوط رکھا ہے، نماز کے لیے اوقات مقرر ہیں، وقت گذر جائے تو نماز قضاء ہو جائے گی، وقت سے پہلے پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی، روزہ بھی وقت سے متعلق ہے، دو منٹ پہلے افطار کر لے تو روزہ درست نہیں ہوگا، دو منٹ بعد سحری کھائیں تب بھی روزہ فاسد ہو جائے گا، حج بھی پانچ مقررہ ایام میں کیا جاتا ہے اور حج کے تمام افعال کے لیے ایام و اوقات مقرر ہیں، زکوٰۃ کا تعلق بھی مال پر سال گذرنے سے ہے، عجیب بات ہے کہ جس دین میں وقت کا اتنا پاس و لحاظ ہو، اسی دین کے ماننے والوں میں وقت کی اس درجہ ناقدری اور ناحق شناسی یہ سب باتیں وعدہ خلافی میں داخل ہیں!

ہم جب کسی ملک کی شہریت اختیار کریں تو یہ اس ملک کے قوانین پر عمل کرنے کا عہد کرنا ہے؛ لہٰذا جب تک وہ قوانین اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں یا صریحاً ظلم پر مبنی نہ ہو ان قوانین کا پابند رہنا ہم پر واجب ہے اور اس کی رعایت نہ کرنا ملک کے ساتھ کیے ہوئے

عہد کی خلاف ورزی ہے، اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے — غرض، سماجی زندگی میں ہم ہر جگہ ایک عہد کے پابند ہیں، بعض عہد ہم اپنی زبان سے کرتے ہیں، بعض عہد ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے از خود ہم سے متعلق ہو جاتا ہے، بعض عہد کسی معاملہ کی وجہ سے شرعاً ہمارے ذمہ ہوتا ہے اور بعض سماج کے عرف ورواج کی بنیاد پر بھی ہمارے لیے واجب العمل ہوتا ہے، ہم پر ان سب کی پاس داری ضروری ہے، مگر زندگی کے کتنے ہی مراحل میں ہم اپنے عہد و پیمان توڑتے ہیں اور وعدے وفا نہیں کرتے، اس پر دقتِ نظر کے ساتھ غور کرنے اور وعدہ خلافی و بدعہدی کے گناہ سے بچنے کی ضرورت ہے۔

منشیات اور ہمارا سماج

انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، ان میں ایک عقل و دانائی بھی ہے، یہی عقل ہے جس نے اس کے کمزور ہاتھوں میں پوری کائنات کو مسخر کر رکھا ہے اور اسی صلاحیت کی وجہ سے اللہ نے اس کو دنیا میں خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے؛ اسی لیے اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن نے بے شمار مواقع پر مسلمانوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، تدبر اور تفکر کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ انسان جن چیزوں کا مشاہدہ کرے اور جو کچھ سنے اور جانے، عقل کو استعمال کر کے اس میں غور وفکر کرے اور ان جانی حقیقتوں اور ان دیکھی سچائیوں کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرے؛ اسی لیے قانونِ اسلامی کے ماہرین اور فلاسفہ نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام بنیادی طور پر پانچ مقاصد پر مبنی ہیں، دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، گویا عقل اور فکر ونظر کی قوت کو برقرار رکھنا اور اسے خلل اور نقصان سے محفوظ رکھنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔

چناں چہ اسلام میں جن کاموں کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور جن سے منع فرمایا گیا ہے، ان میں ایک نشہ کا استعمال بھی ہے، قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ اس کو حرام بلکہ ناپاک قرار دیا ہے۔ (المائدۃ: ۹۰) کیوں کہ انسان کا سب سے اصل جوہر اس کا اخلاق و کردار ہے، نشہ انسان کو اخلاقی پاکیزگی سے محروم کر کے گندے افعال اور ناپاک حرکتوں کا مرتکب کرتا ہے اور روحانی اور باطنی ناپاکی ظاہری ناپاکی سے بھی زیادہ انسان کے لیے مضرت رساں ہے، احادیث میں بھی اس کی بڑی سخت وعید آئی ہے اور بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ اس کے حرام اور گناہ ہونے کو بتایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ (بخاری عن عائشہ، حدیث نمبر: ۵۵۸۵) حضرت جابر بن عبداللہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جس شیٔ کی زیادہ مقدار نشہ کا باعث ہو، اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۸۶۵) یہ نہایت اہم بات ہے؛ کیوں کہ عام طور پر نشہ کی عادت اسی طرح ہوتی ہے کہ معمولی مقدار سے انسان شروع کرتا ہے

اور آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ زہر آمیز انجکشن کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوتی۔

نشہ کے جو نقصانات ہیں، وہ ظاہر ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان تو خود اس شخص کی صحت کو پہنچتا ہے، اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ شراب اور منشیات ایک سست رفتار زہر ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کے جسم کو کھوکھلا اور عمر کو کم کرتا جاتا ہے، انسان کی زندگی اس کے لیے ایک امانت ہے، انسان کے وجود سے نہ صرف اس کے؛ بلکہ سماج کے بہت سے اور لوگوں کے حقوق بھی متعلق ہیں، نشہ کا استعمال اس امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشہ آور اشیاء کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا، جو جسم کے لیے ''فتور'' کا باعث بنتی ہوں، یعنی ان سے صحت میں خلل واقع ہوتا ہو؛ چناں چہ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: **''نھی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسل معن کل مسکر و مفتر''** (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۶۸۶)

منشیات کے نقصانات کا دوسرا پہلو مالی ہے، سیال منشیات ہوں یا جامد، قابل لحاظ قیمت کی حامل ہوتی ہیں، شراب کی ایک بوتل اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا ایک کنبہ اس سے اپنی ایک وقت کی روٹی روزی کا سامان کر لیتا ہے، یہ تو معمولی نشہ آور اشیاء کا حال ہے، بعض منشیات تو اتنی قیمتی ہیں کہ ایک کلو کی قیمت ایک کروڑ روپے ہوتی ہے، اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کلو ہیروئن کی قیمت ایک سو انسانوں کے برابر ہے، اس سے ہمارے عہد میں انسانی وجود کی ناقدری اور صحت و اخلاق کے لیے مخرب اشیاء کی ''قدر و قیمت'' کا تقابل کر سکتے ہیں!

پھر منشیات کا استعمال تو آدمی اپنے اختیار سے شروع کرتا ہے؛ لیکن جب وہ گرفتارِ بلا ہو جاتا ہے تو آپ اپنے قابو میں نہیں رہتا، وہ اضطراراً منشیات کے خریدنے اور استعمال کرنے پر گویا مجبور ہوتا ہے، چاہے کھانے کو دو روٹی میسر نہ ہو، گھر کے لوگ بھوک اور فاقہ سے گذار رہے ہوں، علاج کے لیے پیسے میسر نہ ہوں؛ لیکن جو اس عادت کا اسیر ہوگا، وہ انسانی ضروریات کو پس

پشت ڈال کر پہلے اپنی اس خوئے بد کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لیے اسراف اور فضولی خرچی کا یہ بہت بڑا محرک ہے، نشہ خوری نے خاندان کے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، بڑی بڑی جائدادیں اور پُرشکوہ حویلیاں اس خود خرید زہر کے عوض کوڑی کی قیمت بِک چکی ہیں۔

منشیات کی مضرتوں کا سماجی پہلو یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے جس سے مختلف لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہیں، ایک شخص باپ ہے تو اسے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، نہ صرف اس کے روزمرہ کی کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرنا ہے؛ بلکہ اس کی تعلیم کی بھی فکر کرنی ہے، وہ بیٹا ہے تو اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اگر خاندان کے دوسرے بزرگ موجود ہوں تو ان کی پرورش کا بار بھی اٹھانا ہے، شوہر ہے تو یقیناً بیوی کے حقوق اس سے متعلق ہیں، بھائی ہے تو چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور شادی بیاہ کا فریضہ اسی کے کاندھوں پر ہے، نشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور غافل بنا دیتا ہے اور اس بدمستی میں نہ اس کو لوگوں کے حقوق یاد رہتے ہیں، نہ اپنے فرائض و واجبات، بعض اوقات تو وہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ و برباد کر دے، جیسے طلاق کے واقعات ہیں، طلاق کے بہت سے واقعات بالخصوص دیہی علاقوں میں اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، جس کا خمیازہ اسے بھی بھگتنا پڑتا ہے اور اس سے زیادہ اس کی بیوی اور بچوں کو۔

شراب کے نقصانات کا سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، نشہ کی بدمستی انسان سے ناکردنی کرا لیتی ہے اور ناگفتنی کہلوا دیتی ہے، قتل، عصمت ریزی، ظلم و زیادتی، سب وشتم اور ہذیان گوئی، باعزت لوگوں کی بے توقیری، کون سی بات ہے جو انسان نشہ کی حالت میں نہ کرتا ہو؟ ہوش کی کیفیت میں جس سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی، نشہ کی حالت میں اس پر ہاتھ اُٹھا دینا بھی قابل تعجب نہیں اور معتدل حالت میں تنہائی میں بھی زبان پر جن باتوں کا لانا گراں خاطر ہو، نشہ کی حالت میں انسان اس سے زیادہ فحش اور خباثت آمیز گفتگو بے تکلف کرتا ہے، اسی لیے نشہ صرف برائی ہی نہیں؛ بلکہ برائیوں کی جڑ ہے اور محض ایک گناہ ہی نہیں؛ بلکہ سینکڑوں گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کو ''اُمّ الخبائث'' یعنی برائیوں کی جڑ (نسائی: ۵۶۶۶) اور ''اُمّ الفواحش'' یعنی بے حیائیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۷۳۳) شراب کی اخلاقی قباحتوں کی اس سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی، ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جیسے درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں، اسی طرح شراب سے برائیاں۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۲۷۳۳، عن خبابؓ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ایک خوب صورت عورت نے اپنے پاس شراب رکھی اور ایک بچہ کو رکھا اور ایک شخص کو مجبور کیا کہ وہ تین میں سے ایک برائی کم سے کم ضرور کرے، یا تو وہ اس عورت کے ساتھ بدکاری کرے، یا اس بچہ کو قتل کردے، یا شراب پیے، اس شخص نے سوچا کہ شراب پینا ان تینوں میں کمتر ہے؛ چناں چہ اس نے شراب پی لی؛ لیکن اس شراب نے بالآخر یہ دونوں گناہ بھی اس سے کرالیے۔ (نسائی: ۵۶۶۶)

غرض نشہ جسمانی، مالی، سماجی اور اخلاقی ہر پہلو سے انتہائی مضرت رساں چیز ہے، اس وقت نوع بنوع منشیات کی کثرت اور اس کے استعمال میں جو عموم پیدا ہورہا ہے وہ حد درجہ تشویش ناک بات ہے، لوگوں نے منشیات کو نئے نئے خوب صورت نام دے دیے ہیں، گٹکے، ماوے اور مختلف دوسری اشیاء کے ساتھ نشہ کا نام لیے بغیر تھوڑا تھوڑا نشہ آور اجزاء کا طلبہ اور نوجوانوں کو عادی بنایا جاتا ہے، اور یہی چیز ان کو آئندہ منشیات کا باضابطہ خوگر بنادیتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب ارشاد فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ شراب پئیں گے؛ لیکن اس کو شراب کا نام نہیں دیں گے: ''**یسمونها بغیر اسمها**'' (نسائی، حدیث نمبر: ۵۶۵۸) نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی کم عمر لڑکے کو شراب پلائی، جس کو حلال وحرام کا شعور نہیں، تو اللہ پر ضروری ہے کہ قیامت کے دن اسے لکھنا ہے۔ (جمع الفوائد: ۳۷۹/۲)

مغربی ملکوں میں شراب کی کثرت کی ایک اہم وجہ خاندانی نظام کا بکھراؤ بھی ہے، خاندانی روابط کے کمزور پڑجانے اور رشتوں کے بکھر جانے کے باعث لوگ اپنی نجی زندگی میں ذہنی اور قلبی سکون سے محروم ہیں، اس لیے چند ساعت کے سکون کے لیے نشہ کرتے ہیں کہ کچھ

تو قلب کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی معاشرہ میں زیادہ تر یہ چیز بغیر سمجھے بوجھے مغرب کی نقل اور فیشن کی دَین ہے، اب جرائم پیشہ اور مافیا گروہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشہ کا عادی بنا کر ان کا استحصال کرتا ہے، ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے آلہ کار بناتا ہے اور ان سے نشہ کی تھوڑی مقدار کے عوض قتل وراہزنی، چوری اور عصمت فروشی کے کام لیتا ہے، تعلیم گاہوں میں منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان ستم بالائے ستم اور نقصان بالائے نقصان کا مصداق ہے۔

اس برائی سے سماج کو بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ ایک طرف لوگوں کو نشہ کے نقصانات کے بارے میں باشعور کیا جائے اور اس کے نقصانات سے ہر سطح پر آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ان اسباب پر روک لگائی جائے جو منشیات کے پھیلنے میں ممد ومعاون ہیں، اگر غیر مسلموں کے نام پر شراب بیچنے کے پرمٹ بھی جاری کیے جائیں اور دوسری طرف شراب سے منع بھی کیا جائے تو یہ تو ایک مذاق ہوگا، جہاں قدم قدم پر شراب کی دکانیں کھلی ہوں، ہوٹلوں میں شراب بیچی، خریدی جاتی ہو، سرکاری تقریبات میں جام وسبو پیش کیے جاتے ہوں، وہاں شراب کی برائی کیوں کر لوگوں کے ذہن میں راسخ ہو سکے گی اور کیسے سماج کو اس لعنت سے نجات حاصل ہوگی؟ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلہ میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے: نچوڑنے والے پر، نچوڑوانے والے پر، پینے والے پر، اٹھا کر لے جانے والے پر، اس پر جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے، ساقی پر، بیچنے والے پر، اس کی قیمت کھانے والے پر، خریدنے والے پر اور اس شخص پر جس کے لیے خریدی جائے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۹۵) —— اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ملک کے حکمراں اور اربابِ اقتدار سرتاپا اس کی مضرتوں سے واقف ہیں، ملک کے دستور کے رہنما اُصول میں بھی مکمل شراب بندی کا ہدف رکھا گیا ہے، لیکن حکومتیں اس لیے اس پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں ہیں کہ اس کی تجارت سے حکومت کو اپنی شاہ خرچیوں اور اربابِ اقتدار کو اپنی عشرت کوشیوں کے لیے ڈھیر سارا ٹیکس وصول ہوسکتا ہے؟

معالج — مقام اور ذمہ داریاں

کسی بھی سماج میں ڈاکٹر اور معالج کی خاص اہمیت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں ایسا وجود عطا کیا ہے جس میں خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خامیوں اور مجبوریوں کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، انسان کی طاقت وقوت کا حال یہ ہے کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور طاقت ور سے طاقت ور ترین مخلوق بھی انسان کی قوتِ تسخیر کی اسیر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوری اور ناطاقتی کا حال یہ ہے کہ معمولی کیڑے مکوڑے بھی اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، ایک بالشت کا سانپ بھی اس کی جان لے سکتا ہے اور بیماریاں اسے آسانی سے پچھاڑ سکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں زہر کے ساتھ ساتھ اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا ہے اور بیماریوں کے ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے: ”**تداووا فان اللہ عزوجل لم یضع داءً الا وضع له دواءً غیر داءٍ واحد الھرم**“ (سنن ابی داود، حدیث نمبر: ۳۸۵۷، نیز دیکھیے: سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۴۳۶) اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور تجربہ کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے دواؤں کو دریافت کرے، اس کام کو میڈیکل سائنٹسٹ اور ڈاکٹرز انجام دیتے ہیں، اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی خدمات نہایت اہم ہیں، بھوکے کو کھانا کھلانا محتاج کو کپڑے پہنانا، معذور کے کام میں ہاتھ بٹانا اور ضرورت مند کی حاجت پوری کرنا یہ سب مخلوق کی خدمت ہے، لیکن انسان سب سے زیادہ خدمت کا محتاج اس وقت ہوتا ہے جب وہ مریض ہو، بیماری انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ کھانا موجود ہونے کے باوجود وہ کھا نہیں سکتا، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، لیکن وہ ایک قدم چل نہیں سکتا اور تیمارداری اور مددگاروں کے رحم وکرم کا محتاج ہو جاتا ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی عیادت اور تیمارداری کو بے حد اجر کا باعث قرار دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: جب تک ایک شخص مریض کی عیادت میں رہتا ہے گویا وہ

جنت کے باغ میں ہے۔(مسلم:۱۵۵۶)اس طرح ڈاکٹر گویا اپنی ڈیوٹی کے پورے وقت اس حدیث کا مصداق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے اور کون ہے جو انسانوں کے لیے ڈاکٹر اور معالج سے بڑھ کر نافع ہو؟ اس طرح گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ڈاکٹر کو ''خیر الناس'' (بہترین انسان) کا ایوارڈ ملا ہے، ان سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہوسکتا ہے، فن طب کی اسی اہمیت کی وجہ سے سیّدنا حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں: ''فقہ'' کہ زندگی گذارنے کا طریقہ معلوم ہو اور ''طب'' تا کہ جسم انسانی کی اصلاح پر قدرت ہو سکے۔ ''**العلم علمان: الفقه للاديان وعلم الطب للابدان.**'' (مفتاح السعادة:۱/۲۶۷)

واقعہ ہے کہ یہ گروہ انسانیت کا سب سے بڑا محسن ہے اور اس نسبت سے ان کی توقیر وتکریم سماج کا فریضہ ہے، بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ علاج سے جلدی فائدہ نہیں ہوا، یا مریض کی موت واقع ہوئی تو لوگ ڈاکٹر سے اُلجھ جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اس کی جان کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں، یہ غیر سنجیدہ طرزِ عمل ہے، اس لیے کہ علاج تو انسان کے اختیار میں ہے، لیکن صحت وشفا خدا کی مشیت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ ''**واذا مرضت وهو يشفين**'' (شعراء:۸۰) زندگی کو بچانے کا مکلّف قرار دینا، اس پر اس کی صلاحیت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کے مترادف ہے۔

جو شخص جس مقام کا حامل ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، اس لیے ڈاکٹر اور معالج حضرات کو اپنی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دینی چاہیے، ڈاکٹر کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیشہ میں خدمت کے پہلو کو مقدم رکھے، ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مریضوں کا مفت علاج کریں اور اپنے گھر سے دوائیں لا کر کھلا دیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پیشہ کو محض تجارت اور بزنس نہ بنا دیا جائے اور اجرت کے ساتھ ساتھ اجر کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جائے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ تعلیم اور علاج نے ایک زبردست کاروبار کی صورت

اختیار کرلی ہے اور معاشی کشش کی وجہ سے بہت سے ہوٹل، ہاسپٹل میں تبدیل ہو گئے ہیں، ڈاکٹروں کی فیس مریض کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن گئی ہے، پھر فیس کے سلسلے میں بھی ایک نئی روایت یہ قائم ہورہی ہے کہ مریض جتنی بار مشورے کے لیے جائے ہر بار فیس ادا کرے، اس طرح بعض اوقات ہر ہفتہ ڈاکٹر زفیس وصول کرلیتے ہیں، پھر آمدنی کے بالواسطہ ذرائع بھی پیدا کرلیے گئے ہیں، دوائیں لکھی جاتی ہیں اور مخصوص و متعین دوکانوں سے دوا خریدنے کو کہا جاتا ہے، تاکہ ان سے کمیشن مل سکے، مریض پر بوجھ ڈالنے اور اپنی جیب بھرنے کے لیے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو دوائیں پہلے لکھی گئی تھیں ابھی وہ ختم بھی نہیں ہوئی کہ دوا تبدیل کردی جاتی ہے اور اسی فارمولہ کی دوسری دوا، جس کا نام کمپنی بدل جانے کی وجہ سے بدلا ہوا ہوتا ہے، لکھ دی جاتی ہے، بے چارے مریض کو ڈاکٹر صاحب کی اس ہوشیاری کی خبر بھی نہیں ہوتی، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جتنی دوا مطلوب ہے اس سے زیادہ لکھ دی گئی اور چند دنوں میں نسخہ بدل دیا گیا اور زائد دوائیں بے کار ہوگئیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ نقلی دوائیں یا ایسی دوائیں جن کی مدت ختم ہو چکی ہے، دی جاتی ہیں اور معیاری دواؤں کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

امراض کے ٹیسٹ کا معاملہ تو سب سے سوا ہے، بے مقصد ٹیسٹ کرائے جاتے ہیں، مریض نے اگر کسی دوسرے ڈاکٹر سے ٹیسٹ کرایا ہو تو چاہے وہ رپورٹ دن، دو دن پہلے ہی کی کیوں نہ ہو، لیکن نیا ڈاکٹر پھر سے پورے ٹیسٹ کراتا ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر نے جس پیتھالوجسٹ کا مشورہ دیا ہے اسی کے یہاں ٹیسٹ کرایا جائے، ان اقدامات میں مخلصانہ جستجو و تحقیق کا جذبہ شاذونادر ہی ہوتا ہے، اکثر اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ کمانا اور اپنی جیب بھرنا ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر یا کسی خاص ہاسپٹل کو مریض ریفر (Refer) کرتا ہے، یہ تمام صورتیں اگر مریض کی بھلائی کے جذبہ سے ہوں تب تو ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن افسوس کہ ان سب کا مقصد کمیشن کھانا ہوتا ہے، دواؤں پر کمیشن، ٹیسٹ پر کمیشن، مریض کے بھیجنے پر کمیشن اور جہاں جہاں ممکن ہو وہاں سے کمیشن کا حصول، ان کمیشنوں اور ان کی بڑھتی ہوئی شرحوں نے مریض کی کمر توڑ دی ہے اور

غریب لوگوں کے لیے ہاسپٹل جانے کا تصور بھی ایک بوجھ ہوتا ہے، یہ کمیشن فقہی اعتبار سے رشوت ہے، اس کا لینا حرام ہے اور اس میں واسطہ بننا بھی حرام ہے۔

حکومت کی طرف سے اس بات پر پابندی ہے کہ سرکاری ہاسپٹلوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر الگ سے اپنے نرسنگ ہوم چلائیں، لیکن جسے خدا کا خوف نہ ہو اس کے قدم کون تھام سکتا ہے؟ چناں چہ عام طور پر سرکاری ڈاکٹرز بھی فرضی ناموں سے نرسنگ ہوم چلاتے ہیں، جو مریض سرکاری ہاسپٹل میں آتا ہے، اسے بے توجہی سے دیکھتے ہیں اور صراحتاً یا اشارتاً انہیں نرسنگ ہوم میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے، یا عملی طور پر انہیں اس پر مجبور کر دیا جاتا ہے؛ تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ پیسے اینٹھے جاسکیں، اس عمل میں جھوٹ بھی ہے اور دھوکہ بھی اور بعض دفعہ پریکٹس نہ کرنے کا الاؤنس بھی دیا جاتا ہے، لہٰذا اب اس کے باوجود پیسے لے کر پرائیویٹ پریکٹس حرام طریقہ پر مال حاصل کرنے کی مجرمانہ کوشش بھی ہے اور یہ قرآن کے اس ارشاد کہ: باطل طریقے پر مال نہ کھاؤ، کے قطعاً مغایر ہے، "**ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل**" (بقرۃ:۱۸۸)

اسی طرح ایک نئی صورتِ حال یہ ہے کہ جن امراض کا علاج دواؤں کے ذریعہ ممکن ہے، ان میں بھی آپریشن کا مشورہ دیا جاتا ہے، تا کہ علاج گراں بار ہو اور مریض کی یہ گرانی معالج کے لیے ارزانی کا باعث ہے، خاص کر ولادت کے کیس میں کثرت سے اس طرح کی بات پیش آتی ہے اور آپریشن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ زچگی کرائی جاتی ہے اور حکومت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، کیوں کہ یہ بالواسطہ فیملی پلاننگ کو بروئے کار لانا ہے، اسی طرح مریض کی موت کے باوجود اسے مصنوعی آلہ تنفس پر رکھا جاتا ہے، تا کہ بل بڑھتا رہے، یہ کس درجہ ناشائستہ طریقہ ہے۔

ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ آپریشن کی میز پر پیٹ چیرنے کے بعد ڈاکٹر کی طرف سے نیا مطالبہ سامنے آتا ہے اور مریض اور اس کے متعلقین اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ تمام صورتیں شرعاً ناجائز اور گناہ ہیں، اور اکثر صورتوں میں آمدنی

بھی حرام ہے، افسوس کہ بہت سے دین دار لوگ بھی اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان گناہوں میں مبتلا ہیں، ڈاکٹر کے لیے صرف اس کی تنخواہ اور پرائیویٹ علاج کی صورت میں اس کی فیس، نیز مریض کو اس نے جو دوائیں دی ہیں، ان کی معروف اور مروّجہ قیمت ہی جائز ہے۔

معالج کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنے فن کو باضابطہ طور پر پڑھا ہو، محض چند سنی سنائی باتوں پر علاج شروع کر دینا درست نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے طب کا علم حاصل نہ کیا ہو، وہ علاج کرے تو وہ نقصان کا ضامن ہوگا، **من تطب ولم یعلم منه قبل ذلک الطب فهو ضامن.** (ابوداود: ۶۳۰/۲) اسی لیے فقہاء نے ایسے طبیبوں پر پابندی لگانے کا حکم دیا ہے۔ (بدائع الصنائع: ۱۶۹/۷) ناواقف طبیب سے مراد وہ شخص ہے جس میں بیماری اور اس کی دوا کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، دواؤں کے اثرات سے واقف نہ ہو، نیز دوائیں دے دیتا ہو اور اس کے ری ایکشن کو روکنے والی دواؤں کا علم نہ رکھتا ہو۔ **یسقی الناس دواء مهلکا ولا یقدر علی ازال ضرر دواء اشتد تاثیره علی المرضی.** (الفقه الاسلامی وادلته: ۴۴۹/۵) لہٰذا ایسے ناواقف اور کوتاہ علم طبیب کی کوتاہیاں قابل ضمان ہوں گی اور ان کو سزا دی جائے گی، یہ سزا جسمانی سرزنش بھی ہو سکتی ہے، قید بھی اور خوں بہا بھی۔ (**بدایة المجتهد:** ۲۳۳/۲)

جو معالج تعلیم یافتہ ہو، لیکن اس نے علاج میں کوتاہی سے کام لیا ہو، مناسب تحقیق نہیں کی ہو اور اس کی اس کوتاہی کی بنا پر مریض کو نقصان پہنچا ہو تب بھی وہ ذمہ دار ہوگا اور اس سے ہرجانہ وصول کیا جائے گا، ہاں اگر اس نے فن طب کو پڑھا بھی ہو اور اصول کے مطابق علاج بھی کیا ہو؛ لیکن اس کے باوجود مریض کو صحت نہیں ہو سکی یا اس کا مرض اور بگڑ گیا، تو اب وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا، چناں چہ مشہور فقیہ علامہ دردیر فرماتے ہیں: **اذا عالج طبیب عارف ومات المریض عن علاجه المطلوب فلا شئ علیه** ۔ (سیر صغیر: ۲۲۰/۴) افسوس کہ آج کل علاج کی ایسی سنگین کوتاہیاں سامنے آتی ہیں کہ بعض دفعہ تو سرجن قینچی اور چھری بھی مریض کے جسم میں بھول جاتا ہے، ایسے غفلت شعار ڈاکٹر انسانیت کے خادم نہیں ہادم ہیں اور

وہ سماج کے لیے رحمت کے بجائے زحمت ہیں، غرض کہ طب وعلاج کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور معالج انسانی خدمت کے اعتبار سے سب سے اہم ذمہ داری انجام دیتا ہے، وہ اپنے پیشے میں اجرت کے ساتھ ساتھ اجر اور دنیا کے نفع کے ساتھ ساتھ آخرت کے نفع کو بھی پاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس پیشہ کو محض تجارت کے طور پر اختیار نہ کرے، بلکہ اس میں خدمت کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھے اور جھوٹ، دھوکہ اور حرام طریقہ پر کسبِ معاش سے اپنے دامن کو بچائے۔

ٹریفک اور ہماری ذمہ داریاں

یہ ایک حقیقت ہے کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی، بے اصولی اور نامناسب حد تک جلد بازی کی وجہ سے حادثات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں اخبار سڑک حادثہ کی اطلاع سے خالی ہو اور کچھ ہلاکتیں اس کی وجہ سے پیش نہ آئی ہوں، اسلام نے اس سلسلہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے اور قرآن وحدیث میں ہمیں اس سلسلہ میں اصولی ہدایات مل سکتی ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ چیزیں وہ ہیں، جن کا شریعت نے حکم دیا ہے، اور کچھ باتوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے، ان باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا ضروری ہے، ان میں کسی کمی یا اضافہ کی گنجائش نہیں، کچھ چیزیں وہ ہیں کہ نہ ان کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا گیا ہے، ان سے ایسی مصلحت متعلق ہے کہ نہ صراحتاً شریعت میں اس کے معتبر ہونے کا ذکر ہے اور نہ نا معتبر ہونے کا، ان چیزوں کے بارے میں حکومت کو حق ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی انتظامی قانون بنائے اور حسبِ ضرورت لوگوں پر کسی پہلو کو لازم قرار دے دے، اسلام کے اصولِ قانون کی اصطلاح میں ان کو''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے، جیسے: انسان دائیں بھی چل سکتا ہے اور بائیں بھی، شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ہے کہ چلنے میں کون سی سمت اختیار کی جائے اور کون سی سمت اختیار نہ کی جائے؟ حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے عوام کو پابند کرسکتی ہے کہ وہ متعینہ سمت سے ہی سفر کرے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

اس لیے ٹریفک کے جو اصول وقواعد مقرر کیے گئے ہیں، کہیں تیز چلنے کے اور کہیں آہستہ چلنے کے، رکنے کے اور نہ رکنے کے، گاڑی کسی مقام پر ٹھہرانے کے اور کسی مقام پر نہ ٹھہرانے کے، یہ انتظامی نوعیت کے قوانین ہیں، جن کا مقصد ہماری جان اور ہماری سواری کا تحفظ ہے، جان ومال کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے اور حکومت کے ایسے قوانین کی اطاعت کا ہم نے عہد کیا ہے جو احکامِ شریعت سے متصادم نہیں ہیں، اس لیے ان اصول وضوابط کی رعایت ہم پر واجب ہے اور ان کی رعایت نہ کرنا نہ صرف قانونِ ملکی کی مخالفت ہے؛ بلکہ عہد کی

خلاف ورزی اور اپنی جان و مال کی حفاظت میں بے احتیاطی کی وجہ سے شرعاً بھی ایک قبیح فعل ہے اور گناہ کا باعث ہے، اس لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مفید قوانین کی رعایت کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

قرآن نے انسان کی چال کے بارے میں ہدایت دی ہے کہ اس سے تکبر اور اکڑفوں کا اظہار نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلاَ تَمْشِ فِیْ الاَرْضِ مَرَحاً اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الاَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلاً۔ (الاسراء: ۳۷)

زمین میں اکڑ کر نہ چلو، کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔

ایک اور موقع پر نیک بندوں کی چال ڈھال اور گفتار و رفتار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَ اِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ (الفرقان: ۶۳)

رحمٰن کے سچے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عجز و فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان سے ہم کلام ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔

زمین پر اکڑ کر چلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہے کہ سینے تنے ہوئے ہوں اور گردنیں تکبر سے اکڑی ہوئی ہوں؛ لیکن اکڑ کر چلنے کی صرف یہی ایک کیفیت نہیں؛ بلکہ ہر وہ چال جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہو اور دوسروں کی تحقیر محسوس ہو، اس ہدایت ربانی کی مصداق ہے، آپ گاڑی پر سوار ہیں اور آپ کو یہ گوارا نہیں کہ کسی کی گاڑی آپ سے آگے رہے، آپ بلا وجہ اس کو پیچھے کر کے خود آگے بڑھنے کے درپئے ہیں، اس کے لیے نا مناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، ہارن بجا بجا کر اسے پریشان کرتے ہیں، تو یہ بھی اکڑ کر چلنے ہی کے حکم میں ہے، تواضع کی چال یہ ہے کہ آپ اپنی رفتار معتدل رکھیں، جو آپ سے آگے چل رہا ہے، اسے آگے رہنے دیں، اگر کسی کی سواری آپ سے پیچھے ہے؛ لیکن اس کی رفتار بہ مقابلہ آپ کی سواری کے تیز ہے اور راستہ میں اس کی گنجائش ہے کہ آپ اسے آگے

بڑھنے کا موقع دے دیں، تو آپ اس کو اپنی اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اپنے دوسرے بھائی کو آگے بڑھنے دیں، یہ تواضع کی چال اور قرآن کی زبان میں ''مشی ہون'' ہے۔

صحابہؓ جب آپ کے ساتھ سفر میں ہوتے اور آگے کی سمت سے دشمن کا اندیشہ نہ ہوتا تو اہتمام کرتے کہ اپنی سواری کو حضور صلی اللہ علیہ وسلمکی سواری سے پیچھے رکھیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے، ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اونٹنی آگے بڑھ گئی، یہ اونٹنی بڑی سرکش تھی اور قابو میں نہ آتی تھی، صحابہؓ کو یہ بات گراں گذری اور حضرت عمرؓ نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی فرمائی؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا برا نہ مانا اور حضرت عمرؓ کو اس سے منع فرمادیا، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اسی کی سواری آگے رہے اور دوسرے چلنے والے اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

قرآن مجید نے اچھے انسان کی صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر ناسمجھ لوگ اس سے الجھنے کی کوشش کریں تو وہ سلامتی کی بات کہہ کر گذر جاتے ہیں، یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، راستہ میں چلتے ہوئے بار بار اس کی نوبت آتی ہے کہ ٹریفک کے اصول سے ناواقف، جلد باز اور جاہل واجڈ قسم کے لوگ منھ آنے لگتے ہیں، کوئی اپنی سواری غلط طریقہ پر بیچ میں لے آتا ہے، کوئی اپنی مخالف سمت میں گھس آتا ہے، کوئی بے موقع ہارن بجا کر دِق کرتا ہے، کوئی ایسی جگہ گاڑی روک دیتا ہے جہاں گاڑی روکنے کی اجازت نہیں، اس سے ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بعض لوگ خود غلطی کرتے ہیں اور اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے الٹے دوسروں کو سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، یہ بڑے جذباتی مواقع ہوتے ہیں، اگر دوسرا آدمی بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس سے ماحول کے اور خراب ہونے، آویزش بڑھ جانے اور ٹریفک جام ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، ان ہی صورتوں میں یہ آیت ہماری طرف متوجہ ہوتی ہے کہ یہ وقت برداشت، تحمل اور کلمہ خیر کہہ کر گذر جانے کا ہے کہ ایک شخص تو کانٹا پھینک ہی رہا ہے، اگر دوسرے لوگ بھی پھول پھینکنے کے بجائے کانٹے

ہی پھینکنے پر اصرار کریں تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں اور گل ہائے محبت کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

رفتار حالات کے اعتبار سے ہونی چاہیے، جہاں ازدحام ہو وہاں آہستہ چلا جائے، جہاں ازدحام نہ ہو اور آپ کے آہستہ چلنے کی وجہ سے ان لوگوں کو دشواری ہو جو آپ کے پیچھے ہیں تو وہاں سبک خرامی کے بجائے تیز گامی اختیار کیجیے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کی بابت فرماتے ہیں کہ جب کہیں خالی جگہ ہوتی تو تیز چلتے ورنہ رفتار اس سے کم رہتی: "**یسیر العنق، فاذا وجد فجو نص**" (بخاری: حدیث نمبر: ۲۹۹۹، مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۸۶) پیدل چلنے میں وقار اور متانت ہو، نماز ایک عبادت ہے اور نماز کے لیے آنا ایک عبادت کی طرف سبقت ہے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ اس میں بھی وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ارشاد ہے: "**اذا اتیتم الصلاۃ فاتوھا بالوقار**" (مسند احمد: عن عبدالرحمٰن بن عوفؓ) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سکون کے ساتھ چلو، تیز چلنا کچھ نیکی کا کام نہیں: "**علیکم السکینۃ، فان البر لیس بالابضاع۔**" (مسند احمد، عن اسامہ بن زیدؓ)

راستہ پر بے ضرورت ہارن بجانا بھی پسندیدہ نہیں، اس سے آگے چلنے والے کو وحشت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حادثہ کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس لیے بھی کہ ہارن کی آواز سنجیدہ لوگوں کے لیے گراں خاطر ہوتی ہے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ چلتے ہوئے گھنٹہ بجانے سے منع فرمایا، عربوں کا طریقہ تھا کہ اونٹ کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھ دیتے، جب پورا قافلہ چلتا تو راستہ گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس سے بے ضرورت ہارن بجانے کی قباحت پر روشنی پڑتی ہے، بعض حضرات نت نئی آوازوں کے ہارن گاڑیوں میں لگاتے ہیں، جیسے کتے کی آواز، چھوٹے بچے کے رونے کی آواز، یہ نہایت ہی ناشائستہ بات ہے، اس آواز کے مکروہ

ہونے کے علاوہ لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں اور چونک اٹھتے ہیں، جو خطرناک حادثہ کا باعث ہو سکتا ہے، اس لیے ایسی چیزوں سے گریز ضروری ہے۔

یہ بات بھی مناسب نہیں کہ جہاں پارکنگ کی جگہ نہ ہو وہاں گاڑی کو پارک کر دیا جائے، یہ دوسرے راستہ چلنے والوں کے لیے تکلیف اور مشقت کا باعث ہے، اس سے ٹریفک جام ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ایمان کا ایک درجہ قرار دیا ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو کو ہٹا دیا جائے: ''**وادناها اماط الاذی عن الطریق**'' (مسند احمد، حدیث: ۹۷۴۷) اذیٰ میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو تکلیف دہ ہوں، خواہ وہ گندگی یا نجاست ہوں یا کچھ اور، اس لیے بے جگہ گاڑی کا کھڑا کرنا بھی اس میں شامل ہے؛ کیوں کہ اکثر اوقات اس کی تکلیف راستہ چلنے والوں کے لیے گندگی سے بھی بڑھ جاتی ہے، اسی حکم میں یہ ہے کہ پیٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسن تیل پر گاڑیاں چلائی جائیں کہ یہ یقیناً دوسرے راہ گیروں کے لیے تکلیف واذیت کا باعث ہے اور اس سے پھیلنے والی آلودگی عام لوگوں کے لیے بھی مضر اور نقصان دہ ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے گاڑی والوں کا اور گاڑی پر چلنے والے پیدل چلنے والوں کا خاص کر عورتیں، بچے اور ضعیف لوگ جو جلد راستہ طے نہیں کر سکتے، ان کی رعایت ملحوظ رکھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ گیروں کو عورتوں کی بابت خصوصی رعایت کا حکم فرمایا، عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابوداود، حدیث نمبر: ۵۲۷۳) حضرت ابو اسید انصاریؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستہ کے کناروں سے چلیں۔ (ابوداود، حدیث نمبر: ۵۲۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ کے حصہ میں سواریاں نہ چڑھائی جائیں؛ بلکہ ان کو پیدل راہ گیروں کے لیے چھوڑ دیا جائے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے چلا کریں۔

غرض، راستہ چلتے ہوئے مزاج میں تحمل و برداشت ہو، رویہ میں اعتدال ہو، دوسرے

راہ گیروں کے ساتھ رعایت اور ایثار کا معاملہ ہو، اگر دوسرے راہ رو بے احتیاطی سے کام لیں اور نامناسب رویہ اختیار کریں تو ان کے بارے میں عفو درگذر ہو اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر ٹریفک کے اصول وقواعد کو ملحوظ رکھے، یہ ہیں وہ اصول جن کی طرف قانونِ شریعت میں اشارہ ملتا ہے۔

گداگری — امت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ

۲۹؍ جولائی ۲۰۱۶ء کے اخبار ہندوستان ٹائمز میں یہ سروے شائع ہوا ہے کہ ہندوستان میں جو لوگ گداگری کا کام کرتے ہیں اور بھیک پر اپنی زندگی گذارتے ہیں، ان میں ۲۵؍ فی صد تعداد مسلمانوں کی ہے، یعنی ہر چار بھکاری میں سے ایک مسلمان ہوتا ہے، یہ نہایت افسوس اور شرم کی بات ہے کہ جس امت کے پیغمبر نے تعلیم دی ہو کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، گداگری کے لیے وہ امت مشہور ہو جائے، یہ بات بہت کڑوی ہے؛ لیکن سچائی پر مبنی ہے۔

آج کل ہماری مسجدوں، مذہبی مقامات اور دینی اجتماعات کی ایک پہچان گداگروں کا ازدحام اور ایک خاص لَے اور دھن میں ان کی طرف سے سوالیہ کلمات کی تکرار بھی ہے، ان میں بعض کے اندر الحاح کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور آپ کے لیے ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا دشوار ہوتا ہے، بعض کی جرأتِ رندانہ بھی قابل دید ہوتی ہے، اگر آپ نے انہیں بھیک نہیں دی یا بھیک کی مطلوبہ مقدار نہیں دی، تو ان کی خشمگیں نگاہ کو سہے بغیر چارہ نہیں، کچھ ایسے فرزانے بھی ہیں جو آپ کو دو چار صلواتیں سنانے سے بھی نہیں چوکتے، وہ اس طرح سوال کرتے ہیں کہ ناواقف آپ کو ان کا مقروض سمجھ بیٹھے، مذہبی مقامات کے علاوہ سیاحتی مقامات، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ٹریفک سگنل کی جگہیں جہاں گاڑیوں کے رکنے کی نوبت آتی رہتی ہے، اس گروہ کے پسندیدہ اور مستجاب مقامات ہیں، اس لیے یہاں ان کی وافر تعداد نہ صرف یہ کہ آ موجود ہوتی ہے؛ بلکہ کمالِ اخلاص اور کمالِ استقامت کے ساتھ صبح کی پَو پھٹنے سے لے کر رات گئے تک اپنے محاذ پر ڈٹی رہتی ہے، پولیس والوں کا محصول اور گاہے ڈنڈوں کے ذریعہ ان کی تنبیہ اور دینے والوں کی ڈانٹ ڈپٹ ان کو نہ ملول خاطر کرتی ہے اور نہ ان کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل آنے دیتی ہے، اس لحاظ سے ثابت قدمی میں وہ ایک نمونہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ گداگر بھی انواع واقسام کے ہیں، کچھ صحت مند وتوانا، کچھ واقعی مریض اور زیادہ تر

مصنوعی مریض، مریض اور معذور عام طور پر بے کار شمار کیے جاتے ہیں؛ لیکن اس میدان میں وہ نہایت کار آمد اور مفید ہیں؛ اسی لیے بہت سے صحت مند بھکاری نابینا اور معذور فقیروں کا تعاون حاصل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد سے پتھر دلوں کو موم بنانے کا کام انجام دیتے ہیں، ان میں بچے بھی ہیں، جوان بھی اور بوڑھے بھی، مرد بھی ہیں اور خواتین بھی، کم سن لڑکیاں بھی جوان لڑکیاں اور سن رسیدہ عورتیں بھی گداگری کے اس پیشہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، ایسے گروہ بھی پکڑے گئے ہیں جو دیہاتوں اور دور دراز علاقوں سے بچوں کو پکڑ کر لاتے ہیں اور انہیں کسی قدر معذور بنا کر ان سے گداگری کراتے ہیں، زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ گداگری کے لیے بھی جدید ذرائع کا استعمال شروع ہو گیا ہے؛ چناں چہ بعض فقراء انٹرنیٹ کی مدد سے عالمی سطح پر اپنی رسائی کو وسیع کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گداگروں کا یہ گروہ اس کو ایک آسان اور سہولت بخش ذریعہ معاش تصور کرتا ہے، چند ماہ پہلے اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ حیدرآباد میں گداگروں کی آمدنی کا اوسط تین تا چار ہزار روپے ماہانہ ہے، خاص خاص مواقع جیسے رمضان المبارک اور عید وغیرہ میں اس میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اس پیشہ سے دستبردار ہونے کو کسی طور تیار نہیں ہیں، اگر آپ انہیں کام کرنے کو کہیں یا خود اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دیں تو وہ ایسا منھ بنائیں گے کہ گویا آپ نے ان کی بے عزتی کی ہے، غرض وہ اپنے پیشہ پر قانع بھی ہیں اور مطمئن بھی اور انہیں اس پر نہ کوئی حجاب ہے اور نہ عار! اس بات سے مزید دکھ ہوتا ہے کہ ان میں بہت ہی قابل لحاظ تعداد ہمارے مسلمان بھائیوں کی ہے اور جس امت کو سب سے بڑھ کر غناء اور استغناء کی تعلیم دی گئی ہے، وہی اس اخلاقی بیماری میں پیش پیش ہے۔

اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں مذہبی لوگوں کے لیے کسبِ معاش کی اجازت نہیں تھی اور ان کا گزر اوقات اسی طرح ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں اور لوگوں کی نذر و نیاز پر زندگی گزاریں، ہندوؤں کے یہاں برہمن کے حقوق میں یہ بات شامل تھی کہ لوگ اسے دان کیا کریں، بدھشٹوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں اور بھگتوؤں کو کسب

معاش کی ممانعت ہے اور وہ لوگوں کی دچھنا پر زندگی گزارا کرتے تھے، عیسائیوں کے یہاں جب رہبانیت اور ترکِ دنیا کے فلسفہ نے قبولِ عام حاصل کیا تو نہ صرف مذہبی رہنما؛ بلکہ عوام میں بھی زاہد قسم کے لوگوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ وہ کسبِ معاش چھوڑ دیں اور لوگوں کے دیے ہوئے پر اپنی زندگی گزاریں؛ لیکن اسلام نے اَوّل روز سے ہی کسبِ معاش کو ضروری قرار دیا، قرآن نے کہا کہ اللہ کی بندگی سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کی کوشش کرنی چاہیے اور مال کو فضل الٰہی سے تعبیر کیا (الجمعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہؓ نے تجارت کی، حضرت علیؓ اور بہت سے صحابہؓ نے محنت ومزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کیں اور تلاشِ رزق کی تحسین فرمائی گئی۔

اسلام نے توکل کی تعلیم ضرور دی؛ لیکن لوگوں نے جو بے عملی اور فرائض سے پہلوتہی کو توکل کا نام دے رکھا تھا، اس کی اصلاح بھی فرمائی، اسلام نے بتایا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ اسبابِ دُنیا کو ترک کر دیا جائے؛ بلکہ توکل اسباب کو اختیار کرنے کے بعد نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینے کا نام ہے، اس لیے کسبِ معاش توکل کے منافی نہیں، گداگری پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان کسبِ معاش کی تگ ودو سے دل چرانے لگے، اس کے سدباب کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف کسبِ معاش کی اہمیت کو واضح فرما کر گداگری کے اصل سبب کو ختم کرنا چاہا۔ اور دوسری طرف گداگری کی مذمت فرمائی اور اسے سختی سے منع کیا، ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کچھ سوال کیا، آپ نے ان سے فرمایا کہ: تمہارے پاس کیا کچھ سامان ہے؟ انہوں نے کہا میرے پاس تو محض ٹاٹ اور پیالہ ہے، آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان کی ڈاک لگائی، ایک صاحب نے ایک درہم قیمت لگائی، دوسرے شخص نے دو درہم، آپ نے اسے دو درہم میں فروخت کر دیا، پھر ایک درہم میں کلہاڑی کا پھل منگایا اور کلہاڑی بنا کر اسے حوالہ کر دیا اور ایک درہم اسے دے کر ارشاد ہوا کہ اس سے اپنی ضرورت پوری کریں اور کلہاڑی سے لکڑی کاٹ کر لائیں اور فروخت کریں اور ایک ماہ تک پھر کہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر نہیں آئیں، ان صاحب نے اس ہدایت پر عمل کیا

اور ایک ماہ کے بعد اس حال میں تشریف لائے کہ کئی درہم ان کے پاس موجود تھے اور وہ گداگری کو چھوڑ چکے تھے۔ (سنن ابی داؤد: ۱۶۴۳، سنن ابن ماجہ: ۲۱۹۸، عن انسؓ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یہ بات کہ تم اپنی پیٹھ پر لکڑی کے گٹھے کاٹ کر لاؤ اور اسے فروخت کرو اس سے بہتر ہے کہ تم لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاؤ، وہ چاہیں تو دے دیں، چاہے تو نہیں دیں۔'' (**بخاری، کتاب الزکاۃ، باب اسعفاف فی المسئلۃ، حدیث نمبر: ۲۰۴، عن الزبیر بن العوامؓ**)

اس طرح کے بعض اور واقعات بھی منقول ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ دو شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور کچھ طلب کیا، آپ نے مشورہ دیا کہ جنگل جاؤ، لکڑی کاٹو اور اسے فروخت کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے لکڑیاں بیچ کر کھانے کی اشیاء خریدیں، پھر سونا خرید کیا، پھر سواری کے لیے گدھے خریدے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں برکت رکھی ہے۔ (مجمع الزوائد: ۴۹/۳)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے سے صحابہؓ کو اس درجہ منع فرمایا اور اس کی تعلیم دی کہ وہ معمولی چیزیں مانگنے سے بھی احتراز کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کا حال یہ تھا کہ اگر اونٹنی کی لگام نیچے گر جاتی، تو اونٹنی کو بٹھاتے اور خود لگام لیتے، لگام بھی دوسروں سے مانگنے کے روادار نہیں تھے۔ (حوالہ سابق)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا نتیجہ تھا، حضرت ابو ذر غفاریؓ اور حضرت ثوبانؓ دونوں کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا کہ کسی سے سوال نہ کریں، یہاں تک کہ اگر کوڑا بھی نیچے گر جائے تو وہ بھی دوسرے سے نہ مانگیں۔ (مجمع الزوائد: ۳۹/۳)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مستغنی ہونے کے باوجود سوال کرے، وہ اپنے لیے جہنم کی چنگاریوں میں اضافہ کر رہا ہے، دریافت کیا گیا: مستغنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ ''وَمَا ظَهَرَ غِنِيَة'' ارشاد ہوا: جس کے پاس رات کا کھانا موجود ہو۔ (حوالہ سابق) گویا جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا موجود ہو اس کے لیے

دستِ سوال دراز کرنا روا نہیں، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سوال قیامت کے دن صاحبِ سوال کے چہرے پر خراش کی صورت میں ظاہر ہوگا، اب جو چاہے اسے اپنے چہرہ پر باقی رکھے۔ (حوالہ سابق: ٦٩) اور حضرت حبشی بن جنادہؓ کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے فقر و محتاجی کے بغیر سوال کیا، گویا وہ چنگاری کو کھاتا ہے۔ (حوالہ سابق) حضرت ثوبانؓ کی روایت میں ہے کہ پیسہ رکھنے کے باوجود سوال کرنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر عیب کی صورت اختیار کرلے گا " **کانت شینا فی وجهه یوم القیامة** " (حوالہ سابق) غور کیجیے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں اگر چہرے پر بدنما دھبہ آجائے تو انسان اس کو دور کرنے کے لیے کتنا پریشان ہوتا ہے، آخرت کی دائمی زندگی میں جب اہل جنت خوب صورت ترین شباہت میں ہوں گے، انسان کو اپنے عیب دار اور داغ دار چہرے پر کتنی شرمساری ہوگی، خاص کر ایسی صورت میں کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ رنگ و نور کی اس بستی میں کوئی شخص اتفاقی اور پیدائشی طور پر بدصورت نہیں ہے؛ بلکہ اس کی بدصورتی اس کی بداعمالیوں کا عکس ہے، کتنا عجیب ہے کہ بننے سنورنے والا انسان اس دائمی بدروئی اور بدصورتی کے بارے میں فکرمند نہ ہو!

گداگری، فقر و احتیاج کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ اس کا اصل سبب تن آسانی و سہل انگاری اور مفت خوری و طن پروری کی خو ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نے حیاء اور غیرت کی چادر کو تار تار کردیا ہے، اگر انسان میں قوتِ ارادی اور خودداری ہو اور اپنی عزت و آبرو عزیز ہو، تو وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلا سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے آپ کو عفیف و آبرومند رکھنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے عفیف رکھتے ہیں اور جو مستغنی رہنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے استغنا عطا فرماتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۵۹/۳، بحوالہ مسند احمد)—— خودداری کے اسی مزاج کو باقی رکھنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا کہ لوگ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کریں اور بیت المال ضرورت مندوں کا حسبِ ضرورت تعاون کرے، کیوں کہ سرکاری ادارہ سے کوئی مدد حاصل کرنے کی صورت میں انسان کا جذبہ خود

داری ختم نہیں ہوتا اور حجاب و حیاء کی کیفیت باقی رہتی ہے، جب انسان ایک دوسرے سے سوال کرنے لگتا ہے تو پہلے زبان کھولے نہیں کھلتی، دل پر پتھر رکھ کر اپنا مطلب پھیلاتا ہے، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نہ تو آنکھوں میں خجالت کی کیفیت باقی رہتی ہے، نہ زبان کو اظہارِ مدعا میں کوئی جھجھک باقی رہتی ہے اور نہ ہاتھ کو لوگوں کے سامنے دراز ہونے میں کوئی عار!

کسی بھی قوم کے لیے یہ بات نہایت شرم ناک ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے جو قوم کے مستقبل ہوتے ہیں، جوان مرد وعورت جن میں محنت اور تگ و دو کی صلاحیت ہوتی ہے، جو قوم کا اثاثہ اور اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، ان میں بے عملی اور بے ضمیری پیدا ہو جائے، اس سے زیادہ قابل افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے؟!

گداگری کے سدباب کے لیے مثبت اور منفی اقدامات کی ضرورت ہے، مثبت اقدام یہ ہے کہ ایسے بچوں کو تعلیم میں لگایا جائے، بہت سے سرکاری وغیر سرکاری ادارے ہیں جہاں بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام ہے، انہیں ایسے اداروں میں پہنچایا جائے، جو خواتین اور مرد کام کرنے کے لائق ہیں انہیں مزدوری پر لگایا جائے، آج کل مزدوروں کی کھپت بہت زیادہ ہے، اصل دشواری تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لیے ہے اور گداگری کے پیشہ میں زیادہ تر ناخواندہ اور ان پڑھ لوگ ہیں، انہیں محنت مزدوری پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، جو لوگ واقعی جسمانی اعتبار سے معذور ہوں ان کے لیے اقامت گاہیں قائم کی جائیں، یا گورنمنٹ کی طرف سے بنے ہوئے رفاہی اداروں تک ان کو پہنچایا جائے۔

منفی اقدام سے مراد یہ ہے کہ گداگری کی حوصلہ شکنی کی جائے، مسجدوں اور درگاہوں کے ذمہ داران انہیں وہاں بیٹھنے اور بھیک مانگنے سے روکیں، مذہبی اجتماعات، جمعہ وعیدین کے مواقع پر بھی انہیں بھیک مانگنے سے منع کیا جائے اور ان کی حوصلہ شکنی کی جائے، ان کو بھیک نہ دی جائے، یہ بھیک مانگیں تو کام کرنے کی ترغیب دی جائے، اس طرح ان کی حوصلہ شکنی ہوگی اور یہ باعزت طریقہ پر کمانے کے عادی ہوں گے۔ بہت سے لوگ جمعہ وغیرہ میں کھلے پیسے لے کر آتے ہیں اور روپیہ دو روپیہ ہر فقیر کو دیتے چلے آتے ہیں، بہ ظاہر یہ کارِ خیر ہے؛ لیکن

بالواسطہ یہ اپنی قوم کے ایک گروہ کو گداگری کا عادی بنانا ہے، اس لیے اس سے اجتناب ہی قوم کے مفاد میں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ ایک طرف آپ نے بھیک مانگنے والوں کو دینے سے انکار کر دیا اور دوسری طرف انہیں محنت ومزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب بھی دی اور اس کی تدبیر بھی فرمائی، اگر ہم اپنی قوم کو اس لعنت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ان میں یہ مزاج پیدا کرنا ہوگا کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے بہا کر کمائیں اور آدھے پیٹ کھائیں؛ لیکن دوسروں کے سامنے سوال کے ہاتھ پھیلا کر بے آبروئی کا راستہ اختیار نہ کریں!!

معاملات کی صفائی

دنیا میں بہت سی مخلوقات ایسی ہیں کہ وہ اپنے باقی رہنے میں اپنی ہم جنس کی محتاج نہیں ہیں، جیسے درخت ہے، درخت کو اپنے ہی جیسے درخت کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلند و بالا پہاڑ اپنے باقی رہنے میں دوسرے پہاڑ کے محتاج نہیں ہیں؛ لیکن جان دار اور خاص کر انسان اپنی زندگی میں اپنی ہم جنس مخلوق اور انسان کے محتاج ہیں، ماں باپ کا ''بڑھاپا'' بال بچوں کے بغیر گذارے نہیں گذرتا، بچے؛ باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کے بغیر بچپن سے جوانی تک کا سفر طے نہیں کر سکتے، ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد ہر شخص کو ایک رفیق کی ضرورت پیش آتی ہے، جو شوہر و بیوی کی شکل میں مہیا ہوتا ہے، یہ ضرورتیں تو چھوٹے سے خاندان سے متعلق ہیں، اس سے باہر نکلیے تو ضرورتوں کا دائرہ اور وسیع ہوجاتا ہے، تاجر و گاہک ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور آجر و مزدور کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

سماج کے دو یا اس سے زیادہ افراد کے درمیان باہمی احتیاج و ضرورت کی بناء پر جو مالی تعلق قائم ہوتا ہے، اسی کو فقہ و قانون کی زبان میں ''معاملہ'' کہتے ہیں، معاملات میں بعض دفعہ ''اُدھار'' کی بھی نوبت آتی ہے اور مہلت کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کیے جاتے ہیں، ایسے وقت میں خاص کر باہمی نزاع کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے، عام طور پر معاملات میں جو اِختلافات پیدا ہوتے ہیں، وہ بڑی شدت اِختیار کر جاتے ہیں؛ اِس لیے کہ مال کی حرص اور مال کے سلسلہ میں بخل اِنسانی فطرت میں داخل ہے، ایسے اِختلافات محبت کے رشتوں کو کڑواہٹوں میں تبدیل کر دیتے ہیں، کینہ و کدورت کی آگ سینوں کو سلگا کر رکھ دیتی ہے؛ یہاں تک کہ لوگ مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں، اور قتل و قتال تک نوبت آجاتی ہے — یہ اختلاف عام طور پر دو اسباب کی وجہ سے رونما ہوتا ہے: ایک: بددیانتی، دوسرے: معاملات میں ابہام۔

بددیانتی اور خیانت کے واقعات تو دن رات پیش آتے رہتے ہیں؛ اس لیے کہ بددیانتی آج کی دُنیا میں جرم کی بجائے آرٹ بن چکا ہے اور بعض لوگ ایسی حرکتوں کو ہوش مندی اور عقل مندی باور کرتے ہیں؛ لیکن بہر حال جو لوگ دین و شریعت سے جڑے ہوئے ہیں، نماز و روزہ

کے پابند ہیں اور اسلامی وضع قطع رکھتے ہیں، وہ بڑی حد تک اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ لیکن معاملات میں ابہام اور صفائی و وضاحت کا نہ ہونا ایسی بیماری ہے، جس میں یہ طبقہ بھی گرفتار رہتا ہے، قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر: ۲۸۲ ہے، جو آیت ''مداینت'' کہلاتی ہے، اس میں قرض کا ایک اہم حکم بتایا گیا ہے اور خاص طور پر ایسے معاملہ کو لکھ لینے کا حکم دیا گیا ہے، عدّاء بن خالد بن ہوذہ کے پاس خرید و فروخت کی ایک دستاویز تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کرائی تھی، اس میں خریدار کی حیثیت سے عدّاء کا نام تھا اور فروخت کنندہ کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ (**سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فی کتابۃ الشروط**، حدیث نمبر: ۱۲۶۰) اس سے معلوم ہوا کہ خرید و فروخت نقد ہو تب بھی لکھ لینا بہتر ہے۔

خرید و فروخت کی ایک صورت یہ ہے کہ قیمت نقد ادا کر دی جائے اور خریدی جانے والی شئے ادھار رکھی جائے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''سَلَم'' کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں ایسی خرید و فروخت کا عام رواج تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی؛ لیکن فرمایا کہ پیمانہ متعین ہونا چاہیے، وزن متعین ہونا چاہیے اور مدت متعین ہونی چاہیے: **''من اسلف فی شیء ففی کیل معلوم، ووزن معلوم، الی اجل معلوم''** (**صحیح البخاری، کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم**، حدیث نمبر: ۲۲۴۰) فقہاء نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل کی ہے کہ چوں کہ شریعت کا منشاء نزاع کو روکنا اور جھگڑے کا سد باب کرنا ہے؛ اس لیے ان تمام چیزوں کا متعین اور واضح ہونا ضروری ہے، جن کے بارے میں آئندہ اختلاف پیدا ہوسکتا ہے، جو شئی ادھار ہے، وہ بھی متعین ہو، جیسے چاول، گیہوں، پھر اس کی قسم بھی متعین ہو، جیسے باسمتی چاول، کوالٹی اور کیفیت میں بھی ابہام نہ ہو، جیسے اَعلیٰ درجہ، درمیانی درجہ وغیرہ، سامان کی ڈیلیوری کی جگہ بھی مقرر ہو، مثلاً یہ چیز فلاں شہر میں مہیا کی جائے گی، وغیرہ۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے قرض و ادھار کی تمام صورتوں کے بارے میں اصولی

بات فرمائی ہے کہ ادائیگی کی مدت واضح اور متعین ہونی چاہیے، کوئی شخص کہے کہ کھیت کی کٹائی یا فلاں شخص کے دینے تک کے لیے ادھار ہے، تو اس کا اعتبار نہیں؛ بلکہ مدت یا ادائیگی کا وقت کسی ابہام کے بغیر مقرر ہونا چاہیے: "**لا تسلف لی العطاء والا لی الحصاد، واضرب اجلا**" (**اعلاء السنن: ۱۴/۱۸۳، به حواله: مصنف ابن ابی شیبة**)

آج کل دارالافتاء، دارالقضاء اور محکمہ شرعیہ وغیرہ میں متعدد ایسے معاملات آتے رہتے ہیں، جن میں آپسی جھگڑے کی بنیاد معاملات کا واضح نہ ہونا ہے، اس وقت اس کی چند صورتوں کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے:

☆ بعض اوقات والد ایک کاروبار شروع کرتے ہیں، اس وقت بچے چھوٹے ہوتے ہیں، بچے جیسے جیسے بڑے ہوئے ان میں سے بعض والد کے ساتھ کاروبار میں لگ جاتے ہیں، بعض ملک یا بیرون ملک میں اچھی ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے لڑکے تو کاروبار میں شامل ہو گئے؛ تاکہ تجارت کو فروغ دیں اور اس کی وجہ سے وہ آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے، چھوٹے بھائیوں نے تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہو گئے، اب والد کے انتقال کے بعد جب ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ آیا تو جس بھائی نے کاروبار میں تعاون کیا تھا، وہ چاہتا ہے کہ اس کو اس کی محنت کا معاوضہ ملے، اور چھوٹے بھائیوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ترکہ برابر تقسیم کیا جائے، بعض دفعہ اس میں ان بھائیوں کے ساتھ بظاہر ناانصافی ہوتی ہے، جنہوں نے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے خود الگ سے کوئی ملازمت نہیں کی یا اپنی تعلیم کو قربان کیا، بعض دفعہ اس کے برعکس صورتِ حال بھی پیش آتی ہے کہ جو بھائی کاروبار میں شریک تھا، وہ پورے کاروبار پر قابض ہو جاتا ہے، اور دوسرے بھائی بہنوں کو بے دخل کر دیتا ہے — اگر والدین بچوں کو کاروبار میں شریک کرتے ہوئے وضاحت کر دیں کہ تمہاری حیثیت پارٹنر کی ہوگی اور تم اس میں اتنے فی صد کے مالک ہو گے، یا تمہاری حیثیت ملازم کی ہوگی اور تم ماہانہ اتنی تنخواہ کے مستحق ہو گے، یا تم میرے معاون و مددگار رہو، الگ سے تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا تو بعد کو چل کر اس طرح کا اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔

☆عملی تعاون ہی کی طرح بعض دفعہ مالی تعاون میں بھی یہ صورت پیش آتی ہے، جیسے والد کی تجارت میں ان کے مطالبہ پر یا بلا مطالبہ بعض بچوں نے مختلف موقعوں پر پیسے دیئے، یہ سرمایہ کاروبار کا حصہ بن گیا؛ لیکن یہ بات متعین نہیں ہوئی کہ سرمایہ لگانے والوں کا کاروبار میں خصوصی شیئر ہوگا، یا ان کی یہ رقم قرض ہے جو بعد میں ادا کی جائے گی، یا اپنے والد کا تعاون ہے؟ یہ عدم وضاحت پھر بعد میں بڑے جھگڑے کا سبب بنتی ہے، جن لڑکوں نے رقم دی تھی وہ زائد حصہ چاہتے ہیں، اور دوسرے بھائی پورے کاروبار کو والد کا ترکہ قرار دیتے ہیں۔

☆ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بھائی نے کاروبار شروع کیا، سب لوگ مل کر رہ رہے تھے، مختلف بھائیوں نے حسب گنجائش موقعہ بہ موقعہ کاروبار میں رقم لگائی، بعض نے نہیں لگائی، بعض محنت میں شامل ہوئے، بعض نہیں ہوئے، اب ہوتا یہ ہے کہ جس بھائی نے کاروبار شروع کیا تھا، وہ سمجھتا ہے کہ یہ پورا کاروبار تنہا اسی کی ملکیت ہے، اور دوسرے بھائی اپنے حصہ کے دعویدار ہوتے ہیں، یہ بات اُس وقت زیادہ پیش آتی ہے، جب والد کی زندگی میں اس نوعیت کا کاروبار شروع ہوا ہو، کبھی کبھار وہ بھی دوکان پر بیٹھ جاتے ہیں، یا تجارت شروع کرنے والے بچے نے اپنے والد کے نام سے تجارت شروع کی، اگر شروع ہی میں یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ کاروبار مشترک ہے، یا جس بھائی نے شروع کیا ہے، اس کا ہے اور جن دوسرے بھائیوں نے کچھ پیسے لگائے ہیں یا محنت کی ہے، وہ تعاون ہے یا قرض ہے یا شرکت ہے؟ اور اگر اسی کاروبار سے گھر کے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں تو یہ بہ طورِ شرکت کے ہے، یا جس کا کاروبار ہے اس کی طرف سے تبرع واحسان ہے؟ تو بعد میں اختلاف پیدا نہ ہو۔

☆اسی طرح کی صورتِ حال بعض دفعہ اراضی کی خریداری میں پیش آتی ہے، ایسا ہوتا ہے کہ بعض لڑکے بیرون ملک ملازمت کر رہے ہوتے ہیں، وہ زمین یا مکان کی خریداری کے لیے رقم بھیجتا ہے، اب والد نے اس رقم سے اپنے نام مکان یا زمین خرید لی، یا اپنے کسی ایسے لڑکے کے نام خریدی جو اپنے وطن میں ہے؛ حالاں کہ پیسے بھیجنے والے کا مقصد اس کے لیے جائیداد خریدنا ہے اور والد کی بھی یہی نیت ہے، بھائیوں کو معلوم ہے؛ لیکن جب والد کا

انتقال ہوا تو نیت بدل گئی اور اصل صاحب حق کا نقصان ہوگیا؛ اس لیے اَوّلاً تو خود رقم بھیجنے والے لڑکے کو چاہیے کہ اپنے والد پر اس بات کو واضح کر دے کہ اس کی نیت خود اپنے لیے زمین خریدنے کی ہے اور والد کو بھی چاہیے کہ اس کی نیت دریافت کر کے اس کے نام سے زمین خریدے، اور اگر اس میں کوئی قانونی دقت ہو تو اپنے نام سے خرید کر اس لڑکے کے نام ہبہ نامہ بنادے، یا اس کو پاور آف اٹارنی دے دے، یا کم سے کم اپنا یہ اقرار نامہ رجسٹرڈ کرادے کہ یہ زمین حقیقت میں میرے فلاں لڑکے کی ملکیت ہے، میں اس کا مالک نہیں ہوں اور میرے دوسرے ورثہ کا بھی اس سے حق متعلق نہیں ہے۔

☆ اسی طرح کا اختلاف بعض اوقات مکان کی تعمیر میں بھی پیدا ہوتا ہے، جیسے والد نے مکان کی تعمیر شروع کی اور بعض لڑکوں نے اس میں پیسے دیئے؛ لیکن ان کا پیسہ دینا کس حیثیت سے ہے؟ یہ واضح نہیں ہوتا، بعد میں پیسہ دینے والے لڑکے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس مکان میں اس کا خصوصی شیئر ہو اور دوسرے لڑکے پورے مکان کو والد کا ترکہ قرار دیتے ہیں، یہی صورتِ حال اُس وقت بھی پیش آتی ہے جب اتفاق واتحاد کے ماحول میں کوئی بھائی مکان کی تعمیر شروع کرتا ہے، اب کئی بھائیوں میں سے ایک دو کچھ پیسے لگا دیتے ہیں، کوئی اپنا وقت دے دیتا ہے، اور یہ بات طے نہیں ہوتی کہ اس مالی اور عملی تعاون کی حیثیت کیا ہوگی؟ اگر یہ شروع میں طے پا جائے تو نہ دل کے آبگینے ٹوٹیں گے نہ کینہ وکدورت کی آگ سلگے گی!

☆ ایک قابل توجہ بات تقسیم میراث کی ہے، جیسے ہی مورث کا انتقال ہوا، اس کے ترکہ سے تمام ورثہ کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اور ترکہ میں مرنے والے کی تمام چیزیں شامل ہیں، مثلاً: اگر ایک لڑکا مرنے والے کے ساتھ اس مکان میں مقیم تھا، اب والد کی وفات کے بعد تنہا اس مکان کو یا والد کی دوسری اشیاء کو استعمال کر رہا ہے تو اپنے شیئر سے زیادہ حصہ جو اس کے استعمال میں ہے، وہ اس کے حق میں گناہ اور حرام ہے، پھر تقسیم میں جتنی تاخیر ہوتی جاتی ہے اُلجھنیں بڑھتی جاتی ہیں اور اختلاف کے مواقع بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں؛ اس لیے شریعت کا مقرر کیا ہوا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے گذرنے کے بعد جلد سے جلد ایک دو دنوں کے

اندر تمام ورثہ بیٹھ کر شریعت کے حکم کے مطابق اپنے حصے تقسیم کرلیں اور اس تقسیم میں ہر چیز کو شامل کریں؛ کیوں کہ قرآن مجید میں ترکہ کے لیے ''مَا تَرَکَ'' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی مرنے والا جو بھی چھوڑ جائے؛ اس لیے گلاس اور پلیٹیں بھی ترکہ میں شامل ہیں، ہاں! اگر مرحوم کی بعض اشیاء کے استعمال کے بارے میں ورثہ کا اتفاق ہوجائے کہ یہ چیز فلاں کے استعمال میں رہے گی تو حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ دوسرے حق داروں کی طرف سے اس کے حق میں ہبہ ہے۔

یہ اور اس طرح کے معاملات میں جہاں وضاحت ضروری ہے، وہیں یہ بھی مناسب ہے کہ ان معاملات کو تحریر میں لے آیا جائے اور اس تحریر پر تمام متعلقہ لوگوں اور کچھ گواہوں کے دستخط ہوجائیں؛ تاکہ آئندہ طے پانے والے اُمور کے سلسلہ میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ اگر معاملات کی اچھی طرح وضاحت ہوجائے اور اسے تحریر میں لایا جائے تو زمین وجائیداد کے پچاس فی صد جھگڑے ختم ہوجائیں اور اختلاف کی نوبت ہی نہ آئے۔

غصہ پر قابو

انسان مجموعہ اضداد ہے، طاقت ور ایسا کہ سمندر اور پہاڑ بھی اس کی ٹھوکروں میں ہے اور کمزور ایسا کہ پانی کا معمولی سا تلاطم اور پہاڑ کا ایک سنگ ریزہ بھی اس کی موت کے لیے کافی ہے، لطیف ایسا کہ غنچہ وگل بھی اس پر نثار ہو، اور ذوق سے محروم ہو تو کثیف ایسا کہ شاید کوئی اخلاقی اور مادی آلائش اس کا مقابلہ کر سکے، محبت کرے تو شبنم اور بادِ نسیم سے بھی زیادہ خنک، اور نفرت پر اتر جائے تو آتش فشاں بھی اس کی گرمی عداوت پر شرمائے، اسی طرح انسانی فطرت میں ایک اہم عنصر غصہ، غیظ وغضب اور جوش وانتقام کا ہے، یہ ایک آگ ہے جو انسان کے سینہ کو سلگا کر رکھ دیتی ہے اور اس کا انگ انگ اس کی حرارت سے دہک اٹھتا ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، زبان بے قابو ہو جاتی ہے اور جب غصہ شدید ہو تو اپنے اعضاء پر بھی انسان کی گرفت باقی نہیں رہتی؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ (مسند احمد: ۱۷۹۸۵، ابوداؤد: ۴۷۸۴، عن عطیۃ) گویا غصہ کی حالت میں انسان شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے اور شیطان اس کو اپنے مقصد ومنشاء کی تکمیل کے لیے ذریعہ بناتا ہے۔

غصہ کی کیفیت انسان کو دینی اعتبار سے بعض اوقات سخت خسارہ میں ڈال دیتی ہے، زبان سے کفریہ کلمات نکل جاتے ہیں، آدمی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو سراسر تقاضۂ دین و ایمان کے مغائر ہوتی ہیں، یہی جوشِ غضب انسان کو قتل وقتال اور سب وشتم تک پہنچا دیتا ہے، دینی نقصان تو ہے ہی، دنیوی نقطۂ نظر سے بھی انسان کچھ کم نقصان سے دوچار نہیں ہوتا، بہت سے واقعات ہیں کہ بیوی کو طلاق دے دیتے ہیں، بعض مغلوب العقل حضرات خودکشی کر بیٹھتے ہیں، شدتِ غضب میں اپنا ہی سامان توڑ پھوڑ کرنے سے گریز نہیں کرتے، غصہ کی وجہ سے انسان دماغی مریض بھی بن سکتا ہے اور قلب پر حملہ سے بھی دوچار ہو سکتا ہے —— اگر معاشرہ کے مفاسد کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر برائیاں غصہ ہی کی دین ہیں، خاندانوں کی باہمی نفرت، میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلے، ایک دوسرے کی عزت ریزی، صلح کے مواقع تلاش کرنے

کے بجائے مقدمہ بازی اور جنگ و جدال کا تسلسل، سماج کی یہ مہلک بیماریاں نوے فی صد غصہ ہی کے سبب ہیں؛ اسی لیے اسلام میں غصہ کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور غصہ پر قابو پانے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جیسے ایلواء شہد کو خراب کر دیتا ہے، اسی طرح غصہ ایمان کو، ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ جہنم کے قریب ہو جاتا ہے۔ (احیاء العلوم: ۱٦۵/۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: بدترین آدمی وہ ہے جس کو غصہ جلد آئے اور ختم ہو دیر سے: "**شرهم سريع الغضب بطئى الفيىء**" اور بہترین آدمی وہ ہے جسے غصہ دیر سے آئے اور جلد چلا جائے: "**خيرهم بطىء الغضب سريع الفيىء**" (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۱۲) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر کچھ لوگوں پر ہوا، کچھ لوگ پتھر اٹھا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: پتھر اٹھا رہے ہیں، لوگ ان کی بہادری بیان کرنا چاہ رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ان سے بھی بہادر آدمی نہ بتلاؤں؟ پھر ارشاد فرمایا: ان سے بھی بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم گذرے، جو منتشر حالت میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: فلاں پہلوان ہے کہ جس پہلوان سے بھی کشتی لڑتا ہے اسے زیر کر دیتا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بھی زیادہ پہلوان شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ اس سے بھی بڑا بہادر وہ شخص ہے جس پر کوئی شخص ظلم کرے اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے، اس نے اپنے غصہ پر بھی غلبہ پایا اور اپنے شیطان پر بھی اور اپنے حریف کے شیطان پر بھی۔ (مجمع الزوائد: ٦۸/۸) ایک اور روایت میں ہے کہ اصل بہادر وہ ہے کہ جسے غصہ آئے خوب غصہ آئے، چہرہ سرخ ہو جائے اور بال کھڑے ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنے غصہ پر قابو پالے۔ (حوالہ سابق: ٦۹/۸)

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر غصہ سے بچنے کی نصیحت فرماتے،

ایک صاحب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیحت کی خواہش کی، آپ نے فرمایا غصہ نہ کرو، وہ بار بار پوچھتے رہے اور آپ بار بار یہی جواب دیتے رہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے عرض کیا کہ مجھے کوئی مفید مگر مختصر نصیحت فرمایئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کرو، وہ بار بار نصیحت کی درخواست کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار یہی جواب ارشاد فرماتے۔ (مجمع الزوائد: ۸/۷۰، بحوالہ طبرانی) حضرت ابو درداءؓ نے درخواست کی کہ ایسا عمل ارشاد فرمایا جائے جو مجھے جنت میں داخل کردے، فرمایا: غصہ نہ کرو۔ (حوالہ سابق) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایسا عمل جاننے کی خواہش کی جو خدا کے غضب سے بچانے والا ہو، اب بھی یہی ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کرو۔ (حوالہ سابق: ۸/۶۹، بحوالہ مسند احمد) ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیحت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ سے بچنے کو فرمایا، میں نے اس میں غور کیا تو محسوس کیا کہ غصہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے: ''الغضب یجمع الشر کله۔'' (حوالہ سابق)

اہل علم نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنے بچوں کو خاص طور پر غصہ کی کثرت سے منع فرمایا اور کہا: ''ایاک و کثرۃ الغضب'' (احیاء العلوم: ۳/۱۶۵) امام جعفرؒ کا قول منقول ہے کہ غضب ہر برائی کی کلید ہے: ''الغضب مفتاح کل شر'' حضرت عمرؓ اکثر اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص حرص، خواہش نفس اور غصہ سے بچ گیا وہ کامیاب ہوگیا، مشہور محدث عبد اللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ایک جملہ میں حسن اخلاق کو بتایئے، امام صاحبؒ نے فرمایا: غصہ چھوڑ دو ''اترک الغضب'' (احیاء العلوم: ۳/۱۶۶)

اسی لیے غصہ کو پی جانے پر بڑا اجر ہے، حضرت معاذ بن انسؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص غصہ اُتارنے پر قادر ہو، اس کے باوجود وہ غصہ پی جائے، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن تمام مخلوقات کی موجودگی میں (از راہِ اعزاز) طلب فرمائیں گے اور اسے اختیار دیں گے کہ جس حور کا چاہے انتخاب کرلے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۲۰۲)

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غصہ پر قابو پانا اور غصہ کے وقت اپنے آپ کو عدل اور

اعتدال پر قائم رکھنا آسان نہیں اور انسان کے اخلاق و رواداری کا اصل امتحان اسی موقع پر ہے؛ اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خوب فرمایا کہ آدمی کی بردباری کو اس وقت دیکھو جب وہ غصہ کی حالت میں ہو اور اس کی امانت و دیانت کا اندازہ اس کی طمع و حرص کے مواقع پر، جس کو تم نے حالتِ غضب میں نہیں دیکھا، تم کو اس کی بردباری کا علم نہیں اور جس کو تم نے حرص ولالچ کے مواقع پر نہیں دیکھا، تم کو اس کی دیانت کی خبر نہیں۔ (احیاء العلوم: ۱۶۶/۳)

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا بہت بڑا عمل ہے اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہایت ہی بہادری کا کام ہے؛ اسی لیے آپ نے غصہ پر قابو پانے کی مختلف تدابیر بتائی ہیں، آپ نے اس کی ایک تدبیر یہ بتائی کہ ایسے وقت میں آدمی "**اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم**" پڑھے، ایک صاحب اتنا غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ اب ان کی ناک پھٹ پڑے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہے تو اس کا غصہ فرو ہو جائے، دریافت کیا گیا: وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم**" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۸۰، بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۴۸) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غصہ ایک شیطانی حرکت ہے، جب انسان اس موقع پر تعوذ پڑھے گا، تو اللہ کی مدد سے اس شیطانی حرکت پر غلبہ پالے گا، نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کلمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا ذہن اس جانب منتقل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شیطان کا آلہ کار ہے، اس خیال سے وہ اپنے آپ کو موجودہ کیفیت سے بآسانی نکال سکے گا۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصہ کے وقت انسان کچھ نہ بولے اور چپ سادھ لے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو خاموش رہے: "**اذا غضب احدکم فلیسکت**" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۳۷) کیوں کہ غصہ کی حالت میں انسان جتنا زیادہ بولتا ہے، جوشِ غضب بڑھتا جاتا ہے اور اکثر اوقات ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو خود اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے — غصہ کو روکنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ انسان اپنی موجودہ کیفیت میں تبدیلی لے آئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا

ہو تو لیٹ جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو غصہ کے وقت اس تدبیر کے اختیار کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۸۲، عن ابی ذر غفاریؓ)

ابووائل ایک واعظ تھے، وہ عروہ بن محمد سعدی کے پاس گئے، عروہ سے ایک شخص نے ایسی بات کہی کہ ان کو غصہ آ گیا، وہ اٹھ گئے اور وضو کر کے واپس آئے، پھر ایک حدیث بیان فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہے، شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس لیے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لینا چاہیے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۸۴) — معلوم ہوا کہ وضو بھی غصہ پر قابو پانے میں ایک مؤثر طریقہ ہے، روحانی طور پر تو وضو میں غصہ فرو کرنے کی تاثیر ہوگی ہی؛ کیوں کہ یہ ارشاد نبوی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بڑھ کر صحیح و درست بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن علاوہ اس کے نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پانی کی ٹھنڈک جسم کی حرارت، تکان اور غیر معتدل کیفیت کو دور کرنے اور معتدل بنانے میں بہت مؤثر ہوتی ہے، امام غزالیؒ نے کچھ اور تدبیریں بھی غصہ پر قابو پانے کی بتائی ہیں، ان میں یہ ہے کہ غصہ پر قابو پانے کے فضائل سے متعلق آیات واحادیث کو اپنی نگاہ میں رکھے، اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، غصہ سے انجام کار عداوت وانتقام کی جو آگ فریق مخالف کے دلوں میں سلگے گی اس کو اپنے ذہن میں مستحضر کرے، غصہ کے وقت آدمی کی صورت میں جو بگاڑ آتا ہے اس کو ذہن میں لائے اور سوچے کہ گویا وہ اس کیفیت میں ایک کاٹ کھانے والے کتے اور حملہ کرنے والے درندے کی طرح ہے وغیرہ۔ (احیاء العلوم: ۴/۱۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تدابیر کا حاصل اور غصہ پر قابو پانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خدا کا خوف ہے، خدا سے بے خوفی انسان کو ظلم پر جری بناتی ہے اور خدا کا خوف انسان کے بے قابو جذبات کو تھام لیتا ہے، حضرت عمرؓ ان لوگوں میں تھے جن کو زیادہ غصہ آتا تھا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں تھی؛ اسی لیے ان کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے: ”کان وقافا عند کتاب اللہ“

(بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله تعالیٰ :"خذِ العَفوَ وَامر بِالعرفِ وَاَعرِض عَنِ الجَاهِلِینَ" حدیث نمبر:۴۶۴۲) ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کسی شخص کو اس کی غلطی کی بناء پر کوڑے لگانے کا حکم دیا، اس نے آیت قرآنی پڑھ دی کہ "عفو و درگذر" کو اختیار کرو، بھلائی کا حکم دو اور ناواقف لوگوں سے گریز برتو:"خـذِ الـعَـفـوَ وَامـر بِـالعـرفِ وَاَعـرِض عَنِ الـجَـاهِـلِیـنَ" (الاعراف:۱۹۹) حضرت عمرؓ نے ایک لمحہ غور فرمایا اور اس کو چھوڑ دیا۔(احیاء العلوم:۳/۳/۱۷۱) اگر سینہ میں خوفِ خدا کی آگ موجود ہو، تو وہ غصہ کی آگ کو کھا جائے گی اور اگر دل خوفِ الٰہی سے خالی ہو تو غصہ کی آگ اسے کھا جائے گی دنیا میں اور آخرت میں بھی، غصہ برائیوں کی جڑ ہے اور غصہ پینا سب سے بڑی بہادری۔

... کہ آشیانہ کسی شاخِ گل پہ بار نہ ہو!

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، یعنی وہ تنہا نہ ایک خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے اور نہ تنہا اپنی ضروریات پوری کرسکتا ہے، وہ نہ صرف بیوی بچوں کا محتاج ہوتا ہے؛ بلکہ اس کو خاندان اور سماج کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اسی ضرورت سے باہمی تعلقات وجود میں آتے ہیں، پڑوسیوں سے تعلق، مقامی تاجروں سے ارتباط، زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے استفادہ، سفر کرتے ہوئے سفر کے ساتھیوں کا لحاظ، گاڑی چلاتے ہوئے ان دوسرے لوگوں کا خیال جو ہمارے ساتھ رواں دواں ہیں، معالج اور مریض، تاجر اور گاہک، آجر اور مزدور، استاذ اور طالب علم، حکومت کے نمائندے اور رعایا، غرض کہ زندگی کے ایک ایک لمحہ میں انسان گھر سے لے کر باہر تک ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، جیسے بجلی کا ایک بلب روشنی دینے میں کرنٹ کا محتاج ہے، اسی طرح انسان مختلف ضرورتوں کو پوری کرنے میں کتنے ہی انسانوں، جانوروں، مشینوں اور مادّی وسائل کا ضرورت مند ہے۔

اب اگر وہ اس ضرورت کو خوش گوار طریقہ پر پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے وہ چاہتا ہے کہ اس کا خیال ولحاظ رکھا جائے، اسی طرح وہ خود دوسروں کا بھی خیال ولحاظ رکھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے بڑی خوب تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ مسلمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے لیے جس چیز کو پسند کرتا ہے، اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند کرے: "**یحب لاخیہ مایحب لنفسہ**" (صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر:١٢) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا بھائی جس کیفیت سے دوچار ہو، انسان غور کرے کہ اگر اس وقت وہ اس کیفیت سے دوچار ہوتا تو وہ اپنے ساتھ کس سلوک کا خواہش مند ہوتا؟ وہی سلوک اس کے ساتھ کرنے کی کوشش کی جائے، آپ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں؛ حالاں کہ نوجوان اور صحت مند ہیں، اگر کھڑے بھی ہوجائیں تو کوئی بڑی دشواری نہ ہو، آپ کے بازو میں ایک بزرگ شخص کھڑے ہوئے ہیں، ہاتھوں میں عصا، کمر جھکی ہوئی، قدموں میں

لڑکھڑاہٹ، ہاتھوں میں لرزش اور جسم لاغر، کسی چیز کو تھامے ہوئے، اب غور کریں کہ اگر آپ اس عمر میں ہوتے تو کیا سوچتے؟ یہی کہ کوئی نوجوان اُٹھ کر آپ کو اپنی جگہ بٹھا دے، ایسے وقت میں اگر آپ کھڑے ہو جائیں اور اپنی جگہ پر ان بزرگ کو بٹھا دیں تو آپ کو ان سے بغیر کسی خواہش اور طلب کے ڈھیر ساری دُعائیں ملیں گی اور آپ کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر ہوگا کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔

ٹرین میں بہت سی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ کو نیچے کی برتھ مل گئی اور کسی خاتون کے حصہ میں اوپر کی برتھ ہے، اس کے لیے خود ہی اوپر چڑھنا دشوار ہے اور اگر اس کے چھوٹے بچے بھی ہوں تو پھر تو یہ عمل دشوار تر ہو جاتا ہے، اگر اس وقت آپ کی فیملی اور آپ کے بچے ہوتے تو یقیناً آپ چاہتے کہ آپ ان کے لیے نیچے کی برتھ کا انتظام کریں، اب اگر آپ یہاں تھوڑی سی مشقت کو گوارا کرلیں اور اپنی اس انسانی بہن کو اپنی برتھ حوالہ کر دیں تو سوچیے کہ اس کے دل میں کس قدر شکر کے جذبات موجزن ہوں گے؟

سفر وحضر میں کتنے ہی مواقع آتے ہیں، جب ایسے عمل کی ضرورت پڑتی ہے، یہ طرزِ عمل انسان کو لوگوں کی نگاہ میں محبوب بنا دیتا ہے اور جو انسانوں کے درمیان محبوب ہوتا ہے، اس کو اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے، جو لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہو اور اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ وہ شخص ہے جو لوگوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہو: ’’**ان احبکم الی اللّٰہ احبکم الی الناس.... الخ**‘‘ (**المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر: ۶۰۱۹**) ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ’’ایمان والے کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ خود محبت کرتا ہے اور وہ اس لائق ہوتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اور اس شخص میں خیر نہیں ہے جو نہ خود محبت کرتا ہو اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہو۔‘‘ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے حسن اخلاق کی بڑی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم میں سے وہ شخص مجھ سے قریب ہوگا،

جس کے اخلاق بہتر ہوں گے، اور مجھ سے سب سے دور وہ شخص ہوگا، جس کے اخلاق خراب ہوں گے: ''ان احبکم الی و اقربکم منی فی الآخرۃ محاسنکم اخلاقا.... الخ'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۷۳۲)

یہ تو اخلاق کا ایک پہلو ہے کہ دوسروں کے کام آیا جائے، اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دی جائے، خود نقصان اُٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور خود مشقت برداشت کر کے دوسروں کے لیے راحت و آرام کے مواقع پیدا کیے جائیں، یہ اخلاقی احکام بعض حالات میں واجب بھی ہو جاتے ہیں؛ لیکن زیادہ تر مستحب کے درجہ میں ہیں، اخلاق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کے کسی عمل سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچ جائے، یہ شرعاً واجب ہے، قرآن و حدیث میں اس کی جزوی تفصیلات اتنی وضاحت سے ذکر کی گئی ہیں کہ عبادات کے سوا کسی اور شعبۂ زندگی میں اتنی زیادہ تفصیل کا ذکر نہیں ملتا؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کسی ایسے عمل کو بھی پسند نہیں فرمایا، جس سے جانور کو تکلیف ہو، آپ نے جانور کے چہرہ پر مارنے اور اس کو برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ''ینھیٰ عن لطم خدود الدواب'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۷۱۸۰) لوگ جانوروں کو کھڑا کر کے اس پر بیٹھا کرتے تھے اور اس کو کرسی کی طرح استعمال کیا کرتے تھے، یہ عمل ایک تو بے ضرورت ہے، دوسرے جانور کو چلتی ہوئی حالت میں مشقت کا احساس کم ہوتا ہے اور ٹھہری ہوئی حالت میں مشقت کا احساس زیادہ؛ اس لیے آپ نے اس سے منع فرمایا: ''لا تتخذوھا کراسی'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۵۶۳۹) آپ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ ایک جانور پر تین تین آدمی سوار ہوں: ''نھی عن ان یرکب ثلاثۃ علی دابۃ'' (المعجم الاوسط ، حدیث نمبر: ۲۱۵۷) گویا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہو گیا کہ سواری چاہے جانور کی شکل میں ہو یا کسی مشین کی شکل میں، اس پر اس کی طاقت و صلاحیت کے لحاظ سے ہی بیٹھنا چاہیے، اگر اس کی رعایت نہ کی گئی تو حادثات پیش آسکتے ہیں، جو خود ان کے لیے بھی نقصان کا باعث ہو سکتا ہے اور دوسرے راہ گیروں کے لیے بھی؛ اس لیے ایسا عمل نہ صرف قانوناً درست نہیں ہے؛ بلکہ شرعاً بھی درست نہیں۔

آج اگر ہم اپنی عملی زندگی میں دیکھیں تو کتنے ہی مواقع پر ہم ایسا عمل کرتے ہیں، جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ ہم ایسے کاموں کو اپنی عقل مندی اور ہوشیاری باور کرتے ہیں، مثلاً بہت سے لوگ استعمال شدہ پانی کے اخراج کے لیے نالیاں سڑک پر نکال دیتے ہیں، آنے جانے والوں کو دقت ہوتی ہے، تعفن پھیلتا ہے، کپڑے خراب ہوتے ہیں؛ لیکن ہمیں اس کی پرواہ نہیں، قانون کے مطابق تو ہمیں گھر بناتے وقت اپنی زمین کا کچھ حصہ چھوڑنا چاہیے؛ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ زمین کا کچھ حصہ چھوڑنا تو کجا ہم سڑک کے حصہ میں سیڑھیاں، چبوترے اور چھجے بنا لیتے ہیں اور ہم ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ اگر اس طرح ہم نے کوئی زمین غلط طریقہ پر اپنے استعمال میں لے لی تو ہم نے ایک ہی فرد کو تکلیف نہیں پہنچائی؛ بلکہ ہزاروں افراد کو تکلیف و مشقت میں مبتلا کیا اور ان کی حق تلفی کی، اس طرح ہم اجتماعی طور پر زمین غصب کرنے کے گنہ گار ہوں گے، محلوں میں یہ بات عام ہے کہ اپنے گھروں کا نکلا ہوا کچرا راستہ پر یا کسی کے گھر کے سامنے ڈال دیا، اسی طرح ایک عام مزاج یہ ہے کہ راستہ میں گاڑیاں ٹھہرا دیں، جہاں پارکنگ نہیں ہے، وہاں گاری کھڑی کر دی، اس کی وجہ سے ٹریفک جام ہوتی ہے، کتنے ہی ضرورت مند لوگ وقت پر اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے، منٹوں کا سفر طے کرنے میں گھنٹے لگ جاتے ہیں، فلائٹیں، ٹرینیں اور بسیں چھوٹ جاتی ہیں، اس کے نتیجہ میں ٹکٹ ضائع ہو جاتا ہے، مریض وقت پر ہاسپٹل نہیں پہنچ پاتا، یہاں تک کہ ایمبولینس کو بھی لوگ راستہ دینے کو تیار نہیں ہوتے، کتنے ایسے واقعات ملیں گے کہ مریض کے ہاسپٹل پہنچنے سے پہلے ہی اس کی موت ہو گئی، بظاہر یہ ایک چھوٹا سا فعل معلوم ہوتا ہے؛ لیکن غور کیجیے کہ یہ کتنے سارے لوگوں کی مشقت کا سبب بن جاتا ہے اور مشقت بھی انتہائی درجہ کی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کے باعث تکلیف بننے والے عمل کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ ایمان کا ایک درجہ ہے کہ راستہ سے ''اذی'' کو ہٹا دیا جائے: ''**وادناھا ما ط الاذی عن الطریق**'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۵۸) ''اذی'' کے معنی گندگی کے بھی ہیں اور تکلیف دہ چیز کے بھی؛ اس لیے اس میں وہ

ساری چیزیں شامل ہیں، جو راستہ چلنے والوں کے لیے تکلیف دہ ہو، راستہ پر پیشاب پاخانہ کرنا، کچرا پھینکنا، جسمانی نقصان پہنچانے والی چیزوں کو راستہ پر ڈال دینا، راستہ کے کچھ حصہ کو اپنے استعمال کے لیے مخصوص کر لینا، گاڑی اس طرح کھڑی کرنا کہ ٹریفک جام ہو جائے؛ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا: "**ایاکم والجلوس علی الصعدات**" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۱۶۳) گویا راہ گیروں، پڑوسیوں اور محلّہ کے لوگوں کو تکلیف سے بچانا بھی ایمان میں داخل ہے۔

اور صرف راستہ کی رکاوٹ پر ہی موقوف نہیں، کوئی بھی ایسا عمل جس سے کسی کی حق تلفی ہو، یا جو کسی کے لیے تکلیف یا خوف و دہشت کا باعث ہو جائے، اس کو کر گزرنا اس ممانعت میں شامل ہے، جیسے بے موقع تھوک اور بلغم پھینکنا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص بلغم پھینکے تو اسے زمین میں دفن کر دے، یا ایسی شکل اختیار کرے کہ یہ کسی انسان کے بدن یا کپڑے میں نہ لگے: "**اذا تنخم احد فلیغیب نخامته**.... الخ" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۱۲۷) عام طور پر لوگ دائیں طرف سے چلا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ دائیں طرف تھوک نہ پھینکو، اگر بائیں طرف کوئی نہ ہو تو بائیں طرف تھوکا کرو اور اگر بائیں طرف لوگ ہوں تو اپنے سامنے نیچے تھوکا کرو: "**فلا تبزق عن یمینک ولکن عن یسارک**.... الخ" (کنز العمال: ۳۴۶۱۴)

عوامی حق تلفی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ٹرینوں یا بسوں میں دوسرے کی سیٹ پر آپ بلا اجازت بیٹھ جائیں، یا جو کوچ یا جو سیٹیں خواتین اور معذوروں کے لیے مخصوص ہوں، ان پر دوسرے لوگ قابض ہو جائیں، ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے جو بیت الخلاء عوامی مقامات پر معذورین کے لیے بنائے گئے ہیں، ان میں اچھے خاصے صحت منداور تنو مندلوگ چلے جاتے ہیں اور بے چارے بوڑھے اور معذور لوگ انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، ریلوے پلیٹ فارم اور ٹرین کی جنرل بوگیوں میں بینچیں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی ہیں؛ لیکن بعض لوگ ان پر ایسی بے فکری کے ساتھ سوجاتے ہیں کہ گویا انہوں نے اس بینچ کا

ریز رویشن کرا رکھا ہو۔

تکلیف ہی پہنچانے کی ایک صورت رہائشی علاقوں میں غیر قانونی طور پر ایسی صنعتوں کا قائم کرنا ہے، جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوں، اور جن سے صنعتی فضلات، گیسوں اور دھوؤں کا اخراج ہوتا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے تو اس بات سے بھی منع فرمایا کہ رات کو سوتے وقت چراغ جلتا ہوا چھوڑ دیا جائے: ''**اطفئوا سراجکم**'' (سنن ابی داؤد، ابواب النوم، حدیث نمبر: ۵۲۴۷) یہ ممانعت کئی مصلحتوں کو شامل ہے، ایک تو بلا ضرورت چراغ کے جلانے میں ایندھن کا ضیاع ہے اور ایندھن اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، دوسرے: اس سے نکلنے والا دھواں انسان کے لیے نقصان دہ ہے، تیسرے: اس سے آگ لگنے کا اندیشہ ہے، اسی حکم میں ایسی گاڑیاں ہیں، جن میں ناقص ایندھن استعمال کیا جائے اور اس کی وجہ سے بڑی مقدار میں دھویں کا اخراج ہو؛ کیوں کہ یہ ماحول کے لیے نقصان دہ اور صحت کے لیے تباہ کن ہے۔

گاڑیوں میں ''ہارن'' چلنے والوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہوتا ہے؛ لیکن آج کل کچھ لوگ کتے کی آواز یا کسی اور جانور کی آواز یا چھوٹے بچہ کی آواز کا ہارن استعمال کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو پہیوں والی گاڑی میں ٹرک اور لاری کا ہارن لگا دیا، اس طرح کی آوازیں چلنے والوں کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتی ہیں اور آدمی بسا اوقات توازن کھو دیتا ہے، یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہمارے مزاج اور طرزِ فکر کی عکاسی ہوتی ہے، جو شخص مومنانہ اخلاق کا حامل ہو، جس کے دل میں انسانیت کی محبت اور دوسرے انسانوں کا لحاظ ہو، وہ ہر ایسی بات سے بچتا ہے، جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث ہو، وہ ایک چیونٹی کا بھی خیال کرتا ہے کہ بلا ضرورت اسے مارا نہ جائے، وہ ایک بلی کا بھی خیال رکھتا ہے کہ وہ بھوک سے مر نہ جائے اور اس کو ایک کتے کا بھی پاس ولحاظ رہتا ہے کہ وہ پیاسا نہ رہ جائے، اسے یہ بات بھی بے قرار کرتی ہے کہ اس کا کوئی عمل دوسروں کے لیے تکلیف ومشقت کا سبب ہو جائے، بقول شاعر:

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیانہ کسی شاخِ گُل پہ بار نہ ہو

اور جس انسان کا دل دوسرے انسانوں کی تکلیف سے دُکھتا نہ ہو، وہ دوسروں کا حق مار کر چند لمحوں کی راحت حاصل کرنے کو اپنی عقل مندی و ہوشیاری باور کرتا ہے۔

نظامِ مؤاخاۃ کی ضرورت

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ حرف حرف روشن ہے، سیرت کے جس صفحہ کو پڑھیے اور جس واقعہ کو دیکھیے عبرت وموعظت کا ایک نور پھوٹتا ہوا نظر آئے گا اور زندگی کے تمام مسائل اور ہر طرح کے حالات کے لیے رہنمائی حاصل ہوگی؛ لیکن بعض واقعات وہ ہیں، جو منفرد نوعیت کے حامل ہیں اور مشکلات کے حل کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

ایسے ہی واقعات میں مؤاخاۃ (آپسی بھائی چارہ کا قیام) ہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آفتاب طلوع ہوا تو تین سال آپ نے خاموشی کے ساتھ دعوتِ دِین کا فریضہ انجام دیا، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنے نبی ہونے کا اعلان فرمایا اور ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی، اہل مکہ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ جو شرف واعزاز اب تک بنواسرائیل کے حصہ میں تھا، اب وہ بنواسماعیل کے نصیب میں آیا ہے؛ لیکن انھوں نے نبوت کی اس روشنی سے اپنے دل ونگاہ کے اندھیاروں کو روشن کرنے کے بجائے اپنی آنکھوں پر بغض وعناد کی سیاہ پٹی باندھ لی، اس وقت بہت کم لوگ تھے، جن کی سلیم فطرت نے ان کی یاوری کی اور وہ ایمان سے مشرف ہوئے۔

اگرچہ ان ایمان لانے والے خوش نصیبوں کی متعین تعداد بتانی دشوار ہے؛ لیکن بہر حال ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی، ان میں دولت مند بھی تھے، غریب بھی، وہ لوگ بھی تھے جن کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں تھیں یا صاحب خیر مسلمانوں کی مدد سے غلامی سے آزاد ہو چکے تھے؛ لیکن پھر بھی ان کو عرب کے معاشرہ میں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، مسلمانوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے گئے اور کوئی ایسی تکلیف نہیں تھی جو انہیں پہنچائی نہیں گئی ہو، صبر واستقامت اور توکل علی اللہ، ہی وہ ہتھیار تھے، جن کے ذریعہ انہوں نے اپنا ایمان بچا رکھا تھا، جب اذیت رسانی بہت بڑھ گئی تو آپ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی، جہاں ایک رحم دل عیسائی بادشاہ کی حکومت قائم تھی، تقریباً

۸۰؍افراد نے وہاں ہجرت کی۔

مگر مسلمانوں کی بڑی تعداد اب بھی چھپتی چھپاتی مکہ میں ہی قیام پذیر تھی، وہ کھلے عام نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، قرآن کی تلاوت نہیں کر سکتے تھے، زیادہ تر افراد نے اپنے قبولِ اسلام کو چھپا رکھا تھا، سینہ بسینہ ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچاتے تھے، اور باہم رابطہ رکھتے تھے، اکٹھا ہونا ہوتا تو کسی خفیہ جگہ کا انتخاب کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار حضرت ارقمؓ کا مکان صفا کی پہاڑی پر تھا، یہ جگہ مکہ کی عام آبادی سے بالکل الگ تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہوتے، نماز ادا کی جاتی اور تعلیم وتعلّم کا فریضہ انجام دیا جاتا۔

بالآخر اللہ تعالیٰ نے اہل مدینہ کے دلوں کو ایمان کے شجرۂ طوبیٰ کے لیے منتخب فرمالیا، انہوں نے تین سالوں میں حج کی مناسبت سے الگ الگ تعداد میں خفیہ طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا، اور وعدہ بھی کیا کہ اگر مسلمان مکہ سے مدینہ ہجرت کر جائیں تو وہ ان کو پناہ دیں گے، اور پوری طاقت کے ساتھ ان کا تحفظ کریں گے؛ حالاں کہ اہل مدینہ زیادہ تر غریب اور زراعت پیشہ تھے، مکہ کے تاجروں کے مقابلہ میں ان کا معاشی معیار کم تھا، اور وہ سود خوار یہودیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، جسمانی طور پر بھی وہ مکہ کے سورماؤں کے مقابلہ میں کمزور سمجھے جاتے تھے اور اہل مکہ کو اسلام اور مسلمانوں سے جیسی سخت عداوت تھی، اس کے تحت اس بات کا پورا پورا اندیشہ موجود تھا کہ مسلمانوں کو پناہ دینے پر اہل مکہ ان کو اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں، اور ان کی چھوٹی سی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جا سکتا ہے؛ لیکن ان تمام خطرات واندیشوں کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور ادنیٰ سی بھی تنگ دلی اور بُز دلی ان کے قریب بھی پھٹک نہ سکی۔

اس معاہدہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں موجود مسلمانوں کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم دیا، غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ صحابہؓ مدینہ منتقل ہوتے گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بھی ہجرت کا حکم فرمایا گیا، اور ہجرت کے لیے آپ نے دو اہم

رفقاء کا انتخاب کیا، ایک: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو آپ کے رفیق سفر ہوئے، دوسرے: حضرت علی رضی اللہ عنہ، جن کو آپ نے اہل مکہ کی امانتیں سپرد فرمائیں، دونوں جاں نثاروں نے جان کے خطرہ کو قبول کر کے ان ذمہ داریوں کو لبیک کہا؛ چناں چہ ۲۷ر صفر ۱۳ر نبوی روزِ جمعرات کو آپ اپنی قیام گاہ سے نکلے اور تین دین کوہِ ثور میں روپوش ہوتے ہوئے عام راستہ سے ہٹ کر مدینہ کے لیے روانہ ہوئے، اور ۸ر ربیع الاوّل ۱۳ر نبوی کو قباء پہنچے، یہاں آپ نے چودہ دن قیام فرمایا، پہلی نماز جمعہ بھی یہیں ادا کی، پھر اس کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے آئے، اور عارضی طور پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے یہاں قیام فرمایا۔

انصار نے مکہ کے اس لٹے پٹے، بے آسرا و بے سہارا قافلہ کا اتنی محبت اور گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا کہ شاید ہی آسمان کی آنکھوں نے اس کی کوئی مثال دیکھی ہو، اس موقع پر آپ نے جو پہلا مختصر خطاب فرمایا، اس میں دو چیزوں کی فضیلت بیان فرمائی، سلام کو عام کرنے کی اور کھانا کھلانے کی، یہ گویا اس بھائی چارہ کی تمہید تھی، جو آپ مہاجرین و انصار کے درمیان قائم کرنا چاہتے تھے، عرب اپنی شناخت اپنے قبیلہ کے نام سے ظاہر کیا کرتے تھے، آپ اہل مکہ کو قریش اور ان کے مختلف قبائل کا نام دے سکتے تھے، اور اہل مدینہ کو ان کے مشہور اوس وخزرج کے خاندانوں کے نام سے موسوم فرما سکتے تھے؛ لیکن آپ نے ان دونوں قسم کے مسلمانوں کے لیے ایسے ناموں کا انتخاب فرمایا، جو اسلام کے لیے ان کی خدمت اور جذبہ قربانی کا عنوان تھا، مکہ سے آنے والوں کو ''مہاجرین'' کا نام دیا گیا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے دین کے لیے اپنے محبوب وطن کو خیرآباد کہہ دیا، اور اہل مدینہ کے لیے ''انصار'' کا لقب استعمال کیا گیا، یعنی وہ لوگ جنھوں نے بے آسرا مسلمانوں کو اپنی سرزمین میں بسا کر اسلام کی نصرت اور مدد کی، آپ نے ان کے لیے نام ہی ایسا اختیار کیا جو دین کے لیے جذبہ قربانی کی آگ ان کے دلوں میں بھر دے، وہ آگ جو جاہلیت کی عصبیتوں کو جلا کر راکھ کر دے، اور وہ آگ جو اسلامی رشتہ کے علاوہ تمام رشتوں کو بے وقعت بنا کر رکھ دے، یہ ایسی آگ تھی جسے کوئی بجھا نہیں سکتا تھا، یہود اور منافقین نے ہزار کوشش کی کہ اخوتِ اِیمانی کی اس حرارت کو ٹھنڈی

کردیں؛ لیکن انہیں منہ کی کھانی پڑی اور انصار نے ان کی ساری سازشوں کو ناکام ونامراد کر کے رکھ دیا۔

ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں جو کام انجام دیا، ان میں ایک اہم کام مؤاخاۃ واسلامی بھائی چارہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے دو دو افراد کوایک دوسرے کا اسلامی بھائی قرار دیا، عموماً اس رشتہ اخوت میں ایک بھائی مہاجر ہوتے اور ایک انصاری، یہ صرف نام کا بھائی چارہ نہیں تھا؛ بلکہ سگے بھائی سے بھی بڑھ کر اسلامی بھائی کو اہمیت دی گئی، جس انصاری کے ساتھ اس کا مہاجر بھائی مقرر کیا جاتا، وہ انصاری اپنا مکان، اپنی زمین، اپنے کھیت اور باغات نیز کاروبار کے دو حصے کر دیتا، ایک حصہ خود رکھتا اور ایک حصہ اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتا، مکہ کے لوگ عام طور پر تجارت پیشہ تھے، وہ زراعت کے فن سے واقف نہیں تھے؛ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے خواہش کی کہ وہ اپنے حصہ کی زمین میں بھی کھیتی کریں اور اپنے مہاجر بھائی کی زمین میں بھی، اپنے حصہ کی پیداوار خود رکھیں اور مہاجرین بھائی کے حصہ کی پیداوار ان کو دے دیں، انصار نے اس کو بسر وچشم قبول کیا، پھر ایک مرحلہ ایسا آیا جب آپ کے پاس ڈھیر سارا مالِ غنیمت آیا تو آپ نے انصار سے فرمایا: اگر چاہو تو میں یہ مہاجرین میں تقسیم کر دوں، اور وہ تمہاری زمینیں، باغات وغیرہ واپس کر دیں، یا وہ ان کے قبضہ میں رہیں اور میں یہ مالِ غنیمت تم سبھوں میں تقسیم کر دوں، انصارِ مدینہ نے کہا کہ مالِ غنیمت مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے اور انصار کی جو زمین مہاجرین کو دی گئی تھیں وہ بھی ان ہی کے پاس رہنے دی جائیں، واقعہ ہے کہ روئے زمین پر آج تک کوئی ایسی قوم نہیں گزری جو ایثار وقربانی میں انصارِ مدینہ کی مثال پیش کر سکے!

مؤاخاۃ کے اس عمل نے مہاجرین وانصار کے درمیان ایک ایسا مضبوط برادرانہ رشتہ قائم کر دیا کہ نسل ورنگ اور علاقہ وزبان کے تمام رشتے اس کے مقابلہ میں غیر اہم ہو گئے، مہاجرین مدینہ میں تارکین وطن اور بدیشی نہیں سمجھے گئے؛ بلکہ انہوں نے جس لمحہ مدینہ میں قدم رکھا، وہ اسی وقت سے مدینہ کے باشندے شمار کیے گئے، اور انہیں اس طرح گلے لگایا گیا جیسے

کوئی محبت کرنے والا بھائی اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو گلے لگاتا ہے۔

اہل مغرب اور اعداء اسلام نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی صفوں میں بکھراؤ پیدا کر دیا جائے، اس کے لیے انہوں نے قومیت کا تصور پیش کیا، اور نسل و رنگ، زبان اور علاقہ و وطن کو قومیت کی بنیاد بنایا، انگریز ایک قوم قرار پائے، جرمن دوسری قوم، فرنچ تیسری قوم، ان قوموں کے درمیان شدید نفرتیں رہی ہیں، یہاں تک کہ جنگ عظیم اوّل و دوم میں ان لوگوں نے ایک دوسرے کے مدمقابل رہ کر بڑی خون ریزیاں کی ہیں؛ اگرچہ مسلمانوں کی عداوت کے ایجنڈہ نے ایک حد تک ان کو متحد کر دیا ہے؛ لیکن یہ صرف ظاہری اتحاد ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان کی باہمی کدورتیں حسبِ سابق موجود ہیں، **تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتیٰ** (الحشر:14)

اسلام نے عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر وحدت کی جو روح پھونکی ہے، مغرب نے اس کو درہم برہم کرنے کے لیے اسی وطنی و نسلی قومیت کا سہارا لیا، اور مسلمان عرب، ترک، مصری، شامی اور مختلف خانوں میں بٹ گئے، اس نے اسلامی اخوت کے جذبہ کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، آج صورتِ حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں لاکھوں مسلمان پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہیں، فلسطین، شام، عراق، یمن، برما اور افریقی ممالک کے کتنے ہی پناہ گزیں ہے، جو در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، خود مسلم ممالک انہیں اپنے لیے ایک بوجھ سمجھ رہے ہیں، ان کی کشتیاں ڈبو دی جاتی ہیں، انہیں ان کے قاتل اور خون خوار دشمنوں کے حوالہ کر دیا جاتا ہے؛ تاکہ وہ ان کے لیے نوالہ تر بن جائیں، اور اگر پناہ گزیں کی حیثیت سے انہیں قبول بھی کر لیا جاتا ہے تو انہیں ذلیل و حقیر گداگروں کی طرح رہنے کی اجازت دی جاتی ہے، جن کو صرف جینے اور سانس لینے کی اجازت ہوتی ہے اور کھانے کے چند لقمے مل جاتے ہیں، انہیں مقامی سماج سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور انہیں مسلسل یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اس ملک کے شہری نہیں ہیں، اور انہیں برابری کے ساتھ جینے کا حق نہیں ہے، افسوس کہ مغربی ملکوں میں جتنی توقیر کے ساتھ پناہ گزینوں کو رہنے کی اجازت دی جاتی ہے، مشرقی ملکوں اور خود مسلمان ملکوں میں اس کا

تصور نہیں ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم ممالک مؤاخاۃ کے اصول پر باہمی معاہدہ کریں، کوئی بھی مسلمان جب بھی اپنے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے دوسرے مسلمان ملک کے دروازہ پر دستک دے تو ان کا استقبال کیا جائے، ان کو امن فراہم کیا جائے، ان کو زندگی کی بنیادی ضروریات، خاص کر تعلیم اور علاج کی سہولت دی جائے، انہیں تجارت وکاروبار کی اجازت دی جائے؛ البتہ ان پر یہ شرط لگائی جاسکتی ہے کہ ایک ملک میں رہتے ہوئے دوسرے ملک کے خلاف کوئی تحریک نہ چلائیں، جس سے خود ان ملکوں کے آپسی تعلقات متأثر ہوں، نیز ان مظلوموں کے سلسلہ میں متحدہ طور پر ظالم حکومتوں اور قوموں کو جواب دہ بنایا جائے، اور پناہ حاصل کرنے والے لوگوں کے اخراجات کا بوجھ کسی ایک ملک پر نہ رکھا جائے؛ بلکہ تمام مسلمان حکومتیں مل کر مطلوبہ اخراجات مہیا کریں۔

اس وقت روہنگیا مسلمانوں کی صورتِ حال ہمیں خاص طور پر نظام مؤاخاۃ کی طرف متوجہ کرتی ہے، بنگلہ دیش کی سرحدیں برما سے ملی ہوئی ہیں، ملیشیا، انڈونیشیا اور برونائی ایسی متمول مسلم ریاستیں ہیں، جو سمندر کے ذریعہ برما سے مربوط ہیں؛ لیکن بے چارے روہنگیا مسلمان سمندر کی بے رحم موجوں کے سہارے اِدھر سے اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں؛ لیکن کوئی ملک انہیں پناہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اور روتے بلکتے بچے، بوڑھے، عورتیں اور جوان سمندر کی نذر ہو جاتے ہیں؛ اس لیے موجودہ حالات میں جب کہ اسلاموفوبیا کو قصداً بڑھاوا دیا جا رہا ہے، مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی جا رہی ہے، ضروری ہے کہ مسلم ممالک آفاقی تصور کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل کو حل کریں، ہر تیر جو کسی مسلمان کے سینہ میں چبھے، پوری دنیا کے مسلمان اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کریں۔

ہندوستان کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں، یہاں بھی اس نظامِ مؤاخاۃ کو وجود میں لانے کی ضرورت ہے، بغیر کسی قصور کے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، جمشید پور، بھاگلپور، گجرات اور مظفر نگر کے تجربات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ فرقہ پرست مسلمانوں

کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کو نشانہ بناتے ہیں؛ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان ایسی آبادیاں بسائیں، جہاں یکجا طور پر ان کی بڑی آبادیاں ہوں اور وہ خود اپنا تحفظ کرسکیں، اس کے لیے شہر کے متمول مسلمان فراخ دلی کا مظاہرہ کریں، انھیں کم قیمت پر زمین و مکان فراہم کریں، ان کے لیے تعلیم و علاج کی سہولتیں مہیا کریں، اور اس کام کو تاجرانہ سوچ کے ساتھ نہیں؛ بلکہ دینی جذبہ کے ساتھ انجام دیں، اس کے بغیر دیہات و قصبات اور شہر کے چھوٹے چھوٹے محلوں میں آباد مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ نہیں کیا جاسکتا، اور بالآخر یہ محرومی پورے پورے گروہ کو فتنۂ اِرتداد سے دوچار کرسکتی ہے۔

اس نظامِ مؤاخاۃ سے جہاں اُجڑے ہوئے مسلمانوں کو ٹھکانہ ملے گا اور مسلمانوں کے درمیان باہمی اخوت کا جذبہ پروان چڑھے گا، وہیں اُن نومسلم بھائیوں کے بھی مسائل حل کرنے میں آسانی ہوگی، جو اسلام قبول کرنے کے بعد دشوار کن حالات سے دوچار ہوتے ہیں، یہ اپنے سابق سماج سے بھی کٹ جاتے ہیں اور مسلم سماج کے اندر بھی ایک اجنبی گروہ کی طرح زندگی گزارتے ہیں، ان کے لیے خاص کر بال بچوں کی شادی بیاہ کا مسئلہ بہت پریشان کن ہوتا ہے، وہ جس سماج سے باہر آئے ہیں، اس میں ان کے لیے سخت نفرت کے جذبات ہوتے ہیں، وہ نہ صرف انھیں روزگار کے مواقع سے دور رکھتے ہیں؛ بلکہ پہلے سے بھی جو روزگار حاصل تھا، اسے بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے، نظامِ مؤاخاۃ کو تقویت پہنچا کر ان کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، اور برادرانِ وطن میں دعوتِ اسلام کے کام کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

کاش! ہم عبادات کی طرح ملّی اور اجتماعی مسائل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ مبارکہ کو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔

بُرائی کی آگ

اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے، تو آبادی کے تمام لوگ آگ بجھانے اور گھر کو بچانے دوڑ پڑتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ایک ساتھ دو بالٹی اُٹھاتا ہے، کوئی ڈول دو ڈول لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی لوٹا دو لوٹا ہی پانی ڈال دیتا ہے، چھوٹے بڑے امیر غریب جوان بوڑھے اور مرد دو عورت ہر شخص اپنی طاقت اس بلاءِ ناگہانی سے بچنے بچانے میں صرف کر دیتا ہے؛ کیوں کہ اگر آگ پھیلی تو صرف اسی گھر کا نقصان نہیں ہوگا، جس گھر میں آگ لگی ہو؛ بلکہ یکے بعد دیگرے سارے گھر جلیں گے اور پوری بستی خاکستر ہو کر رہ جائے گی، آگ ایسی کور چشم اور عدم نا آشنا ہے کہ اس کی سرشت میں من وتو کا کوئی امتیاز ہی نہیں، نہ امیر کا خیال کرتی ہے نہ غریب پر رحم کھاتی ہے، نہ طاقت اور حکومت والوں سے ڈرتی ہے نہ بے قصور رعایا اور کمزوروں پر اسے ترس آتا ہے، ایک بلاء بے درماں ہے جو زد میں آتا ہے اسے جلا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر دریا پانی سے لبریز ہو اور پشتہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو، تو سارے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی طاقت بھر پشتہ کو مضبوط کرنے اور پانی کو تھامنے کی تدبیر کرتا ہے؛ کیوں کہ پانی بھی آگ ہی کی طرح بے رحم اور بے حس واقع ہوا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، خوش رنگ پھلواریاں ہوں، ہرے بھرے کھیت ہوں، پُر رونق آبادیاں ہوں، آبادی میں معصوم بچے رہتے ہوں، بے زبان جانور ہوں، بیمار اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے لوگ ہوں، اس کی تلاطم خیز موجیں کودتی پھاندتی، دوڑتی بھاگتی، ہر شئے کو غرقاب اور تہہ آب کرتی پہنچ جاتی ہیں، اسی لیے آگ لگ جائے اور سیلاب آجائے تو ایک دوسرے سے برسر پیکار دشمن بھی اپنی عداوتوں کو فراموش کر کے اس مصیبت کا سدباب کرنے کے لیے یک جٹ ہو جاتے ہیں۔

یہ آگ اور پانی کی مصیبتیں وہ ہیں، جو ہمیں مادّی نقصان پہنچاتی ہیں، جن کی وجہ سے ہمارے در و دیوار ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں؛ لیکن ایک اور آگ ہے جس کا نقصان اس نقصان سے بھی بڑھ کر ہے اور ایک سیلاب ہے جس کی تباہ کاری اس سیلاب سے

کہیں زیادہ ہے، وہ ہے برائی اور بے حیائی کی آگ، جو انسانی آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی ہے اور وہ ہے منکرات اور فواحش کا سیلاب، جس کی زد سے کوئی پکا اور کچا مکان محفوظ نہیں ہے؛ لیکن عجیب بات ہے کہ اس آگ اور سیلاب کو بجھانے اور تھامنے کی ہمارے اندر کوئی فکر نہیں، یہ آگ گھر گھر کو سلگا رہی ہے اور یہ سیلاب اخلاق و کردار کی عمارتوں کو زمین بوس کرتا جارہا ہے؛ لیکن نہ اس پر بے چین ہونے والے دل ہیں، نہ اس پر رونے والی آنکھیں ہیں، نہ اس کے لیے جنبش میں آنے والے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ سماج کے بزرگوں کو اس کی فکر ہے نہ نوجوانوں میں اس کے مقابلہ کا عزم!

برائی کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہے، اس کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ جس قوت سے بُرائی پھیل رہی ہے، اسی قوت سے بلکہ اس سے بڑھ کر بُرائی کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں، اسی تدبیر کا نام قرآن مجید کی زبان میں: ''نہی عن المنکر'' ہے، قرآن کہتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کا ایک بنیادی مقصد نہی عن المنکر ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس کو اقوامِ عالم میں خیر اُمت یعنی بہترین انسانی گروہ کا لقب دیا گیا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۱۰) مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: ''وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اس دوستی کا حق یوں ادا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں'' (التوبۃ: ۱۷۱) بُرائی سے روکنے والوں کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۱۴) اور ارشاد ہوا کہ: ''کم سے کم ایک ایسا گروہ ہمیشہ ضرور رہنا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہو، بھلائی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو کہ یہی لوگ دراصل کامیاب ہیں۔'' (آلِ عمران: ۱۰۴)

قرآن کی اس تعبیر پر بھی غور کیجیے کہ بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا گیا ہے، معروف کے اصل معنی ایسی بات کے ہیں جو لوگوں میں مروّج اور مشہور ہو اور جس کا چلن قائم ہو گیا ہو، اس کے مقابلہ میں منکر کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جو ان پہچانی اور نامانوس ہو، گاہے گاہے پیش آجاتی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں نیکیوں کا عام

چلن ہونا چاہیے، وہ سماج کا مروّج اور مشہور عمل ہو اور برائی کو سماج میں اتنا کم ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث ہو، خلافِ معمول کبھی یہ بات پیش آجاتی ہو۔

اس تعبیر سے نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب بُرائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۷) دل سے روکنے کا مطلب دو ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ دل سے اس پر کراہت محسوس کرے، دوسرے یہ کہ دل میں اس بات کا عزم رکھے کہ جب اسے قدرت حاصل ہوگی، وہ اس بُرائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، ہاتھ سے روکنے کا منشا مار پیٹ اور جنگ و جدال ہی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے اثر و رُسوخ اور اخلاقی دباؤ کا استعمال کرنا بھی اس میں داخل ہے، جیسے انسان دنیا کے مسائل میں اپنے رُسوخ اور اپنی حیثیت کو کام میں لاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں اسے اس سے بڑھ کر اپنی اخلاقی قوت استعمال کرنا چاہیے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ جن چیزوں کا برائی اور منکر ہونا متفق علیہ ہے اور جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی عوام تو کیا، اہل علم اور اہل دین بھی کھلے تساہل سے کام لیتے ہیں، اس سے کس کو اختلاف ہوگا کہ گانا بجانا حرام ہے، شادی بیاہ میں مروّجہ تصویر کشی اور ویڈیوگرافی جس میں عورتوں کی بھی تصویریں محفوظ کرلی جاتی ہیں، ناجائز ہیں، اس سے کسے اختلاف ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بے جا مطالبات حرام ہے اور رشوت کے حکم میں ہے، کون نہیں جانتا کہ سودی کاروبار پر اللہ اور اس کے رسول کی لعنت ہے؛ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سماج کے بااثر لوگ جب علانیہ ان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان بگھارتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ ہماری زبانیں گنگ ہوجاتی ہیں؛ بلکہ ہم خود ان تقریبات میں شریک ہوکر رونقِ محفل میں اضافہ کرتے ہیں، ہم خود حرام اور ناجائز کاروبار کرنے والوں کی اہتمام اور احتشام سے معمور دعوتوں میں شریک ہوکر عملاً اس برائی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث میں اسی لیے برائی سے روکنے کو زبان کا جہاد (جہاد باللسان) قرار دیا گیا ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹) کیوں کہ نیکی کی دعوت آسان ہے، اگر آپ کسی کو نماز روزہ کی دعوت دیں، حج وزکوۃ کے لیے توجہ دلائیں، تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے؛ لیکن جب کسی انسان کو اس کی برائی پر ٹوکا جائے، تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ بے جا ردّ عمل کا اظہار کرتا ہے، اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: یہ بہت بڑا گناہ ہے (اکبر الذنب) ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم اللہ سے ڈرو، تو وہ جواب میں کہے: تم اپنی فکر کرو، **علیک نفسک**۔ (مجمع الزوائد: ۲/۷۱۷)

جو چیز برائی پر ٹوکنے اور اس سے روکنے میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں، ایک دنیا کی محبت، دوسرے اہل ثروت اور اہل اقتدار کا خوف، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں دنیا کی محبت گھر کر لے گی تو تم نہ نیکی کا حکم دو گے اور نہ برائی سے روکو گے اور نہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو گے۔ (مجمع الزوائد: ۲/۷۱۷) اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: خبردار! کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق جاننے کے باوجود حق کہنے سے باز نہ رکھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۴۰۰۸) یہ اس اُمت کے ادبار اور پستی کی علامت ہے کہ اس میں برائی پر ٹوکنے والی زبانیں باقی نہ رہیں، حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ اس دین کے اقبال کی علامت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں دین کا فہم ہو، اس میں ایک دو برے لوگ ہوں تو وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور اس دین کے ادبار کی علامت یہ ہے کہ عام لوگ گناہ میں مبتلا ہو جائیں، اکا دکا اشخاص دین پر قائم ہوں، وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور بات کریں تو مطعون ٹھہریں، یہاں تک کہ علانیہ شراب پی جائے، ایک عورت قوم پر سے گذرے، قوم میں سے ایک شخص اس کی طرف کھڑا ہو اور دامن اُٹھا کر اس طرح برائی کرے جیسے کسی مادہ جانور کی دم اُٹھا کر نر اُس سے جفتی کرتا ہے، اس دن جو شخص یہ کہے کہ تم نے اس کو اس دیوار کے پیچھے تو کر لیا ہوتا، تو

وہ اس دن اس میں ویسے ہی ہوگا جیسے تم میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، اس دن جو نیکی کی طرف بلائے اور بُرائی سے روکے، اس کے لیے ایسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا جس نے مجھے دیکھا ہو، میری اطاعت کی، مجھ پر ایمان لایا ہو اور میرے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۶۲) بُرائی کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ شاید اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

بُرائی سے نہ روکنے کا گناہ صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے؛ بلکہ دنیا سے بھی متعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے نہ روکیں، تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سبھوں کو پکڑ لے گا اور جس قوم میں گناہ کیا جاتا ہو، کچھ لوگ اس سے دور کرنے پر قادر ہوں، پھر بھی وہ اسے دور نہ کریں، تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۵۳۸، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۶۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے قریب ایک لشکر کے زمین میں دھنسا دیئے جانے کا ذکر کیا، حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: شاید ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنھیں زبردستی لایا گیا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب میں تو سب شامل ہوں گے، آخرت میں نیتوں کے اعتبار سے معاملہ ہوگا۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۷۱۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل میں اس طرح بُرائی کا آغاز ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو اس برائی پر ٹوکتا اور کہتا کہ یہ حلال نہیں اور کل ہو کر اسی کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم نشیں بن جاتا؛ چناں چہ یہی چیزیں بنی اسرائیل پر عذابِ الٰہی آنے کا باعث ہوئی۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۳۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے پوری قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے؛ بلکہ جب کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور اکثریت قدرت کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام و خواص سبھوں کی ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۶۸)

یہ ضروری ہے کہ سماج کا ضمیر زندہ ہو، وہ بُرائی سے ایسی ہی نفرت کرتا ہو جیسے انسان گندگی سے نفرت کرتا ہے، سماج میں جب کوئی بُرائی ہو تو کتنی زبانیں ہوں جو اس پر ٹوکنے کے لیے آمادہ ہوں، جب ایک ہاتھ ظلم کرے تو سینکڑوں ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، جب کوئی نگاہ بُرائی کرے تو کتنی ہی غضب آلود نگاہیں اس کے حوصلے پست کر دیں، خدا کی نافرمانی پر انسان کو اپنی نافرمانی سے زیادہ طیش آئے، اپنے بھائی پر جب کوئی ظلم ہوتا ہوا دیکھے تو اسے محسوس ہو کہ یہ ظلم خاص اس پر ہو رہا ہے، جب وہ کسی آبرو کو لٹتے ہوئے دیکھے تو اسے خیال ہو کہ یہ عزت و آبرو کی مقتول عورت اس کی بہن یا بیٹی ہے، برائیوں کے بارے میں جب تک ضمیر زندہ نہ ہو، حدود اللہ کی اہمیت انسان کے ذہن میں نہ ہو اور خدا کے خوف سے ہمارے سینے معمور نہ ہوں، اُس وقت تک برائیوں کے اس سیلاب کو تھامنا، بے حیائی کی اس آگ کو بجھانا اور بداخلاقی کی اس تیز آندھی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

زندگی کے ہر شعبہ میں احسان

جب آپ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں اور خطبہ سنتے ہیں تو قرآن مجید کی ایک آیت تقریباً ہر بار آپ کے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں: ”اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى....“ (النحل:۹۰)- اس میں عدل اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا مفہوم تو ایک حد تک آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے؛ لیکن احسان سے کیا مراد ہے؟ یہ بات عام طور پر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہے؛ حالاں کہ یہ قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے اور قرآن میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور اس پر اجر وثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے پانچ مواقع پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ”احسان“ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں: ”اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ“ (البقرۃ: ۱۹۵، آلِ عمران: ۱۳۴، ۱۴۸، المائدۃ: ۱۳، ۳۹) کم سے کم دو مواقع پر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہیں: ”اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ.“ (النحل:۱۲۸) نیز ارشاد ہے: ”وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ“ (العنکبوت:۶۹) یہ بھی فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی عمل کو قبول فرماتے ہیں، جس میں احسان شامل ہو اور احسان کے ساتھ عمل کرنے والوں کا اجر محفوظ ہے: ”بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.“ (البقرۃ:۱۱۲) احسان کا فائدہ صرف آخرت میں ہی نہیں؛ بلکہ دنیا میں بھی ان کے لیے بھلائی ہے: ”لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ.“ (النحل:۳۰)

پھر مختلف اعمال سے متعلق بھی احسان کا حکم دیا گیا، والدین کے بارے میں بار بار تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ تمہارا رویہ احسان کا ہو: ”وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا.“ (البقرۃ:۳۸) اگر رشتہ کے بندھن کمزور ہو جائیں اور میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹنے کی نوبت آجائے تو فرمایا گیا کہ چھوڑتے ہوئے بھی احسان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے: ”فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ.“ (البقرۃ:۲۲۹) اگر قاتل اور مقتول کے ورثہ کے درمیان خون بہا کی

ادائیگی کا معاملہ طے پا جائے تو تاکید کی گئی کہ قاتل بعد میں ٹال مٹول سے کام نہ لے؛ بلکہ واجبات کی ادائیگی میں احسان کا راستہ اختیار کرے: ''**فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ.**'' (البقرۃ:۱۷۸)

غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں احسان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کو ضروری قرار دیا ہے؛ لہٰذا (اگر شرعاً کوئی شخص قتل کیے جانے کا مستحق ہو تو) بہتر طور پر قتل کرے اور جانور کو ذبح کرنا ہو تو بہتر طور پر ذبح کرے: ''.... **واذا ذبحتم فاحسنوا الذبح۔**'' (مسلم، حدیث نمبر:۱۹۵۵) لڑکیوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر ان کی پرورش احسان کے ساتھ یعنی بہتر طور پر کی جائے تو وہ دوزخ سے پردہ بن جائیں گی: ''**من یلی من هذه البنات شیئًا فاحسن الیهن لکن سترا من النار۔**'' (بخاری، حدیث نمبر:۵۹۹۵) باندیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جوان کی پرورش کرے اور اچھی طرح پرورش کرے، نیز تعلیم و تربیت کرے اور اچھی طرح تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے: ''**غذاها فاحسن غذائها ثم ادبها فاحسن تادیبها۔**'' (بخاری، حدیث نمبر:۹۷)

احسان کا اللہ کی عبادت سے خصوصی تعلق ہے، چناں چہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحابہؓ کی تعلیم و تربیت کے لیے انہوں نے چند سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ احسان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو؛ اس لیے کہ اگرچہ تم خدا کو دیکھنے سے قاصر ہو؛ لیکن خدا تو تم کو دیکھ رہے ہیں: ''**ان تعبد الله کأنک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک۔**'' (بخاری، حدیث نمبر:۵۰) اسی طرح وضو ایک عبادت بھی ہے اور عبادت کا ذریعہ بھی، وضو گناہوں کا کفارہ بھی ہوا کرتا ہے؛ لیکن یہ اس وقت ہوگا جب وضو میں احسان ہو، یعنی اچھی طرح وضو کرتے: ''**فیحسن وضوء ها۔**'' (مسلم:۲۲۸) پڑوسیوں کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خاص تاکید فرمائی کہ

احسان کا رویہ ہو اور پڑوس کا حق ادا کیا جائے: ''واحسن جوار من جارک۔'' (ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۰۵) غرض کہ زندگی کے تمام گوشوں میں احسان ضروری ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احسان سے کیا مراد ہے؟ - احسان یہ ہے کو جس کام کو کیا جائے بہتر طور پر خوش سلیقگی کے ساتھ اور اس کا حق ادا کرتے ہوئے انجام دیا جائے، عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل کرنا ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب خشوع و خضوع بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار بھی؛ اسی لیے فرمایا گیا کہ اس طرح عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، جانور کو ذبح کرنے میں شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ تم سے اس کو کم سے کم تکلیف پہنچے؛ اس لیے آپ نے جانور کے بارے میں فرمایا کہ ذبح کرنے کے لیے تیز دھار دار آلہ استعمال کیا جائے، معاملات میں احسان یہ ہے کہ آدمی صرف دوسروں کو ان کا حق ادا کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے؛ بلکہ اپنے حق کے معاملہ میں ایثار سے کام لے اور دوسروں کے لیے اپنا حق یا اس کا کچھ حصہ چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔

سماجی زندگی سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ دراصل اسی احسان کی عملی تشریح ہے؛ لیکن آج اس سلسلہ میں مسلمان دوسری قوموں سے بھی گئی گذری حالت میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کسی سے اختلاف کی نوبت آئے تو بہتر طریقہ پر دفاع کرو اور ان کا سنجیدہ جواب دو: ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ۔'' (المومنون: ٦٩) مگر آج صورتِ حال یہ ہے کہ معمولی معمولی اختلاف پر مسلمان اور بعض اوقات پڑھے لکھے یہاں تک کہ دین سے واقف حضرات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح الجھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ اس پر اسلام کے کھلے ہوئے دشمن بھی خندہ زن رہتے ہیں، اگر ہم بہتر الفاظ اور اچھے لب و لہجہ میں اپنی بات کہیں اور خوش اسلوبی وخوش اخلاقی کے ساتھ اختلافِ رائے کو پیش کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں تو امت کا بہت سارا اختلاف ختم ہوسکتا ہے اور ملت اسلامیہ جنگ و جدال کے شعلوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماحول کو صاف رکھنے کا حکم دیا ہے، اس زمانہ میں عام طور پر گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوا کرتے تھے؛ اس لیے آپ کی ہدایت تھی کہ لوگ آبادی سے نکل کر قضاء حاجت کریں؛ تاکہ تعفن پیدا نہ ہو، اس بات سے بھی منع فرمایا گیا کہ گھر کی نالیاں راستوں پر نکال دی جائیں کہ اس سے گذرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے؛ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہر شہر میں گندگی اور کثافت مسلمان محلوں کی پہچان بن گئی ہے، گھروں کی نالیاں گھر سے باہر نکال دی جاتی ہیں اور بعض دفعہ تو ان نالیوں کے ذریعہ غلاظتیں اور فضلات تک بہائے جاتے ہیں، جو لوگ اس ماحول کے عادی نہیں ہوتے، ان کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر گذرنا پڑتا ہے، کیا مسلمانوں سے یہی کردار مطلوب ہے اور ''احسان'' کا تقاضا یہی ہے؟ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کے ہٹانے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا ہے: ''وادناها ماطة الاذى عن الطريق۔'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شعب الایمان، حدیث نمبر:۱۶۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ لوگ راستوں پر کھڑے رہیں، جس سے خواتین کو گذرنے میں دقت ہوتی ہے؛ لیکن آج مسلم محلوں کی پہچان یہ ہے کہ جگہ جگہ اوباش نوجوانوں کی ٹولیاں کھڑی ہوتی ہیں، رات گئے تک لوگ اپنے گھروں کے باہر چبوتروں پر بیٹھے رہتے ہیں، بعض اوقات اس بیٹھک میں فحش ہنسی مذاق اور شطرنج وتاش کی شمولیت بھی ہو جاتی ہے، باعزت خواتین وہاں سے گذرنے میں خوف محسوس کرتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں جب بہت معمولی آبادی تھی، لوگ پیدل چلتے تھے یا اونٹ اور گھوڑے کی سواری ہوتی تھی، ہدایت دی تھی کہ راستے کم سے کم سات ہاتھ چوڑے ہونے چاہئیں، آج حکومتیں موجودہ ٹریفک کے لحاظ سے راستوں کی حدود متعین کرتی ہیں، ان کی رعایت ضروری ہے؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نہ صرف قانون کے مطابق اپنے تعمیری حصہ کو پیچھے نہیں کرتے اور راستے سے متصل جگہیں نہیں چھوڑتے؛ بلکہ مزید اپنی حدود سے باہر سڑک کے حصہ میں — جس سے تمام عوام کے حقوق متعلق ہیں — تجاوز بھی کرتے ہیں، اگر دیوار

آگے نہ بڑھائی تو کم سے کم چبوترے، سیڑھیاں اور بالکونی کو سرکاری حصہ میں بنالینا اپنا حق سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ یہ نہ صرف دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا ہے؛ بلکہ عوامی جگہ ہونے کی وجہ سے اس عمل کے ذریعہ آپ ہزاروں افراد کے حقوق کے غاصب بھی بنتے ہیں۔

شریعت نے اسراف وفضول خرچی کو منع کیا ہے، قرآن نے کہا کہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے: ''وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ لَا اُحِب الْمُسْرِفِیْنَ۔'' (الانعام: ۱۴۱، الاعراف: ۱۳) قرآن مجید نے یہ بھی کہا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، فضول خرچی کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اپنے وسائل کو ناجائز کام میں خرچ کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ جائز کام میں ضرورت سے زائد خرچ کیا جائے، فضول خرچی کی یہ دونوں صورتیں آج ہمارے معاشرے میں مروّج ہیں، بات بات پر چراغاں کرنے اور روشنی کی بارش برسانے کا رواج سا ہوگیا ہے، یہاں تک کہ ہمارا دین -جس کا اصل حسن اس کی سادگی ہے- میں بھی ہم نے ایسی چیزوں کو شامل کرلیا ہے، دعوتوں میں کھانے اتنے زیادہ پکائے جاتے ہیں کہ بہت سارا کھانا پھینکنے میں آجاتا ہے؛ حالاں کہ اسی محلّہ میں آپ کے بہت سے ایسے بھائی موجود رہتے ہیں جو لقمہ لقمہ کو ترستے ہیں، ظاہر ہے یہ احسان کے تقاضے کے مغائر ہے۔

اسلام میں شور وغل کو پسند نہیں کیا گیا ہے، اس سے صوتی آلودگی پیدا ہوتی ہے، دماغ اور دل کے مریضوں کو بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے؛ لیکن خود مسلمانوں کی نکاح کی تقریبات کس قدر پُرشور ہوتی ہیں، وہ محتاجِ اظہار نہیں، اسی طرح ہمارے جلسے اور بعض اوقات ہمارے دینی جلسے رات دیر گئے تک چلتے ہیں اور پوری آبادی کو جگائے رکھتے ہیں، یہ شریعت کا مزاج نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی راحت اور عافیت کا اس قدر لحاظ تھا کہ اگر کچھ لوگ سوئے ہوں اور کچھ بیدار ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آواز میں سلام فرماتے تھے کہ جو لوگ جاگے ہوئے ہوں وہ سنیں اور جو سوئے ہوئے ہوں، ان کی نیند خراب نہ ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں تلاوت اس طرح کی جائے کہ جماعت میں جو لوگ

شریک ہیں وہ سن لیں، اس سے زیادہ بلند آواز نہ ہو؛ لیکن افسوس کہ آج کل قراءت کی ریکارڈنگ بھی اس طرح لگائی جاتی ہیں کہ پورے محلے میں اس کی گونج سنی جاسکتی ہے، شاید لوگ محبت واحترام کے جذبہ سے ایسا کرتے ہوں؛ لیکن حقیقت میں یہ قرآن کی بے احترامی ہے نہ کہ احترام؛ کیوں کہ قرآن کا ادب یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو لوگ خاموش ہوں اور قرآن کی طرف متوجہ ہوں؛ لیکن یہاں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ریکارڈنگ بجتی رہتی ہے اور لوگ اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ ساری باتیں اس احسان کے مغائر ہیں، جس کی مسلمانوں کو بار بار تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان آج ایک نیک نام گروہ کی بجائے ایک بدنام گروہ کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں، مسلمانوں کے محلوں میں غیر مسلم رہائش اختیار کرنے سے ڈرتے ہیں، غیر مسلم آبادیوں میں مسلمانوں کو جلدی مکان نہیں ملتا، ہماری پہچان ایک ایسی قوم کی ہوگئی ہے جو بات بات پر مشتعل ہوجاتی ہے، جو اپنے مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے جذبات کی رو میں بہہ جانے کا مزاج رکھتی ہے، جس کے یہاں صفائی، ستھرائی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، جو حق چھوڑنے کی بجائے دوسروں کا حق غصب کرلینے کی عادی ہے، جس کا رویہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا، جو رات میں دیر سے سونے کی عادی ہے اور جس کی صبح دن کو دس گیارہ بجے ہوتی ہے۔

خاص کر ان مسلمانوں کو جو کسی خطہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، اپنے اخلاق و معاملات کو درست کرنے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تلقین کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اللہ نے ہر چیز میں احسان کا یعنی اس کو بہتر طریقہ پر انجام دینے کا حکم دیا ہے کہ ہر کام خوش سلیقگی، شائستگی، مروّت و رواداری، حسن اخلاق اور جذبہ اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائے اور دنیا محسوس کرے کہ یہ عام لوگوں سے مختلف اور اخلاقی اعتبار سے بلند ایک داعی امت ہے، جو کائنات کے خالق و مالک سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتی ہے اور اس کے بندوں سے بھی پیار کرتی ہے۔

تہذیبی ارتداد

ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے، جن میں سب سے اہم اللہ پر، رسول پر، اللہ کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان لانا ہے؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایمانیات ہی پر زور نہیں دیا؛ بلکہ عبادات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی ہدایات سے سرفراز فرمایا اور پوری قوت اور تاکید کے ساتھ امتِ مسلمہ کو ان تعلیمات پر کاربند رہنے کی تلقین فرمائی؛ کیوں کہ کسی قوم کے لیے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدہ کے ذریعہ ممکن نہیں؛ بلکہ تہذیب و معاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ہیں، جو آج ہندو قوم کا حصہ بن چکی ہیں، وہ اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے اپنا الگ وجود رکھتی ہیں؛ لیکن انھوں نے دوسری قوموں سے سماجی اور تہذیبی فاصلہ قائم نہیں رکھا، رہن سہن، لباس و پوشاک، خورد و نوش، شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات وغیرہ میں انھوں نے اپنا رنگ برقرار نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے تشخص کو کھو دیا اور آج ہندو قوم ان کو اپنا ایک حصہ تصور کرتی ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کر دیا جائے؛ کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی سماجی انفرادیت سے محروم ہو جاتی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ دین و مذہب ہی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اور اگر وہ کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل نہ ہو، جب بھی الحاد و انکار کا راستہ اختیار کر لیتی ہے، یا کم سے کم وہ مذہب کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر لیتی ہے، غیر سنجیدہ رویہ سے مراد یہ ہے کہ مذہب سے اس کی کوئی ذہنی اور فکری وابستگی نہیں ہوتی؛ البتہ وہ اسے ایک خاندانی روایت سمجھ کر ڈھوتی رہتی ہے، مذہبی اقدار پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا؛ البتہ خاندانی روایت کے تحت خاص خاص مذہبی تقریبات اور تہواروں میں اس کی شرکت ہو جاتی ہے اور گاہے گاہے کچھ عبادت کی توفیق میسر آ جاتی ہے؛ لیکن حلال و حرام، معاملات، کسبِ معاش اور سماجی زندگی میں مذہب کے لیے کوئی خانہ نہیں ہوتا، اسی کیفیت کو میں نے ’’تہذیبی ارتداد‘‘ سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ارتداد دبے پاؤں آتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر داخل ہوتا ہے اور ایسا میٹھا زہر بن کر حلق سے اترتا ہے کہ زہر کھا کر بھی انسان تحسین وآفریں کے کلمات کہہ اُٹھتا ہے، یہ ارتداد نہ سوئے ہوؤں کو جگاتا ہے، نہ غافلوں کو متوجہ کرتا ہے، نہ فکر مند دِلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے، نہ قلب وذہن کو جھنجھوڑتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، یہ اس بیماری کی طرح ہے، جو بہ ظاہر ہلکی ہو؛ لیکن بہ تدریج انسان کو موت کی طرف لے جائے اور یہ ایسا نشہ ہے کہ مقتول خود قتل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس لیے اس ارتداد کو خوب سمجھنے، اس کے اسباب پر نظر رکھنے اور اس کے نتائج وعواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت پوری دنیا جو بنیادی طور پر یہودی دماغ اور یہودی منصوبہ بندی کی آلہ کار بنی ہوئی ہے اور اس کے اشارۂ چشم وابرو پر رقصاں ہے، اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ اگر مسلمانوں کو کھلے عام مرتد نہیں کیا جاسکتا، تو ان پر ایسی زبردست تمدنی یلغار کر دی جائے کہ وہ خوشی خوشی تہذیبی ارتداد کو قبول کرلیں اور اس مقصد کے لیے اتنے طاقت ور حربے استعمال کیے جارہے ہیں کہ بہ ظاہر اس سے زیادہ دُوررَس اور قوی ومؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں، ٹی وی نے اس رفتار کو بہت تیز کر دیا ہے اور ڈش انٹینا اور کیبل کی وجہ سے مسلمان ملکوں اور مشرقی ملکوں میں ایسے فحش پروگرام کا ایک طوفان سا آ گیا ہے کہ جن کا اسلام اور مسلم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اب انٹرنیٹ نے اس تہذیبی یلغار کو مزید طاقت ور بنا دیا ہے اور ایک ایسی چیز جو بہترین تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال ہوسکتی تھی، انتہائی تخریبی اور غیر اخلاقی مہم جوئی کا آلہ کار بنی ہوئی ہے، اب جونئی معاشی اصلاحات کا عمل پوری دنیا میں جاری ہے اور ''عالمیانے'' کی نئی اصطلاح شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی صحافت، مغربی لٹریچر اور مغربی کمپنیوں کے وساطت سے مخرب اخلاق غذائی اور غیر غذائی اشیاء کی آمد کا ایک سیل بلاخیز جاری وساری ہے۔

اس وقت اس منصوبہ کے نقوش مشرقی علاقوں میں اور مسلم ملکوں میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، ادھر چند سالوں میں عرب اور اسلامی ممالک میں خواتین کے لباس اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ امریکی ویورپی ملبوسات اور عرب خواتین کے ملبوسات میں کوئی

فرق باقی نہیں رہا، بہت سے عرب اور مسلم ممالک وہ ہیں جہاں عوام تو کجا؟ علماء بھی داڑھی نہیں رکھتے، داڑھی جسے کسی زمانہ میں صلاح وتقویٰ اور شرافت واعتماد کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب دہشت گردی اور شدت پسندی کی پہچان سمجھی جاتی ہے، مجھے ایک بار حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جس کے استقبالیہ پر ایک دین دار، خوش شکل، مصری نوجوان لڑکا بیٹھا کرتا تھا اور اس کے چہرے پر داڑھی بہت بھلی محسوس ہوتی تھی، میں اکثر عشاء کے بعد مسجد سے واپس ہوتے ہوئے دو چار منٹ اس کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی مذہب پر، کبھی عربی زبان کے بارے میں اور کبھی مصر میں مسلمانوں کے حالات کے متعلق اس سے گفتگو ہوتی، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بلیغ اور سہل عربی زبان میں گفتگو کرتا اور بہت ہی اخلاق و مروّت سے پیش آتا، اس لیے اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے لطف سا آتا تھا، میں نے ایک دن کہا کہ مصر کے لوگ عام طور پر داڑھی نہیں رکھتے؛ لیکن آپ نے جو داڑھی رکھی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے، اس سے آپ کے چہرے پر ایک نورانیت اور معصومیت سی معلوم ہوتی ہے، میری یہ بات سن کر وہ افسردہ سا ہوگیا اور اس نے سنجیدہ ہوکر کہا کہ شیخ آپ سچ کہتے ہیں، میں داڑھی رکھنا چاہتا ہوں؛ لیکن مصر میں داڑھی رکھنے میں بڑی مشکلات ہیں، ہمارے یہاں داڑھی رکھنے والوں کو باضابطہ اپنا رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، میں جب پہلی بار داڑھی رکھ کر اپنے وطن گیا تو مجھے سات آٹھ گھنٹہ ائیر پورٹ پر تفتیش کے لیے روک لیا گیا اور میرے پورے اہل خاندان کو طلب کیا گیا، جن میں میری ماں اور بہنیں بھی تھیں اور ان سے بھی کافی دیر تک تفتیش کی گئی، اس کے بعد سے مجبوراً میں مصر جاتے ہوئے اپنی داڑھی صاف کرالیتا ہوں اور واپسی کے بعد پھر داڑھی رکھ لیتا ہوں — غور کیجیے! کیسا غضب ہے کہ ایک مسلمان ملک میں مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہ ہو، کاش! یہ اسرائیل ہی سے سبق حاصل کرتے جہاں یہودی مذہبی طبقے کے داڑھی رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جب مسلمان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ حال ہے تو ان مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو مغربی ثقافت کی آغوش میں محو غفلت ہیں اور اسے دنیا ہی میں جنت تصور کرتے ہیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے عرب اور اسلامی ممالک اور مختلف علاقوں میں بسنے والے تارکین وطن مسلمانوں کے لیے فراخ دلی کے ساتھ اپنا دامن دل کھول رکھا ہے، انہیں شہریت دی جاتی ہے، انہیں ملازمت اور مزدوری کے مواقع ملتے ہیں، اور انہیں اپنے ملکوں سے بڑھ کر شہری حقوق دے دیئے جاتے ہیں، تارکین وطن خوش ہیں کہ انہیں پھلنے، پھولنے اور آگے بڑھنے کے بھر پور مواقع ہاتھ آرہے ہیں؛ لیکن انہیں نہیں معلوم کہ وہ ان ممالک کے ہاتھوں اپنی اگلی نسلوں کا سودا کر رہے ہیں؛ چناں چہ لاکھوں عرب اور فلسطینی جو پچاس سال پہلے امریکہ گئے، اب ان میں اپنے مسلمان ہونے کی پہچان بھی باقی نہیں رہی، مذہبی شعور رخصت ہوا، رہن سہن بدل گیا، زندگی کے طور وطریق تبدیل ہو گئے، یہاں تک کہ ان کے نام میں بھی مسلمانیت کی کوئی بو باقی نہیں رہ گئی ہے؛ حالاں کہ ان کے آباء واجداد راسخ العقیدہ مسلمان اور عرب تہذیب کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے، اگر آج ان گذری ہوئی روحوں کو دوسری زندگی دے دی جائے تو شاید ہی وہ خود اپنی نسل اور اپنی اولاد کو پہچان سکیں، یہ ہے اس تہذیبی ارتداد کا اثر، جو بہ تدریج افراد واقوام کو فطری اور اعتقادی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے!

اسی پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اور مماثلت اختیار کی، وہ ان ہی میں سے ہو گیا، اس روایت کو امام ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور امام طبرانیؒ نے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت کیا ہے اور علامہ سیوطیؒ نے اس حدیث کو ''حسن'' یعنی مقبول قرار دیا ہے۔ (الجامع الصغیر، حدیث نمبر: ۳۹۵۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں عقیدہ وایمان میں غیر مسلموں سے مماثلت مراد نہیں ہے؛ کیوں کہ جو شخص عقیدہ کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کر لے، وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں ہے، اس کے غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے کیا معنی؟ لہٰذا اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے اور مختلف مسائل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح وتوضیح نے اس نکتہ کو مزید واضح کیا ہے، مثلاً: آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج نکلنے، سورج ڈوبنے اور سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ یہی اوقات عام طور پر مشرک اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، جو قومیں سورج کی پرستار ہیں، وہ ان ہی اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں، اس لیے ان اوقات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا۔

روزہ میں حکم دیا گیا کہ افطار جلدی کیا جائے، افطار میں تاخیر نہ کی جائے؛ کیوں کہ افطار میں تاخیر اہل کتاب کا طریقہ ہے، یومِ عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم ہوا؛ کیوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے؛ تاکہ مسلمان اپنی عبادت میں ان سے ممتاز رہیں، حج میں بہت سے ایسے افعال جن کو مشرکین بہت اہمیت دیتے تھے، اسلام نے ان کو ختم کیا، یا ان میں تبدیلی پیدا کی، پھر یہی ہدایات آپ نے وضع قطع اور لباس و پوشاک کے بارے میں بھی دی، مجوسی داڑھی منڈایا کرتے تھے، آپ نے اس سے منع فرمایا، اہل ایران اظہار فخر کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہنتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اہل مکہ سر میں مانگ بھی نکالا کرتے تھے؛ چناں چہ مکی زندگی میں آپ نے سیدھے بال رکھنے کو پسند فرمایا؛ تاکہ مسلمان ان سے ممتاز رہیں، مدینہ میں یہود سیدھے بال رکھتے تھے، تو وہاں آپ نے مانگ نکالنے کو پسند فرمایا، پھر جب تمام عرب نے اسلام قبول کرلیا، تو آپ نے دونوں طرح بال رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اسی طرح عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے، یا صرف عمامہ باندھتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ابتداءً ہدایت دی تھی کہ وہ ٹوپی اور عمامہ دونوں کا استعمال کریں؛ تاکہ ان کے اور مشرکین کے درمیان امتیاز باقی رہے، بعد کو جب اہل عرب ایمان لے آئے، تو آپ نے صرف ٹوپی یا صرف عمامہ کے استعمال کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

دین کا یہ مزاج کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے دوسری اقوام سے ممتاز اور متشخص رہنا چاہیے، فقہاء نے بھی اپنے اجتہاد و استنباط اور قانون شرع کی تشریح و توضیح میں ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے اور لباس و پوشاک، خورد و نوش، عبادات، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے طرزِ تعمیر

وغیرہ ہر مرحلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اس بات کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ مسلمان ایک امتیازی شان اور وہ اپنے دین و مذہب اور تہذیب وتمدن میں دوسری قوموں سے ممتاز اور مشخص رہیں؛ کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب سے محروم ہو جاتی ہے اور تمدن وثقافت کے میدان میں دریوزہ گری پر اتر آتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے فکر وعقیدہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ہندوستان میں اس وقت سنگھ پریوار کی جانب سے اس بات کی بھر پور کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمان نماز پڑھیں، مسجدوں کو جائیں، عید بقرعید وغیرہ کر لیا کریں؛ لیکن اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ دیں، اس کے لیے بہ ظاہر معمولی؛ لیکن نتائج کے اعتبار سے دُور رَس اقدامات کیے جا رہے ہیں، نصابِ تعلیم میں تبدیلی لائی جا رہی ہے، ہندوازم کو ایک نظریہ و عقیدہ کے بجائے قومی ثقافت کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے، اسکولوں میں دیویوں، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں، ہندو مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے اور انہیں شریک کیا جاتا ہے اور ہمارے مسلمان نوجوان دیوالی اور ہولی میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں، مردوں اور عورتوں کے لیے دھوتی نما پائجامہ بنائے جا رہے ہیں، بہت سے علاقوں میں مسلمان عورتیں ہندوانہ رسم ورواج کے مطابق سِندور لگاتی، یا کالی پوت کے ہار پہنتی ہیں، بین مذہب شادی بیاہ کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، بعض جگہ مسلمان بچوں کے ہندی نام بھی رکھے جا رہے ہیں، ٹی وی پروگراموں کا ہندوکرن کیا جا رہا ہے اور ہندو دیوتاؤں اور فرماں رواؤں کو قومی ہیرو کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جو ہمارے سماج میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہیں، آج ہم ان کے قدموں کی آہٹ سننے سے قاصر ہیں؛ لیکن اگر ہم نے حالات کو محسوس نہیں کیا تو مستقبل میں اس سے ناقابل تلافی نقصان کا اندیشہ ہے، اس لیے اس وقت اس تہذیبی ارتداد کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے کہ یہ محض سیاسی وثقافتی مسئلہ نہیں؛ بلکہ اپنے دُور رَس اثرات کے اعتبار سے ہمارے ملّی بقا اور دینی تحفظ کا مسئلہ ہے!

خشک سالی، طبعی اور غیبی اسباب

موسم کا معتدل اور متوازن ہونا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، عام حالات میں زمین پر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور فضاء میں شوخی سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی خنک ہواؤں کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی ؛ لیکن جب موسم گرما میں سورج آگ برساتا ہے، گرم وخشک ہوائیں درختوں کو بے روح کردیتی ہیں، لو کے جھونکے انسانوں کے لئے پیامِ موت ثابت ہونے لگتے ہیں اور زمین اور ماحول کی تپش سے کروٹیں بے سکون ہوجاتی ہیں، اس وقت خوشگوار موسم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے!

اس وقت پورا ملک گرمی کی لپیٹ میں ہے اور بہت سے علاقے ہیں، جہاں خشک سالی نے زندگی کو دوبھر کردیا ہے، مہاراشٹر کا تو بہت ہی برا حال ہے، پینے کے پانی کے لئے لوگوں کو تپتے ہوئے ریگزاروں سے گذر کر میلوں دور جانا پڑتا ہے، جانوروں کو چارہ میسر نہیں اور ان کی تصویریں دیکھ کر رحم آتا ہے، پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے، ان حالات میں لوگ گندے پانی بھی استعمال کرنے پر مجبور ہیں اور اس کی وجہ سے بیماریوں کا پھیلنا فطری بات ہے، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہاں تک کہ نہایت سرد علاقوں میں بھی خشک سالی اپنے قدم بڑھا رہی ہے، آسٹریلیا جیسا ہرا بھرا اور درختوں اور جنگلات کی کرامات سے پہچانا جانے والا ملک بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں۔

قحط سالی کی کچھ طبعی وجوہ ہوسکتی ہیں، طبعی وجوہ کا تعلق بھی انسان کے اپنے افعال ہی سے ہے، زمین پر جنگلات اور درختوں کا وجود قدرت کا بہت ہی خوبصورت اور انوکھا تحفہ ہے، اگر قدرت کا ہاتھ ان درختوں کی تخلیق نہ کرے اور زمین کو ان گہنوں سے آراستہ کرنا چھوڑ دے تو کوئی طاقت نہیں، جو ان کو وجود میں لاسکے ؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زراعت اصل میں ہم کرتے ہیں یا تم کرتے ہو؟ (الواقعہ : ۶۴) ان درختوں سے جہاں انسان کو غذائی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور سوکھی لکڑیوں سے وہ اعلیٰ فرنیچر بناتے ہیں اور نوع بہ نوع فائدے اُٹھاتے ہیں، وہیں زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے اور بارش کے نظام کو متوازن بنانے

میں بھی یہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، تیزی سے جنگلات کی کٹائی نے موسم پر نہایت ہی برا اثر ڈالا ہے، دہلی میں درجہ حرارت معمول سے ۷ تا ۸ ڈگری سلسیس بڑھ گیا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ۱۹۷۰ء سے اب تک تین دہوں میں زمین کھلے درجہ حرارت میں ایک ڈگری فارن ہیٹ کا اضافہ ہو گیا ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ درختوں کی کٹائی اور جنگلات کا خاتمہ اس کا بڑا سبب ہے، اسی لئے اسلام نے شجرکاری اور کاشت کاری کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ انسان جب کوئی درخت لگاتا ہے، تو اس درخت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا اجر لکھتے ہیں۔ (مسند احمد عن ابی ایوب انصاریؓ، مجمع الزوائد: ۶۷/۴) حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ جس نے درخت لگایا اس میں سے کوئی آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ (حوالہ سابق: ۶۸/۴) درخت کو آپ نے درخت والوں کے لئے اور ان کے بعد کی نسل کے لئے برکت کا باعث قرار دیا۔ (مجمع الزوائد: ۶۸/۴) برکت میں عافیت امور حفاظت اور ہر طرح کا نفع شامل ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا ہے، عرب میں عام طور پر بیری اور ببول کے درخت ہوتے تھے، اس لئے خاص طور سے حدیث میں بیری کے درخت کا ذکر آیا ہے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے ان کو حکم دیا، کہ لوگوں میں اعلان کر دیں، کہ بیری کا درخت کاٹنے والے پر اللہ کی لعنت ہو۔ (مجمع الزوائد: ۱۱۵/۸، باب فیمن قطع السدر) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بیری کا درخت کاٹتے ہیں وہ اوندھے منھ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (حوالہ سابق بحوالہ طبرانی) اسی مضمون کی روایت عبداللہ بن حبشی سے بھی مروی ہے عمرو بن اوسؓ سے روایت ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے بیری کا درخت کاٹا سوائے اس کے کہ کھیتی کے لئے کاٹے، اللہ تعالیٰ دوزخ میں اس کا گھر بنائیں گے۔ (مجمع الزوائد: ۶۹/۴ باب فیمن قطع السدر) اس سے اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ جنگلات کی حفاظت کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ جدید صنعتوں میں گیس اور کیمیکلز کا بے دریغ استعمال اور اس کے مضر اثرات سے حفاظت کی طرف سے بے توجہی، نیز زمین کے اندر موجود قدرتی وسائل کوئلے وغیرہ کا مسلسل اخراج اور فضاء میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی، یہ سب وہ اسباب ہیں، جو خود انسانوں کے ہاتھوں پیدا ہو رہے ہیں اور انسان خود اپنی تباہی کا سامان بہم پہنچا رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دنیا کو اجتماعی ضرر پہنچانے کا باعث ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور فقہ اسلامی کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ نہ ابتداءً ضرر پہنچانے کی اجازت ہے اور نہ ردعمل میں، لاضرر ولاضرار؛ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے ان امور میں غیر محتاط رویہ اختیار کرنا قطعاً درست نہیں۔

یہ بھی انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ انسان اپنی تباہی کے اسباب پر ہی پوری صلاحیت خرچ کر رہا ہے، ایک سے ایک مہلک نیوکلیر ہتھیار، میزائل، ٹینک اور تباہی پھیلانے والے طیارے ہیں، جو وجود میں آ رہے ہیں؛ لیکن ماحولیاتی عدم توازن جیسے سنگین اور مہیب مسئلہ سے نمٹنے کے لئے سائنس داں ایسی مخلصانہ کوشش نہیں کر رہے ہیں جو ان کا انسانی فریضہ ہے، حکومتیں بھی مہلک ہتھیاروں کی ایجاد کے معاملہ میں ان کی جس قدر حوصلہ افزائی کرتی ہے، تعمیری مقاصد کے لے غالباً اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتیں، اس سے بڑھ کر افسوس کی بات کیا ہوگی؟

یہ تو خشک سالی کے طبعی اسباب ہیں اور ان میں بھی انسان ہی کی شامت اعمال کو دخل ہے؛ لیکن اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات میں جو بھی واقعات پیش آئیں وہ اتفاقی نہیں ہیں؛ بلکہ انسان کے اعمال اور احوال کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر مبنی ہیں، انسان کی اطاعت وفرماں برداری اور معصیت ونافرمانی سے بارش کا غیبی نظام متعلق ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں رات میں ان پر بارش برساؤں اور دن میں ان پر دھوپ نکلا کرے۔ (مسند احمد، مجمع

الزوائد: ۲/۱۱۲) اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب جمعہ کے دن بارش کی دعاء کرنے کی خواہش کی گئی تو بعض روایتوں میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، **استغفروا ربکم انه کان غفارا** ۔ (مجمع الزوائد: ۲/۲۱۶) غرض، خشک سالی، قحط سامانی اور موسم کی غیر معمولی تمازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے کہ انسان اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرے، خدا فراموشی سے باز آئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے کہ اس میں نہ صرف ان کی آخرت کی بھلائی ہے؛ بلکہ ان کی دنیوی فلاح بھی اس سے متعلق ہے، کم سے کم مسلمانوں کے لئے تو یہ حقیقت جزءِ ایمان ہے، اگر مصیبتیں اور آفتیں بھی انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہیں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

اورنگ زیب عالمگیرؒ: تاریخ کا مظلوم حکمراں

عجب بات ہے کہ دہلی میں چند کلومیٹر پر مشتمل ایک چھوٹی سی سڑک اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے عظیم فرماں روا کے نام منسوب ہے؛ لیکن یہ نسبت بھی فرقہ پرستوں کے دلوں میں کانٹا بن کر چبھ رہی ہے اور اس کا نام بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے، اورنگ زیبؒ کے بارے میں ''جدوناتھ سرکار'' جیسے تنگ نظر، متعصب فرقہ پرست اور حقیقت بے زار مصنف کو بھی یہ کہنا پڑا کہ: ''اورنگ زیب کے اقتدار نے مغل حکومت کے ہلال کو بدرِ کامل بنا دیا'' اب اگر کوئی چاند پر تھوکنے کی کوشش کرے تو یہ تھوک اسی کی طرف واپس آئے گا؛ اس لیے ایسی باتوں سے صرفِ نظر کر جانا نامناسب نہ ہوتا؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے؛ بلکہ نئی تاریخ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فرقہ پرست عناصر کو مسئلہ کی اصل حقیقت بتائی جائے اور سچائی کی روشنی پھیلائی جائے۔

برصغیر پر جن مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے، ان میں غالباً سب سے طویل عرصہ مغلوں کے حصہ میں آیا ہے، جو ۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء یعنی تقریباً ساڑھے تین سو سال کے عرصہ پر محیط ہے، اس دوران اگرچہ ہمیشہ پورے خطہ پر مغلوں کو دورِ اقتدار حاصل نہیں رہا اور بہت سے علاقے ان کے قبضہ میں آتے اور جاتے رہے؛ لیکن تقریباً اس پورے عرصہ میں وہ قوتِ اقتدار کی علامت بنے رہے، اس خاندان کے چھٹے فرماں روا اورنگ زیب عالمگیرؒ تھے، اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۱۸ء میں ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں وفات پائی، گویا پورے نوے سال کی طویل عمر پائی، پھر ان کی خوش قسمتی ہے کہ ۱۶۵۷ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک یعنی تقریباً پچاس سال انہوں نے حکومت کی اور ان کے عہد میں ہندوستان کا رقبہ جتنا وسیع ہوا، اتنا وسیع نہ اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد، یعنی موجودہ افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش کی آخری سرحدوں اور لداخ وتبت سے لے کر جنوب میں کیرالہ تک وسیع وعریض سلطنت کا قیام اسی بادشاہ کی دَین ہے۔

ان کی اخلاقی خوبیوں پر تمام مؤرخین یہاں تک کہ ان کے مخالفین بھی متفق ہیں کہ یہ

تخت شاہی پر بیٹھنے والا ایک درویش تھا، جو قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیوں کی سلائی سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی موت کے وقت وصیت کی کہ ان کی اسی آمدنی سے تجہیز وتکفین کی جائے، ایسے زاہد، درویش صفت، قناعت پسند اور عیش وعشرت سے دور بادشاہ کی نہ صرف ہندوستان بلکہ تاریخِ عالم میں کم مثالیں مل پائیں گی، یہ تو ان کی ذاتی زندگی کے اوصاف ہیں، اس کے علاوہ اورنگ زیبؒ نے اپنے عہد میں غیر معمولی اصلاحات بھی کیں، ترقیاتی کام کیے، نامنصفانہ احکام کو ختم کیا، اور سرکاری خزانوں کو عوام پر خرچ کرنے اور رفاہی کاموں کو انجام دینے کی تدبیر کی، اس سلسلہ میں چند نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) اب تک عوام پر بہت سارے ٹیکس لگائے جاتے تھے، اور یہ صرف مغل حکمرانوں کا ہی طریقہ نہیں تھا؛ بلکہ اس زمانہ میں جو راجے رجواڑے اور ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، وہ بھی اس طرح کے ٹیکس لیا کرتی تھیں، شیواجی تو اپنے مقبوضہ علاقہ میں چوتھ یعنی پیداوار کا چوتھائی حصہ وصول کیا کرتے تھے، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مال گذاری کے علاوہ جو ٹیکس لیے جاتے تھے، جن کی تعداد اَسّی (۸۰) ذکر کی گئی ہے، ان سب کو نامنصفانہ اور کسان مخالف قرار دیتے ہوئے ختم کردیا؛ حالاں کہ اس کی آمدنی کروڑوں ہوتی تھیں، یہ بات قابل غور ہے کہ عام طور پر اورنگ زیبؒ کو ہندو مخالف پیش کیا جاتا ہے؛ لیکن انھوں نے متعدد ایسے ٹیکسوں کو معاف کردیا، جن کا تعلق ہندوؤں سے تھا، جیسے گنگا پوجا ٹیکس، گنگا اشنان ٹیکس اور گنگا میں مُردوں کو بہانے کا ٹیکس۔

(۲) انھوں نے مال گذاری کا قانون مرتب کیا اور اس کے نظم ونسق کو پختہ بنایا، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے دور میں ڈھائی کروڑ پونڈ کے قریب سلطنت کی آمدنی تھی، تو وہ عالمگیر کے دور میں چار کروڑ پونڈ کے قریب پہنچ گئی۔

(۳) حکومتوں میں یہ رواج تھا کہ جب کسی عہدہ دار کا انتقال ہوجاتا تو اس کی ساری جائیداد ضبط کرلی جاتی اور حکومت کے خزانہ میں داخل ہوجاتی، آج بھی بعض مغربی ملکوں میں ایسا قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کے بغیر دنیا سے گزر جائے تو اس کا پورا

ترکہ حکومت کی تحویل میں چلا جاتا ہے، عالمگیر نے اس طریقہ کو ختم کیا؛ تاکہ عہدہ دار کے وارثوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

(۴) انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مظلوموں کے لیے انصاف کا حصول آسان ہوجائے، وہ روزانہ دوتین بار دربار عام کرتے تھے، یہاں حاضری میں کسی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ہر چھوٹا بڑا، غریب وامیر، مسلمان وغیر مسلم، بے تکلف اپنی فریاد پیش کرسکتا تھا اور بلا تاخیر اس کو انصاف فراہم کیا جاتا تھا، وہ اپنے خاندان کے لوگوں، شہزادوں اور مقرب عہدہ داروں کے خلاف فیصلہ کرنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے؛ لیکن اس کے علاوہ انہوں نے دور دراز کے لوگوں کے لیے ۱۰۸۲ھ میں ایک فرمان کے ذریعہ ہر ضلع میں سرکاری نمائندے مقرر کیے کہ اگر لوگوں کو بادشاہ اور حکومت کے خلاف کوئی دعویٰ کرنا ہوتو وہ ان کے سامنے پیش کریں اور ان کی تحقیق کے بعد عوام کے حقوق ادا کردیں۔

(۵) عالمگیر کا ایک بڑا کارنامہ حکومت کی باخبری کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کا نظام تھا، جس کے ذریعہ ملک کے کونے کونے سے بادشاہ کے پاس اطلاعات آتی رہتی تھیں، اور حکومت تمام حالات سے باخبر رہ کر مناسب قدم اُٹھاتی تھی، اس نظام کے ذریعہ ملک کا تحفظ بھی ہوتا تھا، عوام کو بروقت مدد بھی پہنچائی جاتی تھی، اور عہدہ داروں کو ان کی غلطیوں پر سرزنش بھی کی جاتی تھی، اس کا سب سے بڑا فائدہ رشوت ستانی کے سدباب کی شکل میں سامنے آیا۔

عام طور پر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو رشوت ''گفٹ'' کے نام پر دی جاتی ہے، یہ نام کرپشن کے لیے ایک پردہ کا کام کرتا تھا، اُس زمانہ میں یہ رقم نذرانہ کے نام سے دی جاتی تھی، جو بادشاہوں کو حکومت کے عہدہ داران اور اصحابِ ثروت کی جانب سے اور عہدہ داروں کو ان کے زیر اثر رعایا کی جانب سے ملا کرتی تھی، اورنگ زیبؒ نے ہر طرح کے نذرانہ پر پابندی لگادی، خاص کر نوروز کے جشن پر تمام امراء بادشاہ کی خدمت میں بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے، اورنگ زیبؒ نے اپنی حکومت کے اکیس ویں سال اس جشن ہی کو موقوف

کردیا اور فرمان جاری کردیا کہ خود ان کو کسی قسم کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے۔

(٦) عام طور پر جہاں بھی شخصی حکومتیں رہی ہیں، وہاں عوام کو اطاعت و فرماں برداری پر قائم رکھنے کے لیے بادشاہ کے بارے میں مبالغہ آمیز تصورات کا اسیر بنایا جاتا ہے، اسی لیے تیمور لنگ کہا کرتا تھا کہ جیسے آسمان پر خدا ہے، زمین میں وہی درجہ ایک بادشاہ کا ہے، اسی لیے مغلوں کے یہاں بھی ہندوانہ طریقہ کے مطابق ایک طرح کی بادشاہ پرستی مروّج رہی ہے، اکبر کے یہاں تو بادشاہ کا دیدار اور سجدہ کرنا ایک عبادت تھا اور ہر دن بے شمار لوگ یہ عبادت بجالاتے تھے، جہانگیر نے سجدہ ختم کیا؛ لیکن زمین بوسی باقی رہی، عالمگیر نے جھروکا درشن بالکلیہ ختم کردیا، جس میں لوگ صبح کو بطورِ عبادت بادشاہ کا دیدار کرتے تھے اور اس وقت تک کھاتے پیتے نہیں تھے؛ البتہ اس بات کی اجازت تھی کہ اگر کوئی ضرورت مند آئے تو اس کی درخواست رسّی میں باندھ کر اوپر بادشاہ کے پاس پہنچادی جائے۔

(٧) عموماً حکمرانوں کی شاہ خرچی اور حکمرانوں کے چونچلے غریب عوام کی کمر توڑ دیتے ہیں، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ایسے تکلّفات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، جیسا کہ گذرا، شاہی نذرانوں کو بند کیا، دربارِ شاہی میں بادشاہوں کی تعریف کرنے والے شعراء ہوا کرتے تھے اور ان پر ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا، جو ''ملک الشعراء'' کہلاتا تھا، اورنگ زیبؒ نے اس شعبہ کو ختم کردیا، وہ اپنی شان میں کسی بڑائی اور مبالغہ آمیز شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے دربارِ شاہی میں گانے بجانے کا خصوصی انتظام ہوتا تھا، قوال اور رقاصائیں گا کر اور ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کرتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں، عالمگیر نے اس سلسلہ کو بھی موقوف کردیا، بادشاہ کے لکھنے کے لیے سونے اور چاندی کی دواتیں رکھی جاتی تھیں، عالمگیر نے اس کے بجائے چینی کی دواتیں رکھنے کی تلقین کی، انعام کی رقمیں چاندی کے بڑے طشت میں لائی جاتی تھی، اس طشت کی رسم کو بھی اورنگ زیبؒ نے موقوف کردیا، عام طور پر بادشاہوں کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی مخصوص کردی جاتی تھی، آج بھی جمہوری ملکوں میں سربراہِ حکومت کے لیے رہائش، سفر اور

ضروریات وغیرہ پر جو رقمیں صرف کی جاتی ہیں اور رہائش کے لیے جو وسیع مکان اور اعلیٰ درجہ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، وہ گذشتہ بادشاہوں کی شاہ خرچی کو بھی شرمندہ کرتی ہیں؛ لیکن اورنگ زیبؒ نے اپنے لیے نہ کوئی عظیم الشان محل تعمیر کرایا، نہ اپنی تفریح کے لیے کوئی باغ بنوایا، اور اپنے مصارف کے لیے بھی محض چند گاؤں کو اپنے حصہ میں رکھا اور بقیہ سارے مصارف کو حکومت کے خزانہ میں شامل کر دیا۔

(۸) انھوں نے تعلیم کی ترقی پر خصوصی توجہ دی، ہر شہر اور ہر قصبہ میں اساتذہ مقرر ہوئے، نہ صرف اساتذہ کے لیے وظائف مقرر کیے گئے اور جاگیریں دی گئیں؛ بلکہ طلبہ کے اخراجات اور مدد معاش کے لیے بھی حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی گئیں، کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے زیادہ تر فرامین تعلیم ہی سے متعلق ہیں، جن کو ان کے بعض تذکرہ نگاروں نے نقل بھی کیا ہے۔

(۹) اس زمانہ میں صنعت و حرفت کو آج کی طرح ترقی نہیں ہوئی تھی اور معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت تھی، اورنگ زیبؒ نے زرعی ترقی پر خصوصی توجہ دی، کسانوں کی حوصلہ افزائی کی، جن کسانوں کے پاس کاشت کاری کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، ان کو سرکاری خزانوں سے پیسہ فراہم کیا جاتا، حسبِ ضرورت کسانوں سے مال گذاری معاف کی گئی، جو زمینیں اُفتادہ تھیں اور ان میں کاشت نہیں کی جاتی تھی، ان کو ایسے کسانوں کے حوالہ کیا گیا، جو ان کو آباد کرنے کے لیے آمادہ تھے، اپنے عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ کسانوں کو اتنا ہی لگان لگایا جائے، جتنا وہ بآسانی اور بخوشی ادا کر سکیں، اگر وہ نقد کے بجائے جنس دینا چاہیں تو قبول کر لیا جائے، انھوں نے کسانوں کے لیے کنواں کھدوانے، قدیم کنوؤں کو درست کرانے اور آبِ پاشی کے وسائل کو بہتر بنانے کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیا، انھوں نے زمین کے سروے کرنے پر خصوصی توجہ کی؛ تاکہ معلوم ہو کہ کون سی اراضی اُفتادہ ہیں اور اُن کو قابل کاشت بنانے کی کیا صورت ہے؟ انھوں نے اپنے فرمان میں لکھا ہے:

''بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے، اس ملک

کی زرعی پیداوار بڑھے، کاشت کار خوش حال ہوں اور عام رعایا کو فراغت نصیب ہو، جو خدا کی طرف سے امانت کے طور پر ایک بادشاہ کو سونپی گئی ہے۔‘‘

زرعی پیداوار کی طرف اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں فتح ہونے والے بہت سے علاقے ایسے تھے، جہاں کے اخراجات وہاں کی آمدنی سے زیادہ تھے؛ لیکن پھر بھی کہیں غذائی اشیاء کی قلت محسوس نہیں کی گئی، اگر یہ صورتِ حال نہیں ہوتی تو اتنے طویل وعریض رقبہ پر پچاس سال تک اورنگ زیب حکومت نہیں کر پاتے اور وہ عوام کی بغاوت کے نتیجہ میں مملکت پارہ پارہ ہو جاتی۔

(۱۰) اورنگ زیبؒ کا ایک بڑا کارنامہ سماجی اصلاح بھی ہے، انھوں نے بھنگ کی کاشت پر پابندی لگائی، شراب و جوئے کی ممانعت کردی، قحبہ گری کو روکا اور فاحشہ عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کیا، لونڈی، غلام بنا کر رکھنے یا خواجہ سرا رکھنے پر پابندی لگائی۔

(۱۱) ہندو سماج میں عرصۂ دراز سے ستی کا طریقہ مروّج تھا، جس کے تحت شوہر کے مرنے کے بعد بیوی شوہر کی چتا کے ساتھ نذرِ آتش کردی جاتی تھی، ہندو سماج میں اسے مذہبی عمل سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا، غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، اس لیے اورنگ زیبؒ نے قانونی طور پر اس کو بالکلیہ تو منع نہ کیا؛ لیکن اصلاح اور ذہن سازی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے عہدہ داروں کو ہدایت دی کہ وہ عورتوں کو اس رسم سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی خواتین کے ذریعہ بھی ان کو اس کی دعوت دیں، نیز پابندی عائد کردی کہ علاقہ کے صوبہ دار کی اجازت کے بغیر ستی نہ کی جائے؛ تاکہ کسی عورت کو اس عمل پر اس کے میکہ یا سسرال والے یا سوسائٹی کے دوسرے لوگ مجبور نہ کرسکیں، اس طرح عملاً ستی کا رواج تقریباً ختم ہو گیا۔

غرض کہ اورنگ زیبؒ نے قدیم سڑکوں اور سرایوں کی مرمت، نئی سڑکوں اور مسافر خانوں کی تعمیر، تعلیمی اداروں اور عبادت گاہوں کو جاگیروں کے عطیہ وغیرہ کے جو رفاہی کام کیے، ان کے علاوہ مختلف دوسرے میدانوں میں جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ بھی آبِ زر سے

لکھے جانے کے لائق ہیں، ان کی رحم دلی، انصاف پروری اور عفو و درگزر کا ان لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے، جو ان کو ایک خشک مزاج، ناروادار اور سخت گیر حکمراں قرار دیتے ہیں، انہوں نے ہمیشہ اپنے حریفوں کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سنی ہوں یا شیعہ، پٹھان ہوں یا مراٹھے وراجپوت، زیادہ سے زیادہ صلح اور درگزر کی پالیسی اختیار کی، خود شیوا جی کو جس طرح انہوں نے بار بار معاف کیا اور اس کے بیٹے کو گلے لگایا، یہ اس کی بہترین مثال ہے، مگر افسوس کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار قائم کرنے کی جو منصوبہ بند کوشش کی، اس میں مغلوں کے دورِ حکومت کو عموماً اور آخری پُر شوکت مغل بادشاہ اورنگ زیبؒ (جس کو انگریز اپنے راستہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے) کے بارے میں خصوصاً بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں اور بعض مصنفین نے ان کا آلہ کار بنتے ہوئے ایسی کتابیں تصنیف کیں، جن کو تاریخ اور واقعہ نگاری کے بجائے ناول نگاری اور افسانہ نویسی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، انہوں نے ایسی بے بنیاد باتیں لکھ دیں جن کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، اورنگ زیبؒ کو ایک ہندو دشمن حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اس کے لیے اورنگ زیبؒ اور شیوا جی کی جنگ کو بنیاد بنایا گیا؛ حالاں کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی نہ کہ مذہبی، اورنگ زیبؒ اور شیوا جی کی جنگ میں اورنگ زیبؒ کا سب سے معتمد کمانڈر ایک راجپوت راجہ جے سنگھ تھا، اور بے شمار راجپوت اور مراٹھے سردار اورنگ زیب کے ساتھ تھے اور ان کی فوج میں بھی بڑی تعداد پٹھانوں، راجپوتوں اور شیوا جی کے مخالف مراٹھوں کی تھیں۔

اورنگ زیبؒ کے عہد میں جو غیر مسلم حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں، ان میں کئی مرہٹے ہیں، جن میں شیوا جی کے داماد اور بھتیجے بھی شامل ہیں، علامہ شبلیؒ نے ان کا نام بہ نام ذکر کیا ہے، جن کی تعداد ۲۶ ہے، خود شیوا جی کو بھی اورنگ زیبؒ نے پنج ہزاری منصب عطا کیا تھا، جو بڑا منصب تھا، اور جس پر بادشاہ کے بعض شہزادے، قریبی رشتہ دار اور معتمد عہدہ دار فائز تھے؛ البتہ شیوا جی ہفت ہزاری چاہتے تھے، مگر راجپوت اور پٹھان اعیانِ حکومت اس کے حق میں نہیں تھے۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شیوا جی جو مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑا کرتے تھے،

وہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لیا کرتے تھے، قلعوں کو تاخت وتاراج کر دیا کرتے تھے، یہ لوٹ ماران کی مستقل حکمت عملی تھی، اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں ہوا کرتی تھی، سورت اس زمانہ میں جنوبی ہند کی سب سے بڑی منڈی تھی، جو بیرونی ممالک سے درآمد و برآمد کا بہت بڑا ذریعہ تھا، یہاں غالب آبادی ہندوؤں کی تھی، شیواجی موقع بموقع وہاں ایسا حملہ کرتے تھے کہ پورا شہر ویران ہو جاتا تھا، کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا ملکی اور کیا غیر ملکی؟ سب کے سب ان حملوں سے پناہ چاہتے تھے، ان حملوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں تھی؛ بلکہ تاجروں کی غالب تعداد ہندوؤں کی تھی، اس لیے ان کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا، یہاں تک کہ شیواجی جن کو مراٹھوں کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، خود مراٹھوں کے خلاف بھی انہوں نے وہی کیا، جو ہر بادشاہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کیا کرتا ہے، بیجاپور کے پہلے سلطان نے ایک مراٹھے خاندان کو ''جاولی'' کا علاقہ عطا کیا، جس نے ایک مضبوط ریاست بنائی اور یہ بتدریج کوکن کے پورے علاقہ پر قابض ہو گیا، اس خاندان کے راجا کا خاندانی لقب چندر راؤ تھا، شیواجی کا احساس تھا کہ جب تک چندر راؤ کا قتل نہ کیا جائے اور اس کی سلطنت پر قبضہ نہ ہو جائے، شیواجی جس وسیع سلطنت کا منصوبہ رکھتے ہیں، وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اس لیے اس نے دھوکہ دے کر اس مرہٹہ راجا کو قتل کیا، اس کے بھائی کو زخمی کیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گئے، غرض کہ اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی؛ بلکہ ایک سیاسی جنگ تھی، جو حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ ہوتی رہی ہے، نہ اورنگ زیب نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جنگ لڑی ہے اور نہ شیواجی کا حملہ ہندوؤں کے وقار کی حفاظت کے لیے ہوا ہے۔

اورنگ زیبؒ پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا ہے اور مندر شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیبؒ کے عہد میں بعض مندر منہدم کیے گئے ہیں؛ لیکن اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ غیر جانب دار مؤرخین نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے انہیں مندروں کو منہدم کیا تھا، جو غیر قانونی طور پر بنائے گئے تھے، مثلاً اورچھا میں ببر سنگھ دیو کے بنائے ہوئے ایک مندر کو

اورنگ زیب نے منہدم کرادیا؛ لیکن اس لیے کہ ببر سنگھ دیو نے اولاً تو ظالمانہ طور پر ابوالفضل کو قتل کیا اور پھر اسی کے سرمایہ سے وہ مندر بنایا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ مندر منہدم کیا گیا تو وہاں کے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یا اس نے ایسے مندروں کو گرایا، جہاں حکومتوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں، یا ایسے مندروں کو جہاں غیر اخلاقی حرکتیں کی جاتی تھیں، جیسے بنارس کا وشوناتھ مندر، ڈاکٹر بی، ایم، پانڈے نے اس کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے کہ اورنگ زیب جب بنگال جاتے ہوئے بنارس کے قریب سے گذرے تو اس کی فوج میں شامل ہندو راجاؤں اور کمانڈروں نے وہاں ایک دن قیام کی درخواست کی؛ تاکہ ان کی رانیاں گنگا اشنان کرسکیں اور وشوناتھ دیوتا کی پوجا کریں، اورنگ زیب راضی ہوگئے، انہوں نے فوج کے ذریعہ حفاظت کا پورا انتظام کیا، رانیاں اشنان سے فارغ ہوکر وشوناتھ مندر روانہ ہوئیں؛ لیکن جب مندروں سے رانیاں واپس ہوئیں تو اس میں بعض موجود نہیں تھیں، کافی تلاش کی گئی، مگر پتہ نہیں چل سکا، بالآخر تحقیق کاروں نے دیوار میں نصب گنیش کی مورتی کو ہلایا، جو اپنی جگہ سے ہلائی جاسکتی تھی تو نیچے سیڑھیاں نظر آئیں، یہ سیڑھیاں ایک تہہ خانہ کی طرف جاتی تھیں، وہاں انہوں نے دیکھا کہ بعض رانیوں کی عصمت ریزی کی جاچکی ہے اور وہ زار و قطار رو رہی ہیں؛ چناں چہ اورنگ زیب کی فوج میں شامل راجپوت کمانڈروں نے اس مندر کو منہدم کردینے کا مطالبہ کیا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ مورتی کو پورے احترام کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کردیا جائے اور چوں کہ ایک مقدس مذہبی مقام کو ناپاک کیا گیا ہے: اس لیے اس کو منہدم کردیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اکبر کے دور سے صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سی مسجدوں کو منہدم کر کے بت خانے بنادیئے جاتے تھے، ہندو مسلمان عورتوں سے جبراً نکاح کرتے تھے اور انھیں اپنے تصرف میں لاتے تھے، جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں بھی یہی صورتِ حال باقی رہی اور خود اورنگ زیب کی حکومت کے بارہویں سال تک یہی صورتِ حال تھی، ممکن ہے کہ بعض مندروں کے انہدام کا یہی پس منظر ہو، چناں چہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اورنگ

زیب نے جہاں مندر منہدم کیے ہیں، وہیں مسجد بھی منہدم کروائی ہے، کہا جاتا ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے مشہور فرماں روا تانا شاہ نے سال ہا سال سے شہنشاہِ دہلی کو شاہی محصول ادا نہیں کیا تھا، اس نے اپنی دولت کو چھپانے کے لیے ایک بڑا خزانہ زیر زمین دفن کر کے اس پر جامع مسجد گولکنڈہ تعمیر کرادی، اورنگ زیب کو کسی طرح اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس مسجد کو منہدم کرادیا، اور اس خزانہ کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کر دیا۔

افسوس کہ فرقہ پرست، متعصب اور دروغ گو تذکرہ نگاروں نے اورنگ زیب کی اس سخاوت اور وسیع النظری کا تذکرہ نہیں کیا، جو ان کا اصل مزاج تھا۔

کاش! فرقہ پرست عناصر کبھی اس بات پر بھی غور کرتے کہ خود ہندوؤں نے کس طرح بودھوں کی خانقاہوں، جینوں کے مندروں اور مسلمانوں کی مسجدوں کو منہدم کیا ہے، خود شیواجی نے ستارہ، پارلی، اور زیر قبضہ آنے والے علاقوں میں مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ایلورا اور اجنتا میں بودھوں کو یہ کیوں کرنا پڑا کہ اپنی عظیم الشان خانقاہوں کو مٹی سے ڈھانپ دیں؛ تاکہ وہ ہندوؤں کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں، آج بھی جگن ناتھ مندر ہندوؤں کی زیادتی کی گواہ بن کر کھڑا ہے، جو دراصل بودھوں کا مندر تھا، اور جس پر زبردستی ہندوؤں نے قبضہ کرلیا، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مسجدیں شہید کردی گئیں، اندرا گاندھی کے دور میں سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ گولڈن ٹمپل اور اکال تخت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فساد میں کتنی ہی مسجدیں شہید کردی گئیں اور حکومت نے اس کی تعمیر نو کرنے سے انکار کردیا، کیا فرقہ پرست عناصر سچائی کی نشان دہی کرنے والے اس آئینہ میں بھی اپنا چہرہ دیکھنا گوارہ کریں گے؟

اورنگ زیب کے فردِ جرم میں اس بات کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں پر جزیہ لگادیا تھا؛ لیکن اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ انہوں نے ۸۰ قسم کے ٹیکس معاف کردیئے، جن میں کئی ٹیکسوں کا تعلق ہندوؤں سے تھا اور جزیہ ان پر اس لیے عائد کیا گیا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی تھی، اگر ہندوؤں سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنا

ہوتا، اور مذہبی آزادی کے تقاضے کے خلاف ہوتا، اس لیے اسلام نے غیر مسلم شہریوں پر الگ نام سے یہ ٹیکس مقرر کیا ہے اور اس کی مقدار نہایت قلیل ہے: فی کس بارہ درہم یعنی ۱۳ر تولہ چاندی سے بھی کم، پھر شریعت کے حکم کے مطابق اورنگ زیب نے عورتوں، بچوں، مذہبی پیشواؤں، معذوروں اور غریبوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا اور جزیہ کے بدلہ غیر مسلم عوام کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی۔

ان سب کے باوجود ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیب کوئی عالم، مفتی اور صوفی نہ تھے بلکہ ایک سیاسی قائد اور حکمراں تھے، بھائیوں کا قتل ہو یا بعض سکھ رہنماؤں کا، مندروں کا انہدام ہو یا مسجدوں کا، یہ سیاسی مقاصد کے تحت تھے، یہ غلط ہو سکتے ہیں؛ لیکن اس کو مذہب کی جنگ قرار دینا اس سے زیادہ غلط ہے، اورنگ زیب سے متعلق جو الزامات ہیں، وہ علم و تحقیق کے بجائے غلط فہمی اور جذبات پر مبنی ہیں، جو لوگ اس معاملہ کی سچائی کو جاننا چاہیں اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنا چاہیں، انہیں علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر''، سیّد صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' (جلد سوم)، مولوی ذکاء اللہ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ'' اور مولانا نجیب اشرف ندوی کی ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے؛ لیکن اس وقت ایک بڑا کام یہ ہے کہ کچھ حقیقت پسند، غیر جانب دار لکھنے والے اٹھیں اور سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی تک کی تاریخ اس طور پر لکھیں، جو فرقہ وارانہ تأثرات سے خالی ہو، جس میں ہر طبقہ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، جس میں بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ کو ایک سیاسی جنگ کی نظر سے دیکھا جائے نہ کہ مذہبی جنگ کی حیثیت سے، جس میں مسلمانوں کے درمیان باہمی رواداری اور اخوت و بھائی چارہ کو نمایاں کیا جائے، جو محبت کی خوش بو بکھیرے نہ کہ نفرت کا تعفن، یہ ایک ضروری کام ہے، جس کی طرف تحقیقاتی اکیڈمیوں، تعلیمی اداروں، ملّی تنظیموں، قومی اداروں اور باصلاحیت اور منصف مزاج دانش وروں کو توجہ دینی چاہیے۔

خدا، رسول اور انسان کے بارے میں اسلامی تصور

مؤرخہ ۲۳، ۲۴ / ستمبر ۲۰۱۶ء کو مگدھ یونی ورسٹی بودھ گیا (بہار) میں اس یونی ورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی کے اشتراک سے ایک ہمہ مذہبی سیمینار منعقد ہوا، جس میں ہندو، آریہ سماجی، جین، بودھ، کرسچن، سکھ، کنفیوشش اور مشرقِ بعید کے بعض دوسرے مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے اور سبھوں نے اپنے اپنے مذاہب کا تعارف پیش کیا، اس حقیر کو ''اسلام کا تعارف'' پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی؛ چناں چہ زبانی تعارف پیش کیا گیا، متعدد شرکاء نے خواہش کی کہ اسے تحریری شکل میں شائع کر دینا چاہیے؛ تاکہ برادرانِ وطن تک اسلام کا تعارف پہنچانے میں سہولت ہو، اسی جذبہ کے تحت یہ تحریر شائع کی جارہی ہے۔ (خالد سیف اللہ رحمانی)

مسلمان جس مذہب پر یقین رکھتے ہیں، اس کے دو نام ہیں: اسلام اور ایمان، اسی لحاظ سے مسلمانوں کے بھی دو نام ہیں: مسلم اور مؤمن، اسلام کے معنی اپنے آپ کو حوالہ کر دینے کے ہیں، یہ عربی گرامر کے لحاظ سے **سِلم** اور **سَلام** سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح، سلامتی اور خود حوالگی کے ہیں، اسی سے مسلم ہے، یعنی ایسا شخص جو صلح کو پسند کرنے والا اور اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے والا ہو، ایمان ''امن'' کے لفظ سے ماخوذ ہے، امن کے معنی ہیں: دوسرے کو امن دینا، یقین کرنا، اسی سے مؤمن ہے، مؤمن کے معنی ہوئے: امن دینے والا، یقین کرنے والا۔

غور کیجیے تو اسلام اور ایمان ان دونوں میں امن، سلامتی، صلح اور خدا کے احکام کے سامنے جھک جانے کے معنی پائے جاتے ہیں، یہی اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کی ابتداء پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، پہلے انسان، پہلے مسلمان بھی تھے، تاریخ کے مختلف ادوار میں جتنے پیغمبر گذرے ہیں، وہ سب اپنے اپنے زمانے میں اسلام کی دعوت دینے والے تھے، اور جن لوگوں نے ان کی دعوت قبول کی، وہ سب مسلمان تھے؛ کیوں کہ مسلمانوں میں وہ سب لوگ شامل ہیں، جو خدا کے احکام کے

سامنے سر جھکا دیں، ایسا نہیں ہے کہ اسلام کی ابتدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے؛ اسی لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے اپنے نام کی نسبت سے کوئی نام منتخب نہیں فرمایا اور اپنے ماننے والوں کو ''محمدی'' یا ''محمڈن'' نہیں کہا؛ بلکہ انہیں ''مسلم'' اور ''مؤمن'' کا نام دیا گیا، جن کو ہندوستان میں عام طور پر مسلمان کہا جاتا ہے۔

خدا ایک ہے!

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، اس کو ہم نے پیدا نہیں کیا ہے؛ بلکہ ہم نے خود اپنے آپ کو بھی نہیں بنایا ہے، کوئی طاقت ہے جس نے اس کائنات کو بھی پیدا کیا ہے اور ہمیں بھی، پھر غور کیجیے تو اس دنیا میں ساری چیزیں ایک توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں، انسان کو آکسیجن کی ضرورت ہے، آلودہ گیسیں انسان کے لیے نقصان دہ ہیں، مگر یہی گیسیں درختوں کی خوراک ہیں، وہ ان گیسوں کو صاف کرکے انسان کے لیے آکسیجن فراہم کرتے ہیں، ہر مقام کی ضرورت کے لحاظ سے بارش ہوتی ہے، ریگستانوں میں بارش کم ہوتی ہے، جنگلات میں زیادہ ہوتی ہے؛ کیوں کہ نباتات پانی کی زیادہ ضرورت ہے، مقررہ اوقات کے مطابق ہی دن و رات کی آمد و رفت ہوتی ہے، کائنات کے اُفق میں اربوں سیارے تھوڑی دیر کے لیے بھی رُکے بغیر گردش کر رہے ہیں؛ لیکن تیز رفتاری کے باوجود ان کے درمیان کبھی تصادم نہیں ہوتا، سورج اتنی حرارت خارج کرتا ہے کہ اگر وہ جوں کا توں زمین پر پہنچ جائے تو زمین جل کر بھسم ہو جائے؛ کیوں کہ ایک سیکنڈ میں سورج جو حرارت خارج کرتا ہے، اس کی مقدار دس لاکھ ایٹم بم سے بھی زیادہ ہے، زمین کے چاروں طرف ہوا کا ایک ایسا غلاف تان دیا گیا ہے کہ وہ ان بے پناہ حرارتوں کو جذب کر لیتا ہے اور انسان کی ضرورت کے بقدر ہی زمین پر پہنچنے دیتا ہے، غرض کہ پوری کائنات ایک مربوط اور متوازن نظام کے ساتھ چل رہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بالا تر ہستی ہے، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہ مسلسل اس کا انتظام بھی کر رہی ہے، اسی ہستی کا نام ''اللہ'' ہے اور وہ ایک ہی ہے، اگر کئی لوگ مل کر کائنات کا نظام چلاتے تو وہ ٹکراؤ سے بچ نہیں پاتے اور کائنات کے نظام میں اِس وقت

جو یکسانیت ہے، وہ برقرار نہیں رہ پاتی؛ چناں چہ قرآن مجید نے خدا کی ہستی کا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے:

''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ زندہ ہے، سب کو تھامے ہوا ہے، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، آسمانوں میں اور زمینوں میں جو کچھ ہے، سب اسی کا ہے، کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش بھی کر سکے؟ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ لوگوں سے اوجھل ہے، اس کو سب کا علم ہے، اس کے علم کے کسی گوشے پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہو سکتا، سوائے اس کے کہ خود وہی (کسی کو کوئی علم دینا) چاہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں، وہی سب سے اوپر ہے اور وہی سب سے بڑا ہے۔ (البقرۃ: ٢٥٥)

اسلام میں خدا کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بھی ایک ہے اور وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے، وہی پیدا کرتا ہے، وہی موت دیتا ہے، انسان اسی کے حکم سے بیمار پڑتا ہے اور اسی کے حکم سے شفا حاصل ہوتی ہے، وہی روزی دینے والا ہے، اسی کے حکم سے کسی کی روزی بڑھتی ہے اور کسی کی کم ہوتی ہے، یہ تصور انسان کو ایک تقدس عطا کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی پیشانی صرف اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے ہے، وہ مخلوقات کے خوف کے وہم سے آزاد ہو جاتا ہے، پھر یہ یقین اس کے اندر کائنات کے بارے میں تحقیق کا جذبہ پیدا کرتا ہے؛ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ خدا نے یہ ساری چیزیں اس کی خدمت کے لیے پیدا کی ہیں، جب انسان کسی چیز کو اپنا خادم سمجھتا ہے تو اس کے بارے میں تحقیق اور جستجو سے کوئی جھجھک نہیں ہوتی، اور اگر وہ کسی چیز کو اپنا معبود سمجھ لے تو احترام کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی کھوج میں نہ پڑے۔

رسول اور کتاب

جو کسی چیز کا بنانے والا ہوتا ہے، وہی اس کے استعمال کے طریقے اور اس کے نفع و نقصان کے پہلوؤں سے بھی واقف ہوتا ہے، جب خدا نے اس کائنات کو بھی بنایا ہے اور

انسان کو بھی، تو اس دنیا کی چیزوں کو اسے کس طرح استعمال کرنا چاہیے اور خود اس کو اپنی زندگی کس طور پر گذارنی چاہیے؟ اس کے لیے اسے خدا کی رہنمائی کی ضرورت ہے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے دو انتظام فرمائے، ایک یہ کہ ہر قوم میں اپنا پیغمبر بھیجا، دوسرے: پیغمبر کے ذریعے اپنی کتاب بھیجی، اور پیغمبر کو ذمہ داری دی گئی کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کی کتاب پہنچائیں، انہیں سمجھائیں اور خود اللہ کے احکام پر عمل کر کے لوگوں کے سامنے عملی نمونہ پیش کریں؛ کیوں کہ کوئی حکم جب عمل کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے تو لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، نیز ہر قوم میں ان ہی کی زبان کا بولنے والا پیغمبر بھیجا گیا اور اسی زبان میں خدا کی کتاب اُتاری گئی؛ چناں چہ قرآن مجید کہتا ہے: ”وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِه“ (ابراہیم: ۱۴) اور ہم نے ہر قوم میں ان ہی کی زبان کا رسول بھیجا۔

یہ پیغمبر انسان ہی ہوا کرتے تھے، ان کو خدا کی طرح پیدا کرنے، مارنے، روزی دینے، روزی سے محروم کرنے، بیمار کرنے اور صحت دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا، وہ بھی اپنی ضرورتوں کے لیے خدا ہی سے دُعا کیا کرتے تھے؛ البتہ ان کو یہ بزرگی اور عظمت حاصل تھی کہ ان پر اللہ کا کلام اُترتا تھا اور اللہ نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے ان کو چن لیا تھا؛ چناں چہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید نے کہلایا ہے: ”اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَىَّ.“ (الکہف: ۱۱۰)

میں بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں؛ البتہ میرے اوپر اللہ کا کلام اُتارا جاتا ہے۔

ایک اور موقع پر فرمایا گیا کہ رسول، اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا: ”وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ.“ (الرعد: ۳۸)

البتہ چوں کہ رسول، اللہ کے پیغمبر ہوتے ہیں اور انسان کو بتاتے ہیں کہ کن باتوں سے کائنات کا مالک خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؛ اس لیے انسان پر یہ

بات لازم ہے کہ وہ پیغمبر کی اطاعت کریں: ''وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ.'' (النساء:۶۴)

ہم نے کسی بھی رسول کو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔

پیغمبروں کا یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگیا، اب آپ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آسکتا، قرآن مجید نے اس بات کو صراحت کے ساتھ کہا ہے۔ (الاحزاب: ۴۰) البتہ انسان کی رہنمائی کے لیے اللہ کی طرف سے دو خصوصی انتظام کیے گئے، ایک یہ کہ آپ پر اُترنے والی کتاب قرآن مجید مکمل طور پر محفوظ کردی گئی، قرآن مجید میں (۶۶۶۶) آیتیں ہیں جو بحیثیت مجموعی (۳۲۰۰۱۵) الفاظ پر مشتمل ہیں، ان میں آپ کے عہد سے لے کر آج تک کہیں ایک حرف کی کوئی تبدیلی نہیں آئی، ہر سال صرف ہندوستان میں قرآن مجید کے ایک کروڑ سے زیادہ نسخے چھپتے ہیں، دوسرے ممالک اس کے علاوہ ہیں، کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کے گھر میں یہ کتاب موجود نہ ہو اور یہ کتاب ہر وقت ہر شخص کے لیے پہلے بھی دستیاب تھی اور اب بھی دستیاب ہے، ان نسخوں میں کہیں ایک نقطہ اور زبر زیر کا بھی فرق نہیں پایا جاتا — دوسرے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی زندگی کے حالات کو اس طرح محفوظ کردیا گیا ہے کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور صبح سے لے کر رات تک زندگی کے ہر لمحہ اور ہر مرحلہ کے لیے آپ کی زندگی سے روشنی حاصل کرسکتا ہے، دس ہزار سے زیادہ معتبر حدیثیں ہیں، جو ہمیں آپ کی تعلیمات سے واقف کراتی ہیں؛ اس لیے اگرچہ پیغمبر کے آنے کا سلسلہ باقی نہیں رہا؛ لیکن انسان اِن ماٰخذ سے اپنی زندگی کے بارے میں خدا کی مرضی کو آسانی سے جان سکتا ہے۔

خواتین، مذہب، عبادت، معاشرت، معیشت اور جانوروں کے متعلق اسلامی تعلیمات

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ سماج میں جو جتنا زیادہ کمزور ہے، وہ اتنا ہی زیادہ قابل توجہ ہے؛ اسی لیے عورتوں کے سلسلے میں خصوصی لحاظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، عورتوں کو منحوس سمجھا جاتا تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلمنے اس کی نفی فرمائی، اسلام کی نظر میں منحوس صرف انسان کا عمل ہوتا ہے، وہ عمل جو گناہ اور ظلم پر مبنی ہو، باقی نہ کوئی مخلوق منحوس ہوتی ہے نہ کوئی انسان، نہ کوئی وقت اور نہ کوئی مکان، یہ بات چلی آرہی تھی کہ چوں کہ جنت میں حضرت حوا علیہا السلام نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی؛ اس لیے عورت گناہ کا دروازہ ہے، قرآن نے عورتوں کی پوزیشن کو صاف کرتے ہوئے کہا کہ اصل قصور شیطان کا تھا، جس نے آدم وحوا دونوں کو بہکا دیا تھا۔ (البقرۃ: ۳۶) لیکن مرد ہونے کی حیثیت سے حضرت آدم علیہ السلام پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ اس لیے اس چوک کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی: ’’وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی‘‘ (طٰہٰ: ۱۲۱) بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں قرآن نے واضح کر دیا کہ اس میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں: لَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ۔ (البقرۃ: ۲۲۸) جتنا حق مردوں کا ہے، اتنا ہی عورتوں کا ہے۔ عورت کو حق دیا گیا کہ وہ خود اپنی رضا مندی سے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ (البقرۃ: ۲۳۲) اسے یہ بھی حق دیا گیا کہ اگر رشتہ کا نباہ دشوار ہو جائے تو وہ شوہر سے علاحدگی حاصل کر سکتی ہے، بیوہ اور طلاق شدہ عورتوں کے نکاح کی ترغیب دی گئی۔ (النور: ۳۴) اس کو بہت سی ذمہ داریوں سے فارغ رکھا گیا؛ چناں چہ والدین اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی اور عورت کی معاشی ذمہ داریاں بھی باپ اور شوہر پر رکھی گئیں؛ تاکہ وہ کسب معاش پر مجبور نہ ہو، اس کو اپنی جائیداد میں تصرف کا پورا پورا حق دیا گیا، نہ اس کا باپ بلا اجازت اس کے مال میں تصرف کر سکتا ہے نہ شوہر اور نہ بیٹا۔ اسے مردوں سے بڑھ کر عزت دی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے باپ کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کا دروازہ ہے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۰۰) اور ماں کے بارے میں کہا کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت

ہے۔ (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۳۱۰۴) بیوی کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق بہتر ہوں، اور سب سے بہتر اخلاق والا وہ ہے، جس کا اپنی بیوی کے ساتھ سلوک اچھا ہو۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۹۵) نیز بیوی کو گھر کی مالکہ قرار دیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: عورت اپنے شوہر کے گھر کی انچارج ہے: "المراۃ راعیة علی بیت زوجها" (بخاری، حدیث نمبر: ۵۲۰۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے بیٹی کے بارے میں فرمایا کہ جس شخص کی ایک یا دو یا اس سے زیادہ بیٹیاں ہوں اور وہ بیٹوں کے مقابلے میں اس کو کمتر سمجھے بغیر اس کی پرورش کرے، وہ اور مَیں جنت میں اس طرح ہوں گے جیسے: یہ دو انگلیاں۔ (ترمذی، ابواب البر والصلة، حدیث نمبر: ۱۹۱۴) بیٹوں کی پرورش پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فضیلت بیان نہیں فرمائی، اسلام کی ان تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ یا تو اسلام سے پہلے لوگ بیٹیوں کو دفن کر دیتے تھے، یا پھر یہ ہوا کہ اگر کوئی لڑکی سر پرست سے محروم ہو جاتی تو کئی لوگ اپنا مقدمہ پیش کرتے کہ ہمیں اس کی پرورش اور کفالت کا حق دیا جائے — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلمکو خواتین کا اس درجہ لحاظ تھا کہ وفات سے پہلے بالکل آخر آخر میں آپ نے جو نصیحتیں فرمائیں، ان میں ایک یہ تھی کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۶۳)

عبادات اور ان کا مقصد

اسلام میں عبادت ان افعال کو کہتے ہیں، جن کو انسان خدا سے اپنے تعلق کے اظہار کے لیے انجام دیتا ہے؛ چناں چہ چار عبادتوں کو اسلام میں خصوصی حیثیت حاصل ہے: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔

نماز دن و رات میں پانچ دفعہ پڑھنا فرض ہے، سال میں ایک ماہ روزہ رکھنا فرض قرار دیا گیا ہے، سال میں ایک بار زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے، جو مختلف مالوں میں ڈھائی فی صد سے بیس فی صد تک نکالی جاتی ہے اور غریبوں پر خرچ کی جاتی ہے، حج زندگی میں ایک بار فرض ہے، جس کے لیے پوری دنیا کے مسلمان مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ان عبادتوں میں تین

باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے: (۱) انسان کے اندر اپنی بندگی اور اللہ کی غلامی کا احساس باقی رہے، وہ سمجھے کہ وہ بڑا نہیں ہے، اللہ کی بڑائی اس کے ذہن میں راسخ ہو؛ اسی لیے نماز میں بار بار ''اللہ اکبر'' کہا جاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑے ہیں، بار بار اللہ کی تعریف کی جاتی ہے، اپنی کمتری کا اعتراف کیا جاتا ہے، یہ بات انسان کو تکبر اور بڑائی کے احساس اور دوسروں کو حقیر سمجھنے سے باز رکھتی ہے۔ (۲) ان عبادتوں کا دوسرا مقصد انسان کی تربیت ہے، مثلاً: ایک مہینہ ہر مسلمان اس طرح روزہ رکھتا ہے کہ موسم کتنا بھی سخت ہو، وہ بھوکا پیاسا رہتا ہے، صبح سے شام تک کھانے کا کوئی لقمہ اور پانی کا کوئی قطرہ اس کے حلق سے نیچے نہیں جاتا، حج کرتے ہوئے ہفتہ دس دن اس طرح گزرتا ہے کہ وہ صرف دو چادریں لپیٹے ہوئے رہتا ہے، نہ خوش بو لگاتا ہے، نہ زیب و زینت کی کوئی اور چیز استعمال کرتا ہے، اس طرح انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اپنے کنٹرول میں رکھے؛ کیوں کہ دنیا میں سارے فساد کی جڑ یہی ہے کہ آدمی اَن کنٹرول ہو جاتا ہے اور اپنی ہر خواہش کو پوری کرنا چاہتا ہے، چاہے جائز ہو یا ناجائز، اور چاہے اس کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ (۳) تیسرا پہلو یہ ہے کہ عبادتوں کے ذریعہ سماج کے غریب لوگوں کی دشواریوں کا احساس دلایا جاتا ہے، جیسے جب کوئی شخص روزہ رکھتا ہے اور خود اپنے اختیار سے بھوک اور پیاس کو برداشت کرتا ہے تو اس وقت اسے اپنے غریب بھائیوں کی دشواریوں اور پریشانیوں کا احساس ہوتا ہے؛ اسی لیے رمضان المبارک کے روزوں کے ساتھ صدقۃ الفطر واجب قرار دیا گیا، جس کے ذریعہ غریبوں کی مدد کی جاتی ہے، ہر صاحب ثروت شخص پر زکوٰۃ نکالنا واجب قرار دیا گیا، جو غریبوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ یہی اسلام کی تمام عبادتوں کی روح ہے، اسلام میں دو تہوار ہیں، ایک: عید، دوسرے: بقرعید، مسلمان اس دن میدان میں نکل کر خدا کے سامنے اپنی پیشانی جھکا دیتے ہیں، نہ شور ہوتا ہے نہ ہنگامہ، نہ گانا نہ بجانا؛ بلکہ زبان پر صرف اللہ کا نام ہوتا ہے۔

معاشرت کا اسلامی تصور

اسلام نے سماجی زندگی کا ایک مکمل نظام دیا ہے، والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی،

بھائی بہن اور رشتہ دار، پڑوس اور ہم سایہ کے حقوق مقرر کیے ہیں — ان قوانین کی بنیاد دو باتوں پر ہے: عدل اور احسان۔ عدل سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا حق لے لے اور دوسروں کو اس کا حق دے دے، دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرنے یا ان کے حق سے کم دینے کی کوشش نہ کرے، قرآن مجید میں ۹۰ بار عدل کا حکم دیا گیا، عدل کے مقابلہ میں ظلم ہے، ظلم سے مراد ہے دوسروں کو ان کے حق سے محروم کر دینا، یا ان کو ان کے حق سے کم دینا ہے، قرآن مجید میں ظلم کی جتنی مذمت کی گئی ہے کم ہی کسی اور گناہ کی اس قدر مذمت کی گئی ہے، قرآن مجید نے کم سے کم ٦٨ بار ظلم کی مذمت کی ہے، یا اس سے منع کیا ہے۔ (الشوریٰ: ٤٠) احسان یہ ہے کہ انسان اپنے حق سے کم لے یا اپنا حق چھوڑ دے، اور دوسروں کو اس کے حق سے زیادہ دے دے اور ایثار سے کام لے، قرآن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں: ''وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ'' (آلِ عمران: ١٣٤) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل احسان ہی پر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلمجب قرض دینے والے کا قرض واپس کرتے تو اس کو بڑھ کر دیتے، دُشمنوں کی غلطیاں معاف کر دیتے، مکہ مکرمہ میں آپ کے دو گھر تھے، ایک: آپ کا آبائی گھر، اور دوسرا: آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ کا گھر؛ لیکن جب فتح مکہ کے موقع سے آپ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنا گھر واپس نہیں لیا؛ بلکہ جو لوگ اس پر قابض ہو گئے تھے، ان ہی کے لیے چھوڑ دیا، آپ کی پوری زندگی اسی اُصول پر قائم تھی اور یہی مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کا معیاری طریقہ ہے۔ معیشت کے بارے میں اسلامی تصور انسان کی ایک اہم ضرورت معیشت بھی ہے، اس لیے اگر جائز حدود میں مال کمانے کی کوشش کی جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے، قرآن مجید نے کسب معاش کے لیے جدوجہد کا حکم دیا ہے۔ (الجمعۃ: ١٠) قرآن نے مال کو خیر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (العادیات: ٨) جس کے معنی ''بہت اچھی چیز'' کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرض نماز کے بعد سب سے بڑا فریضہ کسب حلال ہے۔ (سنن الکبریٰ للبیهقی ، حدیث نمبر: ١١٦٩٥) لیکن معاشی تگ و دو اور کسب معاش کی جدوجہد کے لیے آپ نے کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں، ان میں سے تین

باتیں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں: (۱) زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے لیے کسی کا استحصال نہ کیا جائے، جیسے ایک ضرورت مند شخص قرض کا طلب گار ہو، اور دوسرے شخص کے پاس پیسے ہوں، اور وہ اس کی مجبوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے قرض دے کر اس سے سود وصول کرے، یہ ایک غریب شخص کی مجبوری کا فائدہ اُٹھانا ہے، یا ایک شخص کو فوری طور پر کسی خاص دوا کی ضرورت ہو، جس کی قیمت مارکیٹ میں چار سے پانچ سو روپے ہو؛ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ دوا کی اور دُکانیں بند ہیں، اور یہ ہم سے دوا خریدنے پر مجبور ہے، اس کی قیمت چار سے پانچ ہزار وصول کر لی جائے، اس کو اسلامی قانون کی اصطلاح میں ''غبن فاحش'' کہا جاتا ہے، یہ جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ غریبوں کا استحصال ہے۔ (۲) دوسرے: اسلام کا معاشی نظام دولت کی زیادہ سے زیادہ تقسیم پر مبنی ہے، وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ قوم کی پوری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آجائے۔ (الحشر: ۸) اس لیے اسلام نے کہا کہ کاروبار کی بنیاد سود کے بجائے پارٹنروں میں نفع کی تقسیم پر ہو —— اسی طرح میراث کی تقسیم کا ایک وسیع نظام مقرر کیا گیا ہے، جس کے تحت انسان کے مرنے کے بعد اس کی دولت ماں باپ، شوہر و بیوی، بیٹوں اور بیٹیوں اور بعض حالات میں دوسرے رشتہ داروں کے درمیان تقسیم ہو جاتی ہے۔ (۳) اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ انسان دولت کے کمانے میں اخلاقی اقدار سے آزاد نہ ہو جائے، جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ مارکیٹ میں کسی چیز کی ضرورت ہو اور کچھ تاجر اس کا ذخیرہ اپنے پاس روک لیں؛ تاکہ وہ چیز مہنگی ہو جائے؛ کیوں کہ یہ تقاضۂ اخلاق کے خلاف ہے کہ انسان خود زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے سماج کو دشواری اور تنگی میں مبتلا کر دے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی حرکت کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۱۵۳) اسی طرح اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شخص شراب فروخت کرے، یا لڑنے جھگڑنے والوں کے ہاتھ ہتھیار بیچے؛ کیوں کہ یہ عام لوگوں کو نقصان پہنچانے والی چیزیں ہیں؛ چناں چہ آج ازدواجی اور خاندانی زندگی میں بہت سے تکلیف دہ واقعات شراب نوشی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور آج دنیا میں جو جنگیں ہو رہی

ہیں، وہ اصل میں ان ملکوں کی وجہ ہیں، جن کی معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ ہتھیار کا بنانا اور بیچنا ہے۔

جانوروں کے ساتھ رحم دلی

اسلام نے جس طرح انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اسی طرح جانوروں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کا حکم دیا ہے، اسلام نے جانور سے صحیح طریقے پر فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی ہے، جانور کے منھ پر مارنے سے منع کیا گیا ہے۔(**مسلم، کتاب اللباس**، حدیث نمبر:۲۱۱۶) لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درندگی سے منع فرمادیا۔(**ترمذی، کتاب الجہاد**، حدیث نمبر: ۲۵۶۴) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جانور کو اسٹیج کے طور پر استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا۔(مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۵۶۶۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ایک عورت محض اس لیے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ خود کھائے اور چر کر اپنی ضرورت پوری کرے۔(بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۶۵) اور ایک شخص اس بنا پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دُور کی ہوگی اور اسے پانی پلایا ہوگا۔(بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۶۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتیوں میں سے چرند و پرند جو کھالیں، اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔(بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۲۰) اسلام نے گوشت خوری کی اجازت ضرور دی ہے؛ لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے، کسی صاحب نے ایک گوریا کی طرح کا پرندہ پکڑ رکھا تھا اور اس کی ماں بے قرار تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا۔(ابوداؤد، **کتاب الجہاد**، حدیث نمبر: ۲۶۷۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلا ضرورت اس کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے۔(**نسائی، کتاب الصید**، حدیث نمبر: ۴۳۶۹) اسی لیے جو چیزیں انسان کے کام نہیں آتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ھد ھد وغیرہ کے مارنے کی آپ نے

صراحتاً ممانعت فرمائی۔ (ابو داؤد، کتاب الادب، حدیث نمبر: ۵۲۶۷) کسی ذی روح کے جلانے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت سے روکا ہے، ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولھا سلگایا جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چولھا بُجھانے کا حکم دیا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۳۶۷۳)

دین میں کوئی جبر نہیں

اسلام کا عقیدہ ہے کہ خدا کو ایک ماننے اور اس کے احکام کو قبول کرنے میں دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی نجات ہے، اور مسلمانوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لیے جو پسند کرے، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرے؛ اس لیے وہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ دوسرے انسانی بھائیوں کے سامنے کامیابی اور نجات کے اس راستہ کو پیش کرے اور انہیں اسلام کی طرف آنے کی دعوت دے؛ لیکن کسی مسلمان کے لیے خواہ وہ حکمراں ہو یا ملک کا عام شہری، اور خواہ مسلم اکثریت ملک ہو یا مسلم اقلیت ملک، اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ زبردستی دوسرے کا مذہب تبدیل کرائے اور اسے مسلمان بنائے، قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (البقرۃ: ۲۵۶) دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر اس بات کے لیے بے قرار رہتے تھے کہ مکہ کے لوگ اسلام قبول کرلیں، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں؟ (یونس: ۹۹) اسی لیے اسلام کی جو کچھ اشاعت ہوئی ہے، وہ محبت اور اخلاق کے ذریعہ اور اسلامی تعلیمات کی کشش کی وجہ سے ہوئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال مکہ میں دعوت دی، اس وقت مسلمان اس حال میں تھے کہ وہ کھلے عام نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے، وہ اعلانیہ طور پر قرآن کی تلاوت کرنے سے بھی قاصر تھے، انہیں مجبور ہو کر دو دفعہ مکہ چھوڑ کر حبش جانا پڑا اور پھر اپنے گھر بار سے محروم ہو کر مدینہ آنا پڑا، اس تیرہ سالہ زندگی میں مکہ کے کئی معزز لوگوں نے اسلام قبول کیا، جیسے: حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حمزہؓ وغیرہ، کیا یہاں زور زبردستی سے لوگوں کو مسلمان بنایا

جا سکتا تھا؟ مدینہ کے لوگوں نے خود مکہ پہنچ کر اور اہل مکہ سے چھپ چھپا کر اسلام قبول کیا، پھر ان کی دعوت پر مسلمان مدینہ آئے، اس وقت ان کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ کمانے کے لیے کوئی ذریعہ معاش، کیا یہ دوسروں کو زور زبردستی سے مسلمان بنا سکتے تھے، مدینہ میں یہودیوں کے تین قبائل تھے، یہ تینوں اخیر تک یہودیت پر قائم رہے، اگر آپ چاہتے تو مسلمانوں کی اکثریت کا سہارا لے کر ان پر زور زبردستی کر سکتے تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا نہیں کیا اور ان میں سے چند ہی لوگ تھے، جو مسلمان ہوئے۔ پھر دنیا کے نقشہ پر نظر ڈال کر دیکھیں تو اسپین میں آٹھ سو سال مسلمانوں کی حکومت رہی؛ لیکن پھر بھی وہ عیسائی اکثریت ملک رہا، انڈونیشیا مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے، اسی طرح ملیشیا ایک بڑا مسلم اکثریت ملک ہے، افریقہ کے مشرقی ساحل پر بیشتر مسلم ممالک ہیں، یہ سب وہ علاقے ہیں، جہاں کبھی مسلمانوں کی فوج داخل نہیں ہوئی؛ بلکہ مسلمان سیاحوں اور تاجروں کی دعوت پر اور ان کی زندگی کو دیکھ کر وہاں کے لوگوں نے اپنے طور پر اسلام قبول کیا، اسی طرح ہندوستان میں مختلف مسلمان خاندانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے اور بعض چھوٹی مسلم ریاستوں کو شامل کر لیا جائے تو ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے ساتھ ضم ہونے تک تو تقریباً بارہ سو سال ان کی حکومت کی مدت ہوتی ہے، اگر مسلمان زور زبردستی سے لوگوں کو اسلام قبول کراتے تو یقیناً وہ آج اقلیت میں نہ ہوتے، اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کو خود ان کے دین نے اس بات سے منع کیا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں جبر و تشدد سے کام لیا جائے؛ چناں چہ وہ ہمیشہ اپنے مذہب کی اس تعلیم پر قائم رہے، اور محبت کے ساتھ لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔

ترکی میں ناکام بغاوت
پس منظر اور مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ!

اس کوتاہ علم کے حقیر مطالعہ کے مطابق دنیا میں دو ایسی بڑی قومیں ہیں، جن کی عزت وافتخار کی تاریخ اسلام سے وابستہ رہی ہے، دامن اسلام میں آنے سے پہلے نہ ان کا اپنا کوئی قابل ذکر تمدن تھا، نہ علوم وفنون کے میدان میں وہ قابل توجہ سمجھے جاتے تھے اور نہ ان کی کوئی ایسی سلطنت تھی، جو دنیا کے نقشے پر نمایاں صورت میں نظر آئے، ایک: عرب، دوسرے: ترک۔

عرب بدو اور دیہاتی سمجھے جاتے تھے اور ان کی بدویت ضرب المثل تھی، ریگستان میں وسائل کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ان کے بہت سے قبیلے خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے، صحرائے عرب کے دوش بدوش روم، ایران اور حبش کی طاقت ور حکومتیں قائم تھیں اور تمدن کے اعتبار سے یہ اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے تھے؛ لیکن ان ہی کے درمیان موجود اس ریگستانی علاقہ میں نہ کوئی حکومت تھی نہ لا اینڈ آرڈر کا نظم، نہ پڑھنے لکھنے کا تصور اور نہ تہذیب وتمدن کی روشنی، ان حکومتوں کے لیے اس طویل وعریض صحرائی علاقہ پر قابض ہو جانا کچھ مشکل نہیں تھا؛ لیکن اس کے باوجود وہ اس خطہ کو اس لائق ہی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو اپنی قلم رو میں شامل کریں۔

دوسری قوم ترکوں کی ہے، ترکوں کے مختلف قبائل بکھرے ہوئے تھے، ان میں بھی بہت سے لوگ خانہ بدوش کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے یہاں بھی قبائلی نظام چلتا تھا، یہ بھی تہذیب وتمدن سے عاری اور علوم وفنون سے تہی دست تھے، لوٹ مار اور غارت گری ان کا بنیادی ذریعہ معاش تھا اور ایسے ہی گروہ کی حیثیت سے ان کی پہچان تھی۔

عربوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ فضل وکرم کا معاملہ کیا کہ اسی صحراء سے نبوت محمدی کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کی روشنی نے ذرّوں کو آفتاب وماہ تاب کا ہمدوش بنا دیا، اونٹوں اور بکریوں کے چرنے والے انسانیت کے ہادی بن گئے اور روم وایران کی عظیم الشان سلطنتوں

نے بھی بالآخران کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا، انہوں نے علم کے دیپ جلائے، تہذیب وتمدن کے چراغ روشن کیے اوراپنے علوم وفنون کے کمالات کا ایسا نقش ثبت کیا کہ دنیا کی متعدد قوموں نے ان کے نقش پا کو اپنے لیے نقش راہ بنالیا؛ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ہی سے ان کی تہذیب اور علمی تاریخ کا آغاز ہوا اور پھر وہ ایک ایسی قوم کی حیثیت سے اُبھرے جن کی سلطنت نے ایشیاء، یورپ اور افریقہ میں فتح کے جھنڈے نصب کیے اور یورپ کے عہد تاریک میں انہوں نے علوم وفنون کے قافلہ کو آگے بڑھایا۔

تقریباً یہی حال ترکوں کا ہوا، انہوں نے ایک لٹیرے اور جنگ جو قبائل کے مجموعہ کی حیثیت سے ضرور ایک چھوٹے سے علاقہ میں اپنا اقتدار قائم کیا؛ لیکن ان کا دامن علم وفکر کے سرمایہ سے خالی تھا اوران کی زندگی تہذیب وتمدن کے جلووں سے محروم تھی، ان کو عیسائیت کی طرف لانے کے لیے عیسائی بے قرار تھے؛ لیکن اسلام کی کشش نے انھیں اپنی جانب کھینچ لایا اور زروزمین کے فاتح قلب ونظر کے مفتوح بن گئے، دامن اسلام میں آنے کے بعد ان کا ایک نیا عہد شروع ہوا، وہ جنگ جوئی اور خوں خواری کے بجائے اخلاق وکردار سے آراستہ ہوئے، جہالت کے دلدل سے نکل کر علم وفن کے اقلیم میں داخل ہوئے، روایتی شجاعت و بہادری نے یاوری کی اور وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گئے، تہذیبی وتمدنی ترقی کے جلوے ان کے ہم رکاب ہوئے اور انہوں نے دنیا کے ایک بڑے خطے میں ایک ایسی عظیم سلطنت قائم کی، جو تاریخ عالم کی چند بڑی حکومتوں میں سے ایک قرار دی جاسکتی ہے اور جنہوں نے کم وبیش چھ صدیاں ایشیاء، یورپ اورافریقہ پر اپنی خلافت کا علم لہرایا اور ہندوستان جیسے دُور دراز ملک میں بھی ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ روم وایران کی اپنی ایک تہذیب وتاریخ تھی، ہندوستان اور چین کا نام بھی علم وحکمت کی دنیا میں روشن تھا؛ لیکن اسلام سے وابستہ ہونے سے پہلے عربوں اور ترکوں کی نہ کوئی قابل ذکر تہذیب تھی نہ وہ تاریخ میں قابل توجہ سمجھے جاتے تھے، نہ ان کے یہاں علم وفکر کی جلوہ سامانیاں تھیں، ان کی ترقی، شہرت، رُعب ودبدبہ، حکومت و

اقتدار، تہذیبی وثقافتی اقتدار، غرض کہ سب کچھ اسلام کا مرہون منت ہے، سیّدنا حضرت عمرؓ فتح بیت المقدس کے موقع سے بیت المقدس پہنچے اوراس حال میں پہنچے کہ اونٹنی کی سواری ہے، کپڑوں پر پیوند ہے اور باری کے مطابق غلام اونٹنی پر ہے اور آپ خوداس کی نکیل تھامے ہوئے ہیں، جب لشکر اسلام کے سپاہیوں نے درخواست کی کہ وہ اچھے کپڑے پہن لیں اور بہتر سواری پر سوار ہوں؛ تاکہ دشمنوں پر ان کا رُعب طاری ہو سکے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اللہ نے ہمیں کپڑوں کے ذریعہ عزت نہیں دی ہے، اسلام کے ذریعہ عزت دی ہے، ہماری عزت وعظمت کی اساس اسلام سے وابستگی ہے، یہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اسی حقیقت کا اظہار تھا کہ دنیا کے نقشے پر عربوں کو جو کچھ عزت ووقار کا مقام حاصل ہوا، وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور اسلام کی نسبت کی وجہ سے ہوا، بالکل یہی بات ترکوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، اگر خلافت اموی، خلافت عباسی اور دوسری طرف ترکوں کا عہد حکومت اور خلافت عثمانی کو شمار کیا جائے تو عالم اسلام پر عربوں اور ترکوں کا دورِ خلافت شاید اموی اور عباسی عہد کے مجموعہ سے بھی بڑھ جائے۔

اس لیے مغربی طاقتوں کو یوں تو تمام ہی مسلمانوں سے؛ لیکن خاص کر ان دونوں قوموں سے بڑی کدورت رہی ہے اور انھوں نے ان کو کمزور کرنے اور اسلام سے برگشتہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے، عباسی دور میں انھوں نے سیاسی چپقلش کو بڑھانے کی کوشش کی اوران نام نہاد ایران نژاد نومسلموں کو کھڑا کیا، جنھوں نے فلسفہ یونان کا سہارا لے کر اسلامی معتقدات پر حملہ کرنے کوشش کی اور ایرانیوں اور مجوسیوں کے افکار کو مسلمانوں میں زیر بحث لائے، تشکیک کی فضا پیدا کی، وضع حدیث کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی طرف خلافِ واقعہ باتیں منسوب کر کے اسلام کی وقعت واعتبار کو کم کرنے کی کوشش کی، علم کلام، تفسیر، حدیث، تصوف اور خاص کر سیرت کی کتابوں میں ان ریشہ دوانیوں کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

لیکن جب تک نظام خلافت قائم رہا، ایسے عناصر کو کھل کر اسلام کے خلاف کچھ کہنے

کی جرأت نہیں ہوئی اور مسلمان حکمرانوں نے اپنے باہمی اختلافات کے باوجود ایسے عناصر کی سرکوبی میں کوتاہی نہیں کی؛ لیکن جب خلافت عثمانیہ کا آخری دور آیا، عالم عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت کے جذبات پروان چڑھائے گئے اور دوسری طرف ترکوں کو عربوں سے متنفر کیا گیا اور طرفین کی کوتاہیوں اور غلط فہمیوں نے عداوت کی اس چنگاری کو آتش فشاں بنادیا اور حکومت کی گرفت کمزور ہوتی گئی، صلیبی اور صہیونی طاقتوں کے اشارہ پر ان لوگوں نے جو مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے اور جن کے نام مسلمانوں کی طرح کے تھے، کھلے عام جنگ کا بگل بجادیا، وہ الحاد و دہریت کی دعوت دینے لگے اور انہوں نے کھل کر اسلام کو اپنا نشانہ بنانا شروع کیا۔

عالم عرب میں مصر کو اس کا مرکز بنایا گیا، مصر و شام اور عراق کی بعث پارٹیاں جو زبردستی حکومت پر مسلط ہوگئیں، وہ دراصل کمیونسٹ تحریک کا عرب ایڈیشن ہیں اور ان ملکوں کا انتخاب غالبًا اس لیے کیا گیا کہ عالم عرب کے بہترین ادباء، مفکرین اور قیادت کی بھرپور صلاحیت کے حامل افراد اسی خطہ میں پائے جاتے تھے، خلیجی ممالک اگرچہ پیٹرول کی دولت سے مالا مال ہیں؛ لیکن علمی اور فکری اعتبار سے وہ ان ملکوں کے ہم پلہ نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں، اور ان علاقوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک آبادی بھی ہمیشہ سے رہی ہے، یہ حکومتیں الحاد و دہریت کی غذا اپنے ساتھ لے کر آئیں، انہوں نے تعلیمی اداروں میں اپنی فکر کو پروان چڑھایا اور ہر سطح پر اس بیج کی کاشت کی، جو انہیں صلیبی اور صہیونی دنیا کی طرف سے ملی تھی۔

اسی طرح ترکی میں خلافت عثمانیہ کے خلاف جن لوگوں کو اُبھارا گیا اور جنہیں اقتدار کی کلید حوالہ کی گئی، وہ بھی مغرب کے پروردہ اور ان کی فکر کے گرویدہ لوگ تھے، جنہیں اسلام سے زیادہ کسی اور چیز سے نفرت نہیں تھی، ہاں استعماری طاقتوں نے پہلے تو عالم اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کیے، سمندر کو قطروں میں اور پہاڑوں کو ذرّوں میں بانٹ دیا؛ تاکہ یہ ہمیشہ مغرب کے غلام بن کر رہیں، ان میں دینی حمیت کو ختم کردیا جائے اور اگر کبھی یہ حمیت بیدار بھی

ہو تو انہیں اپنے آقا سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہو، اسی سازش کے تحت خلافت عثمانیہ ختم کی گئی اور عالم عرب کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا دیئے گئے اور پھر اس بات کی کوشش کی گئی کہ خود ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے درمیان بھی نفرت کی آگ سلگتی رہے اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے دُور ہی رہیں۔ عالم عرب میں اس کاروانِ الحاد کی سپہ سالاری جمال عبدالناصر کے حوالہ کی گئی اور ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشاہ کے!

ان لوگوں کو جتنی نفرت اسلام اور اسلامی شعائر سے تھی، شاید ہی کسی اور چیز سے رہی ہو، پھر چوں کہ اسلام دشمن عناصر کو اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ اسلام کا نشہ ایسا نہیں ہے، جو ظلم و جور اور پروپیگنڈہ سے اُتر جائے، عام مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا جو یقین اور محمد رسول اللہ سے جو بے پایاں محبت ہے، اس میں ایسی طاقت ہے کہ مسلمان کوتاہ عمل تو ہوسکتا ہے؛ لیکن بے عمل اور بد عمل مسلمان کا دل بھی ان جذبات سے خالی نہیں ہوتا؛ اس لیے ان سب کو اپنی راہ پر لانا دشوار ہے، اس کے لیے انہوں نے تین ایسے گروہوں کا انتخاب کیا، جن کو لالچ دے کر خریدا جاسکتا ہے، جن میں چھپے ہوئے اسلام دشمنوں کو شامل کیا جاسکتا ہے اور جن کے سہارے عوام کی مرضی کے بغیر ان پر تسلط حاصل کیا جاسکتا ہے، ایک: فوج، جو ہتھیار کی طاقت سے ان کے ایجنڈے کو نافذ کرے، دوسرے: عدلیہ، جو مظلوم پر انصاف کا دروازہ بند کردے اور ظالموں کی ظالمانہ حرکتوں کو سند جواز دیتی رہے، تیسرے: میڈیا، جو کچھ اس طرح جھوٹ کو پھیلائے کہ وہ سچ بن جائے اور واقعات کو مسخ کرے کہ مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے ایمانی جذبات کروٹ نہ لینے پائیں اور دینی حمیت و غیرت کی چنگاری سلگنے نہ پائے، ان ہی تینوں ستونوں سے کام لے کر عالم عرب اور ترکی میں ڈکٹیٹروں اور آمروں نے اپنے اقتدار کے قلعہ کو مضبوط کیا اور جس کسی نے ان کے خلاف زبان کھولی، اس کی آواز بند کردی گئی۔

اس سارے کھیل میں دو طبقوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، ایک سابق استعماری طاقتوں نے، یا دوسرے لفظوں میں صہیونیوں اور صلیبی دنیا نے، جنہوں نے پوری فیاضی کے

ساتھ اپنے لوگوں کو مادی وسائل فراہم کیے، ہتھیار دیئے اور پروپیگنڈہ کے ذریعہ ان کو اخلاقی طاقت فراہم کی، اور اقوام عالم کو گمراہ کیا — اس کے لیے دوسرا اہم کردار ان کالی بھیڑوں نے انجام دیا، جن کو مسلمانوں کی صفوں میں گھسایا گیا اور اسلام اور اسلام پسند گروہ کے خلاف استعمال کیا گیا، یہ وہ لوگ ہیں جو ادیبوں، شاعروں، اساتذہ، سرکاری ملازمین، سماجی کارکنوں کی شکل میں مسلمانوں کی صفوں میں موجود رہتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ مذہبی طبقے میں کام کرنے کے لیے بظاہر مذہب کا لبادہ بھی اوڑھ لیتے ہیں، جن کے ذریعہ مذہبی گروہوں میں انتشار پیدا کرنے کا کام انجام دیا جاتا ہے، یہ وہی گروہ ہے جس کو قرآن مجید میں ''منافقین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ اسلام کا کام شروع کیا تو دو گروہوں نے کھل کر آپ کی مخالفت کی، انھوں نے اسلام سے اپنی عداوت کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، یہ تھے مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے یہود، پھر اسی صف میں بعد کو عیسائی بھی شامل ہو گئے، مشرکین کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ یہ دین ان کے آبائی عقائد وتصورات کے خلاف تھا اور جو روایات پہلے سے جاری رہتی ہیں، ان کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، اس مخالفت میں کسی قدر بنواُمیہ اور بنو ہاشم کی قدیم چشمک بھی شامل ہوگئی تھی، اسی لیے اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے زیادہ تر لوگ بنواُمیہ کے تھے؛ مگر اس کا اصل سبب روایت پرستی ہی تھی، یہود و نصاریٰ کی مخالفت فکری اختلاف سے زیادہ نسلی تفاخر پر مبنی تھی، ان کا خیال تھا کہ نبوت بنی اسرائیل میں رہنی چاہیے، بنو اسماعیل میں کیوں چلی گئی؟

تیسرا مخالف گروہ منافقین کا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں ان سے سابقہ پیش آیا؛ چوں کہ مدینہ کی غالب آبادی مسلمان ہو چکی تھی؛ اس لیے یہ اپنے کفر وانکار کو ظاہر کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے؛ لیکن یہ اندر سے مسلمان نہیں تھے اور انھوں نے اسلام دشمنی اپنے سینے میں چھپا رکھی تھی، یہ زیادہ تر یہودیوں کے آلۂ کار بن کر کام کرتے تھے اور یہودی سازشوں کے جو نقشے بنائے تھے، یہ اس میں رنگ بھرتے تھے، رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بے پایاں رحمت و شفقت، کرامت نفس اور حکمت و مصلحت کے تحت کبھی ان کے حقیقی چہرے سے پردہ نہیں اُٹھایا اور سوائے حضرت حذیفہؓ کے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خصوصی راز دار (صاحب السِّر) بنایا تھا، کسی اور سے یہ بات ظاہر نہیں فرمائی کہ مدینہ میں کون کون سے چہرے منافقین کے ہیں؛ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو من جانب اللہ اس کی اطلاع دی گئی تھی، عہد نبوی میں مختلف غزوات ان ہی منافقین کی ناپاک کوششوں کی وجہ سے ہوئے، غزوہ اُحد کے موقع سے اہل مکہ کو اُکسانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا، غزوۂ خندق میں تو خاص طور پر ان کا اہم رول رہا، غزوۂ بنوقریظہ کی نوبت ان ہی کی وجہ سے آئی، بنوقینقاع، بنونضیر اور اہل خیبر سے جو ٹکراؤ ہوا، اس کے پیچھے بھی کہیں نہ کہیں منافقین کا ہاتھ موجود تھا، اس گروہ نے مدینہ میں اسلام کی برکت سے شیر و شکر ہو جانے والے قبائل اوس و خزرج کے درمیان اختلاف کے بیج بونے اور مہاجرین و انصار کے درمیان تصادم پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کیں؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن تدبیر اور صحابہؓ کے بے پایاں اخلاص کی وجہ سے یہ ساری کوششیں ناکام و نامراد ہوگئیں، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت اندازی کے پیچھے بھی ان ہی کا ہاتھ تھا، غرض کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں تھا، جس میں منافقین نے اپنی ناپاک کوششوں میں کوئی کسر چھوڑی ہو؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و احسان سے ان کی یہ کوششیں ناکام ہوتی رہیں۔

قرآن مجید میں منافقین کے مزاج، ان کے طریقۂ کار اور ان کی ناشائستہ حرکتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور تقریباً پچاس آیتیں منافقین اور ان کے طرزِ عمل کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ان کا مزاج یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں: ’’یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا‘‘ (البقرۃ: ۸) حالاں کہ وہ فساد و انتشار پیدا کرنے پر کمر بستہ ہوتے ہیں؛ لیکن دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ہی اصلاح کے نمائندہ ہیں: ’’قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ‘‘ (البقرۃ: ۱۱) اہل ایمان کو وہ بے وقوف، دقیانوس، قدامت پرست، انتہا پسند اور لکیر کا فقیر تصور کرتے ہیں: ’’قَالُوْا اَنُؤمِنُ کَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ‘‘ (البقرۃ:

۱۳) مسلمانوں کے سامنے تو وہ ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں؛ لیکن آپس میں ان کی مخالفت کی باتیں کرتے ہیں۔(البقرۃ:٦) مسلمانوں کی کامیابی سے زیادہ ان کو کوئی چیز رنج و غم میں مبتلا کرنے والی نہیں ہوتی اور مسلمانوں کی تکلیف سے زیادہ ان کو کسی بات سے خوشی نہیں ہوتی: ''اِن تَمسَسکم حَسَنَة ....الخ'' (آل عمران:۱۲۰) بمقابلہ مسلمانوں کے ان کی دوستی غیر مسلموں کے ساتھ ہوتی ہے۔(النساء:۱۳۹) گناہ، ظلم وزیادتی اور حرام خوری میں وہ آگے آگے رہتے ہیں۔(المائدۃ:۶۲) وہ ہر وقت فتنہ کے متلاشی ہوتے ہیں۔(التوبۃ: ۴۸) مسلمانوں پر طعن و تشنیع ان کا شیوہ ہوتا ہے۔(التوبۃ:۵۷) اسلام کے مزاج کے برعکس وہ لوگوں کو برائی کی طرف بلاتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں۔(التوبۃ:٦٨) وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کو نقصان پہنچانے والے ادارے ایسے خوش نما ناموں سے قائم کرتے ہیں کہ گویا اسلام کے بہت بڑے خادم ہیں؛ لیکن ان کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا اوران کے درمیان اختلاف پیدا کرنا ہوتا ہے: ''وَالَّذِینَ اتَّخَذوا مَسجِدًا ضِرَارًا وَّکفرًا وَّتفرِیقاً بَینَ المومِنِینَ ....الخ'' (التوبۃ:۱۰۷) وہ دشمنانِ اسلام کو اُکساتے ہیں کہ ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ رہیں گے۔(الحشر:۱۱) وہ اسلام کے اقرار اور بظاہر مسلمان ہونے کو اپنے لیے ڈھال بناتے ہیں۔(منافقون:۲) وہ اپنے چہرے بشرے، رہن سہن کے اعتبار سے اس معیار پر، نیز تعلیم اور زبان و بیان کے اعتبار سے اس درجہ کے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھ کر متأثر و مرعوب ہو جائیں: ''وَاِذَا رَاَیتَهم تعجبک اَجسَامهم وَ اِن یَّقولوا تَسمَع لِقَولِهِم'' (منافقون:۴) ان کا خاص ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ ملکوں اور زمینوں پر قابض ہو جائیں؛ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں اور مخلص مسلمانوں کو نکال باہر کریں؛ کیوں کہ وہ انہیں کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں: ''لِیخرِجَنَّ الاَعَزّ مِنهَا الاَذَل.'' (منافقون:۸)

اگر غور کریں تو ان اوصاف کے حامل لوگ ہمیشہ مسلم سماج میں موجود رہے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی شکل میں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے، ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکے بعد یہ گروہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، قرآن مجید جیسی قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی

کتاب میں اس تفصیل کے ساتھ منافقین کا ذکر بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گروہ قیامت تک مختلف صورتوں میں اسلام مخالف حرکتیں کرتا رہے گا، ایک ایرانی النسل مجوسی کے ہاتھوں سیدنا حضرت عمرؓ کی شہادت، حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف عبداللہ بن سبا اور اس کے متبعین کی شورش جس کے نتیجے میں بالآخران کی شہادت ہوگئی، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی صلح کو ناکام کرنا، پھر خود حضرت علیؓ کی شہادت اور بنوامیہ کے عہد میں اہل بیت کے ساتھ روح فرسا مظالم جیسے واقعات کی تہہ میں کہیں نہ کہیں اس گروہ کی فتنہ اندازی اور تفرقہ انگیزی کارفرما نظر آتی ہے، اور پھر استعماری دور میں مختلف مسلم حکومتوں میں سازشی گروہ کی کارستانیاں، عالم اسلام میں فوجی بغاوتیں، جمہوری اداروں کی تباہی، مغرب کی غلامی کرنے والے آمروں اور بادشاہوں کا تسلط، اور بہت سی دفعہ عوامی مزاج کو دیکھتے ہوئے مسلم سماج میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ایسے لوگوں کو کھڑا کرنا ''جو مذہبی لباس میں عوام کو گمراہ اور خود اسلام کے نام پر انہیں اسلام سے برگشتہ کریں'' یہ سب اسی منافقانہ تحریک کا تسلسل ہے، اُس زمانہ میں عبداللہ بن ابی کو منافقین کا سردار کہا جاتا تھا؛ لیکن ہر دور میں ایسے سردار رہا کیے ہیں، جن کا دماغ اسلام مخالف فتنوں کے پیچھے کارفرما ہوتا تھا، عبداللہ بن سبا اپنے زمانے کے منافقین کا سردار تھا، ماضی قریب میں کمیونسٹ ذہن کے حامل فرماں روا اپنے عہد کے سردارانِ منافقین تھے، اب بھی مصر و شام کے حکمراں اور ان کے ہم مزاج اور شریک کار مفسدین ''جو عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں، وہ اس دور کے داعیانِ نفاق ہیں'' جیسے ہندوستان کی تاریخ میں اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ابوالفضل وفیضی جیسے علمائے سوء کو کھڑا کیا گیا، اس طرح کے سرکاری لوگ ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں، مصر میں بعض مذہبی جماعتوں اور مذہبی شخصیتوں نے جس طرح سیسی کی تائید کی، یہاں تک کہ اس کی ان دستوری ترمیمات کو بھی تقویت پہنچائی، جن کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مذہب کی حیثیت سے اسلام کو جو اہمیت دی گئی ہے، اسے ختم کر دیا جائے، ظاہر ہے ایسے حکمرانوں اور ان کی تائید کرنے والے نام نہاد خدا ناترس علماء کے منافق ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے؟

ترکی میں جس انقلاب کی کوشش کی گئی، وہ اسی منافقانہ تحریک کا تسلسل ہے، امریکہ اور مغربی طاقتوں نے جس طرح افغانستان، عراق، یمن، شام، لیبیا اور لبنان کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا اور مظلوموں کی مدد کے نام پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انسانی تاریخ میں کم ہی اس کی مثال مل سکے گی، وہ چاہتا ہے کہ وہی کھیل ترکی میں بھی کھیلا جائے اور اس کے لیے وہ مختلف سازشیں کر رہا ہے، جیسے ترکی کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے کردوں کی مدد، شام کی جنگ میں ترکی کو کھینچنے کی کوشش، یورپین یونین میں ترکی کو قبول نہیں کرنا، ترکی کے سیاسی استحکام کو نقصان پہنچانے والی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور انہیں اپنے یہاں پناہ دینا، جن میں سرفہرست فتح اللہ گولن ہیں، اسی سلسلہ کی ایک آخری کڑی کے طور پر وہاں بغاوت کرائی گئی، جس کو خود فوج کے بڑے حصہ نے اور ترکی کی عوام نے ناکام ونامراد کر دیا۔

دراصل مشرق وسطیٰ میں امریکہ وروس نے اپنی پالیسی کے ذریعہ عرب ملکوں کو دوستی کی آڑ کی میں ہمیشہ اپنا محتاج بنا کر رکھا اور ان کے بہترین قدرتی وسائل کو لوٹ لوٹ کر کھایا، جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اپنے بہترین قدرتی وسائل، محل وقوع کی اہمیت اور افرادی وسائل کی کثرت کے باوجود مسلم ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے اسرائیل سے اپنی آنکھیں نہیں ملا سکتے، اس پورے خطے میں اگر کسی ملک کا اس ذلت آمیز صورتِ حال سے استثناء کیا جا سکتا ہے تو وہ ’’ترکی‘‘ ہے: اسی لیے وہ اہل مغرب کی نظر میں بہت کھٹک رہا ہے اور اس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جارہی ہیں، اردگان سے ان کے عوام کی محبت کا سبب ان کے غیر معمولی کارنامے ہیں، انہوں نے ایک طرف ترکوں کی خواہش کے مطابق ان کی اسلامی شناخت کو زندہ کیا، یہاں عربی رسم الخط کی ممانعت تھی، قرآن کریم کی اشاعت ممنوع تھی، خواتین کے حجاب استعمال کرنے پر پابندی تھی، داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں تھی، ایک زمانہ میں اذان پر بھی پابندی تھی اور عربی زبان میں قرآن مجید کی تلاوت پر بھی، غرض کہ کمال اتاترک نے اسلامی روایات کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور وہاں فوج وعدلیہ کی ایسی تربیت کی گئی کہ وہ جبراً عوام کو ان کی اسلامی شناخت سے محروم

رکھیں، اردگان نے اسلامی اقدار کو بازیاب کیا اور ترکی کے باحمیت اور غیرت مند مسلمانوں کو اسلام کی طرف واپس آنے کا موقع دیا۔

اردگان کا دوسرا بڑا کارنامہ ملک کی ترقی ہے، اسی بات نے سیکولر لوگوں کے درمیان بھی ان کو مقبول ومحبوب بنا دیا ہے، جب اردگان نے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لی تو ترکی ورلڈ بینک کا بہت بڑا مقروض تھا؛ لیکن اب خود اس نے ورلڈ بینک کو پانچ ارب ڈالر قرض دے رکھا ہے اور اس کے خزانہ میں سوا ارب ڈالر کا محفوظ ذخیرہ ہے، اقتصادی اعتبار سے اس وقت وہ ١١١ر نمبر تھا اور اب وہ ١٦ر نمبر پر ہے اور دنیا کے سب سے زیادہ صاحب ثروت ممالک گروپ ٢٠ میں شامل ہے، ١٠ سال پہلے ایک عام ترکی کی سالانہ آمدنی ساڑھے تین ہزار ڈالر تھی اور اب یہ ١١ ہزار ڈالر تک پہنچ گئی ہے، سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں تین سو فی صد اضافہ ہوا ہے، ١٠ سال پہلے اس کی برآمدات ٢٣ ارب ڈالر تھیں اور اب ١٥٣ ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہے، اس کی صنعتی ترقی بھی حیران کن ہے، یورپ میں فروخت ہونے والی الیکٹرانک اشیاء میں ہر تیسرا سامان ترکی کا بنایا ہوا ہوتا ہے، ان کے عہد میں تقریباً پچاس ایئرپورٹ اور ١٩ ہزار کلومیٹر سڑکیں بنائی گئی ہیں، تعلیمی ترقی کے لیے ١٢٥ یونی ورسیٹیاں اور ١٨٩ اسکول قائم کیے ہیں اور ایک کلاس میں ٢١ سے زائد طلبہ کے رکھنے کی ممانعت ہے، سائنسی تحقیق کے لیے ٣٥ ہزار لیباریٹریاں بنائی گئی ہیں اور اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک حکومت نے تمام شہریوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام ہے، ترکی کا عزم ہے کہ ٢٠٢٣ء تک وہ ترکی کو دنیا کی پہلی اقتصادی اور سیاسی قوت بنائے گا اور ٣ لاکھ محقق سائنس داں تیار کیے جائیں گے۔ (یہ اعداد وشمار انور غازی کے مضمون ''دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ'' سے ماخوذ ہے)

واقعہ یہ ہے کہ رجب طیب اردگان کے زیر قیادت ترکی نے ترقی کا جو سفر طے کیا ہے، وہ ایک مثال ہے، یہاں تک کہ ٢٠٠٨ء کے معاشی بحران نے بھی اس کے ترقی کے سفر کو نہیں روکا، مغرب اپنے پرانے طریقۂ کار کے مطابق ترک عوام کے دینی جذبات کا استحصال کرنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے لیے فتح اللہ گولن کا استعمال کر رہا ہے، یہ شخص بظاہر ایک

صوفی اور مذہبی مسلمان ہے؛ لیکن اس کی فکر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو انسانی مدد پہنچانے اور اسرائیل جیسے ظالم و غاصب ملک سے ترک تعلق کی بناء پر اردگان کا مخالف ہوا اور وہ اسلام و عالم اسلام کے برخلاف صہیونیوں اور صلیبیوں سے ترکی کو قریب کرنے کا داعی ہے، ترک فوج کی ایک ٹکڑی کی بغاوت کو ناکام کرنے کا سہرا دراصل ترکی عوام کے سر جاتا ہے اور مغربی طاقتوں کو اس بغاوت کی ناکامی پر بڑا افسوس ہے؛ لیکن مصر میں جمہوری حکومت کی تباہی، شام میں وقت کے سب سے بڑے سفاک ڈکٹیٹر کی خوں آشامی اور عراق میں مسلمانوں کے ایک گروہ پر ہونے والے مظالم پر انہیں کوئی ملال نہیں، یہ ترکی ہی ہے جہاں عدنان مندریس کی منتخب حکومت کو ۱۹۶۰ء میں ایک بددین جنرل کے ذریعہ ختم کردیا گیا، مندریس نے جام شہادت نوش کیا اور ایک نئے ڈکٹیٹر کنعان کے اقتدار کو پورے مغرب نے تسلیم کرلیا، حقیقت یہ ہے کہ اردگان صرف اپنی ترک عوام ہی کے دل میں نہیں ہیں؛ بلکہ وہ پوری ملت اسلامیہ کے دلوں کا سرور اور آنکھوں کا نور بن چکے ہیں، دعا ہے کہ جیسے گذشتہ کئی مواقع پر انھوں نے ایمانی فراست اور حکمت سے کام لے کر فتنوں کا مقابلہ کیا ہے، اب بھی وہ اسی طریقہ کو اختیار کریں اور اعتدال، تدریج، حزب مخالف، عوام اور فوج کو اعتماد میں لیتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھائیں اور وہ وقت آئے کہ ان کے ذریعہ خلافت عثمانیہ کی عظمت رفتہ واپس آئے اور ملتِ اسلامیہ کا سویا ہوا مقدر بیدار ہوجائے۔

اس واقعہ سے مسلمانوں کو جو سبق ملتا ہے، اس میں چند باتیں بہت اہم ہیں:

☆ ....اول یہ کہ اگر تعلق مع اللہ ہو اور مخلوق کے ساتھ بھی محبت اور خدمت کا معاملہ رکھا جائے تو کامیابی انسان کے قدم چومتی ہے، یہی اسلامی تاریخ رہی ہے، مثلاً خلافت راشدہ اسلام کا عہد زریں ہے، اس دور میں جس چیز نے مسلمانوں کو ایشیاء سے یورپ اور افریقہ تک پہنچادیا، وہ تعلق مع اللہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف، ہمدردی، شہری ترقی کی طرف توجہ، تعلیم کی ترویج اور غریبوں وکمزوروں کی مدد تھی، حضرت عمرؓ کا دور اس کی بہترین مثال ہے؛ لیکن آج کل مسلم حکمرانوں سے لے کر عام مسلمانوں تک ہر طبقہ میں یہ

کوتاہی پیدا ہوگئی ہے کہ اولاً تو انہوں نے ترقی کے لیے مادی وسائل کے استعمال کو کافی سمجھ لیا ہے اوران ہی پر محنت کی جاتی ہے، انہیں اس کا یقین نہیں رہا کہ فتح ونصرت کی اصل کلید، اللہ کے ساتھ تعلق ہے، دوسری طرف جولوگ دین دار ہیں اور مذہبی قیادت کے مقام پر فائز ہیں وہ عوام کی خدمت پر کوئی توجہ نہیں دیتے، وہ اعمالِ نبوت پر تو کسی حد تک عمل پیرا ہیں، مگر اخلاقِ نبوت سے بیگانہ ہیں۔

☆.... دوسرے: مسلمانوں کو ہمیشہ اس بات پر نظر رکھنی چاہیے کہ ایسا نہیں ہے کہ منافقین کا طبقہ دنیا سے ناپید ہوگیا ہے؛ بلکہ یہ ہر زمانہ میں نام اور طریقۂ کار کی تبدیلی کے ساتھ موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھاتے ہیں اور مسلمانوں میں انتشار وبکھراؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بہت سی دفعہ دین دار مسلمانوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور دین کے نام پر بے دینی کی دعوت دیتے ہیں، یہ مسلم ممالک میں بھی ہوتے ہیں اور مسلم اقلیت ممالک میں بھی، مسلمانوں کو ہمیشہ ایسے دوست نما دشمن سے چوکنا رہنا چاہیے، یہ دینی کاموں کے ذمہ دار بھی ہوسکتے ہیں، امام وخطیب کی صورت میں بھی سامنے آسکتے ہیں، پیرِ طریقت کا حلیہ بھی اختیار کرسکتے ہیں، آج کل حدیث کا انکار، مسلمانوں کی تکفیر، صحابہؓ کی بے احترامی، قانونِ شریعت کی مخالفت، دین کے مسلمات کا تمسخر، مسیحیت ومہدویت کے دعوے، جغرافیائی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر مسلمانوں کے درمیان نفرت کو ہوا دینا، علماء ومشائخ کا استہزاء، مدارس اور خانقاہوں کی بے وقعتی وغیرہ کے فتنے جو اٹھ رہے ہیں، یہ سب نفاق ہی کی مختلف شکلیں ہیں؛ اس لیے یادرکھنا چاہیے کہ اس گروہ کے دو بنیادی مشن سے ان کو پہچانا جاسکتا ہے، ایک: مسلمانوں میں شکوک وشبہات کے بیج بونا، دوسرے: ان میں اختلاف وانتشار کو ہوا دینا، نہ جانے مسلمانوں کے درمیان آج بھی کتنے عبداللہ بن سبا، ابوالفضل وفیضی اور فتح اللہ گولن چھپے ہوئے ہیں؟ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ چوکنا رہیں، فراست ایمانی سے کام لیں، اپنے شعور کو بیدار رکھیں اور کسی دام ہم رنگ زمین بچھانے والے شکاری کے جال میں نہ پھنس جائیں۔

☆ ....تیسرے: مسلمانوں کو اگر غلبہ اور کامیابی حاصل ہو اور وہ فتح سے ہمکنار ہوں تو ان کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کے منافقین اور فتح مکہ کے موقع پر مکہ کے مشرکین کے ساتھ تھا، یعنی عفو و درگذر اور خفیہ شر پسند عناصر کے بارے میں چوکسی، اس وقت ترکی میں باغیوں کے خلاف جس وسیع پیمانہ پر دار و گیر ہو رہی ہے، اگر اس میں چوکسی اور بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے عفو و درگذر کا راستہ اختیار کیا جاتا، جو سازش کے دماغ ہیں، ان کے خلاف تو سخت کارروائی کی جاتی اور جو ان کے متبعین ہیں، ان کی فکری تربیت پر توجہ دی جاتی، ان کے لیے مشروط معافی کا اعلان کیا جاتا اور نازک و حساس عہدوں سے ہٹا کر ان سے کام لیا جاتا، تو یہ زیادہ بہتر بھی ہوتا اور اسوۂ نبوی سے ہم آہنگ طریقہ بھی، اور لوگ محسوس کرتے کہ ایک دین دار، اسلام پسند، غلبہ حاصل کرنے والے قائد اور ایک بد دین ڈکٹیٹر اور آمر کے درمیان اخلاق و کردار کا کیا فرق ہوتا ہے؟ اگر ایسا نہ ہو تو آہستہ آہستہ ان مخالفین کا ایک گروپ قائم ہو جاتا ہے، وہ بیرونی دشمنوں سے اپنے روابط استوار کر لیتے ہیں اور زخم کھائے ہوئے سانپ کی طرح زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

داعش: وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

داعش ''دولتِ اسلامیہ عراق وشام'' کا مخفف ہے، یعنی عراق وشام میں قائم اسلامی حکومت۔

کسی تحریک کی ابتداء کب ہوئی؟ اس کی متعین تاریخ بتانا دشوار ہوتا ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی تحریک بیک جنبش قلم وجود میں نہیں آتی اور یک لخت اس مقام پر نہیں پہنچ جاتی، جو لوگوں کو نظر آئے، داعش کی صورتِ حال بھی یہی ہے؛ لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اس کی بنیادیں القاعدہ میں پیوست ہیں، جس کی بنیاد اسامہ بن لادن نے ۱۹۹۰ء میں رکھی تھی، اسامہ بن لادن نے امریکہ اور مغربی طاقتوں کی مدد سے افغانستان میں جہاد چھیڑا اور اس کو ایسی کامیابی سے ہمکنار کیا کہ روس جیسی سپر طاقت کو وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ رہا، جب روس نے رخت سفر باندھا تو اعتدال پسند مجاہدین کو کنارے کرنے اور تحریک افغانستان کے شدت پسند عناصر کو آگے بڑھانے کے لیے عرب شرکاء کا گروپ ''القاعدہ'' کے نام سے اور غیر عرب حضرات کا گروپ ''طالبان'' کے نام سے ابھارا گیا اور طالبان بالکل اسی طرح اچانک منظر عام پر آئے اور قندھار سے کابل تک پہنچ گئے، جیسے ابھی داعش نے کیا ہے، پھر جب امریکی فوج صدام حسین سے لڑنے کے لیے جزیرۃ العرب میں اتری تو اسامہ کو اس سے سخت اختلاف تھا کہ مرکز اسلام میں غیر مسلم فوجیں کسی بہانہ سے پہنچ جائیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر اس وقت مسلم ملکوں کا اس طرح کا اتحاد قائم کیا جاتا، جو اب سعودی عرب نے قائم کیا ہے تو شاید مشرق وسطیٰ کی وہ بدترین صورتِ حال نہ ہوتی جو اس وقت ہے؛ کیوں کہ اگر بھیڑیے کو بکریوں کا ریوڑ ہاتھ آجائے تو یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک دو بکریوں کو کھا کر بقیہ کو بخش دے گا اور خدا حافظ کہہ کر واپس چلا جائے گا۔

چناں چہ اب القاعدہ کی جدوجہد کا رخ امریکہ کی طرف ہو گیا اور افغانستان سے لے کر عرب ملکوں تک جہاں جہاں امریکہ نے اپنا پنجہ گاڑا تھا، مقابلہ آرائی شروع ہوگئی، انہوں نے اپنے سب سے زیادہ معتمد رفیق ابومصعب الزرقاوی کو عرب ملکوں کی ذمہ داری

سونپی اور ۲۰۰۱ء میں پہلی خلیجی جنگ کے بعد زرقاوی نے ایک الگ نام سے یہاں تحریک شروع کی، ۲۰۰۶ء میں زرقاوی کی وفات کے بعد ابوعمر بغدادی اس تحریک کے قائد منتخب ہوئے، عراق میں القاعدہ کی شاخ نے ۲۰۰۶ء میں ''الدولۃ الاسلامیہ فی العراق'' کا نام اختیار کرلیا، پھر بعد کو جب شام کی طرف پیش قدمی ہوئی تو ۲۰۱۳ء میں ''الدولۃ الاسلامیہ فی العراق والشام'' نام کا اعلان کیا گیا، ۲۰۱۰ء میں ابوعمر بغدادی کی وفات کے بعد ابوبکر بغدادی کو تنظیم نے اپنا قائد منتخب کیا اور جب ۲۰۱۴ء میں موصل میں اس نے عراقی فوجوں کو شکست دی اور فوج اپنا ہتھیار تک چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تو اس وقت اس تنظیم کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوئی — اس لیے حقیقت یہ ہے کہ اس تنظیم کی پیدائش القاعدہ ہی سے ہوئی ہے؛ البتہ اس میں تشدد و غلو بڑھتا چلا گیا، القاعدہ کی جنگ مغربی قبضہ گیروں کے خلاف تھی اور داعش نے خود مسلمانوں کے خلاف ایسی خوں ریزی شروع کردی کہ اسلامی تاریخ میں اس کی کم ہی مثال ملے گی۔

داعش کے سلسلہ میں تین باتیں اہم اور قابل توجہ ہیں، اوّل یہ کہ اس خوں ریز تحریک کو کس نے پیدا کیا؟ دوسرے: ان کے افکار و اعمال کیا ہیں؟ تیسرے: قرآن و حدیث کی نظر میں ان کے فکر و عمل کی کیا حیثیت ہے؟

پہلے سوال کا جواب واضح ہے کہ اس تحریک کو یہود و نصاریٰ، مغربی طاقتوں اور اسلام دشمنوں نے وجود بخشا ہے؛ اس لیے کہ یہ بات دوپہر کی دھوپ کی طرح واضح ہے کہ اسامہ بن لادن کو تقویت پہنچانے والی اور القاعدہ کو وجود میں لانے والی قوت امریکہ ہے اور اس نے اپنی اس مدد کو خفیہ بھی نہیں رکھا؛ بلکہ کھل کر تعاون کیا؛ کیوں کہ وہ اس وقت اپنی مدمقابل طاقت روس کو ذلیل کرنا چاہتا تھا؛ چناں چہ پینٹاگون کی خفیہ رپورٹ کی اشاعت سے تصدیق ہوگئی ہے کہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، اسرائیل اور دوسری مغربی حکومتوں نے نہ صرف القاعدہ طرز کی حکمت عملی کو منظور کیا؛ بلکہ اس کی نگرانی بھی کی (comZerohedge) اور اسی تنظیم کے بطن سے مرحلہ بمرحلہ داعش کی پیدائش ہوئی ہے، ابھی کچھ دنوں پہلے امریکی کمانڈر کا بیان اخبار میں آچکا ہے کہ ہم لوگوں نے داعش کی تربیت کی ہے، ایڈورڈ اسنوڈین (2013ء) نے N.S.A

رپورٹ کا افشاء کرتے ہوئے بتایا ہے کہ امریکہ، اسرائیل اور برطانیہ ہی نے آئی، ایس، آئی، ایس کی تخلیق کی ہے (ComPolitifact) اسنوڈین نے مزید کہا ہے کہ ابوبکر بغدادی کو اسرائیل نے تربیت دی ہے (InBlogspotHoaxSnowpen) یہ بات بھی اخبارات میں آچکی ہے کہ داعش کے بعض زخمی اور بیمار افراد کا علاج اسرائیل میں ہوا ہے، نیز جس جدید ٹیکنالوجی کا داعش استعمال کررہے ہیں، یا ان کے پاس جو جدید ترین اسلحہ ہے، یہ سوائے اسرائیل اور امریکی قوتوں کے کوئی اور فراہم نہیں کرسکتا، مسلمان اس وقت ان وسائل میں اتنے پسماندہ ہیں کہ ان سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسی چیزوں کو وجود میں لائیں گے، اسرائیل اور مغربی قوتوں کو سازشوں کے رچنے میں مہارت حاصل رہی ہے، جن کا وہ استعمال کرتے رہے ہیں اور کچھ وقت گذرنے کے بعد وہ خود ہی اپنی ان سازشوں سے پردہ بھی اٹھاتے ہیں، ایسی عیار قوموں کے بارے میں یہ کوئی مبالغہ آمیز خیال نہیں ہے۔

داعش کی پیدائش کن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ اس کا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اگر ہم اپنے حقیقی دشمنوں کو نہیں پہچانیں گے تو آپس میں ایک دوسرے کو موردِ اِلزام ٹھہرائیں گے، امت میں اختلاف بڑھے گا، ہماری صفوں میں بکھراؤ پیدا ہوگا اور ہمارے دشمنوں کا مقصد پورا ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ مسئلہ کی اصل جڑ کو سمجھیں اور غلط فہمیوں سے بچیں، مثلاً ایک رجحان پایا جاتا ہے کہ داعش سلفیوں کی ایک تنظیم ہے، اس طرح کی سوچ سے اندیشہ ہے کہ جیسے عالم اسلام میں سنی شیعہ لڑائی کی آگ بھڑک چکی ہے اور وہ چنگاری سے شعلہ اور شعلہ سے آتش فشاں بن چکی ہے، کہیں سلفی اور غیر سلفی کی جنگ شروع نہ ہوجائے اور عالم اسلام میں جنگ وجدال کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے، جب مسلکی بنیاد پر عالم اسلام میں کوئی لڑائی چھڑتی ہے تو جن مسلم اقلیت ملکوں میں دونوں مسالک سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں، ان کے یہاں بھی اس آگ کی تپش پہنچ کر رہتی ہے اور کبھی کبھی دلوں کی کدورتوں اور زبان وقلم کے اختلافات سے بڑھ کر بات تشدد تک پہنچ جاتی ہے، خدا نہ کرے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو۔

البتہ بعض دفعہ کسی تحریک کا قائد ہوتا تو ہے اعداء اسلام کا آلہ کار؛ لیکن اپنی ذہانت سے اس کو ایسا اسلامی رنگ دے دیتا اور کتاب وسنت کا جامہ پہنا دیتا ہے کہ بہت سے بھولے بھالے سادہ لوح مسلمان بھی نادانستہ طور پر اس کا شکار ہو جاتے ہیں، اور وہ پورے اخلاص کے ساتھ ایک دینی کام سمجھ کر قیادت کے احکام بجالاتے ہیں، جن کے ذریعہ دشمن کا ایجنڈا پورا ہوتا ہے، خود عہد نبوی میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، منافقین مدینہ کے مسلم سماج میں وہی حرکت کیا کرتے تھے، جو اِس وقت یہودی اور ان کی معاون نصرانی طاقتیں عالم اسلام میں کر رہی ہیں، اب اسی پر غور کیجیے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بعض منافقین نے نہایت اوچھی تہمت لگادی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کوئی مسلمان اس پر کان ہی نہیں دھرتا اور کسی تحقیق کی ضرورت محسوس کیے بغیر اسے رَدّ کر دیا جاتا، خود قرآن مجید نے بھی اس مطلوبہ کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (النور: ۱۲) لیکن منافقین نے کچھ اس طرح پروپیگنڈہ کیا کہ بعض نیک نفس مخلص مسلمان بھی اپنی سادہ لوحی میں اس کا شکار ہو گئے؛ اس لیے اگر مخلص مسلمانوں کا کوئی گروہ اس میں شامل ہو اور اس میں کسی خاص مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور ان کی اس شرکت میں ان کے غلو آمیز افکار بھی معاون و مددگار ہو گئے ہوں تو یہ باعث تعجب نہیں؛ لیکن اس فتنہ کو پیدا کرنے، تقویت پہنچانے اور فروغ دینے کا اصل کام مغربی طاقتوں اور بالخصوص اسرائیل کی طرف سے ہو رہا ہے اور عراق وشام میں داعش کے ابھرنے کا سب سے زیادہ فائدہ بھی اسرائیل اور فرعونِ وقت بشار الاسد ہی کو پہنچ رہا ہے، بظاہر اس کا آخری انجام یہی ہوگا کہ شام وعراق کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا؛ تاکہ اسرائیل کے عرب پڑوسیوں میں کوئی ایسا ملک نہ رہے جو اسرائیل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں داعش کے طرزِ عمل کا فکری سرچشمہ کیا ہے؟
— اگر اس کو ایک جملہ میں کہا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس عہد کے ''خوارج'' ہیں، خروج کے معنی نکلنے اور بغاوت کرنے کے ہیں، عراق کے ایک گروہ نے، جو حروراء اور نہروان میں مقیم تھا، حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی تھی؛ اس لیے وہ خوارج کہلائے۔ (معجم الفرق

الاسلامیہ: ۱۲۲، القاموس الفقہی: ۱۱۵) خوارج کی پیدائش تو بظاہر ۳۷ھ میں ایک سیاسی واقعہ سے ہوئی، جب خلیفہ راشد حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان طے پایا کہ دو حضرات کو حَکم بنادیا جائے اور ان ہی کے فیصلوں پر دونوں گروہ عمل کریں، اس وقت حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک گروہ نے جو مسلمانوں کے اتحاد کو پسند نہیں کرتا تھا، شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ ان ہی کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی؛ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ایسے اسلام دشمن عناصر اس سے پہلے نہیں تھے، یا اس گروہ کو کچلنے کے بعد باقی نہیں رہے؛ بلکہ خود عہد نبوی میں بھی بعض ایسے منافقین کا سراغ ملتا ہے، حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ ایک غزوہ کے موقع سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت تقسیم کیا تو ایک شخص نے جس کی پیشانی پر سجدہ کا نشان بھی تھا، کہنے لگا: آپ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑا رنج ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد مجھ سے بڑھ کر تمہارے ساتھ کوئی انصاف نہیں کرے گا، صحابہؓ نے عرض کیا: کیا اس شخص کو قتل نہ کردیا جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، پھر اپنے رفقاء کی طرف متوجہ ہوکر کہا: یہ اور اس کے ساتھی دین سے اس طرح نکلے ہوئے ہیں، جیسے تیر اپنے کمان سے نکل جاتا ہے، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے: ''**لا یتعلقون من الاسلام بشیٔ**۔'' (مسند احمد: ۳۶/۵، مستدرک حاکم: ۱۴۶/۲)

آہستہ آہستہ خوارج نے ایک مستقل فرقے کی صورت اختیار کرلی اور خود اس فرقہ میں کئی فرقے پیدا ہوگئے، جن میں سب سے زیادہ شدت نافع بن ازرق کے متبعین میں رہی، جو ''ازارقہ'' کہلاتے ہیں، جب بنو امیہ نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور اہل مکہ پر ظالمانہ چڑھائی کی، تو یہ شخص حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے ساتھ تھا۔ (تاریخ طبری: ۳۹۷/۳) پھر یہ اپنے متبعین کے ساتھ اَہواز چلا گیا اور وہاں اس نے اپنے شدت پسندانہ افکار کو ایک مسلک و مذہب کی حیثیت دے دی، خوارج میں سب سے معتدل فرقہ ''اباضیہ'' کا ہے، جو عبد اللہ بن اباض تمیمی کی طرف منسوب ہے، یہ اپنے مخالفین کی تکفیر کے سلسلہ میں کہتے تھے کہ وہ ایمان کے

اعتبار سے کافر نہیں ہیں؛ بلکہ کفر سے مراد ''کفر نعمت'' ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے منکر ہیں، اوران کا خون حلال نہیں ہے۔ (دیکھیے: **المقالات للامام اشعری: ١٨٤/١، الفرق بین الفرق لعبد القاهر بغدادی: ١٠٣**) آج کل مسقط میں اسی گروہ کی حکومت ہے اور یہ اس طرح کے خوارج نہیں ہیں، جن کا تذکرہ اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں ہے، ہماری کتابوں میں جس گروہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد ''ازارقہ'' ہیں۔

ازارقہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ ان کے ساتھ نہیں ہیں، وہ سب کافر و مشرک ہیں، جو مسلمان حکمراں ان کے خیال میں ظالم ہوں، ان کے خلاف بغاوت کرنا واجب ہے، ان تمام لوگوں کو جو اگرچہ کلمہ پڑھتے ہیں؛ لیکن ان کے خیال میں مشرک و کافر ہیں، قتل کرنا؛ بلکہ ان کے بچوں کا قتل اور ان کو قید کرنا بھی جائز ہے، یہاں تک کہ مخالفین کا بلا امتیاز قتل عام بھی درست ہے اور ان کی عورتیں بحیثیت باندی حلال ہیں، ان سے لوٹا ہوا مال اور ان کی رکھوائی ہوئی امانتیں بھی حلال ہیں، نہ ان سے نکاح جائز ہے نہ ان کا ذبیحہ، اگر کوئی شخص عذر کی وجہ سے ظالم حکمرانوں کے خلاف نہ نکل سکے، تب بھی وہ مجرم ہے، اور جس سرزمین پر ایسے لوگوں کی حکومت ہو، وہاں سے ہجرت کر جانا واجب ہے، اسلامی فرقوں پر لکھی گئی کتابوں میں امام اشعری، ابن حزم ظاہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقادر اسفرائنی وغیرہ نے ان کے افکار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو داعش کی فکر اور ان کا طرزِ عمل بالکل وہی ہے جو ازارقہ نے اختیار کیا تھا، اور جن کے گمراہ اور مفسد ہونے پر پوری امت کا اجماع و اتفاق ہے، یہ بات نہایت اہم ہے کہ خوارج ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے ایک موقع پر ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بددین گروہ ہر دور میں پیدا ہوتا رہے گا، مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو قتل کردیں اور تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مخلوق کے بدترین لوگ ہیں: **''لا یزالون یخرجون حتی یخرج آخره''** (مسند احمد: ١٢٤/٤، مستدرک حاکم: ١٤٦/٢، مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: ١٩٧٦٣) بعض روایات سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ خوارج جبل لبنان یا کسی اور پہاڑی علاقہ کے قریب قتل کیے جائیں گے: ”یقتلون بجبل لبنان او بجبل“ (فتح الباری: ۳۳۴/۴) شاید اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اشارہ ہو کہ قیامت قائم نہیں ہوگی، جب تک دو گروہوں کے درمیان ایک بڑی جنگ نہ ہو جائے؛ حالاں کہ وہ دونوں ایک ہی بات کا دعویٰ کر رہے ہوں گے، جن میں ایک گروہ دین سے پوری طرح نکلا ہوا ہوگا۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۹، بخاری، حدیث نمبر: ۵۳۹۶)

اس لیے موجودہ عہد میں خوارج کا ظہور اور ان کا مشرقِ وسطیٰ میں ابھرنا، پھر مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار ہونا اور ایک ایسے علاقہ میں زور پکڑنا، جہاں پہاڑی علاقے موجود ہیں اور جو لبنان سے قریب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی میں شامل نظر آتا ہے، حضرت سہل بن حنیفؓ کی روایت میں ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں کوئی بات فرمائی ہے؟ تو آپ نے ایک ہاتھ سے عراق کی طرف اور دوسرے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا اور پھر عراق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں سے ایسے لوگ نکلیں گے، جو اپنے سر منڈائیں گے، ان کی زبانوں پر قرآن ہوگا؛ لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں جائے گا، وہ اسلام سے ایسے نکلے ہوئے ہوں گے جیسے تیر اپنے کمان سے نکل جاتا ہے۔ (**بخاری، کتاب استطابة المرتدين والمعاندين و قتالهم**، حدیث نمبر: ۵۳۵۶) — اس حدیث میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ عراق اور شام خوارج کے فتنہ کا خاص مرکز بنے گا اور یہ فتنہ عراق کی طرف سے ابھرے گا۔

تیسرا قابل توجہ سوال یہ ہے کہ داعش کے لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ ان تعلیمات کو اقوام عالم کے سامنے اچھی طرح واضح کرنے کی ضرورت ہے، داعش کی پہلی بنیادی فکر یہ ہے کہ کوئی شخص ان کے خیال کے مطابق دین کے کسی عمل کو چھوڑ دے، یا کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو وہ مسلمان باقی نہیں رہتا؛ بلکہ وہ کافر ہو جاتا

ہے، یہ قطعاً غلط ہے، ایمان کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرنے پر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر جب کوئی شخص ایمان لاتا تو آپ اسی کا عہد لیتے تھے، اگر کسی کے بارے میں تحقیق کرنی ہوتی کہ یہ مسلمان ہے یا نہیں؟ تو آپ ان ہی دو امور کے سلسلے میں سوال فرمایا کرتے تھے، توحید و رسالت کا اقرار کرنے والے گناہ کے مرتکب کو بھی قرآن نے مسلمان ہی شمار کیا ہے۔ (سورۃ الحجرات: ۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و معمولات میں اس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے تو نفرت کرتے تھے، گنہ گاروں سے نہیں؛ لیکن ایک موقع پر آپ نے صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ اہل قبلہ میں سے چاہے کوئی شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو، پھر بھی اس کو کافر نہ ہو: ''لا تکفروا احداً من (اهل) قبلتي بذنب وان عملوا الكبائر۔'' (دار قطني، باب صفة الصلاة، حدیث نمبر: ۲)

اور ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے باوجود مسلمان ہی باقی رہتا ہے تو اس کو کافر قرار دے کر قتل کرنا اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کو حلال سمجھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جو مسلمان اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی گواہی دے، تین ہی صورتوں میں اس کو قتل کی سزا دی جا سکتی ہے، ایک یہ کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہوا ہو، دوسرے: اس نے کسی شخص کا قتل ناحق کیا ہو، تیسرے: وہ مرتد ہو گیا ہو۔ (بخاری، حدیث نمبر: ٦٨٧٨) اور یہ بات بھی پیش نظر ہونی چاہیے کہ ان تینوں صورتوں میں بھی قتل کی سزا اسلامی حکومت جاری کر سکتی ہے، کسی مسلمان شہری کو اپنے طور پر مسلم یا غیر مسلم ملک میں اس سزا کے جاری کرنے کی اجازت نہیں ہے، فقہاء نے اس کو واضح طور پر اور صراحت کے ساتھ لکھا ہے اور یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔

گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینے اور ان کا جان و مال کو حلال سمجھنے سے جو دوسری بات پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے

جذبات پروان چڑھتے ہیں، مسلم حکمرانوں کی جو بدتر صورتِ حال ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں، ان کا فسق و فجور، ظلم و جور، عیش پرستی اور عشرت کوشی، احکام شریعت کی تنفیذ سے انکار، اسلامی فکر و تہذیب اور شریعت ربانی کے مقابلہ میں مغرب کے الحاد و اباحیت پر مبنی فکر و عمل کو قبول کر لینا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کم و بیش کا فرق تو پایا جاتا ہے؛ لیکن شاید ہی کوئی ایسا مسلم فرماں روا مل جائے، جو اسلام کے مطلوبہ معیار کو پورا کرتا ہو، اگر سورج کا چراغ لے کر تلاش کیا جائے، تب بھی ایسا دُرّ آب دار ہاتھ نہیں آئے گا؛ لیکن کیا اس کی وجہ سے ان کے خلاف مسلح بغاوت کرنا جائز ہے اور کیا اس کے سبب مسلمانوں کی خوں ریزی کرنا نیز نہ ختم ہونے والی جنگ کا بگل بجا دینا درست ہے؟

یہ ایک اہم سوال ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا واضح جواب دیا ہے، حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ایسے حکمراں آئیں گے، جو میرے طریقہ کو اختیار نہیں کریں گے، میری سنت پر نہیں چلیں گے اور ان حکمرانوں میں عنقریب کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوں گے، جن کے دل ایسے ہوں گے کہ گویا انسانوں کے قالب میں شیطانوں کے دل رکھ دیئے گئے ہیں، حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر میں ان کو پاؤں تو کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امیر کی بات سنا کرو اور اس کی اطاعت کیا کرو، اگر وہ تمہاری پیٹھ پر مارے اور تمہارا مال لے لے، تب بھی سمع و طاعت کا دامن نہ چھوڑو۔ (مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث نمبر: ۱۸۴۷) ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے کہا: تم عنقریب میرے بعد خود غرضی دیکھو گے تو صبر سے کام لینا، یہاں تک کہ مجھ سے حوض (کوثر) پر آملو، حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ اگر تمہارے اوپر کوئی ناک کٹا حبشی امیر بنا دیا جائے، تب بھی سمع و طاعت کا دامن نہ چھوڑو، نقصان پہنچائے تو صبر کرو، کسی بات کا حکم دے تو اس کی تعمیل کرو، تم کو تمہارے حق سے محروم کر دے تو برداشت کر لو، ظلم کرے تو صبر سے کام لو، اور تمہارے دین میں خلل پیدا کرنا چاہے تو کہو کہ میرے دین کی بجائے میری جان حاضر ہے (دمی دون دینی) لیکن جماعت سے الگ نہ ہو۔ (کنز

العمال، حدیث نمبر: ۱۴۳۵۳)

ان احکام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت برقرار رہے، چاہے اس کے لیے چند افراد کے فسق و فجور اور ان کے ظلم و جور کو برداشت کرنا پڑے، اسی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مسلمان اچھا ہو یا برا، اس کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو، کوئی مسلمان نیک و صالح ہو یا فاسق و فاجر، اس پر نماز جنازہ پڑھا کرو، امیر نیک و صالح ہو یا فاسق و فاجر، اس کے ساتھ جہاد میں شریک رہو۔ (سنن دار قطنی عن ابی ہریرۃؓ، کتاب العیدین، حدیث نمبر: ۱۰) یہ مضمون متعدد روایتوں میں آیا ہے اور صحابہؓ نے اسے عملی طور پر برتا ہے، غور کیجیے کہ حجاج بن یوسف کے ظلم و جور کو دیکھتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جرأت مندی کے ساتھ اسے ٹوکا بھی ہے اور آپ کی وفات بھی بظاہر اسی بد بخت کی سازش سے ہوئی ہے؛ لیکن اس کے باوجود آپ اس کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ (التلخیص الحبیر :۲/ ۱۱۰) بنو امیہ اور بنو عباس میں کیسے کیسے ظالم بادشاہ پیدا ہوئے، اہل بیتؓ اور صحابہؓ ان کے ہاتھوں قتل کیے گئے، انھوں نے حرمین شریفین کی انتہائی درجہ بے حرمتی کی، اس کے باوجود صحابہؓ نے ان کے پیچھے نماز بھی ادا کی اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف جہاد میں بھی ان کے ساتھ شریک رہے۔

داعش کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے محروم ہیں اور کفر کی حالت میں ہیں، ان کا قتل جائز ہے، ان کا مال حلال ہے، یہاں تک کہ ان کی عورتوں کو باندی بنا لینا بھی درست ہے، یہ نہایت ہی غلط تصور ہے اور اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی ایک سازش ہے، قرآن مجید میں ان ہی لوگوں سے جہاد کی اجازت ہے، جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوں، اور اس میں بھی یہ ضروری ہے کہ حدود سے تجاوز نہیں کیا جائے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (سورۃ البقرہ: ۱۹۰)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں دو باتیں قابل توجہ ہیں:

ایک یہ کہ ان ہی لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے، جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں، جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ جنگ نہ ہوں اور انہیں گھر سے بے گھر نہ کریں، قرآن نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ مسلمانوں کو انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ (الممتحنة:۸) دوسرے: جن سے ان کی زیادتیوں کی وجہ سے جنگ کرنا جائز ہے، ان سے جنگ کرنے میں بھی اصول وقواعد کی رعایت ضروری ہے، یہ جائز نہیں ہے کہ انسان حدود سے تجاوز کر جائے، ان حدود میں سے یہ بھی ہے کہ جب دشمن گرفت میں آجائے تو بعض خاص صورتوں کے علاوہ اس کو قتل کرنا جائز نہیں؛ بلکہ دو ہی راستے ہیں یا تو انہیں یک طرفہ طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ (محمد:۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تر یہی دو معاملے فرمائے ہیں کہ حملہ آور دشمنوں کے جو لوگ قید ہوئے یا تو انہیں یوں ہی رہا فرما دیا، یا ان سے فدیہ وصول کیا: اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ فدیہ کی ادائیگی مال ہی کے ذریعہ ہو، غزوۂ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے لکھے قیدیوں کا فدیہ دس بچوں کی تعلیم مقرر فرمائی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کا باہم تبادلہ فرمالیا، اور کئی واقعات ایسے بھی پیش آئے ہیں کہ دشمنوں پر قابو پانے کے بعد آپ نے ان کو گرفتار ہی نہیں کیا، یوں ہی معاف فرما دیا، جس کی سب سے بڑی مثال فتح مکہ ہے۔

اسلام کے قانونِ جنگ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو لڑنے والے نہ ہوں، ان کو نشانہ نہ بنایا جائے؛ اسی لیے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جنگ سے دور رہنے والوں کو قتل کرنے کی ممانعت ہے، اس بات کو بھی منع فرمایا گیا کہ تکلیف پہنچا پہنچا کر قتل کیا جائے، انسان تو کجا کسی بھی جان دار کو آگ میں جلانے کی ممانعت فرمائی گئی ہے، مسجدوں اور مسلمانوں کے مقدس مقامات ہی کو نہیں، غیر مسلموں کے مذہبی مقامات کو بھی منہدم کرنے اور ان کی بے حرمتی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے؛ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے مفسد بادشاہوں کی مذمت کی گئی ہے، جو عبادت گاہوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور اس میں پہلے یہودیوں کے کلیساؤں، پھر

عیسائیوں کے چرچوں اور اخیر میں مسلمانوں کی مسجدوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ (سورۃ الحج: ۴۰) داعش کی جو حرکتیں اس وقت ذرائع ابلاغ میں آرہی ہیں، وہ ان تمام اصولوں کو پامال کرنے پر مبنی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان خبروں میں ملاوٹ بھی ہو؛ لیکن جتنی کچھ بھی حقیقت ہو، وہ اس کی شناعت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے، انہوں نے نہ صرف چرچوں کو منہدم کیا؛ بلکہ مسجدوں کو بھی اور صحابہ کرامؓ کی قبروں کو بھی کھود ڈالا، اور پھر وہ انسانوں کو قتل و ذبح کرنے، زندہ جلانے اور عورتوں کی ڈاک لگانے کی تصویریں بھی جاری کرتے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا مقصد صرف ملک گیری اور اپنے مخالفین کو زیر کرنا ہی نہیں ہے؛ بلکہ اسلام کو رسوا کرنا، دین حق کی شبیہ کو خراب کرنا اور مسلمانوں کو ذلیل کرنا بھی ہے، اور یہ سب کچھ اسلام دشمن قوتوں کے اشاروں پر کیا جارہا ہے؛ تاکہ مسلمان تنہا ہو جائیں اور پوری دنیا مسلم اور غیر مسلم کے دو خانوں میں تقسیم ہو جائے، اس وقت عملی طور پر مشرق سے مغرب تک یہی صورتِ حال ہے اور اِس وقت مسلمان جیسی تنہائی سے دوچار ہیں اور پوری دنیا میں انہیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جارہا ہے، شاید ہی کبھی یہ کیفیت رہی ہو، اسلام اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بھی وہ نہیں کر سکے، جو یہ دوست نما دشمنوں نے کیا ہے۔

اب ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے داعش کا کیا حکم ہے اور اس فتنہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ —— جہاں تک شرعی نقطۂ نظر کی بات ہے تو اس کو تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا ہے کہ اخیر زمانہ میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو نوجوان ہوں گے۔ (**حدثاء الاسنان**) عقل وشعور کے اعتبار سے کم تر درجہ کے ہوں گے، بات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل کریں گے؛ لیکن وہ اسلام سے اس طرح نکلے ہوئے ہوں گے، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے، ان کا ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں ہوگا تو تمہارا جہاں کہیں ان سے مقابلہ ہو، ان سے جنگ کرو، اور وہ جس کو قتل کریں، وہ قیامت کے دن اجر کا مستحق ہوگا۔ (**بخاری، عن علی، کتاب فضائل القرآن، حدیث نمبر: ۴۷۷۰**) گویا ایسے لوگ حقیقت میں مسلمان نہیں ہیں، یہ دراصل ان لوگوں میں شامل ہیں، جن کو قرآن مجید

نے ''منافقین'' کہا ہے، یعنی ایسے لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوں؛ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہیں، بعد میں اس طرح کے جو لوگ مسلمانوں کی صفوں کو داخل ہو جائیں، ان کو فقہاء نے ''زندیق'' سے تعبیر کیا ہے، اور زندیق کا وہی حکم ہے جو حکم کافر کا ہے؛ بلکہ عام لوگوں کے کفر سے ان کا کفر بڑھا ہوا ہے؛ اس لیے کہ بعض فقہاء کے نزدیک زندیق کی توبہ بھی نا قابل قبول ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیہ: ۱۲۶/۱۴) اس لیے مسلمانوں کو ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ اسلام کی سربلندی کے لیے کام کر رہے ہیں، یا خلافت قائم کر رہے ہیں؛ بلکہ یہ زمین میں فساد مچانے کی بدترین کوشش ہے، یہ اسلام کو بدنام کرنے کی سازش ہے اور یہ خلافت نہیں ہے، جنگل راج ہے، خلافت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی دبنگ شخص کچھ غنڈوں کو ساتھ لے کر لاٹھی تلوار کے زور سے زمین کے کسی خطہ پر قابض ہو جائے اور اپنی خلافت کا اعلان کر دے، خلیفہ مسلمانوں کا منتخب نمائندہ ہوتا ہے اور وہ معتبر علماء اور اصحابِ رائے کے مشورہ سے فیصلہ کرتا ہے، احکامِ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے، وہ انصاف، عفو و درگذر، صلح جوئی اور اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کا نمونہ ہوتا ہے، داعش جو کچھ کر رہا ہے، وہ ایک ظالم اور قانون سے آزاد ڈکٹیٹر کا عمل تو ہو سکتا ہے، شریعت اسلامی کے نگہبان خلیفہ کا عمل نہیں ہو سکتا۔

ان حالات میں مسلمانوں کی دو اہم ذمہ داریاں ہیں: ایک یہ کہ وہ نوجوانوں کو صحیح صورتِ حال سے باخبر کریں، انہیں بتائیں کہ یہ تحریک مکمل طور پر اسلام کے مزاج سے ہٹی ہوئی ہے، اس کا مقصد اسلام کو رسوا کرنا اور مغربی قوتوں کے لیے اس بات کا جواز فراہم کرنا ہے کہ وہ مسلم ملکوں میں اندھا دھند بم باری کریں اور اپنے ناپاک وجود کو وہاں برقرار رکھیں — دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، جہاد کی حقیقت کیا ہے، جہاد کن لوگوں سے ہے، صلح و امن کا اسلام میں کیا مقام ہے، غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ اسلام نے کس طرح زندگی گذارنے کی تعلیم دی ہے، جن صورتوں میں جنگ کی نوبت آجائے، ان میں بھی اسلام کا قانونِ جنگ کیا ہے؟ ان امور کی مدلل وضاحت کو غیر

مسلموں تک پہنچانا اور اس کے لیے میڈیا خاص کر سوشل میڈیا کا سہارا لینا وقت کی اہم ضرورت اور ایک دینی فریضہ ہے، خصوصاً ائمہ وخطباء کو جمعہ کے خطبات میں اس کی وضاحت کرنی چاہیے، دینی جلسوں میں اس پر روشنی ڈالنی چاہیے، دینی جامعات میں اس پر اظہارِ خیال ہونا چاہیے، عصری درس گاہوں کے طلبہ کی ذہنی تربیت پر بھی توجہ دینی چاہیے؛ کیوں کہ مسلمان اس وقت پوری دنیا میں جس ظلم وجور اور محرومی وناانصافی کا شکار ہیں، اس سے اگر نوجوانوں کا گرم خون کھول اٹھے تو باعث حیرت نہیں، اس ماحول میں انسان ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا اور تریاق نما زہر کو اکسیر سمجھنے لگتا ہے اور نادانستہ طور پر ایسی سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ علماء اور مختلف مکاتب فکر کے مذہبی قائدین اپنے رویہ میں احتیاط پیدا کریں اور دوسرے اہل قبلہ کی تکفیر میں حد درجہ احتیاط سے کام لیں، بدقسمتی سے برصغیر میں بعض حضرات کے یہاں اسلام کا ایسا تصور ہے کہ وہ اپنے گروہ کے سوا کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے، ان کی نظر میں ان کے سوا ہر فرقہ اور ہر مذہبی جماعت ایمان کے دائرہ سے باہر نکل چکی ہے، اسی طرح ایک اور ایسا گروہ ابھر رہا ہے، جو نہ صرف موجودہ دور کے مسلمانوں کو مشرک ٹھہرا رہا ہے اور امت کے سوادِ اعظم کو دائرۂ اسلام سے باہر نکالنے پر تلا ہوا ہے؛ بلکہ سلف صالحین کی غالب اکثریت کو بھی وہ ضال ومضل ٹھہراتا ہے، محدثین، مفسرین، فقہاء اور متکلمین کی غالب اکثریت اسلامی معتقدات کی تشریح میں امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کی آراء کو قبول کرتی آئی ہے، جن کو ''اشاعرہ'' اور ''ماتریدیہ'' کہا جاتا ہے، یہ حضرات بیک قلم ان سب کو گمراہ اور گمراہی کا مبلغ قرار دیتے ہیں؛ بلکہ بعض تو ان کو مشرک بھی ٹھہراتے ہیں، اگر ایسے غلو پسند اور کم فہم لوگوں کی بات درست مان لی جائے تو مسلمانوں کی تعداد نہ صرف موجودہ دور میں بلکہ عہد ماضی میں بھی بہت کم رہ جائے گی، یہ غلو، کم فہمی، مزاجِ دین سے ناآگہی اور تنگ نظری ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ علماء اور اربابِ افتاء، مسلمان مفکرین اور مذہبی قائدین موجودہ حالات کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کریں، دوسروں کو کافر ومشرک ٹھہرانے کے فتنہ پر قابو پائیں اور اپنے عمل سے اسلام دشمن طاقتوں کی تقویت کا

سبب نہ بنیں۔

اللہ تعالیٰ اس نئی اسلام دشمن سازشی تحریک سے امت کی حفاظت فرمائے اور مغرب کی طرف سے مسلط کی جانے والی اس خوں ریز جنگ سے باہر لائے، جس کو تیسری جنگ عظیم قرار دیا جارہا ہے۔ وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان!

اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے اسلام کو بدنام کرنے کی سازش

داعش نے اسلام کو بدنام کرنے اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا جو بیڑہ اُٹھایا ہے، اس کے ایک حصہ کے طور پر وہ عورتوں کو باندی بنانے اور ان کی خرید وفروخت کے بازار لگانے کی اوچھی حرکت بھی کررہے ہیں، سنا گیا ہے کہ جن لوگوں پر وہ تسلط حاصل کر لیتے ہیں، ان کی عورتوں کو باندی ڈکلیئر کردیتے ہیں، کھلے عام ان کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان کو نیلام کیا جاتا ہے، برسرعام ان کی ڈاک لگائی جاتی ہے اور یہ ساری غیر اسلامی حرکتیں اسلام کے نام پر کی جاتی ہیں، پھر یہی شرم ناک تصویریں انٹرنیشنل اور نیشنل میڈیا سے لے کر سوشل میڈیا تک ہر جگہ پھیلائی جاتی ہے اور جس مذہب نے سب سے زیادہ عفت و پاک دامنی، شرم وحیا اور عورت کے ناموس کے احترام کی تلقین کی ہے، ایسے رُسوا کن واقعات کو اسی دین وشریعت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے اور اس سلسلہ میں چند سوالات پر غور کرنا چاہیے:

(۱) غلام اور باندی سے متعلق قانون کیا شریعت محمدی کا وضع کیا ہوا ہے، یا دیگر مذاہب اور قوانین میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے؟

(۲) اسلام نے غلام اور باندی کے رواج کو بیک جنبش قلم کیوں ختم نہیں کیا اور اس نے کس طرح بتدریج اس رواج کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی؟

(۳) اسلام میں غلام اور باندی کے کیا احکام اور حقوق ہیں؟

(۴) کیا اسلامی تعلیمات کی رُو سے اب بھی غلام اور باندی بنائے جاسکتے ہیں؟

جہاں تک اسلام سے پہلے غلام اور باندی کا تصور ہے تو یہ تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا ہے، مغربی تہذیب کا سلسلۂ نسب روم اور یونان سے ملتا ہے، ان کے یہاں غلاموں اور باندیوں پر جو مظالم ہوا کرتے تھے، تاریخ میں ان کا ذکر موجود ہے، یہاں تک کہ غلاموں کو جانوروں سے لڑایا جاتا تھا اور غلام بنائی ہوئی عورتوں سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی، ہندو مذہب برادرانِ وطن کے دعوے کے مطابق ان کا مذہب قدیم ترین مذہب ہے، ان کے یہاں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کرشن جی کے اصل بیوی تو رادھا تھیں؛ لیکن سینکڑوں گوپیاں ان کے تصرف میں تھیں، ظاہر ہے کہ وہ سب ان کی باندیاں ہی تھیں، کرشن جی ان سے جنسی اعتبار سے بھی لطف اندوز ہوا کرتے تھے، ہندو مذہب میں جنگ کا یہی قانون تھا کہ جنگ میں جو قوم مغلوب ہو جائے، عورتوں کے بشمول تمام چیزیں جیتنے والے کی ملکیت ہو جاتی؛ چناں چہ منو جی کی دھرم شاستر کی یہ عبارت ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

''گاڑی، گھوڑا، ہاتھی، چھتری، لباس (سوائے ان جواہر کے جو اس میں ٹکے ہوئے ہوں) غلہ، مواشی، عورتیں اور ہر قسم کی رقیق اور جامد چیزیں (سوائے چاندی سونے کے) اس شخص کی جائز ملک ہیں جو لڑائی میں ان کو جیتے۔'' (٧:٦٩)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندو مذہب میں مفتوح قوموں کے مردوں اور عورتوں کو غلام اور باندی بنا لینے کا باضابطہ قانون موجود تھا، یہ تو انفرادی غلامی کا مسئلہ ہے؛ لیکن ہندو مذہب کی اصل تعلیمات میں تو پوری قوم کی غلامی کا تصور ہے، جس کی ایک ایک مرد و عورت پر اس سے اعلیٰ تر گروہ کی ملکیت قائم ہوتی تھی؛ چناں چہ منو جی کی تعلیمات میں ہے:

''شودر ذات کا ہر آدمی خواہ خریدہ ہو یا ناخریدہ، اسے برہمن اپنی خدمت پر مجبور کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کو واجب الوجود نے برہمن کی غلامی ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ (٨: ٣١٤)

تورات میں بھی باندی کا تصور موجود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی طرف یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں اپنی نسبت کرتے ہیں، تورات میں ہے کہ: ''مصری شہزادی

حضرت ہاجرہ ان کی پہلی بیوی حضرت سارہ کی باندی تھیں، جو انھوں نے حضرت ابراہیم السلام کو دے دی تھی اور اسی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے“ (پیدائش: ۱۶: ۱-۴)
اگرچہ بائبل کا یہ بیان درست نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہی تھیں؛ لیکن بائبل کے اس بیان سے یہ بات بہرحال واضح ہوگئی کہ باندی کا تصور یہودی وعیسائی مذہب میں بھی موجود ہے، بائبل کے بیان کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی ڈھیر ساری باندیاں تھیں؛ چناں چہ تورات میں ہے: ”اس کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔“ (سلاطین: ۱۱)

تورات میں جنگ کا جو قانون بیان کیا گیا ہے، اس میں مفتوح قوم کی عورتوں کو باندی بنا لینے کا واضح حکم دیا گیا ہے؛ چناں چہ تورات کے صحیفہ گنتی میں ہے:
”سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کردو اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف تھی جان سے ماردو؛ لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔“ (۱۳: ۱۷-۱۸)

اس لیے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ باندیوں کے رسم کی ایجاد اسلام نے کی ہے، یہ رسم دنیا کے دوسرے مذاہب اور نظام ہائے قانون میں پہلے سے موجود رہی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس رسم کو ختم کیوں نہیں کیا؟ اَوّلاً تو بعینہٖ یہ سوال ہندو مذہب کے ماننے والوں اور تورات کی اتباع کرنے والوں سے بھی ہوتا ہے؛ لیکن اس کی حکمت پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام باوجود یہ کہ عدل وانصاف کا داعی اور مساوات کا علم بردار ہے، نیز اس کی بنیادی دعوت ہی انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں داخل کرنا ہے، تو پھر اس نے کیوں غلامی کے اس نظام کو سود اور شراب وغیرہ کی طرح یک بارگی ختم نہیں کیا؟ —— دراصل اس کا تعلق قانون جنگ سے ہے، جنگ میں جو لوگ مارے جائیں، ان کا تو کام تمام ہو چکا؛ لیکن مفتوح قوم کے جو مرد وعورت بچ جائیں، ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، گذشتہ اقوام میں ان کے لیے دو ہی راستے تھے، یا تو ان کو بھی قتل

کردیا جاتا، یا انہیں غلام و باندی بنالیا جائے، مثلاً تورات میں ہے:

''لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری کردیتا ہے، کسی چیز کو جوسانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو؛ بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔ (استثناء: ۲۰: ۱۶-۱۷)

تورات کے اسی باب میں ایک اور موقع پر کہا گیا ہے:

''اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے؛ بلکہ جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دے دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے، کھائیو۔ (استثناء: ۲۰: ۱۰-۱۴)

غرض کہ جنگی قیدیوں کے سلسلہ میں یہی دو طریقے تھے، ان کا قتل عام یا انہیں غلام اور باندی بنالینا، اسلام چوں کہ اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے غلامی کے اس نظام کو پسند نہیں کرتا اور نہ بلا وجہ قتل وخوں ریزی کو گوارا کرتا ہے؛ اس لیے اس نے اَوّل یہ ہدایت دی کہ میدانِ جنگ میں تو تمہارا دشمنوں کو قتل کرنا درست ہے؛ لیکن جب وہ قابو میں آجائیں تو سوائے بعض استثنائی اور غیر معمولی صورتوں کے انہیں قتل نہ کیا جائے؛ بلکہ قیدی بنالیا جائے: ''حَتّٰی اِذَا اَثْخَنتموهم فَشدوا الوَثَاقَ'' (محمد: ۴) اب ان قیدیوں کو زندہ رکھتے ہوئے اسلام سے پہلے ایک ہی راستہ تھا کہ انہیں غلام اور باندی بنالیا جائے؛ لیکن اسلام نے ان کے لیے کئی راستے رکھے ہیں — ایک صورت یہ ہے کہ ان کو گرفتار ہی نہ کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر مشرکین کے ساتھ اور بنو قینقاع، بنو نضیر اور خیبر کے موقع پر یہی صورت اختیار فرمائی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ گرفتار کرنے کے باوجود انہیں بلا معاوضہ رہا کردیا جائے، جس کو قرآن مجید نے ''مَــن''، یعنی احسان سے تعبیر کیا ہے۔ (محمد: ۴) — آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے جنگ حنین کے موقع پر قبیلہ بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کو بغیر کسی معاوضہ کے رہا

فرما دیا، صلح حدیبیہ کے موقع سے اسّی مشرکین کے گروہ نے صبح کے اندھیرے میں حملہ کیا اور گرفتار ہوئے، ان کو بھی آپ نے یوں ہی رہا فرما دیا، بعد کو جب روم و ایران کے علاقے فتح ہوئے تو اس وقت بھی عمومی طور پر مفتوحین کو رہا کر دیا گیا اور انہیں غلام و باندی نہیں بنایا گیا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو رہا کیا جائے اور فدیہ میں بھی یہ گنجائش ہے کہ چاہے ان سے مال کی شکل میں فدیہ لیا جائے یا ان کی مہارت سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسی کو ان کا فدیہ بنا دیا جائے، جیسا جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، غزوۂ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے دس مسلمان بچوں کی تعلیم کو ان کے حق میں فدیہ قرار دیا تھا — قرآن میں ان ہی دو صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے: بلا معاوضہ رہا کر دینا، یا معاوضہ لے کر رہا کر دینا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قید کیے جانے والوں کے ساتھ اصل حکم یہی دو ہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے، اس زمانہ میں قیدیوں کے تبادلہ کا کوئی بین قومی معاہدہ نہیں تھا؛ لیکن جہاں ایسی صورت ممکن ہوئی، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے قیدیوں کا تبادلہ بھی فرمایا اور اسی لیے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر دشمن جنگی قیدیوں کے باہمی تبادلہ پر آمادہ ہو جائیں تو قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے گا۔ (فتح القدیر: ۳۰۶/۴)

پانچویں صورت یہ ہے کہ کہ دشمن کے قیدیوں کو غلام اور باندی بنا لیا جائے؛ لیکن یہ صرف ایک جائز عمل تھا، اس کی ترغیب نہیں دی گئی، اور اس کی گنجائش بھی اسی وقت ہے، جب کہ قیدیوں کے تبادلہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے۔

اس زمانہ میں صورتِ حال یہ تھی کہ بعض اوقات جنگی قیدیوں کے تبادلہ کا معاہدہ نہیں ہو پاتا تھا اور قیدیوں کو یوں ہی یا فدیہ لے کر رہا کر دینے میں مسلمانوں کا دفاع خطرہ میں پڑ سکتا تھا؛ چناں چہ غزوۂ بدر میں جن قیدیوں کو رہا کیا گیا، انہوں نے بھی آئندہ جنگ کی آگ بھڑکانے میں اہم رول ادا کیا؛ اس لیے اب ایک ہی صورت تھی کہ ان کو قید کر کے سماج کا حصہ بنا لیا جائے اور ان کو تمام انسانی حقوق دیئے جائیں، یہ بات اس لیے بھی ضروری تھی کہ بعض

اوقات جنگ میں پوری پوری آبادی اجڑ جاتی تھی، مردوں کی اکثریت یا تمام مرد مارے جاتے تھے، اب ان بچوں اور عورتوں کے لیے بجائے اس کے کہ جیل بنائی جائے اور ان کو آزاد فضا سے محروم کرکے جانوروں کی طرح پالا جائے، یا عورتوں کو یوں ہی بغیر کسی کفیل کے چھوڑ دیا جائے، اس بات کو بہتر سمجھا گیا کہ ان کو خاندان کا حصہ بنالیا جائے؛ اسی لیے غلام اور باندی اسی خاندان کی طرف منسوب ہوتے تھے، جس کی ملکیت میں وہ ہوا کرتے تھے، غرض کہ اس وقت اس کو باقی رکھنا اور بتدریج ختم کرنا ایک ضرورت تھی اور کسی کے غلام اور باندی ہونے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ وہ جنگ میں قید ہوکر آئیں، یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ باندی سے استفادہ کے جائز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مفتوحہ قوموں میں جو عورت جس کے ہاتھ آجائے، وہ اس کو اپنے تصرف میں لے آئے؛ بلکہ اس کے لیے بھی قاعدہ وقانون مقرر تھا، غلام ہوں یا باندی، یہ حکومت کی ملکیت ہوتے تھے، پھر انہیں مجاہدین میں تقسیم کرکے انھیں مالک بنایا جاتا تھا، مالک بنائے جانے کے بعد بھی ان سے عدت گذروائی جاتی تھی؛ تاکہ نسب میں اختلاط کا اندیشہ نہ رہے۔

افسوس کہ ذرائع ابلاغ قرآن مجید کے ارشاد: ''**مَا مَلَکَت اَیمَانُکُم**'' (تمہارے داہنے ہاتھ جس کے مالک ہوجائے) کی غلط تعبیر کرتے ہوئے اس کا مطلب بیان کررہے ہیں کہ جو جس کے ہاتھ آجائے، وہ اس کو اپنے تصرف میں لے لے، یہ بالکل غلط ہے، عربی زبان کا ایک محاورہ یہ ہے کہ مالک ہونے کو ''ملک ید'' یا ''ملک یمین'' سے تعبیر کرتے ہیں؛ کیوں کہ آدمی جس چیز کا مالک ہوتا ہے، عام طور پر اس کو قبضہ میں لینے کے لیے اپنے ہاتھوں اور خاص کر داہنے ہاتھ کا استعمال کرتا ہے، اسی لیے ید کے معنی تو ہاتھ کے ہیں؛ لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ''قبضہ'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے؛ کیوں کہ قبضہ حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہاتھ ہی ہے، اسی طرح اعمال تو انجام دیئے جاتے ہیں جسم کے تمام اعضاء سے، چاہے عمل اچھا ہو یا برا؛ لیکن عربی زبان میں اس کو ''کسب ید'' یعنی ہاتھوں کی کمائی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید میں فرمایا گیا: ''**بِمَا کَسَبَت اَیدِیکم**'' (الشوریٰ: ۳۰) تو ملک

یمین یا ملک ید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عورت تک جس کا ہاتھ پہنچ جائے، وہ اس کی ملک ہے اور اس سے اس کے لیے جنسی استفادہ کرنا جائز ہے؛ بلکہ ''**مَا مَلَکَت اَیمَانُکم**'' کے معنی یہ ہیں کہ جو عورت قید ہو کر آئے، قیدیوں کے تبادلہ کی صورت نہ بن پائے اور حکومت ان قیدیوں کو اپنی ملکیت میں لے کر فوجیوں کو اس کا مالک بنادے اور پھر وہ فوجی عدت گذروا کر ایک بیوی کی طرح اس کو اپنے حرم میں داخل کرلے تو اب اس کے لیے اس عورت سے استفادہ کی گنجائش ہے، گویا جیسے نکاح کے ذریعہ قواعد وضوابط کی پابندی کے ساتھ ایک مرد و عورت کا باہمی تعلق استوار ہوتا ہے، اسی طرح ''ملک یمین'' کے ذریعہ بھی قواعد وضوابط کی پابندی کے ساتھ مرد وعورت کا تعلق قائم ہوتا ہے، نہ یہ کہ جنگ ہو تو جو عورت جس کو بھا جائے، وہ اس کو اپنے قبضہ میں لے لے اور اس کے ساتھ بیوی جیسا عمل کرے، یہ زنا ہے اور اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔

پھر گذشتہ قوموں میں ان کی غلامی دائمی ہوتی تھی، ان کے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی؛ چناں چہ منو جی نے جو تعلیم دی ہے، وہ یہ ہے:

''شودر کو اگر اس کا آقا آزاد کرے تب بھی وہ آزاد نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ جو حالت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اس سے کون اس کو نکال سکتا ہے۔'' (۸:۴۱۴)

لیکن اسلام نے غلامی کا راستہ تو ایک ہی رکھا اور وہ ہے جنگی قیدیوں کا راستہ؛ لیکن اس کی آزادی کے لیے بہت سے راستے رکھے، اگر کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے تو کفارہ کے طور پر غلام یا باندی آزاد کرے۔ (المائدۃ:۸۹) اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کرلے، یعنی کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے تو غلام یا باندی کو آزاد کرنا اس کے لیے کفارہ ہے۔ (المجادلۃ:۳) اگر کسی سے قتل کا ارتکاب ہوجائے تو اس کا کفارہ بھی غلام کو آزاد کرنا ہے۔ (النساء:۲۹) —— غرض کہ مختلف گناہوں کے لیے غلام و باندی کے آزاد کرنے کو کفارہ قرار دیا گیا۔

اس کے علاوہ غلام کو آزاد کرنے کی بڑی فضیلت بیان کی گئی؛ چناں چہ حضرت

ابو ہریرہؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرے گا تو اس کے ہر عضو کو آزاد کردہ غلام کے اس عضو کے بدلہ دوزخ سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ (بخاری، باب فی العتق و فضله، حدیث نمبر: ۲۵۱۷) ایک صورت وہ رکھی گئی جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''تدبیر'' کہتے ہیں، یعنی آقا کہہ دیتا کہ میرے بعد یہ باندی آزاد ہو جائے گی، بہت سے لوگ کارِ خیر کے طور پر اس طرح آزاد کیا کرتے تھے، جیسا کہ لوگ ایصالِ ثواب کے لیے وصیت کیا کرتے ہیں، غلام و باندی کو آزاد کرنے کی ایک صورت یہ رکھی گئی کہ ان پر ایک رقم باندھ دی جاتی کہ جب بھی تم اتنی رقم ادا کر دو گے، آزاد ہو جاؤ گے، ان کو ''مکاتب'' کہتے تھے، پھر اس کے ساتھ ساتھ ایسے غلاموں کی مدد کرنے کی ترغیب بھی دی گئی اور خود قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا گیا۔ (البلد: ۱۳) باندی کے لیے آزادی کا مزید ایک راستہ رکھا گیا، وہ یہ کہ باندی کو بیوی کا درجہ دیتے ہوئے اس سے جنسی حظ اُٹھانے کی اجازت دی گئی، اب اگر ان کو اپنے آقا سے اولاد ہو جائے تو یہ گنجائش ختم کر دی گئی کہ وہ اس کو ہبہ کے ذریعہ یا فروخت کر کے کسی اور کو منتقل کر دے، نیز اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو وہی درجہ دیا گیا، جو بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کا ہوتا ہے، ایسی باندی کو ''اُم ولد'' کہا جاتا تھا اور عملاً وہ آزاد کے درجہ میں آجاتی تھی۔

غرض کہ ایک طرف تو آزادی کی مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں، دوسری طرف عمومی طور پر بھی غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی، جس کا اثر تھا کہ مسلمان اس کو سب سے بڑا کارِ ثواب تصور کرنے لگے انھوں نے نہ صرف اپنے غلاموں اور باندیوں کو آزاد کیا بلکہ بڑی تعداد میں غلاموں اور باندیوں کو خرید خرید کر بھی ان کو پروانۂ آزادی عطا کیا، مثلاً عہد صحابہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار، ذوالکلاع حمیری نے آٹھ ہزار اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار غلام آزاد کیے، مولانا عبدالسلام ندویؒ نے حدیث کی معروف کتاب ''بلوغ المرام'' کی شرح ''نجم الوہاج'' کے حوالہ سے صحابہ کرامؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد انتالیس ہزار دو سو سینتیس نقل کی ہے۔ (اسوۂ صحابہؓ: ۱۱۲/۲) ظاہر ہے کہ اس

میں مکمل احاطہ نہیں ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سے غلام ہوں گے، جنہیں صحابہؓ نے آزاد کیا ہوگا، اسلام کی ان ہی تعلیمات کا اثر ہے کہ رفتہ رفتہ غلام و باندی کا رواج ختم ہوگیا اور انسانیت کو اس سے نجات مل گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا اب بھی غلام اور باندی بنائے جاسکتے ہیں؟ کیا شریعت اسلامی میں اس کی گنجائش ہے؟ جواب یہ ہے کہ اَوّل تو موجودہ دور میں اقوام متحدہ کے واسطے سے تمام قوموں کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے کہ سیویلین آبادی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی، ان کی آزادیاں سلب نہیں کی جائیں گی اور قید ہونے والے فوجیوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے گا، پوری دنیا میں اُصولی طور پر یہی معمول ہے، اگر کوئی حکومت اس کی خلاف ورزی کرتی ہے تو اس کو زیادتی باور کیا جاتا ہے اور اس پر بین الاقوامی دباؤ بھی ڈالا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ زیادتی کے ایسے واقعات کو نظیر نہیں بنایا جاسکتا، عالمی معاہدہ کی رو سے مسلمانوں پر بھی اس کی رعایت کرنا واجب ہے۔ دوسرے: ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ۳۰ دفعات پر مشتمل بنیادی انسانی حقوق کا منشور اقوام متحدہ نے پاس کیا، جس کی دفعہ: ۴ غلامی کے خاتمہ سے متعلق ہے، اور مسلم ملکوں نے بھی اس پر دستخط کیا ہے، یہ بھی ایک معاہدہ ہے اور شریعت میں عہد کو پورا کرنے کا حکم ہے، خواہ وہ افراد کے درمیان ہو یا دو قوموں کے درمیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بین الاقوامی معاہدات کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ صلح حدیبیہ کے مطابق مسلمانوں پر یہ بات لازم قرار دی گئی تھی کہ اگر مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ چلا آئے تو مسلمان اس کو واپس کردیں اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہوکر مکہ چلا جائے تو اہل مکہ اس کو واپس نہ کریں، یہ دفعہ سراسر ناانصافی پر مبنی تھی، ابھی یہ معاہدہ مکمل ہی ہوا تھا کہ مکہ سے ایک صحابیؓ اس حال میں آپ کے پاس پہنچے کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حدیبیہ ہی میں مقیم تھے، آپ کی بہت کوشش کے باوجود اہل مکہ ان کے معاملہ میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوئے، اور مسلمانوں نے دکھے دلوں کے ساتھ اپنے ایک بھائی کو ان کے دشمنوں کے حوالہ کردیا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے عہد کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں کیا، اسی طرح مدینہ ہجرت کرنے

کے بعد آپ نے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا؛ حالاں کہ یہودیوں کی طرف سے سازشوں کے اور وعدہ خلافی کے متعدد واقعات کا ارتکاب ہو چکا تھا؛ لیکن آپ نے معاہدہ کی پاس داری فرمائی؛ اس لیے مسلمان چاہے دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں، اگر جائز اسباب کی بنا پر جنگ کی نوبت آ گئی اور کچھ غیر مسلم مرد وعورت قید ہو گئے تو ان کو غلام و باندی بنانا جائز نہ ہوگا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ غلاموں اور باندیوں کو اسلام سے پہلے کوئی حق حاصل نہیں تھا، انہیں اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں، باندیوں کو ایک مشترکہ ملک سمجھا جاتا تھا اور ان کو بے آبرو کرنے کی کھلے عام اجازت ہوتی تھی، جانوروں کی طرح ان کے لیے اصطبل ہوتا تھا، اسی میں انہیں رکھا جاتا تھا، انہیں معمولی معمولی باتوں پر کوڑوں کی سخت سزائیں دی جاتی تھیں، رومیوں میں سیافی کا کھیل بہت مقبول تھا، جس کے لیے بڑے بڑے اسٹیڈیم ہوتے تھے، اس میں غلاموں کو آپس میں لڑایا جاتا تھا، جو غالب آتا، وہ مغلوب کی بوٹی بوٹی کر دیتا تھا، بعض اوقات انہیں درندوں سے لڑایا جاتا تھا اور قتل وخون کے اس ہول ناک منظر پر تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت قبطیوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا، صرف نجومی کے اس بیان پر کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہونے والا ہے، جو فرعون کی حکومت کو ختم کر دے گا، بنو اسرائیل کے ہر نومولود کو قتل کر دیا جاتا تھا، خود عربوں میں غلاموں اور باندیوں کے ساتھ ہر طرح کی زیادتی روا رکھی جاتی تھی، یہاں تک کہ باندیوں سے قحبہ گری کا کام بھی لیا جاتا تھا، وہ محفلوں میں ناچتی گاتی اور لوگوں کو شراب پلاتی تھیں۔

اسلام نے اگرچہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے غلام اور باندی کے نظام کو کلی طور پر ختم نہیں کیا؛ لیکن ایک طرف آزادی کے ایسے راستے نکالے کہ بالآخر غلامی کا رواج ختم ہو گیا، دوسری طرف غلاموں کو تمام بنیادی انسانی حقوق عطا کیے اور مالک کے حقوق قریب قریب اس حد تک محدود کر دیے، جو ولی کو اپنے زیر ولایت شخص پر حاصل ہوتی ہے، غلام اپنے آقا کو رب کہا کرتے تھے اور آقا اپنے غلام کو عبد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ

کوئی شخص اپنے غلام کو عبد (بندہ) کہے، یا کوئی غلام اپنے آقا کو رب؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے غلاموں کے بارے میں فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں۔ (بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر: ٥٧٠٣٠) آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا کہ غلام اور باندی کو خادم اور خادمہ کہنا چاہیے۔ (کشف الخفاء:١/٦٩) اسی طرح اسلام نے آزاد مرد کے باندی سے نکاح کو اور غلام مرد کے آزاد عورت سے نکاح کرنے کو جائز قرار دیا، حضرت ابوہریرہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہے اور اس کا غلام اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے تو فرمایا کہ اس کو اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھالو؛ کیوں کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور جیسی روح تمہارے اندر ہے، ویسی ہی روح اس کے اندر بھی ہے۔ (الزھد لابن المبارک:١/١٣٣) مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے مختلف صحابہؓ کے درمیان مواخاۃ اور بھائی چارہ قائم فرمایا تو حضرت بلالؓ کو خالد بن رواحہ خثعمیؓ کا، حضرت زیدؓ کو حضرت حمزہؓ کا اور خالد بن زیدؓ کو حضرت ابوبکرؓ کا بھائی قرار دیا، غلاموں اور باندیوں کو ان کے جان و مال اور ان کی عزت و آبرو، تعلیم اور نکاح میں وہی حقوق دیئے گئے، جو عام لوگوں کے ہیں، یہی وجہ ہے کہ غلاموں میں بڑے بڑے علماء، حکومت کے اعلیٰ عہدہ داران؛ یہاں تک کہ سلاطین بھی پیدا ہوئے۔

حیرت اہل مغرب پر ہے کہ یورپ میں تو اٹھارہویں صدی کے انقلابِ فرانس تک غلاموں اور باندیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی، غلاموں سے کاشت کاری کی پُر مشقت خدمت لی جاتی تھی، اگر کوئی غلام تنگ آکر بھاگ جاتا تو قانون کی نظر میں وہ بھگوڑا قرار دیا جاتا تھا، پھر جب وہ گرفتار ہو جاتا تو اس کے جسم کو داغا جاتا اور اسے پابہ زنجیر اس کے مالک کے حوالہ کیا جاتا، امریکہ میں ابراہیم لنکن کے عہد تک غلامی کا رواج باقی تھا؛ لیکن انفرادی غلامی سے بدتر وہ غلامی ہے، جس کو مغرب کی استعماری طاقتوں نے مشرقی ملکوں میں اختیار کیا، اس سلسلہ میں مردوں سے بے گار لینے، عورتوں کی بے آبروئی کرنے اور فوجیوں سے ان کی مشترک طور پر عصمت ریزی کرانے کے اتنے زیادہ اور ایسے ایسے سنگین واقعات پیش آتے رہے ہیں، جو شیطانوں کو بھی شرم سار کردیں، الجزائر، افریقی ممالک، ملیشیاء، چین اور ابھی

ماضی قریب میں بوسنیا وغیرہ میں پوری پوری قوم کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا رہا ہے، وہ کسی قوم کے چند افراد کو غلام اور باندی بنانے سے لاکھ درجہ بدتر ہے، افسوس ہے کہ لوگوں کو اپنے آنکھوں کا شہتیر نظر نہیں آتا اور دوسرے کی آنکھوں کا بال بھی چبھنے لگتا ہے!

یہ تو مغرب کا حال ہے، ہندوؤں کے یہاں غلاموں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا؟ اس کے لیے منوسمرتی کا مطالعہ کرنا چاہیے، چناں چہ یہاں منوسمرتی کی چند دفعات نقل کی جاتی ہیں:

☆ شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے۔ (۳:۱۷)

☆ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (۴:۱۸)

☆ اگر کسی برہمن کی اپنی ذات کا آدمی موجود نہ ہو تو اس کی میت کو شودر کے ہاتھ سے نہ اٹھوانا چاہیے؛ کیوں کہ جو مراسم تجہیز ایک شودر کا ہاتھ لگنے سے آلودہ ہو جائیں، وہ بہشت کی طرف نہیں جا سکتے۔ (۵:۱۰۴)

☆ اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھالے تو وہ سات دن تک آشِ جو کے سوا کچھ نہ کھائے پیے۔ (۱۱:۲۴)

☆ ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے؛ کیوں کہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی جائیداد اس کا آقا لے سکتا ہے۔ (۸:۴۱۷)

☆ شودر اگر مال و دولت حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہو تب بھی اسے حاصل نہ کرنا چاہیے؛ کیوں کہ جو غلام دولت جمع کر لیتا ہے وہ برہمن کو اذیت دیتا ہے۔ (۱۰:۱۲۹)

☆ شودر عورت کے پیٹ سے برہمن، کشتری یا ویش مرد کا لڑکا باپ کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہ پا سکے گا، اس کا باپ جو کچھ اسے دے دے، وہی اس کی ملک ہے، دو تج ذات کے مردوں کی جو اولاد خود اپنی ذات کی عورت سے پیدا ہوئی ہو، وہ باہم ترکہ کی مساویانہ تقسیم

کرے۔(۹:۱۴۹-۱۵۶)

☆اگروہ (شودر) غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجا اس کے منھ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے۔(۸:۲۷۲)

اس کے برخلاف اسلام نے غلامی کا سدباب کرنے اور غلام و باندی کو عام انسانوں کے درجہ میں لانے کے لیے سہ رخی کوششیں کیں، ایک طرف غلام اور باندی کو آزاد کرنے کی بہت سی صورتیں نکالیں، دوسری طرف آزاد کرنے اور اس میں تعاون کرنے کو بہت ہی قابل تحسین عمل قرار دیا، تیسرے: غلاموں اور باندیوں کے لیے ایسے حقوق متعین کیے کہ وہ عام لوگوں کے ہم پلہ ہو جائیں، ان تدبیروں نے آہستہ آہستہ غلامی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔

نوٹ:- اس تحریر میں منوشاستر کے جو حوالے دیے گئے ہیں، وہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''الجہاد فی الاسلام'' سے ماخوذ ہے، اور خود مولانا نے منوشاستر کے دو انگریزی ترجمے سامنے رکھے ہیں، جن میں ایک سر ولیم جونز کا ہے، دوسرے برنل کا ترجمہ مع شرح ہے، جسے ۱۸۹۴ء میں پروفیسر ہاپکنس نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔